یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب .



سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

۷۸۶

۱۱۰_۹۲

یا صاحب الزماں ادرکنیؑ

یا عباسؑ

Knowledge for All

SABIL-E-SAKINA

DvD Version

لبیک یا حُسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس

رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

ہمارے عقائد ہماری تاریخ

علی حسین رضوی

ہمارے عقائد

ہماری تاریخ

ایک تحقیقی دستاویز

26/05/03

سید سرفراز ناصر

Syed Sarfaraz Nasir.

ہمارے عقائد

ہماری تاریخ

(صرف شیعوں کے لیے)

مؤلفہ

علی حسین رضوی

مطبوعہ

امامیہ اکیڈمی کراچی

ہمارے عقائد
ہماری تاریخ

مصنف : علی حسین رضوی

اشاعت اوّل : اگست ۱۹۹۰ء

اشاعت دوم : نومبر ۲۰۰۱ء

تعداد : ایک ہزار

پرنٹر : افریشیا پرنٹنگ پریس

باہتمام : سید اینڈ سید (پبلشرز) کراچی

قیمت : -/170 روپے

ہمارے عقائد

ہماری تاریخ

ماضی میں ہم جن حالات سے بھی دوچار رہے ہوں لیکن علم ہمارا طرۂ امتیاز تھا. بالخصوص اپنے عقائد اور اپنی تاریخ سے ہماری واقفیت نے جابرانہ اور ظالمانہ ماحول میں بھی ہمیں زندہ رکھا. لیکن اب صورت حال بالکل مختلف ہے جن میں صرف مجالس سیدالشہدا ہمارا واحد سہارا ہیں۔

پڑھنے کیلیے بکھرا ہوا مواد تو موجود ہے مگر نئی نسل کے پاس مطالعہ کے لیے اتنا وقت نہیں کہ اس میں سے وہ اپنی تاریخ کو اخذ کرسکے۔ بازار میں تاریخ اسلام کے نام سے جو کچھ ملتا ہے: اس میں ہماری تاریخ کا کوئی حصہ پایا نہیں جاتا للذا ضرورت تھی کسی ایک کتاب کی جو "آپ بیتی" کے طور پر چودہ سو سال کے واقعات کا احاطہ کرسکے۔

اس ضرورت کو بڑے مختصر پیرائے میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایک ہی کتاب میں اپنے عقائد و تاریخ کو یکجا کردیا گیا ہے جس کا مطالعہ نوجوان قاری کے ذہن میں تصویر ماضی کے خد و خال کو روشن کردے گا اور پھر اس کو اپنی حیثیت متعین کرنے میں کسی قیاس آرائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

سردست اس کی اشاعت ایک محدود دائرے میں اور ایک محدود پیمانے پر کی جارہی ہے۔ آپ سے بس اتنی ہی استدعا ہے کہ اپنی کاپی محفوظ کرالیں جو ہمارے منصوبۂ اشاعت کا حصہ ہے۔

مؤلف

ترتیب مضامین

افتتاحیہ

زیرِ نظر کتاب درحقیقت تاریخ محمدؐ وآلِ محمدؐ ہے جس کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی تاریخ اسلام کہا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کے پورے تاریخی سرمائے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی جائے تو دمشق میں استقرار خلافت سے مستنصر باللہ کے عہد تک تقریباً چھ سو سال کا پورا دور حسن و شباب کی رنگینیوں میں ڈوبا نظر آتا ہے اور دربارِ شاہی میں مہوشان حشر رفتار کے ہاتھوں سے گلرنگ کے جام چھلکتے دکھائی دیتے ہیں

اس مدت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے چند مقدس سال مستثنیٰ کیے جاسکتے ہیں حضرت معاویہ کا دور کسی طرح اس دائرے سے باہر نہیں نکلتا کیونکہ اس میں جمال و شراب کا زیادہ چرچا نہ تھا تو دارالامارۂ دمشق کے در و دیوار پر برگزیدہ اصحاب رسولؐ اور بے گناہ سادات کے خون کے چھاپے لگائے جاتے تھے پھر اس پر مستزاد منبروں سے حضرت علیؑ اور اولاد علیؑ پر تبرا ہے جس کا فتویٰ اسلام کے کسی مسلک فقہ سے نہیں مل سکتا۔ یہ غیر اسلامی اعمال خطائے اجتہادی کی تعریف میں بھی نہیں آسکتے۔ مسلمان کتنی ہی طرفداری کریں، فحاشی کے اس دور کا آغاز ۴۱ھ یا اس سے کچھ قبل ہی متصور ہوگا۔

سونے پر سہاگہ ہے معاویہ کی وہ روایت سازی، جس نے سیرت پیغمبرؐ تک کو داغدار کرکے رکھ دیا اور جس کا کم از کم نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل اس طرح مدغم ہو گئے کہ آج دونوں میں تمیز مشکل ہے۔ جھوٹ اتنی بار دہرایا گیا کہ سچ اس کے سامنے مدھم پڑ گیا۔ عوام کو دھوکا دینے کے لیے کوئی کچھ کہہ دے لیکن معاویہ کے دامن سے یہ داغ

دھوئے نہیں جاسکتے۔

رہ گئے عبد اللہ ابن زبیرجن کی خلافت ایک مختصر مدت کے لیے، ایک محدود علاقے میں قائم ہوئی۔ انھوں نے بھی آلِ رسولؐ کے ساتھ جابرانہ اور ظالمانہ سلوک کیا، صرف بیعت لینے کے لیے اور ناجائز خلافت پر جائز ورثار سے مہر تصدیق ثبت کرانے کی خاطر ان میں ذرا بھی دور بینی ہوتی تو مطالبہ بیعت کے سابقہ انجام کو نہ بھولتے۔

اس کے بعد مسلم سلاطین کا آج تک کا دور، جس میں نیرو اور چنگیز خاں کے کردار چہروں پر اسلام کا نقاب ڈالے ہر موڑ پر پائے جاتے ہیں اور مسلمان مورخ جب ان کے کارناموں کو قلم بند کرتا ہے تو اس کا نام رکھتا ہے تاریخ اسلام — کیا یہی اسلام ہے جس کی سرگزشت ہم آج تک پڑھتے آئے ہیں؟

جامعین احادیث کچھ زیادہ مورد الزام نہیں ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اہل بیت اور محبانِ علیؑ کی احادیث کو درخور اعتنار نہیں سمجھا، ہم ان سے بھی شکایت نہیں کرتے، انھیں جو کچھ ملا یا جو انھوں نے چاہا اس کو یکجا کر دیا لیکن ان سے جو تاریخ مرتب کی گئی اس میں قلم کاری کی خیانت قابل معافی نہیں ہے۔ قدیم مورخین میں جس کسی نے علیؑ اور فاطمہؑ کی اولاد کا تذکرہ کر دیا وہ خواہ اعثم کوفی جیسا کھرا حنفی ہی کیوں نہ ہو اس کو شیعہ کہہ دیا گیا۔

مورخین کی نظر میں شیعیت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ کوئی صوفی جذبۂ ولا میں "علی کا پہلا نمبر" کا آوازہ بلند کر دے تو گردن زدنی، حالانکہ تصوف میں تو پہلا نمبر علیؑ کا ہے ہی مگر بات نشیب کی طرف چلا جاتا ہے اور فوراً ذہن میں خلافت کا صحیح نمبر آجاتا ہے تو بُرا معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ کے قدیم عہد کے بعد جب مورخین نے قلم اُٹھایا تو خونخواروں کو فاتح ممالک لکھا لیکن قلوب کے اندھوں کو یہ دکھائی نہیں دیا کہ ان خونخواروں کی باچھوں سے سادات کا لہو بھی ٹپک رہا ہے۔

دمشق ہو یا بغداد کا قصر الحمراء، وہاں اگر ایک طرف بادۂ ناب سے بھرے ہوئے حوض نظر آئیں گے تو دوسری طرف سادات کے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہوں گے۔ حد ہے قسی القلبی کی کہ مسلمان قلم کار اولاد فاطمہ کے قتل پر اس کی آنکھ میں نمی بھی نہیں آتی اور سب کچھ دیکھنے کے باوجود وہ انجان بن کر گزر جاتا ہے۔

اور کوئی مورخ کسی واقعے یا کردار کا ذکر قلم کی روانی میں کر جاتا ہے تو ربط بیان میں اس کی اہمیت اور قیمت کو اتنا گرا دیتا ہے کہ اس سے قاری کے ذہن میں ایک بُرا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔

اس پر طرفہ ستم یہ ہے کہ پچھلی ربع صدی سے ناصبیت کُھل کر سامنے آگئی ہے جس کو نہ علیؑ کو بُرا کہنے میں عار ہے اور نہ رسولؐ کی بیٹی کو۔ خود حضرت ختمی مرتبت کو زبان سے تو کچھ نہیں کہا جاتا لیکن اُم المومنین عائشہ پر آپ کی فریفتگی ثابت کرنے کے لیے ایسی مفروضہ احادیث بیان کر دی جاتی ہیں جو شانِ رسالت کو مجروح ہی نہیں کرتیں بلکہ آپ کا تقویٰ، عزت نفس اور عدل سب پر داغ لگ جاتا ہے۔

ہمارے رسول خلقت آدم سے چودہ ہزار سال پہلے بھی نبی تھے اور قیامت کے بعد تک نبی رہیں گے۔ خدا کی طرف سے آپ کے بعد بارہ امام منصوص من اللہ تھے جو اپنے اپنے وقت معین پر تشریف لائے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ دنیا نے کس کو خلیفہ بنایا، کس کو شہنشاہ، ہم تو دین اسلام کے ان ہادیوں کے پابند رہے اور رہیں گے جنھیں رسول ہی کی طرح اللہ نے مامور کیا تھا۔

اُمت مسلمہ نے ان ہادیوں کے ساتھ جو سلوک کیا مسلم مورخین نے اس کے بیان میں صرف بد دیانتی ہی نہیں کی بلکہ انصاف کا خون بھی بہایا۔ لہٰذا ضرورت تھی مسلک اسلام پر ان کے گرد آلود نقوش پا کو اُبھارنے کی اور یہ بتانے کی کہ جابر و ظالم فرماں رواؤں کی تاریخ، تاریخ اسلام نہیں ہے۔ تاریخ اسلام تو نام ہے۔

مبلغین اسلام کی سرگزشت کا جسکا ایک مختصر سا خاکہ اس کتاب میں پیش کیا جاتا ہے جو خون اسلام اور خون سادات کے سرناموں کا تابع ہے۔

رسولؐ سے لے کر حضرت حجتؑ تک ہم پر کیا کیا بیتی، پیغمبر اسلام کے نام لیواؤں نے کس کس طرح یوم ذبح منایا؟ اس کی ایک جھلک قارئین کرام کو اس میں دکھائی دے گی اور یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اسلام کے خلافت ساز کتنے رحمدل یا کتنے شقی القلب تھے کہ پانی کو انھوں نے خون کے مقابلے میں گرانقدر بنا دیا۔

مظلوموں کی داستان کے ایک دور کا احاطہ یقیناً کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے تاریخ شیعان علیؑ کی ضرورت بھی ہے جو دور غیبت سے شروع ہو کر دور حاضر تک پہنچے اور یہ بتا سکے کہ تقیہ میں زندہ رہنے والی قوم ہر حال میں زندہ رہتی ہے اور درخت کی پرانی شاخیں کٹ جاتی ہیں تو نئی شاخوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

اس تاریخ کی غائت تحریر کسی تاریخی کردار پر کیچڑ اچھالنا ہرگز نہیں ہے جس کی تحقیق میں جو جیسا ہے، وہ اسکو اسی طرح قلوب و ذہن میں جگہ دے، ہم نے تو یہ مختصر ترین خاکہ تحریر اپنے بیٹوں کے لیے قلم بند کیا ہے تاکہ صرف ایک کتاب کے مطالعہ سے وہ اپنے عقائد اور اسلاف کے حالات کا احاطہ کر سکیں اور سطحی معلومات کیلیے انھیں ادھر ادھر بھٹکنا نہ پڑے۔

دوسرے حضرات اس کتاب کو ملاحظہ نہ فرمائیں کیونکہ تاریخ کے تلخ حقائق کو شاید وہ برداشت نہ کر سکیں لیکن اگر کوئی اپنے علم کے لیے پڑھنا چاہتا ہے تو میری استدعا ہو گی کہ وہ پوری کتاب ہی پڑھ ڈالے۔ ہر قابل اعتراض سوال موجب تشکر ہو گا۔

مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے عقائد

اصول و فروعاتِ دین

ہمارے عقیدے کی بنیاد اصولِ دین پر ہے جو گنتی میں پانچ ہیں

توحید، عدل، نبوّت، امامت، قیامت

خدا کی ذات و صفات پر یقین دین و ایمان کی پہلی شرط ہے۔ یقین بھی ان آداب و قیود کے ساتھ کہ وحدت پر حرف نہ آئے۔ خدا کی ذات کے سلسلے میں چند باتوں پر اعتقاد لازم ہے۔

خدا ایک ہے اور صرف ایک۔ نہ اس کا کوئی شریک کبھی تھا، نہ ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔

وہ کسی چیز سے مِل کر نہیں بنا۔ مادّیت اور جسم سے پاک و صاف ہے۔

ہر جگہ حاضر ہے اور موجود ہے۔ کوئی زمانہ یا مقام نہیں رکھتا۔ ہر بات پر قادر ہے، کہیں مجبور نہیں نہ کسی ذات میں حلول کر سکتا ہے، نہ کسی چیز میں سما سکتا ہے اور نہ خیال کے گھیرے میں آسکتا ہے تغیر سے مبرّا ہے، جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ویسا ہی رہے گا۔

اس کو دیکھا نہیں جا سکتا، نہ دُنیا میں اور نہ عقبیٰ میں۔

اپنی ذات و صفات میں وہ کسی کا محتاج نہیں

اس کی صفات عینِ ذات ہیں۔ ان میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی

ان کے علاوہ چند مزید خصوصیات کا اطلاق بھی اس پر ہوتا ہے۔

وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

کوئی بات اس کے اختیار سے باہر نہیں۔ اس نے کائنات کو پیدا کیا ہے اور چاہے تو دوسری کائنات بھی پیدا کر دے۔

عالم ہے اور عین علم بھی۔ کوئی بات اس سے ڈھکی چھپی نہیں ہے اور نہ ہوگی۔

زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

جو کچھ ہوتا ہے، اس کے ارادے اور اختیار سے ہوتا ہے۔ کوئی ذرہ بغیر اس کی مرضی کے حرکت نہیں کر سکتا۔

آنکھ اور کان نہیں رکھتا مگر ظاہر اور باطن کا جاننے والا ہے۔

منہ اور زبان نہیں رکھتا مگر چاہے تو بات کر سکتا ہے، جیسے کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ سے بات کی تھی۔ صادق بھی ہے اور عین صدق بھی۔ اس کی ہر بات صحیح اور سچ ہوتی ہے۔

"عدل" اصول دین میں دوسرے درجے پر ہے جس کے معنی ہیں کسی بات یا چیز کا موقع محل سے مناسبت، مصلحت اور حکمت سے رکھنا۔ یہ لفظ ظلم کی ضد ہے جو کمی یا زیادتی تصرف بے جا یا بے محل محل کی تعریف میں آتا ہے۔ یہ دونوں لفظ بہت وسیع المعنی ہیں۔ درحقیقت عدل بھی خدا کی عین ذات ہے۔ اس کی کوئی جزاء یا سزا بے جا اور بے موقع نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس کی ذات میں اس کو عادل سمجھنا عین ایمان ہے۔ واضح رہے کہ انسان مختار مجاز ہے۔ اس کے ہر عمل کا نتیجہ عدل کے مطابق ہی نکلتا ہے۔ آخرت کا ثواب و عذاب بھی اسی تعریف میں ہے۔

دین کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں اصول میں نبوت، امامت اور قیامت ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ سارے نبی اور ان پر نازل ہونے والی کتابیں برحق

ہیں۔ انبیاء اور کتب سب اللہ کی طرف سے بھیجی گئی ہیں۔ ہر نبی معصوم ہوتا ہے اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا۔ ہر نبی کے معجزات صحیح اور درست ہوتے ہیں۔ وہ سہو یا نسیان سے مبرا ہوتا ہے، اندھا، بہرا، گونگا اور دوسرے جسمانی عیوب سے پاک ہوتا ہے۔ کوئی متعدی یا کراہت کے لائق بیماری اس میں پائی نہیں جاتی۔ حضرت ایوبؑ اس سے مستثنیٰ تھے کیونکہ کوڑھ ان کے لئے بیماری نہ تھی بلکہ ضبط و صبر کی آزمائش تھی۔ نبی کوئی گرا ہوا پیشہ اختیار نہیں کرتا۔ محنت مزدوری یا باعزت روزگار میں اُسے عار نہیں ہوتا۔

انبیاء میں صاحبانِ کتاب و شریعت رسول کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد جو نبی آئے انھوں نے سابق رسول کی شریعت پر عمل کرایا۔ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰؐ کے آنے کے بعد پچھلی تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں صرف اسلام قیامت تک کے لئے باقی رہ گیا۔

چونکہ اب سلسلۂ نبوت خدا کی طرف سے ختم ہوگیا تھا لہٰذا حشر تک اسلام کے عملدر آمد اور دین کی بقاء کے لئے مشیت نے سلسلۂ امامت جاری کیا، امام بھی اللہ کا مامور ہوتا ہے۔ وہ نبی تو نہیں ہوتا مگر نبی کی بیشتر خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں اور وہ تحفظ و بقائے شریعت میں پیغمبرؐ کی نیابت کرتا ہے۔

حضرت علیؑ سے لے کر امام مہدیؑ تک ہمارے بارہ امام ہیں، چونکہ گیارہ امامؑ دشمنوں کے ہاتھوں تلوار و زہر سے شہید ہوگئے اور امامت کو قیامت تک جانا ہے اس لئے بارہویں امامؑ خدا کے حکم سے کسی مقام پر روپوش ہیں۔ خدا نے انھیں طویل عمر عطا فرمائی ہے، شاید آدمؑ و نوحؑ سے بھی زیادہ۔ آپ قربِ قیامت میں ظاہر ہوں گے اور دنیا کو عدل سے بھر دیں گے۔

اصولِ دین کا پانچواں عقیدہ قیامت کا ہے جس کو مسلمانوں کا ہر مکتبۂ فکر مانتا ہے۔ روایاتِ معتبرہ کی رُو سے اس دن اسرافیل کے پہلے صور پر تمام

مردے زندہ ہو کر قبروں سے نکل آئیں گے۔ دوسرے صور پر سب جاندار مر جائیں گے، تیسرے پر پھر زندہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہر ایک کے اعمال کا حساب ہوگا۔ بہشت اور دوزخ کے دروازے کھولے جائیں گے اور انسانوں کو ان کے کئے کی جزا و سزا ملے گی۔

فروعاتِ دین ایک طرح کا لائحہ عمل ہیں جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ خمس، حج اور جہاد کے ضابطے مقرر کئے گئے ہیں اور ان کو ہر مرد و عورت پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ اصل کے معنی جڑ اور فروع کے معنی شاخ۔ جڑوں اور شاخوں سے مل کر شجر مکمل ہوتا ہے۔ جس کو شجرۂ دین کہا جاتا ہے۔

اصول و فروعات کی یہ ترتیب و تفصیل ہمارے لئے مختلف ہے، ویسے مسلمانوں کا ہر مکتبۂ فکر قدرے ترمیم و تنسیخ سے ان کو مانتا ہے اور ہر ایک اپنے عقیدے کو برحق سمجھتا ہے۔

اصول میں سب سے زیادہ اہمیت توحید کو ہے لیکن خدا شناسی کے لئے خود شناسی شرطِ اولین ہے۔ انسان جب تک اپنے آپ کو نہ سمجھے، اس وقت تک پیدا کرنے والے کی صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور اگر خدا ہی سمجھ میں نہ آیا اور وحدانیت میں شرک کا شائبہ بھی پیدا ہو گیا تو اصول و فروعات کیا، دین ہی ہاتھ سے چلا جائے گا۔

اس لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے غایتِ تخلیق پر ایک نظر ڈالی جائے اور مشیّت الٰہی کا جائزہ لیا جائے تو فکر و نظر کے دروازے خود بخود وا ہو جائیں گے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ انسان کی حقیقت و حیثیت متعین ہو جائے گی اور خالق کی قدرتِ کاملہ کو سمجھنے کے لئے ذہن میں ایک روشنی پیدا ہو جائے گی۔

توحید و قرآن

خلقتِ آدمؑ

"میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ جب میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے، اے محمدؐ، آپ کو خلق کیا۔" (۱)

یہ حدیثِ قدسی تمام مسلمانوں میں معتبر مانی جاتی ہے اور تسلیم کیا جاتا ہے کہ خالقِ مطلق نے سب سے پہلے حضورؐ کے نور کو پیدا کیا۔ اس کی توثیق حضورؐ بھی فرماتے ہیں۔

"خدا نے سب سے پہلے میرے نور کو خلق کیا" (۲)

اس طرح آپ اُس اوّلین انسان کی تعریف میں ہیں جو خدا کی معرفت کے لئے وجود میں آیا۔ اِس حقیقت کا انکشاف بعض دوسرے مواقع پر بھی آپؐ نے فرمایا۔

"میں اُس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ مٹی اور پانی کے درمیان تھے۔" (۳)

یعنی جس خمیر سے آدمؑ کا پتلا تیار کیا گیا، وہ خمیر ابھی تیار ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ بات بروایت حضرت علیؑ خلقتِ آدمؑ سے چودہ ہزار سال قبل کی ہے۔ بعض دوسرے لوگ سات ہزار سال قبل بتاتے ہیں۔

اس طرح "حضورؐ خدا کے نور سے پیدا ہوئے" اور "آپ کے نور سے تمام انبیاء علیہم السلام کے انوار نکالے گئے" (۴) جو آپ کی نبوت پر ایمان لائے۔

اِس سے ہر مکتبۂ فکر کے علماء نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ تمام مخلوقات میں اوّل و افضل ہیں۔ پھر حضور فرماتے ہیں کہ" میں اور عؑلی ایک ہی نور سے ہیں" ⑤ مفہوم کے اعتبار سے یہ حدیث کئی دوسرے مقامات پر بھی ملتی ہے جس کا ماحصل یہی اور صرف یہی ہے کہ عؑلی ذاتِ محمدیؐ میں جزو لاینفک ہیں اور صرف عؑلی ہی نہیں، عؑلی کے ساتھ جناب فاطمہؑ حسنؑ اور حسینؑ بھی شامل ہیں جن کے بارے میں رسولِ کریم کے ارشادات کسی استدلال کے محتاج نہیں اور جو پنجتنؑ کے مقدس اسمیہ سے بہر طور سرنامہ موجودات ٹھہرتے ہیں۔

ایک نور کے دو حصے جو محمدؐ اور علیؑ کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں، بلاشبہ حاصلِ تخلیقات ہیں لیکن منصبِ پیغمبری میں اگر فاطمہؑ کو شریک نہ کیا جاتا تو کائنات کی تشکیل کے بعد ابنائے آدمؑ کو تو ہدایت کے دو بلکہ تیرہ نمونے مل جاتے لیکن حوّا کی بیٹیاں فریاد کرتیں کہ ہمارے لئے کس کی نظیر ہے لہذا مشیت نے فاطمہ کو فاطمہ زہراؑ بنا کر اپنے محبوب کے صُلب میں مقدر کر دیا تاکہ عدل پر کوئی حرف نہ آئے اور آپ کی خلقت سے سیرتِ محمدی کی تفسیرِ مزید کے دو نمونے اور مِل جائیں جن کے نام حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔

" منقول ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خاص قسم کی لغزش واقع ہوئی تو انہوں نے مناجات کی۔" اے رب! بواسطہ محمدؐ، میری اس لغزش کو معاف فرمادے"۔ ⑥ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ربطِ بیان میں صراحت فرمائی ہے کہ آدمؑ نے کلمۂ طیبہ میں محمدؐ کا نام عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا۔ ہمارا موقف اِس سے زیادہ مختلف نہیں ہے، ہماری تحقیق میں آنحضرتؐ کے ساتھ چار نام اور لکھے ہوئے تھے، جن کا واسطہ آدمؑ نے دیا تھا اور ان کی توبہ قبول ہوئی تھی۔

عقیدے کے بعید ترین پس منظر پر نگاہ ڈالی جاتے تو بلا قید زمان و مکان پہلے صرف خدا تھا، خدا ہی خدا، پھر محمدؐ کا نور، اور محمدؐ کے ساتھ چار نور اور جو محمدؐ سے مشتق تھے۔ عرش و کرسی اور ملائکہ کی تخلیق اس کے ساتھ یا بعد کی باتیں ہیں لیکن چونکہ اسرارِ مشیت میں نور محمدیؐ کی تخلیق کا ایک خاص مقصد تھا۔ لہٰذا "کن فیکون" سے کائنات کی خلقت ہوئی اور "تمام مکنونات علوی اور سفلی آپ ہی کے نور سے، آپ ہی کے جوہر پاک سے ارواح، شبیہات، عرش، کرسی، لوح، قلم، جنت و دوزخ، ملکؑ فلک، انسان و جنات، آسمان و زمین، بحار، جبال اور تمام مخلوقات عالمِ ظہور میں آئی۔" (۷) پھر آدمؑ کی تخلیق مٹی اور پانی سے کی گئی حضرت امیر المومنینؑ کا ارشادِ گرامی ہے کہ "میں چالیس سال تک مٹی کے اُس خمیر کو گوندھتا رہا جس سے آدم کا پتلا تیار ہوا"۔ پھر اُس میں نفخ روح کی گئی اور نور محمدیؐ کو پشت پر ثبت کیا گیا جو آپ کی پیشانی پر ضو دیتا تھا۔ فرشتوں کو اسی نور کے سامنے سجدۂ تعظیمی بجا لانے کا حکم دیا گیا تھا۔

خدا کے وجود کی مدت تو ہمیشگی ہے لیکن اگر کائنات کی تخلیق، ہندو جگوں کے حساب سے تسلیم کر لی جائے تو کئی لاکھ سال قبل ٹھہرے گی۔ خلقتِ انوارِ مقدسہ اِس سے بہت پہلے کی بات ہے۔ رہ گئی حضرت آدمؑ کی تخلیق تو وہ ہزاروں سال پہلے ضرور ہوئی، مگر ایک جگ تین تین چار چار لاکھ برس کا ہے لہٰذا آدم کا روئے زمین پر آنا بھی لاکھوں برس پہلے ماننا پڑے گا۔ پھر ایک لاکھ چوبیس ہزار ہادیوں کی تعداد اِسی مدت میں پوری ہو گی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مسلّم ہے کہ اللہ کے پیغمبر مشرق و مغرب شمال اور جنوب ہر طرف نازل ہوئے اور اِن سب کا زمانہ حضرت آدمؑ کے بعد کا ہے حضرت حوّا کی خلقت، آدمؑ کی جنت کی زندگی اور ترکِ اولیٰ معروف واقعات ہیں لیکن آدمؑ اور گناہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے اگر اس کو مان لیا جائے تو

عصمتِ پیغمبری کا دامن تار تار ہو جاتا ہے۔ اِس عقیدے کے قائل تو صرف وہ لوگ ہیں جو حضورؐ کی سیرت کو بھی داغدار ثابت کرنے کا شرف رکھتے ہیں ہمارا عقیدہ تو "لا تقربا ھذہ الشجرۃ" پر عمل نہ کرنے کو لغزش بھی قرار نہیں دیتا بلکہ اُسے ترکِ اولیٰ کہتا ہے۔ یعنی جس کا ترک کرنا مستحب اور ترک نہ کرنا گناہ نہیں۔ اس کی پاداش اِس سے زائد نہ ہوسکتی کہ آدمؑ و حوّا جنت سے باہر لے آئے گئے اور پھر ذواتِ مقدسہ کا واسطہ دینے پر معاف کر دیئے گئے

ترکِ اولیٰ کے سلسلے میں ہمارے دو علماء سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور آپ کے بھائی سید رضی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ نمازِ جماعت کی امامت کے سلسلے میں زیرِ بحث تھا کہ نماز کون پڑھائے ؟ آپ کی والدہ گرامی نے فیصلہ کیا کہ وہ پڑھائے جس نے ترکِ اولیٰ نہ کیا ہو۔ چنانچہ سید مرتضیٰ پیچھے ہٹ گئے اور سید رضی نے امامتِ نماز کے فرائض انجام دیئے۔

بنی آدمؑ کی تاریخ بادی النظر میں یہیں سے شروع ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس کا مبدا اوّل آنحضرت کا نورِ مقدس ہے جو انبیاء کا سرچشمہ بھی ہے اور باقی تمام مخلوقات کا منبع ہدایت بھی۔ بالفاظِ دیگر جس کو خلاقِ مطلق نے کائنات سے پہلے پیدا کیا تھا اور ایک دستورِ حیات بھی دیا تھا جس کو قرآن کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید

لغت کے اعتبار سے قرآن پڑھی یا پڑھائی جانے والی چیز کو کہتے ہیں لیکن اصطلاحاً وہ مکتوبِ ہدیٰ ہے جو نورِ محمدؐ کی تخلیق کے ساتھ علمِ باری سے لوحِ محفوظ میں منتقل ہوا اور پھر ہمیشہ کے لئے اِس نور میں پیوست ہو گیا۔

پیغمبرؐ کی مادّی زندگی میں اس کا نزول اقساط میں بتدریج ہوتا رہا، لہٰذا شانِ نزول سے مختلف مفاہیم لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوئے اور آج تک اس کی علیحدہ علیحدہ تاویلیں کی جاتی ہیں پھر بھی اس حد تک تو

سب ہی مانتے ہیں کہ

"پہلے آسمان پر، جو دُنیا کا آسمان ہے، دفعتہً رمضان کی شب قدر میں نازل ہو گیا تھا پھر آسمانِ دنیا سے دنیا میں تدریج کئی سال میں نازل ہوا۔" (۸)

اُصل قرآن قبلِ تنزیل حضرت کے قلب پر القار ہو چکا تھا مگر اس کی تبلیغ کا حکم نہ تھا بلکہ تبلیغ کے لئے جو نزول ہوا ہے وہ رفتہ رفتہ ضرورت کے اعتبار سے ہوا۔"

"پہلے خدا کی ذات سے لوحِ محفوظ میں دفعتہً نازل کیا گیا پھر جبریل کی ذات میں رفتہ رفتہ نازل ہوا۔" (۹)

یہ تو ہیں اُن علمار کے نظریات جو تحقیقی قیاسات سے کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور اپنے استنباط کو قطعی قرار دیتے ہیں۔ ہم قرآن کو پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ گرامی سے علیحدہ کرکے سوچنا بھی ایمان کی نقیض سمجھتے ہیں۔ اِس لئے ہمارے نزدیک تو حضورؐ کے لئے نہ قرآن اجنبی تھا اور نہ جبریلؑ۔ قرآن کا ایک ایک لفظ آنحضرتؐ کے علم و یقین میں تھا اور جبریل تو وہ تھے جنہوں نے خود محمدؐ تو درکنار محمدؐ کے نور کو جبینِ آدمؑ پر چمکتے دیکھ کر سجدۂ تعظیم کیا تھا۔ پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ جن و انس اور ملائکہ سب سرکارِ دوجہاں کے حلقہ بگوش اور امتی تھے اور ان کا درجہ بارگاہِ خداوندی میں حضورؐ کے مقابلے میں اتنا کم تھا کہ شبِ معراج ایک منزل پر پہنچ کر جبریل نے کہا تھا، اب آگے جاؤں گا تو میرے پر جل جائیں گے۔

غارِ حرا میں وحی کا پہلا نزول جس طرح بیان کیا جاتا ہے، وہ نہ صرف حیرت خیز ہے بلکہ تعجب انگیز بھی۔ ہر مورّخ یا تذکرہ نگار واقعہ کو ایک ہی طرح لکھتا ہے۔ تین یا آٹھ ربیع الاول، سن ۴۱ عام الفیل بروز دوشنبہ ملک نمودار ہو کر اپنا تعارف کراتا ہے۔ میں جبریل ہوں۔ خدا نے آپ کو

رسالت کے لئے منتخب کرلیا ہے۔ جن و انس کو دعوتِ توحید دیجئے، پھر جبرئیلؑ سورہ اقرأ پڑھنے کو کہتے ہیں۔ آپ جواب دیتے ہیں کہ میں پڑھنا نہیں جانتا جبرئیلؑ آپ کو سینے سے لگا کر بھینچ لیتے ہیں اور تین مرتبہ اس عمل کو دہراتے ہیں آپ پسینے پسینے ہو جاتے ہیں اور تب جا کر سورۂ اقراء کی تلاوت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

بات بالکل واضح ہے کہ آپؐ جبرئیلؑ کو پہنچانتے نہ تھے اور نہ کبھی ان سے واسطہ پڑا تھا۔ جبرئیل نے رسول بنائے جانے کا جو مژدہ سنایا، اس کا بھی حضورؐ کو کوئی علم نہ تھا اور پڑھنے کا جہاں تک تعلق ہے، جبرئیل کسی رسم الخط میں شاید کوئی نوشتہ لائے تھے ورنہ بات اگر زبانی ہوتی تو اس موقع پر اُمیّت کا اظہار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر جب جبرئیلؑ نے اپنے بازوؤں میں لے کر زور سے بھینچا اور پسینے میں شرابور کر دیا تو آپ میں صلاحیت پیدا ہو گئی۔ کتنی بوالعجبی ہے!

اور اس کے بعد جو واقعات لکھے جاتے ہیں، انہیں دیکھ کر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آپ ہانپتے کانپتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں۔ خدیجۃ الکبریٰ آپ کو ڈرا سہما پا کر تسکین دیتی ہیں پھر ورقہ بن نوفل کے ذریعہ دلجوئی کراتی ہیں

آنحضرتؐ کے سلسلے میں ہماری تحقیق اور ہمارا عقیدہ جامۂ بشری اختیار کرنے تک تو ملتا جلتا ہے مگر ولادت کے بعد سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر نبی اور امام تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے اور دنیا کی ہر مروّج زبان سے واقف۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے گہوارے میں اعلان کیا تھا کہ میں عبداللہ ہوں، خدا نے مجھے کتاب دی ہے۔ حضورؐ چونکہ ختم المرسلین تھے اس لئے دنیا میں آنے سے قبل بھی نبی تھے اور جانے کے بعد بھی قیامت تک نبی رہیں گے۔ اس لئے ہم آج بھی یا رسول اللہ کہہ کر سلام کرتے ہیں آپ جب دنیا میں تشریف لائے تو نبی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جب تک اہلِ مکہ

کے ذہنوں کو اپنا پیغام سننے کے قابل نہیں بنالیا، اور صادق و امین ہونے کا لقب حاصل نہیں کر لیا، اس وقت تک اپنے مشن کا آغاز نہیں کیا۔

قرآن حضور کے خمیر میں رچا بسا تھا اور فرشتگانِ رحمت تابع فرمان پھر بھی پیکرِ انسانی میں جبرئیل سے آپ کی ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی لہذا ایک لحظے کے لئے اجنبیت کا اظہار ناممکن نہیں ہے اور قرآن کے بارے میں تو یہ مسلّم ہے کہ پہاڑ پر نازل ہوتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا، اس لئے حضورؐ کے مادی جسم پر بھی کچھ اثر پڑ سکتا تھا، نہ کہ وہ کیفیت جو بیان کی جاتی ہے تاہم جناب خدیجہ کے سامنے صورتِ حال کا اظہار بربنائے مصلحت بھی ہوسکتا ہے کیونکہ وہ پہلی خاتون تھیں جنھیں دائرۂ اسلام میں داخل ہونا تھا

مقصود اس رائے زنی کا صرف اتنا ہے کہ نزولِ وحی سے جو سراسیمگی اور بدحواسی عموماً بیان کی جاتی ہے وہ کسی نئے آدمی میں تو پیدا ہوسکتی ہے لیکن اس رسولؐ میں ہرگز نہیں جو قبلِ تخلیقِ آدم بھی نبی تھا اور عرش و فرش سب جس کی آنکھوں کے سامنے پیدا ہوئے تھے البتہ جسمِ انسانی کسی حد تک متاثر ہوسکتا تھا تو وہ ہوا۔ گھر پہنچتے ہی آپ نے جناب خدیجہ سے چادر طلب کی اور قدرے خستگی کے عالم میں چادر اوڑھ کر لیٹ رہے۔ ایک غیر مسلم مصنف کے محسوسات ملاحظہ ہوں۔

"ذاتِ باری تعالیٰ کی نسبت حضرت محمدؐ کے وسیع تر تصوّر کو اس زمانے کی ذہنی فضا سے جو تعلق قدرتی طور پر تھا، صرف اس سے اس امر کی کچھ توجیہ ہوتی ہے کہ آپ کو جو مہتم بالشان الہامات ہوئے، ان کے باوجود آپ نے اپنی سلامتیِ طبع اور ضبطِ نفس کو قائم رکھا۔" (۱۰)

اس کے بعد جنابِ خدیجہ کا ورقہ بن نوفل کے پاس آنحضرتؐ کو لے جانا دل میں چھپی ہوئی دہشت کو دور کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ ایک طرح

کا اعلانِ رسالت تھا جو آنحضرتؐ ورقہ بن نوفل کی زبان سے کرانا چاہتے
تھے تاکہ کچھ لوگ اس پیغام سے آشنا ہو جائیں جو آگے چل کر آپ کو دعوتِ
ذی العشیرہ میں دینا تھا۔

ورقہ بن نوفل ایک کہن سال بزرگ تھے، انجیل و زبور اور ادیانِ
ماسبق کے عالم، جن کی ساری زندگی، حق کی جستجو میں، غور و فکر کرتے گذر
گئی تھی۔ انہوں نے آپؐ سے سارے واقعات سنتے ہی کہہ دیا۔

"میں اُس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جس کے قبضے میں ورقہ
کی جان ہے، کہ خدا نے تمہیں اِس قوم کا نبی منتخب کیا ہے۔ تم پر
ناموسِ اکبر نازل ہوا ہے۔ لوگ تمہیں جھوٹا کہیں گے، تمہیں ایذا
پہنچائیں گے۔ تمہیں جلا وطن کریں گے اور تمہارے ساتھ جنگ
کریں گے۔ کاش میں اُس دن تک زندہ رہتا تو یقیناً تمہارے
لئے جنگ کرتا۔" (۱۱)

پھر نزولِ وحی کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور مکّے میں صادق و امین کے
متعلق چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ کوئی کہتا وہ جھوٹ تو نہیں بول سکتا،
کوئی آپ کو فاترالعقل قرار دیتا۔ حتیٰ کہ وہ ساعت آ گئی جو قادرِ مطلق کی
طرف سے اعلانِ نبوت کے لئے متعین ہوئی تھی۔

تنزیلِ قرآن کا دورانیہ تیئیس ۲۳ سال ہے اور یہی مدّت تبلیغِ رسالت
کی کہی جا سکتی ہے۔ اِس عرصے میں بڑے بڑے انقلابات رُونما ہوئے، ذہن
بدلے، سرکشوں کے سرخم ہوئے اور وہ لوگ بھی دائرۂ اسلام میں داخل
ہو گئے جن کے دل و دماغ اسلام کی حقانیت قبول کرنے کے اہل نہ تھے
پھر حجۃ الوداع میں تکمیلِ دین کے بعد سرورِ کائنات کی حیاتِ مادی بھی
ختم ہو گئی۔

اب عام مسلمانوں نے قرآن اور سنتِ رسُولؐ کو مشعلِ راہ بنایا، پیغمبرؐ

کی عملی زندگی کے دیکھنے والے موجود تھے جو حضورؐ کو ازلی اور ابدی رسول مانتے تھے اور وہ لوگ بھی جو آپ کو اپنا سا بشر سمجھتے تھے۔ اقوالِ رسولؐ ان سب کے حافظے میں تھے اور ہر ایک نے اپنی فہم کے مطابق ان کے معنیٰ نکالے تھے۔ احادیث کا یہ تسلسل تقریباً ڈیڑھ سو سال جاری رہا، اور ان میں مصلحت آمیز سیاسی اقوال بھی شامل ہوتے رہے۔ آیاتِ قرآنی چونکہ تنزیل کے بعد ہی لکھی جاتی تھیں لہٰذا ان میں کوئی رد و بدل نہ ہو سکا۔

کاغذ چین میں بن چکا تھا لیکن عموماً عرب میں دستیاب نہ تھا لہٰذا جو کچھ لکھا جاتا، وہ پتھر پر، لکڑی پر، ہڈی پر، چمڑے پر یا چھلی پر۔ آیاتِ قرآنی بھی اسی طرح قلم بند کی گئیں اور موقع موقع سے انہیں سوروں کی شکل میں تشکیل دیا جاتا رہا۔ نتیجے میں ترتیبِ نزول باقی نہ رہ سکی۔

کہا جاتا ہے کہ دورِ جاہلیت عربی زبان کا فصیح ترین دور تھا اور عربوں کو اس پر اتنا غرور تھا کہ وہ غیر عرب کو عجمی کہتے تھے اس لئے ایران کا نام انہوں نے عجم رکھ دیا تھا۔ قرآن اسی دور میں نازل ہوا مگر اس کی فصاحت نے عربوں کو دنگ کر دیا اور جب انا اعطینا سبعات معلقات کے مقابلے پر لٹکایا گیا تو عربوں کو کہنا پڑا۔ ما ھذا کلام البشر

لکھنے کی حد تک اس زمانے میں عربی کے سات قسم کے حروف رائج تھے لہٰذا تنزیلِ آیات کے وقت جو کاتب موجود ہوا اس نے ان حروف میں تحریر کیا، جو اس کو معلوم تھے۔ اس طرح مختلف آیات مختلف حروف میں قلم بند ہو گئیں۔ تدوینِ قرآن کے موقع پر یہ دشواری پیش آئی کہ ایک قرآن کو سات قسم کے حروف میں کیونکر لکھا جائے؟ اس لئے حروف کی ایک قسم منتخب کی گئی اور اس میں قرآن کو لکھوایا گیا۔

"حضرت عثمان نے قرآن جمع شدہ کو نقلیں کرا کے ممالک میں بھیجا اور اس امر کا التزام کیا کہ وہ حروفِ سبعہ، جن پر قرآن

نازل ہوا، ان میں سے ایک حرف فصیح کو تمام ممالک اسلامیہ میں رواج دیا جائے اور دیگر حروف رائج نہ کئے جائیں تاکہ اختلاف نہ ہو سکے التزام کے باعث اور اس خدمت کے سبب جو نقول کر کے ممالک میں قرآن ارسال کئے گئے، حضرت عثمان جامع قرآن مشہور ہوئے، ورنہ قرآن عہدِ نبوی میں مرتب ہو چکا تھا اور عہدِ صدیقی میں اس کی نقل کی گئی تھی البتہ اس میں مختلف حروف تھے اور وہ سب عہدِ عثمانی میں دور کر دیئے گئے، ایک حرف شافی رہ گیا جس میں نہ تبدیلی ہوئی نہ تحریف، نہ زیادتی نہ کمی۔" (۱۴)

اس تحقیق میں یہ اضافہ بے محل نہ ہوگا کہ حروف کی قرأت میں بھی فرق تھا جس کی تصحیح اپنے نقطۂ نظر سے کی گئی۔

مولانا عبدالباری ایک دوسرے مقام پر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس کی تصدیق علامہ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوت سے ہوتی ہے

"مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، جامع قرآن ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان جامع سور ہیں۔"

یہی قرآن فی زمانہ مروّج ہے۔ حضرت علیؑ نے بعدِ وفات سرکارِ دوعالم جو قرآن بترتیب نزول مرتب فرمایا تھا اس کے بعض حصّوں کی نقول یورپ کے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اصل قرآن حضرت حجتؑ اپنے ساتھ لے کر آئیں گے۔ ترتیب نزول نہ ہونے کے باوجود موجودہ قرآن ہمارے لئے مکمل مرکز ایمان ہے۔

عقیدے کی اساس

یہی قرآن مجید وہ اساسی دستاویز ہے جس میں توحید و رسالت اور امامت کے مضمرات و براہین پائے جاتے ہیں اور ایک عقیدے کے لوگ اس کو اپنی رہنمائی کے لئے کافی قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس فیصلے سے

اختلاف نہ کیا جاتا بشرطیکہ عام اذہان میں درکِ معنیٰ کی صلاحیت ہوتی۔

بات بالکل سامنے کی ہے کہ قرآن کلام الہٰی ہے جو محکمات اور متشابہات پر مشتمل ہے اور جس میں حروفِ مقطعات میں بعض اشارے بھی ملتے ہیں مسئلہ صرف زبان دانی کا نہیں ہے بلکہ اسرارِ علوم کا ہے جن کو صرف معلّمِ حقیقی جانتا ہے یا اس کو معلوم ہے جسے معلّم نے بتایا ہو۔ ہمارے عقیدے میں نبی اور امام تلامذہ الرحمٰن ہوتے ہیں۔ کلامِ رحمٰن کو بجا طور پر وہی سمجھ سکتے ہیں آیات کا سیاق و سباق جس کے علم میں نہ ہو وہ مفاہیم کو کما حقہٗ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے قرآنی الفاظ کی خاموشی سے صوتی و صوری آہنگ کو سمجھے بغیر جو اُٹھتا ہے وہ ایک نیا افسانہ بنا لیتا ہے۔ اِن افسانوں کے سامنے اگر قصہ واقعی بیان کیا جائے تو اس کو جھوٹا ٹھہرایا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنے عقائد میں ایسے وارثانِ قرآن کو جگہ دی ہے جو منصوص من اللہ ہوں اور نسیان و خطا سے مبّرا ہوں۔

اس طرح توحید و قرآن پر ہمارا مسلک تقریباً وہی ہے جو مسلمانوں کے دیگر مکاتبِ فکر کا ہے۔ ذاتِ رسالت بھی کچھ زیادہ مختلف فیہ نہیں ہے، لیکن رسالت کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ ہمارا رسولؐ عالمِ نور میں بھی خاتم النبیینؐ تھا اور حیاتِ انسانی کے بعد بھی تا ابد خاتم رہے گا۔ مادّی زندگی میں جسمانی لحاظ سے تو وہ ہمارا جیسا تھا لیکن بات بغیر وحی ہرگز نہ کرتا۔ اس کی نشست و برخاست، نقل و حرکت، لین دین، اخوت و موانست سب مشیّت کے تابع۔ زندگی انسانی تھی مگر ہر عمل پابندِ الہٰی۔ بشر تھا مگر بشری زندگی کی ہر سانس خدا کے لئے، سوتے جاگتے، حضر و سفر گھر باہر، ہر جگہ پیغمبر۔ جس طرح رزاقِ حقیقی کافر و مومن ہر ایک کو رزق دیتا ہے، اسی طرح ہمارے نبیؐ نے مومن و منافق سب کو اپنی بزم میں جگہ دی تھی کہ شاید کوئی کسی وقت سدھر جائے۔ رحمت للعالمین کی شان

بھی یہی تھی کہ اعلانِ کفر کیے بغیر کسی کو کافر قرار نہ دیا جائے اور خود اپنی طرف سے اعلانِ کفر کرنے کا موقع فراہم نہ کیا جائے۔

خلّاقِ عالم نے بلا شبہ کسی عورت کو پیغمبری کا منصب عطا نہیں کیا لیکن بیشتر انبیا کے ساتھ خواتین کے لئے ایک نمونہ تقلید ضرور پیدا کیا جو حضرت حوّا سے شروع ہوتا ہے اور ہاجرہ، سارا، آسیہ اور مریم سے ہوتا ہوا جناب فاطمہ زہراؑ تک پہنچتا ہے۔ عورت کے لئے اگرچہ خطا سے مبّرا ہونا ضروری نہیں ہے مگر یہ شرف صرف جناب فاطمہ زہراؑ کا ہے کہ پیغمبر نہ ہونے کے باوجود آپ کو صاحبِ تطہیر ٹھہرایا گیا۔ خود رسولِ اکرم کی نگاہ میں اتنا محترم قرار دیا گیا کہ آپ کا لقب معصومہ پڑ گیا۔

فاطمہؑ بلا شبہ شریکِ رسالت نہ تھیں مگر شریکِ کارِ رسالت ضرور تھیں

توحید و رسالت کے اس عقیدے کے بعد امامت کی منزل ہے جو ہمارے لئے حکمِ رسولؐ کی تابع ہے بلکہ حکمِ الٰہی کا درجہ رکھتی ہے۔ شاید اسی لئے خداوندِ عالم نے رسالت کے ساتھ ہی اس کا التزام بھی کیا تھا نبوّت آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہونے والی تھی اور اس نے اسلام و قرآن کے تحفظ کا وعدہ کیا ہے۔ وہ خود جسم و جسمانیات سے مبّرا ہے کسی مقصد کے لئے اسباب فراہم کرتا ہے۔ خود کبھی نہیں آتا، لہٰذا اس نے اپنے محبوب کے ساتھ تیرہ نور اور خلق فرما دیئے جو قیامت تک اس کے دین کے محافظ رہیں اور جو روئے زمین پر اس کی حجّت قائم کریں۔

ہمارے اماموں کا سلسلہ انبیاء کی طرح اللہ کی طرف سے قائم ہوا تھا۔ اُن میں سے کوئی نبی یا رسول نہ تھا مگر ہر ایک صاحبِ عصمت۔ ان کا کام توحید کے بعد دیگرے شریعتِ محمدیؐ کو بچانا تھا اور فرض تھا کہ دُنیا جب دین کی صورت بگاڑنے کی کوشش کرے تو وہ دین کی صحیح تصویر پیش کرتے رہیں ان کی زندگیاں اپنی زندگیاں نہیں تھیں وہ تو جیتے تھے تو خدا کے لئے اور

مرے تو خدا کے لئے جس طرح پیغمبر کوئی لاؤ لشکر لے کر نہیں آتا۔ ہمارے امام بھی اسی طرح تنِ تنہا منصبِ دین لے کر آتے رہے اور پیغمبر کی متعینہ حدود میں صراطِ مستقیم پر قدم آگے بڑھاتے چلے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام ہمارے عقیدے میں پہلے امام ہیں جنہیں نائب رسول یا خلیفۂ نبی جو کچھ نام دیا جائے مگر وہ نام ہوگا اللہ ہی کی طرف سے، اور ان کے جانشین حسنؑ، حسینؑ، سید سجادؑ، باقرؑ، جعفر صادقؑ، موسیٰ کاظمؑ، علی رضاؑ، محمد تقیؑ، علی نقیؑ، حسن عسکریؑ، مہدیؑ آخر زماں تمام کے تمام اِسی منصب پر فائز ہیں۔ ہمارے عقیدے میں سب امام ہیں اور خلاقِ عالم نے انہیں آنحضرتؐ کی جانشینی کے لئے پیدا کیا ہے۔

یہ آئمہ منصوص اللہ ہیں۔ ان کا کسی سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ دُنیا کسی کو خلیفہ بناتے یا کوئی اپنی طاقت سے کسی مُلک پر قبضہ کرلے، آئمہ کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا۔ انہیں تو تحفظِ دین کرنا تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کرتے رہے اور اتنے گہرے نقوشِ قدم چھوڑ گئے جو قیامت تک ہمارے لئے مشعلِ راہ رہیں گے۔

ان عقائد کا یقیناً مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے اختلاف ہے۔ وہ ختمی مرتبت کے بعد کسی کو منصوص من اللہ نہیں مانتے لیکن دینی قیادت کیلئے امام کی ضرورت کا احساس اوّل دن سے پیدا ہوگیا تھا جز فی الفور شرمندۂ تعبیر تو نہ ہوسکا لیکن تقریباً پونے دو سو سال بعد خود ساختہ امام وجود میں آگئے۔

خلافت سازی کو وقت کا تقاضا کہا جاتا ہے اور امامت دین کی ضرورت اب یہ اپنے اپنے فہم کی بات ہے کہ خدا کے دین کے لئے خدا کے بھیجے ہوئے اماموں کو نہ مانا جائے بلکہ خود اپنے امام بنا لئے جائیں۔ دین اگر انسان ساز ہوتا تو انسان ساز امام کا جواز پیدا ہوجاتا مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دین خدا کا اور امام انسان کا۔ پیغمبرؐ خدا کا اور خلیفہ انسان کا!

نتیجہ جو نکلنا چاہیئے تھا، وہی نکلا کہ انسان کی بنائی ہوئی خلافت آخری منزلوں میں ٹھوکریں کھا کر ختم ہوگئی اور انسان ساختہ امامت چھوٹی بڑی مساجد میں پڑھے لکھے یا جاہل امام صاحب کی ذات پر مختتم ہوگئی۔

خدا ساز امامت امامِ آخر کے وجود سے باقی ہے ——— اور جو لوگ کہتے ہیں کہ "امام مہدیؑ" پیدا ہوں گے۔ وہ انھیں آخری خلیفہ اور آخری امام تو مانتے ہی ہیں۔ ہمارا ایک مؤدبانہ سوال ہے کہ آخری خلیفہ اور آخری امام تو خدا کی طرف سے آئے گا۔ پہلا امام اور پہلا خلیفہ آپ کی طرف سے کیوں ؟

مقصود محض اعتراض نہیں ہے بلکہ بات افہام و تفہیم کی ہے۔ آپ نہ سمجھیں تب بھی "اسلام کی رسی" ہمارا آپس کا مضبوط رشتہ ہے۔

ہماری تاریخ

رسالت کا پس منظر

یوں تو ہماری تاریخ اس مبارک لمحے سے شروع ہوتی ہے جس میں خالق مطلق نے نورِ محمدیؐ کو خلق کیا لیکن بات چونکہ حدود زمان و مکان سے باہر تھی، اس لئے صحیح معنی میں خلقتِ آدمؑ کو نقطہ آغاز بنانا بے محل نہ ہوگا بلکہ وہ دن ہماری تاریخ کا پہلا دن تھا جب آدم زمین پر اُتارے گئے اور بطنِ حوّا سے ابنائے آدم کا سلسلہ شروع ہوا۔

نسلِ انسانی کا دورانیہ، آدمؑ و خاتمؐ کے مابین اتنا طولانی ہے کہ اس میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گذر جاتے ہیں۔ یہ پیغمبر کرۂ ارض کے ہر حصّے میں نازل ہوئے۔ خدا نے کسی خطّے کو محروم نہیں رکھا۔ قرآنِ مجید نے ایشیا کے نصف مغربی حصے سے لے کر وادیٔ نیل تک کے بعض انبیاء کے نام محفوظ کر دیئے ہیں۔ دنیا کے باقی حصوں کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ چین، ایران، ہندوستان اور مشرقِ بعید میں جو برگزیدہ ہستیاں گذری ہیں اور جن کے حالات ہزاروں سال کی گرد میں اَٹے ہوئے ہیں وہ یقیناً خدا کے فرستادہ ہادی ہوں گے۔ کنفیوشس، سائرس، زرتشت رام چندر، کرشن اور گوتم جیسی اَن گنت شخصیتیں ہیں جنہوں نے بنی آدمؑ کی ہدایت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ وقت کے طویل فصل سے ان کی تعلیمات مسخ ہو گئیں اور آج جو مسالک اور مذاہب ان سے موسوم ہیں ان میں توحید شرک کی بھول بھلیوں میں ضم ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ قیاس اس لئے بھی قابلِ قبول ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ اور خاتم المرسلینؐ جو ماضی کے قریب ترین پیغمبر تھے اور جن کو ابھی دو ہزار سال بھی پورے نہیں ہوئے، ان کی تعلیمات اور حالات روایتوں کے انبار میں اس طرح خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں کہ بعض وقت کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بات ہے عام لوگوں کی ورنہ ہماری حد تک تو ایک سیدھا سادھا راستہ ہے کہ ہم اس روایت کا یقین کرتے ہیں جو ہمارے آئمہ ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام دونوں کے بارے میں ہمارا مؤقف یہی ہے اور ان دونوں کے متعلق ہم نے جو کچھ سمجھا ہے اور جس پر یقین رکھتے ہیں وہ اِسی روشنی میں، جو سرورِ کائنات سے حضرت علیؑ تک حضرت علیؑ سے امام حسنؑ تک، امام حسنؑ سے امام حسینؑ تک پہنچی اور پھر سلسلۂ آئمہ میں آگے بڑھتی رہی۔ دوسروں کے اقوال بھی یقیناً درخورِ اعتنار ہیں لیکن صرف اس صورت میں، جب وہ اقوال آئمہ سے متصادم نہ ہوں چنانچہ ہمارے اسلام کی نوعیت وہی ہے جو ہمیں ہمارے آئمہ نے بتائی ہے پیغمبر کی ذاتِ گرامی کی عظمت ہماری نظر میں خدا کے بعد ہے جس کی تعلیم ہمیں دی گئی ہے اور آپ کی مادی زندگی کی عملی تصویر، جو ہمارے سامنے ہے ہم اس کو انہیں زاویوں سے دیکھتے ہیں جو ہمارے جذبۂ ایمان سے تشکیل پائے ہیں۔

کوئی انہیں انسانوں کے درمیان رہتے بستے دیکھ کر اور جامۂ بشری میں پا کر اپنا سا بشر قرار دے دے لیکن ہمارے لئے آپ پیکرِ بشریت کا ایک مثالیہ تھے، سراپا عصمت مجسم صدق و صفا، جن کی ہر بات قابلِ تقلید اور ہر عمل دلیلِ ایمان تھا۔

سلسلۂ نسب

آپ کا نور پشتِ ابوالبشر سے جناب شیث میں منتقل ہوا اور حضرت آدمؑ نے اپنے بیٹے شیث سے آخری وقت میں وصیّت فرمائی۔

"اس نور مبارک کو پاک بیبیوں میں منتقل کرنا بعد میں حضرت شیث نے اپنے فرزند، جن کا نام انوش تھا، یہی وصیت کی اس طرح اس وصیّت کا سلسلہ ایک قرن سے دوسرے قرن تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ نورِ مبارک حضرت عبدالمطلب سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما تک آیا۔" (۱۲۳)

محدث دہلوی نے آگے چل کر وضاحت فرمائی ہے اور سُنن بیہقی کے حوالے سے آنحضرت کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ میں جاہلیت کی کسی برائی سے متولد نہیں ہوا حتیٰ کہ ہمیشہ اسلامی نکاح ہی سے پیدا ہوا۔

آپ کا شجرۂ نسب حضرت آدمؑ سے چلتا ہے تو شیث، انوش، قانن مہلائیل، یرد، ادریس، متوشلخ، لمک، نوح، سام، ارفخشد، شالخ، عابیر فالغ، ارغو، شاروخ، ناحور، تارخ اور ابراہیم سے ہو کر اسمٰعیل تک پہنچتا ہے جن میں بعض اتنے اولوالعزم پیغمبر گزرے ہیں کہ محتاجِ تعارف نہیں۔ حضرت سام کے ننانوے بیٹے تھے جن میں ارشد پہلے اور ارفخشد دوسرے تھے۔ حضرت ہود، صالح اور ابراہیم انہی کی نسل سے ہیں اور عرب کے بیشتر قبیلوں کا سلسلۂ نسب انہی سے جا کر ملتا ہے۔

حضرت اسمٰعیل سے حضرت عبدالمطلب تک جن بزرگوں کے نام آتے ہیں وہ عرب کی تاریخ میں وحدانیت کا علامیہ ہیں۔

اسمٰعیل، قیدار، حمل، نبت، سلامان، ہمیع، یسع، ادد، آد، عدنان معد، نزار، مضر، الیاس، مدرکہ، خذیمہ، کنانہ، نضر، مالک، فہر، غالب، لوئی کعب، مرّہ، کلاب، قصی، عبد مناف، ہاشم، عبدالمطلب۔

آبار و اجداد کا یہ سلسلہ یقین کے ساتھ مکمل سلسلہ انبیار تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان میں کی ہر فرد سیرت و کردار میں ممتاز اور خدائے واحد کی قائل تھی حسب و نسب میں پاک و پاکیزہ تھی اور صلب طاہر سے پیدا ہوئی تھی حضرت عائشہ سے روایت ہے۔

رسول خدا نے جبریل سے نقل کیا کہ میں نے زمین کے مغارب و مشارق کو دیکھا ہے مگر کسی شخص کو محمد مصطفٰے سے افضل نہیں دیکھا اور کسی کی اولاد کو میں نے نہیں دیکھا جو بنی ہاشم سے افضل ہو"۔ (۱۴)

نسب کی اس فضیلت کے بعد حضور کے اسلاف میں کسی کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا خواہ وہ عبد المطلب ہوں، عبد اللہ ہوں یا ابو طالب۔

مادی زندگی اور بعثت کے لحاظ سے حضرت آدمؑ اول النبیین اور آنحضرتؐ ختم المرسلین تھے۔ دیگر انبیار اور رسل کے زمانے ان دونوں کے مابین ہیں جن کے ادوار کا تعین قدرے مشکل ہے تاہم ابن خلدون نے فکر و تحقیق سے سنین کا حساب لگانے کی کوشش کی ہے جس کو حتمی تو نہیں کہا جا سکتا مگر از روئے قیاس زمانے اور علاقے کے متعلق ایک اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت آدمؑ زمانہ نامعلوم، مقام غیر معین۔ ہندوستان نے جُگوں کی جو تقسیم کی ہے اس سے دنیا کی ابتدا لاکھوں سال قبل ہوئی تھی اور انسانی عمر کا تخمینہ دس ہزار سال ہے۔ مورخ فرشتہ نے آدمؑ کا تعین سات ہزار سال قبل کیا ہے اور شروع کے انسانوں کی عمر ہزار بارہ سو سال بتائی ہے۔

حضرت شیثؑ زمانہ نامعلوم، مقام غیر معین۔ ہندوستان میں اجودھیا کے ویرانے میں ایک بہت ہی لمبی چوڑی قبر بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت شیثؑ کی قبر ہے۔

حضرت ادریسؑ	۳۳۸۲ ق م تا ۳۰۱۷ ق م	مقام عراق
حضرت نوحؑ	۳۹۴۰ ق م تا ۱۹۹۸ ق م	مقام عراق کہا جا سکتا ہے مگر طوفان کے بعد کی جگہ کا تعیّن نہیں ہو سکتا۔
حضرت ابراہیمؑ	۲۱۶۱ ق م تا ۱۹۹۶ ق م	عراق و شام و عرب
حضرت اسمٰعیلؑ	۲۰۷۰ ق م تا ۱۸۷۴ ق م	عراق و شام و عرب
حضرت اسحٰقؑ	۲۰۶۰ ق م تا ۱۸۸۰ ق م	عراق و شام
حضرت لوطؑ	....	اردن
حضرت یعقوبؑ	۲۰۰۰ ق م تا ۱۸۵۳ ق م	فلسطین و مصر
حضرت یوسفؑ	۱۹۱۰ ق م تا ۱۸۰۰ ق م	فلسطین و مصر
حضرت ہودؑ	۲۲۰۰ ق م	حضر موت (عرب) قوم عاد
حضرت صالحؑ	.... ۱۷۹۷ ق م	شمالی مغربی عرب اور شام قوم ثمود
حکیم لقمانؑ	۱۶۰۰ ق م	
حضرت ایوبؑ	۱۹۰۰ ق م	
حضرت شعیبؑ	۱۵۵۰ ق م	مدائن
حضرت موسیٰؑ	۱۵۳۰ ق م تا ۱۴۰۰ ق م	مصر و علاقہ سینا
حضرت ہارونؑ	۱۵۲۳ ق م تا ۱۴۰۰ ق م	ایدوم
حضرت داؤدؑ	۱۰۲۴ ق م تا ۹۶۲ ق م	الخلیل
حضرت سلیمانؑ	۹۹۰ ق م تا ۹۲۳ ق م	حکومت شام و فلسطین و مصر
حضرت الیاسؑ	۸۷۰ ق م تا ۸۴۰ ق م	فلسطین و شام
حضرت یونسؑ	۷۸۱ ق م تا ۷۴۱ ق م	نینوا و موصل
حضرت عزیرؑ	۵۸۵ ق م	فلسطین و عراق
حضرت ذوالکفلؑ	۵۹۲ ق م	عراق
حضرت عیسیٰؑ	۴ ق م	

اس فہرست میں قدیم تہذیبوں کے مشاہیر کو شامل کر لیا جائے تو دس بیس ناموں کا اضافہ ہو جائے گا، مگر چین، ہندوستان، یونان اور ایران وغیرہ میں جو پیغمبر بھی مبعوث ہوئے ہیں، ان سے متعلق پورے یقین کے ساتھ کوئی معلومات فراہم کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے اتنے ہی پر اکتفا کرنا پڑے گی اور اس عظیم انسان کا نام لکھنا پڑے گا جو ایک لاکھ چوبیس ہزار کا آخری بندہ ہے۔ خدا نے جس کو پہلے بندے سے قبل نور کا ایک مرکزی نقطہ بنا کر خلق کیا تھا اور آج بھی جس کے نام کی بزرگی خود بخود گردنوں کو خم کر دیتی ہے۔

حضورؐ کے نور رسالت کا سفر کائنات کی زندگی سے طویل تر ہے۔ آدمؑ سے عیسیٰؑ تک جتنے بھی پیغمبر گذرے، آپ کا سایۂ رحمت ہر ایک پر سایہ فگن رہا۔ ایک دوسرے کو نوید سناتا چلا گیا اور عیسیٰؑ چونکہ آخری پیش رو تھے لہذا عیسیٰؑ نے حیاتِ چند روزہ میں اور صلیب کی بلندی پر بھی آپ کو یاد کیا۔ قوم کو اپنے پلٹ کر آنے کا مژدہ بھی دیا اور فارقلیط کی آمد کی خبر بھی سنائی۔

کائنات ہزاروں سال سے منتظر تھی، خلائے آسمانی کے سیارے متعین راہوں پر چلتے چلتے تھک چکے تھے کہ اچانک عرش سے فرش تک ایک نئی زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ مورخین نے اپنے اپنے انداز پر ان تغیرات کا ذکر کیا ہے جو ارض و سما میں پیدا ہوئے مگر یہ محسوسات کی باتیں ہیں جن کو جامع الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ نظامِ فطرت میں جو انجانی لہریں اُٹھی ہوں، وہ یقیناً اُٹھی ہوں گی لیکن مشاہدے میں یہ ضرور آیا کہ ہرقل کے محل کا ایک کنگرہ زمین بوس ہو گیا اور ایران میں ڈھائی ہزار سال سے جلتا ہوا زرتشت کا آتش کدہ اچانک بجھ گیا جو مستقبل کی تاریخ کے لئے ایک اشارہ تھا۔

حضرت عیسیٰ کو گذرے ہوئے ۵۷۰ سال گذر چکے تھے۔ ابرہہ کے واقعہ کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ رئیسِ مکّہ عبدالمطلب کی غم زدہ اور بیوہ بہو کے بطن سے ایک بچے کی ولادت ہوئی۔ دادا نے اس کا نام محمدؐ رکھا۔

عرب کے ستارہ شناسوں نے جس طرح ایک نئے ستارے کو طلوع ہوتا دیکھ کر پیدائشِ عیسیٰ کی پیشین گوئی کی تھی، اسی طرح فضاؤں کی فرحت خیز رنگینیوں پر اور کائنات کی ان دیکھی نشانیوں کا مشاہدہ کرکے آخری نجات دہندہ کے آنے کی خوش خبری بھی سنائی۔ عام الفیل کے پہلے سال ربیع الاوّل کی بارہویں یا سترھویں تاریخ تھی، دوشنبہ کو صبح صادق کا وقت تھا کہ تخلیقِ کائنات کا مقصد پورا ہوا۔ آسمان پر طلوعِ آفتاب سے قبل عبدالمطلب کے گھر سے ایک سورج کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔

خود عبدالمطلب کو سوتے جاگتے نومولود کے لئے فطرت کے اشارے ملتے رہے تھے۔ آپ کا دل باغ باغ ہوگیا اور آپ نے عبداللہ کے دُرِ یتیم کے لئے اپنی آغوش کھول دی، جو غیر معمولی بشر ہونے کی ایک علامت ساتھ لایا تھا۔ اور ماں کے پیٹ سے ختنہ شدہ اور ناف بریدہ پیدا ہوا تھا۔

اسلاف

آپ کا نور بطونِ پاکیزہ اور اصلابِ مطہرہ سے گذرتا ہوا حضرت عبداللہ تک پہنچا تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ سے حضرت عبدالمطلب تک انتیس پشتیں گزر چکی تھیں۔ سلسلہ در سلسلہ اسلاف کے عقائد پر پوری روشنی ڈالنا تو ممکن نہیں لیکن اتنا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ سب کے سب مسلکِ ابراہیمی پر قائم اور یقینِ توحید پر دائم تھے۔

یوں تو حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد جو بھی سردارِ قبیلہ ہوا وہ عزت و ناموری میں نمایاں رہا لیکن پہلی صدی قبلِ مسیح میں جب عدنان نے بنی جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کی تو اطراف میں ممیّز اور ممتاز ہوگئے، ان کے بیٹے معد حجاز و نجد میں آبادبنی اسمٰعیلؑ کے مورثِ اعلیٰ بنے۔ پھر تیسری صدی عیسوی میں فہران کے جانشین ہوئے، جن کا لقب قریش تھا اور وہی اس قبیلے کے بانی ہیں فہر کے بیٹے غالب بھی ایک مقبول سردارِ قبیلہ تھے پھر آنحضرت کے نسبی

سلسلے میں چار بزرگوں نے قیادت کا منصب سنبھالا اور پانچویں صدی عیسوی میں قصی بن کلاب کا دور آگیا۔ قصی ایک بلند حوصلہ، باہمت اور مدبّر بزرگ تھے۔ اطراف وجوانب کے قبائل میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ شریف النفس شائستہ اور مہذّب انسان تھے، انہوں نے خانہ کعبہ کی تولیت بنی خزاعہ سے حاصل کی۔ رفاہِ عام کے بے شمار کام کئے۔ ۴۸۰ء میں قصی کے انتقال پر سب سے بڑے بیٹے عبدالداران کے جانشین ہوئے لیکن عملی طور پر اقتدار عبدمناف کے ہاتھ رہا، جو نہ صرف انتظامی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ متقی اور مخیر بھی تھے ان کے دو بھائی عبد اور عبدالعزیٰ بھی تھے۔ جناب خدیجہ عبدالعزیٰ کی تیسری پشت میں تھیں۔

عبدمناف کے انتقال پر آپ کی اولاد سے عبدالدار کی اولاد کا تنازع ہوا اور طے یہ پایا کہ رفادہ سقایہ کی قیادت بنی عبدمناف کے پاس حجابت اور لوابرادری کا منصب عبدالدار کی اولاد کا ہوگا اور دارالندوہ کی صدارت مشترک رہے گی۔

عبدمناف کے چار بیٹے تھے، نوفل، مطلب اور دو جڑواں بیٹے عمرالعلا المعروف بہ ہاشم اور عبدالشمس۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں اس طرح پیدا ہوئے تھے کہ ہاشم کے پاؤں کا پنجہ عبدالشمس کی پیشانی پر چپکا ہوا تھا جس کو تلوار سے الگ کیا گیا اور جو عرب کے شگون میں خونریزی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

ہاشم صحیح معنی میں قصی کے جانشین تھے۔ اچھے نظم ونسق کے باعث آپ کی اقتصادی حالت بھی بہت اچھی تھی، آپ نے اُسے فراخ دلی سے خرچ بھی کیا۔ ایک شدید قحط کے موقع پر کیک خرید کر تقسیم کئے اور لوگوں سے کہا کہ اِسے توڑ کر شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھاؤ، توڑنے کا عربی لفظ ہشم ہے اس لئے آپ ہاشم مشہور ہوگئے اور قریش میں آپ کا خاندان بنی ہاشم کے نام سے موسوم ہوگیا۔

بنی اُمیّہ

ہاشم کے شخصی جبروت اور خاندانی اثرات کے سبب عبدشمس واقعی ہاشم سے جلتا تھا۔ یہ رشک و حسد عبدشمس کے بعد اس کے بیٹے اُمیّہ کے دور میں کھل کر سامنے آ گیا جب بنی اُمیّہ نے بنی ہاشم کے حریف قبائل بنی عدی اور بنی تیم سے رفاقت کا معاہدہ کر لیا۔ حضرت عمر عدی کی اولاد میں ہیں اور حضرت ابوبکر تیم کی نسل سے۔

عبدشمس کی ہاشم کے مقابلے میں کوئی وجاہت اور قیمت نہ تھی لیکن اُمیّہ نے اپنی ریشہ دوانیوں سے خاندان کا وقار قدرے بلند کیا اور بعض قبائل سے رسم و راہ پیدا کر کے بنی اُمیّہ کو گمنام نہ رہنے دیا۔

ہاشم اور اُمیّہ اگرچہ چچا بھتیجے تھے لیکن اُمیّہ ہمیشہ ہاشم کو نیچا دکھانے کی تدبیریں کیا کرتا۔ ایک بار اس نے دولت کے زعم میں ہاشم پر کیچڑ اُچھالی اور اپنے تفاخر کا اعلان کیا بالآخر طے پایا کہ خزاعی کاہن کو حکم بنایا جائے اور لوگوں کی موجودگی میں دونوں اپنے اپنے خاندانی فضائل بیان کریں، سماعت کے بعد کاہن جس کے حق میں فیصلہ دے، اس کو فریقِ مخالف کی طرف سے سیاہ آنکھوں والی پچاس اونٹنیاں دی جائیں اور شکست خوردہ فریق دس سال کے لئے مکہ چھوڑ دے، نتیجے میں فیصلہ ہاشم کے حق میں ہوا، اُمیّہ شام میں جلا وطن ہو گیا اور ہاشم نے اونٹنیاں ذبح کر کے اہلِ مکہ کو کھلا دیں۔

اُمیّہ کے چار بیٹے تھے۔ ہشام، حرب، عاص اور سفیان۔ سفیان کے نواسے سعد ابن ابی وقاص تھے، جن کا بیٹا عمر سعد کربلا میں افواج شام کا سپہ سالار ہوا۔ عاص کے چار بیٹوں، حکم، عمر، عثمان اور عفان میں سے، عفان کے بیٹے عثمان تیسرے خلیفہ تھے اور حکم کا بیٹا مروان تھا۔ تاریخ کا مشہور کردار صخر المعروف بہ ابوسفیان، حرب کا بیٹا اور اُمیّہ کا پوتا تھا۔

ابوسفیان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، یزید، عتبہ، معاویہ، رملہ اور میمونہ میمونہ کی بیٹی حضرت اُم لیلیٰ مادر حضرت علی اکبر تھیں رملہ سے طلحہ بن عبداللہ ہوئے رملہ ہی اُم المومنین اُم حبیبہ تھیں۔

معاویہ محتاجِ تعارف نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک خونیں باب تحریر کیا۔

بنی ہاشم

قصی کے پدر بزرگ کلاب کی ایک بیٹی تھیں زہرہ۔ جن کے بیٹے کا نام بھی عبد مناف تھا۔ ان کے بیٹے کا نام وہب تھا۔ وہب کی بیٹی تھیں حضرت آمنہ جو حضور کی والدۂ گرامی تھیں۔

ہاشم عبد مناف کی تاریخ ساز اولاد میں تھے۔ فضلہ، ابوصیفی، اسد اور شیبہ یعنی عبد المطلب۔ اسد کی بیٹی فاطمہ حضرت علیؑ کی عالی مرتبت ماں تھیں جنھیں رسولِ اکرم بھی ماں کا درجہ دیتے تھے۔

عبد المطلب کے بارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ دو بیٹوں کے نام ہیں قثم اور حجل لیکن انہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، دس کے نام ہیں۔ حارث، ابولہب، ابوطالب زبیر، عبد اللہ، ضرار، عباس، مقوّم، الغیداق اور حمزہ۔ بیٹیوں میں عاتکہ، اُمیمہ، اروٰی برّہ، اُمِ حکیم (البیضا) اور صفیہ۔ صفیہ کے بطن سے زبیر پیدا ہوئے جو جنگِ جمل کے ہیرو تھے۔ حارث کی بیٹی کا نام بھی اروی تھا۔ ابولہب نے تین بیٹے چھوڑے۔ معتب عتیبہ اور عتبہ۔ حضرت ابوطالب کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ طالب، جعفر عقیل، علیؑ، اُمِ ہانی اور جمانہ۔ حضرت عبد اللہ نے محمدؐ نام کا وہ درِ شاہوار چھوڑا، وقت کے محور پر جس کا نام ہمیشہ درخشاں رہے گا۔

ریگزارِ عرب کا معاشرہ

بطلیموس نے شہر مکّہ کو "مکوربا" کا نام دیا تھا جو سبائی لفظ "مکربی" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں معبد۔ اور معبد بلاشبہ خانہ کعبہ کی نسبت ہی سے کہا جا سکتا ہے۔ یہ شہر ایشیا کو یورپ سے ملانے والی "مصالح کی شاہراہ" پر بڑی اہمیت کا حامل تھا اور مآرب اور غزہ کے وسط کی منزل بھی تھا لہذا مشرق سے مغرب جانے والے اور مغرب سے مشرق کو آنے والے قافلوں کا مستقر بن گیا اور تجارتی لین دین کے سبب یہاں کے لوگوں کا مزاج کاروباری بن گیا۔ اس سے تجارت پیشہ طبقہ کسی حد تک دولتمند ہو گیا تھا۔

آب و ہوا کے لحاظ سے مکہ، مدینہ اور طائف کو چھوڑ کر پورے علاقے کا موسم بہت سخت ہوتا ہے اور گرمیوں میں درجہ حرارت تو اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ طنجہ کا مشہور سیاح ابن بطوطہ پاپیادہ طوافِ کعبہ کرنا چاہتا تھا مگر کر نہ سکا، کیونکہ پتھروں سے ایسی آگ نکل رہی تھی کہ پاؤں اس کی تاب لا سکتے۔

یوں تو پورے جزیرہ نما میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے لیکن بہت قدیم باشندے حامی نسل کے اور اس کے بعد آنے والے سامی تھے جو اسمٰعیلی قبائل کہلاتے تھے۔

عرب دنیا کے بعض دوسرے حصّوں سے زائد توہم پرست تھے پھر بھی ان کا ایک خاص قومی مزاج تھا۔ قبیلے سے محبت، عجیب و غریب خاندانی حمیت، جذبۂ انتقام بے رحمانہ سفلہ پن، طبیعت کی اونچ، جذبۂ حریت اور اسی کے دوش بدوش روحانی بلند پروازی ـــــ اس کو جاہلانہ غیرت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ کسی نوجوان کا خسر بننے کے بجائے عرب اپنی بچیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیتے تھے۔

روم، ایران اور ہندوستان کی طرح عرب کا معاشرہ بھی بہت گھناؤنا تھا۔ بلکہ دوسرے خطوں میں تو ڈھونڈھنے سے کچھ اخلاقی اقدار مل بھی جاتیں لیکن عرب میں ناپید تھیں۔ شراب گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، بدمستی میں ہر گناہ ثواب تھا، عصمت بے قیمت تھی۔ ذی عزت خاندانوں کی عورتیں نفس پروری کے لئے اپنا جامۂ نسائیت خود اتار پھینکتی تھیں، نظریں اس کی بھی مل جاتیں کہ کسی تاجر کا نسلہ حاصل کرنے کے لئے دولت مند عورت خود اس کے پاس چلی جاتی، محرمات تک موقع محل سے جائز ہو جاتیں۔ عکاظ کے میلے میں فاحشہ عورتوں کے کیمپ اور علتِ قوم لوط کا مظاہرہ کرنے والے عام تھے۔

اِن دنوں کی اگر کوئی بات اچھی کہی جا سکتی تو وہ فنون کے مظاہرے تھے بالخصوص شاعری کے اعلیٰ نمونے جو فصحائے عرب پیش کرتے اور ایک دوسرے پر بازی لے جاتے۔ عربی کے سات مایۂ ناز قصیدے جو سبعات معلقات کہے جاتے ہیں، ایسے ہی مواقع پر منتخب ہوتے تھے اور خانہ کعبہ میں لٹکے ہوئے

تھے جو گویا دعوتِ مبارزت تھی طباع شعراء کے لئے۔

عقیدہ بھی بداخلاقی سے مستثنیٰ نہ تھا۔ شرک توحید کا جزو بن گیا تھا۔ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں، اجنہ کو الوہیت کے ہم پلہ، بتوں کو مظہرِ خدا قرار دیا جاتا۔ بتوں کی پرستش عام تھی۔ لات، منات، ہبل اور عزیٰ بڑے باعظمت بت تھے اور ہبل تو خانہ کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔ ان کے علاوہ مصالحے اور لکڑی کے بنے ہوئے گھریلو بت بھی تھے۔ مشہور بتوں کے ناموں پر سانڈ چھوڑے جاتے اور ان کے لئے انسانوں کی قربانیاں بھی ہوتی تھیں۔

یہ باتیں اس خطے کی ہیں جہاں حضرت ابراہیمؑ نے توحید کے چراغ جلائے تھے اور ماضی کے دھندلکے میں جن کی روشنی دُور سے اب بھی دکھائی دیتی تھی۔ عیسائی اور یہودی قبائل میں عقائد کے مدھم نقوش پائے جاتے مگر ان کی اکثریت بھی صنم پرستی کی لت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ پھر بھی یہ نہیں جا سکتا کہ خدائے واحد کا تصور موجود ہی نہیں تھا۔ یقیناً ایسے لوگ بھی تھے جو حق کی جستجو میں جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے اور تزکیۂ روح کے لئے جسمانی اذیتیں بھی برداشت کرتے ایک طبقہ وہ بھی تھا جو مسلکِ ابراہیمی پر نسلاً بعد نسل قائم چلا آرہا تھا مگر ان خرافات کی مخالفت کرنے کی ہمت اس میں نہ تھی یا شاید اُسے معلوم ہو کہ خدا نے اِس کام کے لئے جس کو متعین کیا ہے، وہ آنے ہی والا ہے۔

ایسے میں آخر وہ دن بھی آ ہی گیا کہ سلسلۂ انبیاء اپنے اختتام پر پہنچا اور اسلام اپنی مکمل شکل میں کائنات کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

خدا نے انسان کو اپنی شناخت کے لئے پیدا کیا تھا اور اسلام کا مقصد بھی خدا شناسی ہے لیکن خود اپنے کو پہچانے بغیر خدا کو پہچانا نہیں جا سکتا۔ اِس لئے آدمؑ سے عیسٰیؑ تک جو رسول بھی اپنی شریعت لے کر آیا، اس میں خدا اور انسان کی معرفت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ جس طرح ہر نبی سرورِ کائنات کا پیش رو تھا، اسی طرح ہر شریعت اسلام کا پیش خیمہ۔ یہ تو وقت وقت کی بات

ہے کہ ہر شریعت کے اصول میں زمانے کے تقاضوں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا اور شریعت کے اساسی اصول کے ساتھ بعض وہ باتیں بھی شامل رہیں جن کی اُس دَور کی ضرورت تھی، پھر ایک کے بعد دوسرا مُرسل ایک ترمیمی شریعت لے کر آگیا اور یہ تسلسل اس وقت تک باقی رہا جب تک خدا کا آخری پیغمبر اسلام کے نام سے مکمل پیغامِ الٰہی لے کر نہیں آگیا۔

واضح الفاظ میں حضورؐ کی ذاتِ گرامی تمام انبیاء و مرسلین ماسبق کی سیرتوں کا مجموعہ ہے۔ قرآن اپنے دامن میں توریت، زبور، انجیل اور دیگر صحف سماوی کو لئے ہوئے ہے اور اسلام خدا کا وہ دین ہے جو جزئی پچھلے ہر دین میں شامل رہا اور بالکل آخر میں خاتم الادیان بن کر دُنیا کے سامنے آگیا۔

آنحضرتؐ نے اِس کی صراحت مختلف موقعوں پر کی ہے مگر خود اپنے بارے میں آپ کیا فرماتے، علیؑ کے لئے کہہ دیا۔ میں تو یہیں ہوں، "اگر تم آدمؑ کو ان کے علم میں، نوحؑ کو ان کے تقویٰ میں، ابراہیمؑ کو ان کی خُلّت میں، موسیٰؑ کو ان کی ہیبت میں اور عیسیٰؑ کو ان کی عبادت میں دیکھنا چاہو تو میرے بھائی علی ابن ابی طالبؑ کو دیکھ لو۔"

گہوارۂ طفلی

خود حضورؐ نے اپنے سلسلۂ نسب کے طاہر ہونے کی تصدیق فرمائی ہے اس لئے عبدالمطلب یا عبداللہ کے متعلق کسی بدگمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب آدمؑ سے لے کر جناب عبداللہ تک نکاح سے اصلاب کا آگے بڑھنا مسلم ہے پھر عبدالمطلب کے وحدانیت پر ایمان کا ثبوت واقعہ ابرہہ سے ملتا ہے اور سورۂ "الم تر کیف" سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

عبدالمطلب کا اصل نام شیبہ تھا۔ ۵۱۰ء میں ہاشم کے وفات پانے پر آپ اپنے چچا مطلب کی تولیت میں آئے جو ہاشم کے بعد رفادہ اور سقایہ کے منتظم تھے اور قدر و منزلت میں "الفیض" کے لقب سے مشہور تھے، اہلِ مکہ نے غلطی سے

شیبہ کو مطلب کا غلام سمجھ لیا اور انہیں عبدالمطلب کہہ کر پکارنے لگے جو آگے چل کر ان کا نام ہی پڑ گیا۔

عبدالمطلب ۵۲۰ء میں مکے کے سربراہ ہوئے اور بڑی خوش اسلوبی سے شہر اور نواحِ شہر کا انتظام دس آدمیوں کے سپرد کر دیا مگر قوم کی سیادت درحقیقت انہیں کے ہاتھ میں رہی۔ ایک عرصے کے بعد حبش کا نائب السلطنت ہاتھیوں کی ایک فوج لے کر مکّے پر حملہ آور ہوا، اور نجد کے قبائل میں ایک دہشت پھیل گئی۔ عبدالمطلب بڑے صبر و سکون سے حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ ایک دن انہوں نے ابرہہ سے ملنے کی خواہش کی اور ملاقات ہونے پر ابرہہ سے کہا۔ "آپ کی فوج کے لوگ میری بھیڑیں ہنکا لائے ہیں، انہیں واپس کر دیں۔" ابرہہ حیرت سے منہ دیکھنے لگا اور بولا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ آپ کعبے کو منہدم نہ کرنے کی بات کریں گے۔" اِس کا جواب عبدالمطلب نے بڑی متانت سے دیا۔ "میں اپنی چیز لینے آیا ہوں۔ کعبہ خدا کا گھر ہے، گھر والا خود اس کی حفاظت کرے گا۔"

اور ہوا بھی یہ کہ پہاڑیوں سے ابابیلوں کا ایک غول نکل کر ہوا میں بلند ہوا جن کے پنجوں میں کنکریاں دبی ہوئی تھیں۔ یہ کنکریاں ابابیلوں نے ہاتھیوں پر پھینکیں، اور ہر کنکری ہاتھی کے جسم کو توڑ کر دوسری طرف نکل گئی۔ جس سے ہاتھی بھاگنے لگے۔ ابرہہ زخموں سے چور چور صنعا کی طرف بھاگ گیا اور وہاں جا کر مر گیا۔

ولادت باسعادت

ایران میں نوشیرواں عادل کی حکومت کا بیالیسواں سال تھا حضرت عیسیٰ کو گزرے ہوئے پانچ سو ستر سال گزر چکے تھے۔ واقعہ فیل کا پہلا سال تھا کہ جمعہ صبح صادق کے وقت شعبِ ابی طالب میں نورِ ہدایت کا وہ آفتاب طلوع ہوا جو ازل سے روشن تھا اور جس کی روشنی ابد تک پھیلتی رہے گی۔

عبدالمطلب خدا پر ایقان کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ بھی یقیناً اِسی مسلک پر عامل رہے ہوں گے۔ جنابِ عبداللہ کی شادی آمنہ بنتِ وہب

سے ہوئی تھی۔ وہ فرماتی ہیں کہ ایک رات زمین و آسمان مجھے منور و معطر نظر آنے لگے اور بعض انجانی آوازیں سنائی دینے لگیں کہ مجھے کرامت و شرف اور سعادت کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ یہ میرے لئے ایک مژدۂ جانفزا تھا، جس سے رگ رگ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن اس خوشی کو دیرپائی میسّر نہیں آئی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد یثرب کے سفر میں جنابِ عبداللہؑ کا انتقال ہو گیا۔

حضرتِ آمنہ کے شہرۂ آفاق بیٹے کی ولادت کائنات کا ایک عظیم واقعہ ہے باپ کا سایہ اگرچہ سر پر نہیں تھا مگر دادا نے اس کمی کو محسوس نہ ہونے دیا اور اتنی مسرّت کا اظہار کیا جیسے انہیں اپنے عبداللہؑ سے گراں قدر کوئی گوہرِ بے بہا مل گیا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ شوہر کی وفات کا حضرت آمنہ پر اتنا اثر تھا کہ آپ کا دودھ خشک ہو گیا لہذا انّا کی دستیابی تک ابولہب کی کنیز ثوبیہ نے تین چار مہینے دودھ پلایا پھر ایک بدوی خاتون حلیمہ سعدیہ عرب کے رواج کے مطابق اپنے قبیلے میں لے گئیں۔ یہ واقعہ بھی بہت سی دوسری باتوں کی طرح ہمارے پیغمبر کے لئے ہتک آمیز ہے۔ دُنیا کے کسی نبی نے اپنی ماں کے علاوہ غیر عورت کا دودھ نہیں پیا۔ پیا تو صرف ختمِ المرسلین نے، جن کی بعثت کے لئے خدائے قادر نے کائنات کو خلق کیا تھا اور بیش روی میں اتنے نبی بھیجے تھے۔ بطون و اصلاب کو پاک رکھنے کے لئے اتنی احتیاط اور رگوں میں خون پیدا کرنے کے لئے ایک بدوی عورت کا انتخاب؟ جو موحد بھی نہیں کافرہ تھی۔ مشیت کیا اس پر قدرت نہ رکھتی کہ آپ کے انگوٹھے سے دودھ کا کوئی فوارہ جاری کر دیتی ـــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دُنیا آپ کو ایک عام آدمی ثابت کرنے پر تُلی ہوئی تھی لہذا اپنے مقصد کے لئے ایسی روایتیں گھڑلیں جن کو ایک دوسرے سے نقل کرتا چلا آیا اور جھوٹ اتنی بار بولا گیا کہ وہ آج سچ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے پر کتنی ہی معقول دلیل دی جائے کوئی اس کو ماننے پر تیار نہیں کیونکہ اس سے مقصد پر حرف آتا ہے۔

اسی طرح کی بعض دوسری روایتیں بھی اسلام کی تاریخ میں داخل کر دی

گئی ہیں، صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آپ ہمارے ہی جیسے ایک بشر تھے لیکن جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ جھوٹ اور سچ کی آمیزش میں مورخین یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ آپ کی قوتِ نمو محیر العقول تھی، تین ماہ میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ سات ماہ کی عمر میں چلنے لگے، آٹھویں مہینے بولنے کے قابل ہو گئے اور نویں مہینے اچھی طرح بات چیت کرنے لگے کہ دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔

ماں کے دودھ کی کرامت دُنیا میں ضرب المثل ہے۔ بدوی عورت کے دودھ میں یہ اعجاز تھا کہ اس نے برسوں کا کام چند روز میں کر دکھایا۔ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے لئے کسی دوسری عورت کا دودھ حرام تھا، جائز تھا تو صرف محمد مصطفیٰؐ کے لئے، لہٰذا کوئی کچھ لکھے، عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی کہ بیشتر انبیاء تو ماں کی آغوش سے نبی ہوں اور خاتم الانبیاء پہلے تو صحرائی ماحول میں ایک غیر مسلم عورت کا دودھ پئیں پھر الگ تھلگ ویرانے میں چار پانچ سال گذاریں اور اسی زمانے میں شق الصدر بھی کیا جائے۔ محدث دہلوی قلم بند فرماتے ہیں کہ

> "آپ بکریاں چرانے کے لئے اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ گئے ہوئے تھے کہ تین فرشتے نمودار ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں برف سے بھرا ہوا طلائی طشت تھا، دوسرے کے ہاتھ میں زمرد کی لگن میں برف تھی۔ ایک نے زمین پر لٹایا، سینے کو ناف تک چیرا، آنتوں کو نکال کر برف سے دُھویا، پھر دل برآمد کرکے سیاہ نکتہ کو نکال پھینکا، ایک نوری انگشتری سے دل پر مُہر لگائی، پھر ساری چیزیں اپنی اپنی جگہوں پر رکھ کر شگاف کو جوڑ دیا۔" (۱۵)

گویا اس طرح آپ کے جسم کی تطہیر کی گئی۔ اتنے چھوٹے سے سن میں کوئی عام بچہ بھی گناہ سے آلودہ نہیں ہوتا تو اشرف الانبیاء کے متعلق تو ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عیسیٰؑ نے گہوارے میں کہا تھا کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ مجھے کتاب دی گئی ہے۔ اُن کے سینے کو چاک کرکے کس نے طہارت کی تھی یا حضرت موسیٰؑ اور دوسرے

انبیاء کو کس نے پاک کیا تھا؟ بات صرف اپنا سا بشر ثابت کرنے کی ہے، جس کے لئے روایتوں کا یہ التزام کیا گیا ہے۔

ہمارا عقیدہ اِن خرافات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یقیناً ثویبہ اور حلیمہ کو آپ کی دیکھ بھال کے لئے رکھا گیا ہو گا لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ آپ نے جنابِ آمنہ کے علاوہ کسی کا دودھ پیا ہو۔ پھر یہ حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے کہ واقعہ شق الصدر سے خوف زدہ ہو کر حلیمہ سعدیہ آپ کو لے کر آگئیں لیکن جنابِ آمنہ نے پھر آپ کو قبیلہ بنی سعد میں واپس بھیج دیا، جہاں آپ نے مزید دو تین سال قیام فرمایا۔

ہم اپنی حد تک تو خواب میں بھی شق الصدر کو آپ سے منسوب نہیں کرتے رہ گئی بات حلیمہ سعدیہ کے دودھ پلانے کی تو اس کو اپنے پیغمبر پر بہتان قرار دیتے ہیں ہمارے عقیدے میں دودھ صرف جناب آمنہ نے پلایا اور اس وقت تک ثویبہ آپ کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ پھر کچھ دنوں کے لئے حلیمہ سعدیہ کے پاس بھیج دیئے گئے۔ حلیمہ سعدیہ کے بعد اُم ایمن آپ کی نگراں ہوئیں۔

آپ کی عمر ابھی بمشکل چھ سال کی ہو گی کہ سایہ مادری سے محروم ہو گئے اور حضرت ابو طالب کی رفیقۂ حیات فاطمہ بنتِ اسد نے ماں کی جگہ لے لی۔ جنابِ فاطمہ نے اس دلجوئی سے آپ کی تربیت کی کہ آپ انھیں اپنی سگی ماں سمجھتے رہے

"ٰ۴ ھ میں ان کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفن میں اپنی قمیص مبارک پہنائی اور قبر میں لیٹ کر اس کو متبرک کیا۔ لوگوں نے اس عنایت کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ ابو طالب کے بعد سب سے زیادہ اسی نیک سیرت خاتون کا ممنونِ احسان ہوں"۔ (۱۶)

جنابِ آمنہ کی وفات کے سلسلے میں ایک روایت ابو نعیم زہری کی سند سے اسماء بنتِ جرہم سے منقول ہے کہ

"اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ سال کے بچے تھے

اور اپنی والدہ کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضور کی تربیت و کفالت حضور کے دادا حضرت عبدالمطلب نے کی۔ حضرت عبدالمطلب آپ کو اپنے تمام فرزندوں سے زیادہ محبوب جانتے تھے اور کبھی آپ کے بغیر دستر خوان نہ بچھاتے۔ جلوت و خلوت کے تمام اوقات میں حضرت عبدالمطلب کے پاس ان کی مسند پر جلوہ فرما رہتے تھے۔" (۱۷)

آپ کی عمر ابھی آٹھ سال کی تھی کہ دادا کی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ عبدالمطلب ۱۲۰ سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور عظیم المرتبت چچا ابو طالب ان کی کمی کو پورا کرنے لگے۔ ابو طالب کی سرپرستی آپ کے تربیتی دور کا سنہرا باب ہے۔ آپ کے مالی حالات جناب عبدالمطلب کے مقابلے میں بہت کمزور تھے مگر آپ نے خانۂ کعبہ کی تولیت اس رُعب و دبدبہ سے کی کہ اِس شان کا کوئی غریب سردار آپ سے پہلے اور آپ کے بعد نہیں ملتا۔ عبدالمطلب نے مرتے دم وصیّت کی تھی:۔

"ابو طالب! یہ تیرے حقیقی بھائی کا بیٹا ہے، اس کی حفاظت کرنا، اِسے نورِ نظر اور لختِ جگر سمجھنا، اِس کی خبر گیری میں کوتاہی نہ کرنا جان و مال سے اس کی اعانت کرنا اور دست و بازو سے تحفظ کرتے رہنا۔"

ابو طالب نے باپ کی وصیت کا جتنا پاس و لحاظ کیا، اُس کی شہادت دینے پر دوست و دشمن سب مجبور ہیں اور جی نہ چاہنے کے باوجود بعض مورخین کو لکھنا پڑا کہ خدا کے بعد ابو طالب کی پناہ نہ ملتی تو حالات کے دھارے کا رُخ کچھ اور ہوتا!

حضرت عبدالمطلب پر ایک نظر

اپنے اسلاف کی طرح آپ کا عقیدہ بھی دینِ ابراہیمی پر تھا۔ عرب کے اُس

تاریک دور میں اصنام پرستی کو روکنا آپ کے امکان میں نہیں تھا مگر آپ خود کبھی ان افعالِ شنیعہ کے مرتکب نہیں ہوئے جو اس زمانے میں عام تھے۔ ہاشم کے بعد آپ کعبے کے متولی ہوئے لہذا خانۂ خدا میں بت پرستی کو روکنا آپ کی ذمہ داری ہو سکتی تھی لیکن ایسے کسی اقدام کے جو بھیانک نتائج ہو سکتے تھے، وہ ڈھکے چھپے نہ تھے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بعثتِ محمدی روایتاً آپ کے علم میں رہی ہو اور یہی زیادہ قرینِ قیاس ہے، جیسا کہ سنتِ آدمؑ کے طور پر ایک نبی دوسرے نبی سے کہتا آیا تھا۔ کعبے کی اساسی حیثیت بھی حضرت عبدالمطلب کو معلوم تھی، وہ جانتے تھے کہ سنگِ اسود حضرت آدمؑ جنت سے لائے تھے اور اسی مقام پر نصب کیا تھا جہاں کعبے کی عمارت بنی ہوئی ہے ~~ـــــ~~ پھر اس کا طواف سنتِ نبوی میں داخل ہو گیا۔

کعبے کا طواف اب بھی کیا جاتا مگر اس کی تاریخ اوہام پرستی کی دھند میں خلط ملط ہو گئی تھی۔ اسمٰعیلؑ کے بعد ثابت بن اسمٰعیل اس کے متولی ہوئے لیکن ان کی بیوی قبیلہ بنی جرہم کی تھی۔ کسی بات پر اولادِ اسمٰعیل کا بنی جرہم سے جھگڑا ہو گیا اور وہ مکہ سے نکل کر اطراف و اکناف میں جا بسی۔ ایک مدت کے بعد گرد و نواح کے قبائل نے عمرو بن حارث سردار بنی جرہم کو مار بھگایا۔ اس نے چلتے وقت حجر اسود کو اکھاڑ کر چاہِ زم زم میں ڈال دیا اور اس کو پاٹ کر برابر کر دیا۔

عمرو نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ حجرِ اسود کی جگہ ہرن کی دو طلائی مورتیاں نصب کر دیں جو اسفندیار نے ایران سے اس کو بھیجی تھیں یہ مورتیاں غزالِ کعبہ کہلائیں۔

مکے کے نخلستان میں چاہِ زم زم کو بڑی اہمیت تھی مگر اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ یہ چاہ حضرت اسمٰعیل کی یادگار تھی۔ مذہب کی روایتی تاریخ شاہد ہے کہ خلیل اللہ کی ایک بیوی جناب سارہ اس وقت لاولد تھیں۔ جناب ہاجرہؑ کے بطن سے جب جناب اسمٰعیلؑ کی ولادت ہوئی تو وہ دونوں سے جلنے لگیں اور انہوں نے ان کو جلا وطن کرنے کی ضد کی۔ مشیتِ خداوندی دیکھ کر جناب ابراہیم جناب

سارہ کی دلجوئی پر مجبور ہو گئے اور جناب ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو اس مقام پر لا کر چھوڑ گئے جہاں آگے چل کر آپ نے خود خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ حضرت ابراہیمؑ کچھ کھجوریں اور پانی اِن دونوں کے لیے رکھ گئے تھے جب تک وہ چلا، اس وقت تک جناب ہاجرہ حضرت اسماعیلؑ کو دودھ پلاتی رہیں پھر دودھ خشک ہو گیا اور حضرت اسمٰعیلؑ پیاس میں تڑپنے لگے تو جناب ہاجرہ بیقرار ہو کر اُٹھیں اور پانی کے لئے ایک طرف دوڑ پڑیں۔ کوہ صفا پر پہنچیں پھر اُتر کر کوہ مروہ پر آئیں۔ اِس طرح سات مرتبہ دوڑیں —— حج میں اِسی کی تاسی کی جاتی ہے۔

آخر پانی نہ ملا تو جناب ہاجرہ محبتِ مادری میں پلٹ پڑیں، آکر دیکھا تو جناب اسمٰعیلؑ جاں بلب تھے، جنابِ ہاجرہ پھر مضطرب ہو کر مروہ پر چڑھ گئیں اور فریاد کرنے لگیں تو ایک آواز کان میں آئی۔ جناب ہاجرہ نے گردن گھما کر نظر ڈالی تو اس مقام پر پانی کے آثار پائے جہاں جنابِ اسمٰعیل پڑے ہوئے تھے —— کہا جاتا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے اپنا بازو زمین پر مارا تھا جس سے چشمۂ آب جاری ہوا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ نے شدّتِ تشنگی میں ایڑیاں زمین پر رگڑیں تو پانی نکل آیا۔ جناب ہاجرہ نے بڑھ کر پانی کے گرد باڑھ باندھ دی تاکہ وہ بہہ کر ضائع نہ ہونے پائے۔ اِس طرح چاہ زم زم وجود میں آیا۔ اب جس کا کوئی پتہ نہ تھا اور مکّے والوں کو پانی کی بڑی قلّت محسوس ہو رہی تھی۔

عمرو بن حارث نے مکّہ چھوڑتے وقت دو بُت بھی چاہ زم زم پر نصب کر دیئے تھے جن سے چاہ چھپی ہوئی تھی۔ حضرت عبدالمطلب نے نزاکتِ وقت محسوس کر کے ایک مقام کو نشان زد کیا اور اپنے بیٹے حارث کی مدد سے وہاں کھدائی شروع کی تو چاہ کے آثار نمودار ہو گئے اور پانی نکل آیا۔

اس موقع پر حضرت عبدالمطلب نے ربِ کعبہ سے دُعا مانگی کہ اگر انھیں دس بیٹے عطا ہوئے تو وہ ان میں سے ایک کو خدا کی راہ میں قربان کریں گے۔ وقت

کے فضل سے پروردگار نے دس کے بجائے بارہ بیٹے دے دیئے مگر انہوں نے منت پوری نہ کی، حالانکہ بیٹے سب کے سب باپ کی منت پوری ہونے کے لئے اپنے کو پیش کرتے مگر عبدالمطلب فیصلہ نہ کر پاتے تھے۔ آخر ایک رات انھیں خواب میں بشارت ہوئی اور وہ اپنی وعدہ فراموشی پر لرز اُٹھے۔ آخر سوچ سمجھ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ قرعہ ڈال کر طے کریں کہ کس کو راہِ خدا میں قربان کیا جائے؟ لیکن قرعے میں نام عبداللہ کا نکلا جو انہیں سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اِس محبوبیت میں عبداللہؑ کے ذاتی محاسن بھی تھے اور اس نور کی آب و تاب بھی جو عبداللہ کی پیشانی پر تابندہ تھا۔

عبدالمطلب اب وجد کی عظیم سیرت کے وارث تھے وہ دل پر پتھر رکھ حضرت عبداللہ کو قربان گاہ میں لے آئے مگر عبداللہ کے قبولِ عام نے ارادے پر عمل نہ کرنے دیا۔ بنی ہاشم کے عمائدین سامنے آگئے کہ عبداللہ کے بجائے روایت کے مطابق دس اونٹوں کی قربانی دی جائے لیکن قرعہ جب اونٹوں کے مقابلے پر ڈالا گیا تو عبداللہ ہی کے نام نکلا۔ دوبارہ بیس اونٹوں پر قرعہ اندازی کی گئی مگر مقصد پورا نہ ہوا، پھر تیس اونٹوں پر۔ اس طرح اونٹوں کی تعداد بڑھائی جاتی رہی، آخر سو اونٹوں پر قرعہ نکل آیا۔ حضرت عبدالمطلب نے اتمام حجت کے لئے دوبارہ قرعہ ڈلوایا تو اونٹوں ہی کے حق میں نکلا اور سو اونٹ قربان کر دیئے گئے۔ اس طرح ایک آدمی کی دیت دس کے بجائے سو اونٹ مقرر ہو گئی جو اسلام میں بھی رائج رہی۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد حضرت عبداللہ کی قربانی دوسری قربانی تھی جو دنبے اور اونٹوں نے اپنے سر لی لیکن اس کا اصل بدل کربلا میں ہوا۔ امام حسینؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ لی اور حضرت علی اکبر حضرت عبداللہ کے بجائے قربان ہوئے جو محمدؐ کی طرح پدرِ محمد سے بھی مشابہت رکھتے تھے۔

آنحضرتؐ ابوطالب کی سرپرستی میں

کہنے کو تو آنحضرتؐ نے صرف دو سال عبدالمطلب کے زیرِ سایہ گزارے تھے لیکن حقیقتاً

پیدائش کے بعد سے آٹھ سال کی عمر تک عبدالمطلب ہی آپ کے نگران رہے تھے اور ان کے بعد آپ ابوطالب سے مانوس تھے جنھوں نے صحیح معنیٰ میں حق شفقت و بزرگی ادا کر دیا اور یتیم بھتیجے کو وہ پیار دیا کہ آنحضرت کو ان کی شخصیت پر ناز ہونے لگا

عبدالمطلب کے بعد چاہِ زم زم عباس کو ملا تھا اور کعبہ کا کلیدی عہدہ ابوطالب کو۔ وہ اپنے مالی حالات درست کرنے کے لئے کبھی کبھی تجارتی قافلوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد ابوطالب شام کے سفر کے لئے تیار ہوئے، وہ حضور کو ساتھ لے جانا نہ چاہتے تھے مگر آپ کے اصرار پر انکار نہ کر سکے اور ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ بصرہ کے قریب قریہ کفر میں تجارتی منڈی تھی۔ وہاں ابوطالب نے نسطوری راہبوں کے معبد میں قیام کیا۔ جرجیس عرف بحیرا وہاں ایک راہب تھا جو توریت و انجیل کا عالم تھا۔ وہ آنحضرت کے جمال و جلال کو دیکھ کر دنگ رہ گیا، پھر اس نے ایک ابر کو سر پر سایہ فگن دیکھا۔ تمام کتبِ آسمانی اس کے مطالعہ سے گزر چکی تھیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیش گوئی اس کے ذہن میں تھی۔ کیسی خیال پر اس نے حضور کی پشت مبارک کھول کر دیکھی اور مہر نبوت کو چوم کر ابوطالب سے کہا کہ یہ خدا کے آخری پیغمبر ہیں، اِن کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرنا، پھر اس نے اپنے علم کے مطابق ابوطالب سے مستقبل کی بہت سی باتیں کہیں

ابوطالب جو مال لے کر چلے تھے وہ سب حضور کی برکت سے اِسی منڈی میں فروخت ہو گیا اور ابوطالب اِسی مقام سے آنحضرت کے بارے میں دل و دماغ کی ایک روشنی لے کر واپس ہو گئے۔

آنحضرت نے ابھی زندگی کے دس بارہ سال گزارے تھے مگر آپ کا اُٹھان تحیر خیز تھا۔ غور و خوض کی عادت تو آپ کو بچپن ہی سے تھی۔ کبھی بکریوں کے ریوڑ لے کر چرانے کے لئے چلتے اور نگاہ فضائے بسیط کی طرف اُٹھتی تو کائنات کی چشمک سے ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی۔ عالم نور میں جو کچھ دیکھا تھا اس میں سے کچھ بھولا نہ تھا مگر ایک خواب کی سی کیفیت میں کوہ سینا پر چمکنے والا نور

آپ کے سامنے تھا اور وہ نور بھی، جس نے گلیلی کے کسانوں اور ماہی گیروں کی زندگیوں کو روشن کر دیا تھا یہ نور دُور اور بہت دُور سے اپنی طرف بڑھتے نظر آتا اور آپ کی نظر فاران کی چوٹی کی طرف اُٹھ جاتی، پھر آپ سر جھکا کر ایک فکر میں ڈوب جاتے کیونکہ اِس کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ ابھی دماغوں اور دلوں کو اس سطح پر لا کر ہموار کرنا تھا جہاں وہ آپ کا پیغام سُن سکتے اور کوئی اثر قبول کرتے جس کی مساعی آپ نے شروع کر دی تھیں اور اپنی صداقت سے لوگوں میں سچ بولنے کی اہمیت واضح کرتے جا رہے تھے۔

اب آپ جوانی کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے اور آپ کی عملی زندگی شروع ہو گئی تھی۔ اہلِ مکّہ پر آپ کے اخلاقی اثرات بڑھتے جا رہے تھے اور آپ آہستہ آہستہ بگڑے ہوئے معاشرے کو سدھارنے کی کوشش کر رہے تھے، چچا کی مالی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے کچھ کاروبار بھی کر لیتے لیکن چونکہ سرمائے کی کمی تھی لہٰذا عموماً سرمایہ دوسروں کا ہوتا اور محنت آپ کی، جس سے آپ کی دیانت کا سکہ کے والوں کے دلوں پر بیٹھ گیا اور آپ متدین، صادق اور امین مشہور ہو گئے نتیجے میں ہر تاجر آپ کے شریکِ تجارت ہونے کا متمنی تھا۔ ان میں مکے کی ایک خاتون خدیجہ بھی تھیں۔ ان کا کاروبار اتنا بڑا تھا کہ ملیکۃ العرب کہی جاتی تھیں۔ انہوں نے آپ کی شہرت سُن کر درخواست کی اور آپ ان کا مال لے کر شام کی طرف روانہ ہو گئے۔

آپ کی اصلاحی اور رفاہی زندگی ہوش سنبھالنے کے بعد سے شروع ہو گئی تھی، جس میں عمر کی تدریجی ترقی کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ قریش اور بنی قیس میں جنگ ہوئی تو آپ نے قریش کا ساتھ دیا، لیکن تلوار نہیں اُٹھائی کیونکہ آپ شجاعت و شرافت کے ورثہ دار ہونے کے باوجود طبعاً صلح پسند اور ہادی ہی تھے لہٰذا قبائلی جنگ کے بھیانک نتائج کا احساس کر کے، جب آپ کے چچا زبیر بن عبد المطلب نے بنی زہرہ اور بنی تیم میں معاہدہ کرانے کی سعی کی تو آپ

نے اس میں عملی حصّہ لیا۔ یہ معاہدہ مسافروں کی حفاظت، غریبوں اور مظلوموں کی حمایت اور امن وامان کے قیام کے لئے تھا اور فضل، فضالہ، فضیل اور مفضل ناموں کے لوگ اس میں شریک تھے، لہٰذا تاریخ میں حلف الفضول کہلاتا ہے۔

آپ کی رفاہی زندگی کا اہم ترین واقعہ یونانیوں کی سازش سے کعبے کا تحفظ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عثمان بن حریث نامی عرب نے زر ومال کے لالچ میں دینِ عیسوی قبول کرلیا تھا۔ مکّے کی تجارتی اہمیت کو دیکھتے ہوئے قسطنطینیہ کی نظر مدتوں سے اس پر لگی ہوئی تھی۔ قیصر نے عثمان بن حریث کے ذریعہ اس کو فتح کرنے کی سازش کی اور عثمان مکے پہنچ کر اندر ہی اندر لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے لگا۔ آنحضرتؐ کو اس کی خبر لگ گئی اور آپ نے اس کا بھانڈا پھوڑ کر مکے کو تباہی سے بچا لیا۔

اِن مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ آپ کسبِ معاش کی طرف سے بھی غافل نہ تھے اور مالِ تجارت کے منافع سے چچا کی مالی اعانت کرنے کی کوشش کرتے رہتے جناب خدیجہ کا مال بصرہ لے جانا اِسی سلسلے کی کڑی تھا۔ یہ کاروباری سفر بہت کامیاب رہا۔ خدیجہؑ پہلے ہی حضور سے کچھ کم متاثر نہ تھیں اور دل ہی دل میں آپ کی شخصیت پر فریفتہ ہوتی جا رہی تھیں۔ سفر سے واپسی پر جب ان کے غلام میسرہ نے حضور کے طور طریقے اور عادات واطوار کا نقشہ کھینچا تو آپ نے فیصلہ کر لیا اور شادی کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔

جناب خدیجہ سے شادی

حضور کو یہ رشتہ منظور تھا مگر آپ نے اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک حضرت ابو طالب نے ہاں نہیں کر دی۔ آخر ۵۹۵ء میں ایک طرف سے حضرت ابو طالب اور دوسری طرف سے ورقہ بن نوفل نے نکاح پڑھا۔ ورقہ کے ساتھ جناب خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد بھی شامل تھے۔ جناب ابو طالب کا خطبۂ نکاح ان کے اندر چھپے ہوئے انسانی عقائد کا ترجمان ہے۔ "تمام تعریفیں اس خدائے واحد

کے لیے ہیں جس نے ہمیں نسلِ ابراہیمؑ اور ذریت اسمٰعیلؑ سے قرار دیا۔۔۔۔۔۔"

مہر بارہ اوقیہ سونا اور پچیس اونٹ مقرر ہوا تھا جو حضرت ابوطالب نے اسی وقت ادا کر دیا۔

آنحضرت کی عمر اس وقت پچیس سال اور جناب خدیجہ کی چالیس سال تھی، مورخین کو ایک تواتر سے اصرار ہے کہ اِس سے قبل خدیجہ کی دو شادیاں ہو چکی تھیں اور ان کی دو بیٹیاں بھی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ "مناقب ابن شہر آشوب" کا بیان صحیح ہے۔ خدیجہ بنتِ خویلد خدا کی طرف سے محمد کی امانت تھیں اور اب تک کنواری رہی تھیں۔ دونوں بیٹیاں ان کی بہن "ہالہ" کی تھیں، جن کو جنابِ خدیجہ نے بیٹیوں کی طرح پالا تھا اور آنحضرت کی زندگی میں داخل ہونے سے قبل دونوں کی شادیاں کافروں سے ہو چکی تھیں۔

محدث دہلوی کے الفاظ میں "سیدہ خدیجہ عقل و فراست میں کامل اور قریش کی عورتوں میں افضل و انسب تھیں"۔ دولت کی اتنی بہتات تھی کہ پورے حجاز میں کوئی ان کے ہم پلہ ٹھہرایا نہ جا سکتا۔ ازدواجی زندگی میں وہ اتنی اچھی بیوی ثابت ہوئیں اور آپ نے حضور کو اپنی جانب اس قدر ملتفت کر لیا کہ حضور نے ان کے سِن حیات کبھی دوسری عورت سے عقد کا تصور بھی نہیں کیا اور ان کی وفات کے بعد بھی کبھی انہیں فراموش نہ کر سکے۔

حجر اسود کی تنصیب

آپ کی اصلاحی زندگی ایک دھارے پر بہہ رہی تھی، شب و روز دردِ انسانی کے احساس اور حد سے زائد بگڑے ہوئے معاشرے کے منجدھار میں گزر رہے تھے۔ کتنے ہی قلوب اور اذہان کو آپ نے منقلب کر دیا تھا۔ کعبے کی نئی تعمیر کے بعد حجر اسود کی تنصیبِ نو کا قضیہ پیدا ہو گیا۔ ہر سردارِ قبیلہ اس شرف کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بحث و تمحیث کے بعد طے پایا کہ اگلی صبح کو جو سب سے پہلے داخلِ حرم ہو اسے حکم بنا دیا جائے۔

صبح ہوئی تو سب سے پہلے حضور نے حرم میں قدم رکھا۔ آپ نے ایک مضبوط چادر بچھائی، حجرِ اسود کو اس میں رکھا، تمام سرداروں کو اس کے کونے پکڑا دیئے سردار اس کو اُٹھا کر لائے اور آپ نے حجرِ اسود کو اُٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا اِس طرح آپ نے ایک بڑے تنازعے کو طے کر دیا۔

بعثت سے قبل یہی آپ کی زندگی تھی اور آپ مسلسل انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ جس کو آپ کی بے نام پیغمبری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ولادتِ علیؑ

خلاقِ کائنات نے آخری نبی کے لئے جو التزامات کئے تھے۔ ان میں سرِفہرست حضرت ابوطالب تھے پھر جناب خدیجہ مگر ابھی ایک تیسرے کا انتظار تھا۔ خود سرورِ کائنات بھی جس کے منتظر تھے۔ اعلانِ نبوت کے لئے زمین اگرچہ پوری طرح ہموار نہ تھی مگر شخصی کردار کا لوہا اہلِ مکہ میں مانا جا چکا تھا اور آپ کو یقین تھا کہ اگر آپ کوئی سچی بات کہیں گے تو وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو، بے لگام اور منہ زور عرب اس کو سُن ضرور لیں گے اس لئے آپ اپنے قوتِ بازو کے لئے چشم براہ تھے آخر وہ ساعت آ پہنچی جس میں لوازماتِ مشیّت کا تکملہ ہونے والا تھا۔

حضرت ابوطالب کی شریکِ زندگی فاطمہ بنتِ اسد خانہ کعبہ کے طواف کے لئے آئی تھیں کہ دردِ زہ کے آثار محسوس ہوئے۔ آپ کعبے کی دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک معتبر روایت یہ بھی ہے کہ دردِ زہ گھر ہی پر شروع ہو گیا تھا اور آنحضرت کے کہنے کے مطابق فاطمہ کعبے کی طرف آئی تھیں، قریب پہنچتے ہی درد نے شدّت اختیار کر لی۔ آپ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئیں اور خدا سے مشکل آسان کرنے کی دعا کرنے لگیں۔

عین اسی وقت دیوار میں ایک شگاف پیدا ہوا اور فاطمہ بنت اسد اندر داخل ہو گئیں۔

بچے کی ولادت تاریخ کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے مگر اس بند مکان میں، جو تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا، تنِ تنہا فاطمہ بنت اسد کا رہنا انھیں کے دل گردے کا کام تھا یا ہو سکتا ہے کہ اعتقاد نے سہارا دیا ہو جو ان کے دل میں کوئی خوف یا دہشت پیدا نہیں ہوئی۔

اسلام کی تاریخ ایک ایک واقعہ پر کئی کئی روایتیں بیان کرتی ہے۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی ہے کہ ابو طالب کا بیٹا ماں کی گود میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ خود ابو طالب نے گود میں لیا تو ان کے منہ کو نوچ لیا۔ ماں نے اس کا نام اسد رکھا۔ محمدؐ نے علی رکھ دیا۔ بچے نے آنکھیں اس وقت کھولیں جب آنحضرت تشریف لائے اور اس کو مخاطب کیا۔ بچے نے پہلی بار جو صورت دیکھی وہ پیغمبرؐ کی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ حضور نے گود میں لے کر اپنی زبان اس کے منہ میں دے دی جس کو وہ اس طرح چوسنے لگا جیسے یہی اس کی غذا ہو۔

۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل اس واقعہ کی یادگار ہے جس کے بعد یہ بچہ مکے کے صادق و امین کی گود میں پرورش پاتا رہا۔ مورخین نے اس کو ابو طالب کی اعانت قرار دیا ہے کہ جعفر کی کفالت عباس نے اور علی کی آنحضرتؐ نے اپنے ذمہ لے لی۔ لیکن یہ مسلّم ہے کہ پیدائش کے بعد علیؑ حضورؐ ہی کے زیرِ تربیت رہے کیونکہ مشیت نے آپ کو پیدا ہی حضورؐ کے لئے کیا تھا۔

عادات و اطوار کی طرح علی کا نمو بھی غیر معمولی تھا۔ آپ نے گہوارۂ طفلی میں کلّۂ اژدر کو اس کے منہ میں انگلیاں ڈال کر پھاڑ ڈالا جو قریش کے بعض دشمنوں نے چھوڑا تھا، ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ کعبے میں ایک بہت پرانا سانپ پلا ہوا تھا۔ نوزائیدہ بچے کو کعبے میں رکھ دیا جاتا۔ وہ صحیح النسب بچے کے گرد سات چکر لگا کر چلا جاتا تھا اور اس کی تصدیق کو قریش مان لیتے تھے۔

توہم پرستی کے اس ماحول میں جہاں بتوں کے ساتھ سورج اور ستاروں کی پرستش بھی ہوتی تھی، یہ عجیب و غریب رسم تعجب خیز نہیں، مگر ابو طالب کا بیٹا تو

ایسا نہ تھا جس کو بجبر درِ کعبہ پر رکھوا دیا جاتا لہٰذا بعض دشمنوں نے سانپ کو کعبے سے لا کر گھر میں چھوڑ دیا۔ سانپ جیسے ہی گہوارے میں مُنہ علی کے اوپر لے گیا آپ نے ایک انگڑائی لے کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس کے مُنہ میں ڈال دیں اور سانپ کے مُنہ کو دو ٹکڑے کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ وہم پرست قریشیوں کو اژدر کے مرنے کا بڑا صدمہ تھا کسی نے کہا۔ اب بچوں کے نسب کی تحقیق کیونکر کی جائے گی؟ تو غیب سے جواب ملا علی کی دوستی اور دشمنی سے شناخت کر لینا۔

علی اپنی تیز اُٹھان کے ساتھ عقل و دانش میں بھی عام بچوں کی طرح نہ تھے پہلے تو آنحضرت ان کو گود میں کھلایا کرتے تھے، اب انگلی پکڑ کر چلانے لگے۔ حلف الفضول تو علی کے سامنے کا واقعہ نہ تھا لیکن جب حضورؐ نے رومیوں سے مکے کو بچایا تو علی کو اچھی طرح یاد تھا کہ آپ جنابِ خدیجہؑ سے ذکر کیا کرتے تھے، اور علی تائیدی نگاہ سے اپنے مربی و مرشد کو دیکھتے رہتے تھے۔

وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ علیؑ سے حضورؐ کا خلا ملا بڑھتا رہا اور حضورؐ کی عزلت گزینی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اب آپ کوہِ حرا کی طرف نکل جاتے اور اس کے ایک غار میں مصروفِ عبادت ہو جاتے۔

ملیکۃ العرب، رفیقۂ حیات نے خزانوں کا مُنہ آپ کے رفاہی کاموں کے لئے کھول دیا تھا۔ عبادت کی طرف آپ کا حد سے زیادہ رجحان اس کو گراں گزرنا چاہیئے تھا مگر کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ خدیجہ نے آپ کے کسی عمل میں کوئی اختلاف کیا ہو بلکہ وہ گھر سے چلتے وقت ضروریات کی چیزیں ساتھ کر دیتیں اور جب آپ کو کئی کئی شبانہ روز گزر جاتے تو خود کھانے پینے کا سامان پہنچا کر آتیں۔ ممکن ہے کہ علیؑ بھی ان مواقع پر حضرت خدیجہؑ کے ساتھ ہوتے ہوں۔ وہ تو کمسن تھے۔ پاسِ ادب زبان کھولنے کی بھی اجازت نہ دیتا لیکن خدیجہؑ کو تو حق تھا۔ محمدؐ ان کے محبوب تھے۔ محمدؐ کے لئے انہوں نے اپنے کو مٹا دیا تھا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ خدیجہؑ نے

کبھی ناک بھوں بھی چڑھائی ہو بلکہ اس کے برعکس حضورؐ جب گھر آتے تو بڑی خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے استقبال کرتیں اور جب خود غارِ حرا کی طرف جاتیں تو کشادہ دلی اور ایک نیرِ لب تبسم کے ساتھ تمام چیزیں رکھ کر اُلٹے قدم واپس ہو جاتیں۔ شاید حضور نے رازِ مشیت میں انہیں شریک کر لیا تھا یا خدیجہؑ کے باطن نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہو، تب ہی تو انہوں نے کبھی اپنے شریکِ حیات سے کچھ پوچھا نہیں، ہر صورت اور ہر کیفیت میں بس تعاون ہی کرتی رہیں۔ اسی لئے ہمیں یہ روایت صحیح ترین معلوم ہوتی ہے کہ آپ خدا کی طرف سے خویلد کے گھر میں محمدؐ کی امانت تھیں۔ دنیا ہماری روحانیت کے لئے دارالاسباب ہے۔ دین کو ہم مادیت کی شاہراہ قرار نہیں دیتے ہماری آنکھ مادی جامے میں روحانی اقدار کی شناخت رکھتی ہے، جناب خدیجہ ہمارے نزدیک پیغمبر نہیں تھیں بلکہ پیغمبر کی ایسی رفیقۂ حیات تھیں، اساسی طور پہ پیغمبرؐ کو جن کی ضرورت تھی اور جن کے انتقال کے بعد کتنی ہی بیویاں حیاتِ پیغمبر میں داخل ہوئیں مگر کوئی ان کی جگہ نہ لے سکا اور حضور انہیں زندگی کی ہر موڑ پر یاد کرتے رہے۔

غارِ حرا سے کعبے تک

حضورؐ جانتے تھے کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب انہیں پیغمبرِ اسلام ہونے کا دعویٰ کرنا ہے۔ چالیس سال تک آپ نے تجربات، مشاہدات اور محسوسات سے اپنے مادی جسم کو اس بارِ گراں کے اٹھانے کے قابل بنا لیا تھا جسے آپ لوحِ محفوظ میں چھوڑ آئے تھے۔ بچپن سے آج تک آپ نے عرب کے قبائل کو باہم دست و گریباں دیکھا تھا، ریت کے ذرّوں کو خون سے رنگین پایا تھا۔ بے آئین اور سفاک صحرائیوں میں فحش رسوم اور باطل عقائد کی وہ بہتات تھی کہ ان کے دل و دماغ مسخ ہو کر رہ گئے تھے، لہذا پہلے آپ نے ان سے ملتا جلتا انسان بن کر ان کے اندر چھپے ہوئے انسانوں کو پرکھا پھر ان میں اتنی تبدیلی پیدا کی کہ وہ آپ پر اعتبار کر سکیں۔

یہی آپ کا مقصدِ اولیں تھا اور عرب کی تقدیر میں مشیت کے قلم نے بھی یہی لکھ دیا تھا، لہذا عمر کے چالیس سال پورے ہونے کے بعد ایک دن جب آپ غارِ حرا

میں داخل ہوئے اور اپنے کو فکرِ الٰہی میں مستغرق کیا تو ایک آواز سنائی دی، آپ نے سر اُٹھا کر دیکھا تو ایک نورانی چہرہ سامنے تھا، یہ جبرئیل تھے۔ انھوں نے کہا۔ "اقراء باسم ربک"۔ ایک لحظے تک آپ جبرئیل کو دیکھتے رہے پھر آپ نے پڑھنا شروع کر دیا۔ ظہر کا وقت تھا۔ آپ نے نماز پڑھی اور باہر نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

یقیناً آپ پر ایک بوجھ تھا جس سے آپ کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ آپ تھکے تھکے سے تھے۔ گھر پہنچ کر آپ نے جنابِ خدیجہ اور حضرت علی کو بتا دیا کہ آج سے دَورِ رسالت کا آغاز ہو گیا۔ پھر آپ جنابِ خدیجہ سے چادر لے کر اور اس کو اوڑھ کر لیٹ گئے اور تھوڑی دیر تک سکون حاصل کرتے رہے۔ ورقہ بن نوفل مکّے کے ان موحدین میں تھے جو خالقِ حقیقی کے بارے میں غور و فکر بھی کرتے' آنے والے رسول کی حقیقت سے بھی باخبر تھے۔ لہٰذا جنابِ خدیجہ نے ورقہ بن نوفل کو یہ مژدہ سنایا تو انہوں نے فوراً اس کی تصدیق کر دی، جس کے نتیجے میں کچھ لوگ اِس خبر سے آشنا ہونے لگے۔

۲۷ رجب سنہ ۴۱ عام الفیل کی سہ پہر کو کائنات نے ایک منظر دیکھا۔ ایک شخص بیت المقدس کی طرف رُخ کئے کھڑا تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اَدھیڑ عورت اور ایک نو سال کا بچہ صف بستہ تھا۔ یہ پہلی نماز تھی جو خانۂ خدیجہ میں ادا کی گئی۔

اِس کے بعد یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ جنابِ خدیجہ، آغازِ اعلانات سے ہمرازِ رسالت تھیں اور علی اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے امام اور آغوشِ رسالت کے پروردہ۔ خانۂ کعبہ میں جب پہلے پہل رسول کی گود میں آئے تھے تو تلاوتِ کلامِ پاک سے اپنا تعارف کرایا تھا اور حضرت عیسیٰ کی طرح اپنے امام ہونے کا اعلان کیا تھا۔ پھر اسی کعبہ میں جنابِ خدیجہ کے ساتھ رسولِ اکرم کے پیچھے مسلسل نماز پڑھ کر اپنے پیدائشی مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔ (۱۸)

غارِ حرا میں افتتاحِ رسالت کے بعد سے پنج وقتہ نماز آنحضرت اور ان دو نوں متبعین کا معمول بن گیا تھا لیکن سرِ عام اِس دینِ تازہ کی کوئی بات کسی سے کہی نہیں گئی۔ یہ اور بات ہے کہ ورقہ بن نوفل سے ان کے حلقے میں توحید کا ڈھکا چھپا پیغام پہنچ گیا یا خود پیغمبر کی ذاتِ گرامی نے بغیر زبان کھولے اپنے قریبی حلقے میں کسی سے کچھ کہہ دیا ہو مگر براہِ راست کوئی اعلان کیا نہیں گیا ~~کہ~~ اعلان کرتا بھی کون؟ جناب خدیجہؑ عورت تھیں، خود پیغمبر کی مصلحت ابھی اس کی اجازت نہ دیتی تھی اور حضرت علیؑ تو حضورؐ کے اس طرح پیرو تھے، جیسے بکری کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے۔

وحیِ ربانی کچھ دنوں ملتوی رہ کر پھر جاری ہو گئی تھی۔ نزولِ وحی کے لئے کسی مقام یا وقت کا تعین نہ تھا۔ حضرت جبرئیل جب بھی کوئی آیت لے کر آتے حضورؐ پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور آپ اسے محفوظ فرما لیتے۔ اس طرح تین سال گزر گئے۔ آخر آپ کو کھلے عام اعلانِ رسالت کی ہدایت صادر ہو گئی، اور ایک دن آپ نے کوہِ صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر آواز دی بالکل اسی طرح جس طرح کبھی بلندی کوہ سے ان کے بزرگ "آلِ غالب" کو پکارا کرتے تھے۔

"یا معشرِ قریش"!

آپ کی آواز پر لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے ان سے سوال کیا۔

"میں اگر یہ کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے کوئی لشکر آ رہا ہے تو تم بغیر دیکھے یقین کر لوگے؟"

سب یک زبان ہو کر بولے۔

"ہم نے تم کو ہمیشہ سچ بولتے ہی پایا ہے۔"

تب آپ نے فرمایا۔

"تو میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ایک ہے۔ اس پر ایمان نہ لاؤ گے تو عذاب میں مبتلا ہو گے۔"

بعض لوگوں کے کان میں اِس عقیدے کی سُن گن پڑ چکی تھی حضورؐ کی زبان سے سن کر وہ برہم ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا، جب مکّے میں آپ کے خلاف بدظنی کا اظہار ہو رہا تھا۔ سارا مجمع ناراضگی کے عالم میں منتشر ہو گیا۔ پھر آپ بھی وہاں سے چلے آئے۔

روایاتِ معتبرہ کی رو سے آپ نے سکہ بعثت میں بنی ہاشم کو دعوت دی اور علیؑ سے کہا کہ ایک پیمانہ طعام، ایک ران بکری کی اور ایک کاسہ دودھ کا تیار کریں اور عبدالمطلب کی اولاد کو بُلا دیں۔ علیؑ نے حسبِ ارشاد تعمیل کی، جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے کھانا پیش کیا۔ ایک کم چالیس آدمی تھے مگر سب نے اتنے ہی کھانے میں پیٹ بھر کر کھا لیا۔ حضرت ابوطالب، جناب حمزہ، جناب عباس اور ابولہب ہر ایک موجود تھا۔ اس معجزے پر ابولہب بول اُٹھا "اتنے سے کھانے میں محمدؐ نے جادو کر دیا"۔ آنحضرتؐ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر سب موقع دیئے بغیر چلے گئے۔

اگلے دن پھر اسی طرح سب یکجا کئے گئے اور اتنے ہی کھانے میں سب نے کھا لیا۔ آج حضورؐ نے کھانا ختم ہوتے ہی کہنا شروع کر دیا "نصیب والے ہیں آپ کہ میں آپ کے لئے دُنیا اور آخرت کا تحفہ لایا ہوں"۔ تسلسل میں آپ نے خدا کا پیغام پہنچایا اور کہا "جو شخص اس میں پہل کرے گا وہ میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہو گا"۔

مجمع ایک خاموشی میں حیرت اور غصّے کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ دس سال کا ایک بچہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یا رسول اللہ! میں آپ کے دشمنوں کو نیزہ ماروں گا، ان کی آنکھیں پھوڑ دوں گا، پیٹ چیر دوں گا، ٹانگیں کاٹ دوں گا اور آپ کا وزیر ہوں گا"۔

حضورؐ نے علیؑ کی پشتِ گردن پر ہاتھ رکھ کر ایک طمانیت کا اظہار کیا اور کہا "یہ میرا بھائی، میرا وصی اور خلیفہ ہے، اس کی سنو اور اطاعت قبول کرو"۔

اس پر لوگ تمسخر کرتے ہوئے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ابوطالب سے کہنے لگے "تمہیں حکم ہوا ہے کہ بیٹے کی بات سنو اور اطاعت کرو"۔

ہر مؤرخ نے اس کی تفصیل اسی طرح لکھی ہے کہ آلِ عبدالمطلب کوئی اثر قبول کئے بغیر جھیل گئی۔

اِس کے بعد آنحضرتؐ سے دشمنی اور توہین کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ابوطالب کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔

مورخین نے ایمانِ ابوطالب کے متعلق جو بھی لکھا ہو لیکن اس کی شہادت ضرور دی کہ بھتیجے کی حفاظت میں انہوں نے کبھی اپنے بیٹوں کی بھی پرواہ نہیں کی بچپن میں جہاں جاتے، انگلی پکڑ کر ساتھ لے جاتے، رات بستر پر اپنے پاس لٹاتے اور حتی الامکان آپ کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب انجانے دشمنوں کا خطرہ تھا لیکن اب تو دشمن بھی کھل کر سامنے آگئے تھے لہذا ابوطالب زیادہ محتاط ہو گئے اور یہ احتیاط اس لئے بھی بڑھ گئی کہ آنحضرتؐ کی تبلیغی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں پھر بھی قریش کی ہر مخالفت کا جواب آپ بڑی استقامت اور تحمل سے دیتے۔ یہ مساعی عام سطح پر تو اب تک کامیاب نہ تھیں مگر قریبی کچھ لوگوں نے اثر ضرور قبول کیا تھا۔

"رسولِ عربی کی داستانِ حیات کا یہ ایک وصفِ جمیل ہے جو آپ کے صدق خلوص، آپ کی تعلیمات کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ پر آپ کے راسخ یقین و ایمان پر پُر زور دلالت کرتا ہے کہ آپ کے سب سے قریبی رشتہ دار یعنی آپ کی بیوی اور چچیرے بھائی اور آپ کے گہرے دوست آپ کی رسالت کی سچائی اور آپ کے مبعوث من اللہ ہونے پر یقین لائے"۔

"اگر ان لوگوں کو، جو شریف النفس اور عقل مند تھے اور گلیلی کے ماہی گیروں سے کسی صورت کم تعلیم یافتہ نہ تھے، معلم اسلام میں دُنیا پرستی، فریب کاری یا ضعفِ ایمان کا شائبہ تک نظر آتا تو اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے بارے میں آپ کی تمام اُمیدیں ایک لمحے کے اندر خاک میں مِل جاتیں"۔ (۱۹)

بہرطور اب اسلام کا مرکزی نقطہ پھیل کر دائرے کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا اور اس میں بہت سے لوگ داخل ہو گئے تھے۔ ورقہ بن نوفل کا اسلام ثبوت کا محتاج ہے۔ علیؑ اللہ کی طرف سے امامت کے لئے منصوص تھے۔ پہلی خاتون، جنھوں نے اسلام قبول کیا، جنابِ خدیجہ تھیں۔ اس کے بعد زید بن حارثہ، عبداللہ بن ابوقحافہ المعروف بہ ابوبکر وغیرہ مشرف بہ اسلام ہوئے پھر یہ تعداد چالیس تک پہنچ گئی۔ جن میں سلمان، ابوذر، مقداد، خباب، جابر، ابوسعید خدری، زید بن ارقم، عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص فاطمہ بنت خطاب، عثمان بن مظعون، عبداللہ بن مسعود، سعید بن زید وغیرہ شامل تھے۔ آخر ایک روز قریش وفد کی شکل میں ابوطالب کے پاس آئے اور ابوطالب نے بھتیجے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ چچا پر اتنا بار نہ ڈالو جس کو وہ اٹھا نہ سکے۔ اس پر آپ آبدیدہ ہو گئے اور ابوطالب نے سامی نسل کی مردانہ شان سے کہہ دیا کہ وہ ہر صورت میں اپنے بھتیجے کے ساتھ ہیں۔

قریش کا دوسرا حربہ مال و دولت، عزت و وجاہت کی پیش کش تھی جس کا جواب حضور کی طرف سے یہ دیا گیا کہ ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ دیا جائے تب بھی وہ اپنے فریضے سے دست کش نہیں ہو سکتے ابوطالب کا اوّل دن سے ایک فیصلہ تھا۔ انہیں محمدؐ بن عبداللہ کی سپر بن کر رہنا تھا مگر قریش سے رابطہ رہنے کے سبب وہ براہِ راست حملے کو روکنے کی خاطر درمیانی رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور مصلحتِ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا۔

لوگ راستے میں کانٹے بچھا دیتے، نماز پڑھتے وقت پشت پر کوڑا پھینک دیتے مگر فوراً موقع سے ٹل جاتے کہ کہیں ابوطالب نہ آجائیں۔ ایک دن عقبہ بن معیط نے نماز پڑھتے وقت گردن میں چادر ڈال کر گھسیٹا تو آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ اس طرح نت نئے مظالم ڈھائے جاتے رہے پھر بھی معلّمِ اسلام لوگوں کو توحید کی طرف بلاتا ہی رہا اور اپنا مقصدِ تخلیق پورا کرتا رہا۔ ہر زہ سرائی کرنا

اور بے ہودگی سے پیش آنا تو کفار کا معمول بن گیا تھا لیکن ایک طرف وہ اپنے مسلک میں سخت سے سخت تر ہوتے جا رہے تھے، دوسری طرف پیغمبر کی صداقت اور حقانیت تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی جس میں آخر عمر ابن خطاب بھی شامل ہو گئے۔

پھر قریش کے بعض لوگ محمدؐ دشمنی میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے خون خرابے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان میں ابوسفیان، ابولہب وغیرہ پیش پیش تھے۔ ایک بار کوہِ صفا پر ابوجہل نے حضورؐ کو بہت سخت دشنست کہا۔ حمزہ کو خبر ہوئی تو طیش میں اس کو ڈھونڈھنے کیلئے نکلے نواحِ کعبہ میں وہ ہاتھ آ گیا تو حمزہ نے کمان اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ ابوجہل کا سر پھٹ گیا۔ اس کے بعد ہی وہ حضورؐ کی خدمت میں آ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

قریش کی ریشہ دوانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ان کے جواب میں مسلمان بھی دینِ حق کے لئے جانوں کی بازی لگانے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک دن حضورؐ نے نماز کے بعد حرم میں تبلیغ شروع کی تو کفار آپ پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمانوں نے آپ کو بچانے کی کوشش کی تو حارث بن ابی ہالہ اتنے زخمی ہوئے کہ درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے (۵ بعثت) خدا کی راہ میں مسلمانوں کی یہ پہلی قربانی تھی۔

ہجرتِ حبشہ

اس تشدد کے باوجود مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی مگر مکہ اب ان کے لئے محفوظ نہ رہا تھا اس لئے آنحضرتؐ کی مرضی سے مسلمانوں کا ایک قافلہ حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا جس کے سربراہ جعفر طیارؑ تھے۔ قریش بھی غافل نہ تھے۔ انہوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیع کو تحائف لے کر شاہ نجاشی کے پاس بھیج دیا۔ حبشہ کے دربار میں جعفر طیارؑ سے ان کا مناظرہ ہوا، اور جناب جعفر طیارؑ نے رسولِ اسلام کا تعارف ایسے الفاظ میں کرایا کہ نجاشی بہت متاثر ہوا۔ قریش کے سفیروں کو منہ کی کھانا پڑی اور مسلمان کئی سال حبشہ میں رہ کر واپس ہوئے تو

جنگ خیبر سر ہو چکی تھی۔

جنابِ خدیجہ بھی تبلیغِ اسلام میں اپنے عظیم المرتبت شوہر سے پیچھے نہ تھیں وہ عورتوں سے اسلام کی حقانیت بیان کرتیں اور کسی حد تک انہیں متاثر کرتیں۔ اب تک آپ کے دو بیٹے قاسم اور عبداللہ پیدا ہوئے تھے مگر دونوں انتقال کر گئے تھے ابراہیم بعد میں ماریہ قبطیہ سے پیدا ہوئے مگر وہ بھی وفات پا گئے، لہذا قریش حضورؐ کو ابتر کہتے تھے، آخر خدا نے کفار کا منہ بند کر دیا اور ۲۰ جمادی الثانی ۵ بعثت کو چاند سی بیٹی عطا کی جس کا نام فاطمہ رکھا گیا۔ حضورؐ کی مسرت بیان کی محتاج نہیں مگر وہ اس کا لطف نہ اٹھا سکتے۔ ہر طرف سے بے رحم دشمنوں کا نرغہ، سوتے جاگتے جان کا خطرہ، لہذا کچھ دنوں بعد آپ بھی اپنے باقی اصحاب کو لے کر کوہ صفا پر ارقم بن ابی ارقمؓ کے مکان میں منتقل ہو گئے اور وہاں سے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔

شعب ابی طالب

بت پرست قریش بھی اپنے عقیدے میں اتنے راسخ تھے کہ حضور سے عداوت کو اپنا ایمان بنا لیا تھا۔ انہوں نے ایک جماعت کے ساتھ پھر ابو طالب کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ان سے کہا کہ وہ محمدؐ کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ ان کا مقاطعہ کر دیا جائے گا۔ کہنے والوں میں مکّے کے عمائدین بھی شامل تھے۔ ابوجہل، شیبہ، عتبہ نضر، عاص اور عقبہ بن ابی معیط۔ ابو طالب کوئی سخت جواب دینا چاہتے تھے تاہم انہوں نے مصلحتاً بڑی نرمی سے ٹال دیا مگر چند روز کے وقفے سے وہ پھر آنحضرتؐ کے قتل پر تیار ہو کر آ گئے اور ابو طالب نے کہہ دیا کہ اگر ان کی طرف سے محمدؐ کو ایک کانٹا بھی چبھ گیا تو وہ ان سب کو ہلاک کر دیں گے۔ اس پر ہر ایک غضبناک ہو گیا، سب نے مل کر بنی مطلب کے مقاطعہ کے لئے ایک عہد نامہ مرتب کیا اور اس کو کعبے میں لٹکا دیا۔ ابو طالب آنحضرتؐ کی حفاظت کے لئے تقریباً چالیس افرادِ خاندان کو لے کر محرم ۷ بعثت میں شعب کے اندر چلے گئے، جس پر

حملہ کرنا اگرچہ آسان نہ تھا پھر بھی قریش نے قدرے فاصلہ سے اس کو گھیرے میں لے لیا۔

کفارِ قریش کو جانی دشمنی تو ان لوگوں سے تھی جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا مسلمانوں کے دوستوں سے انہیں کوئی عداوت نہ تھی، ان کو تو وہ بخش دینے پر تیار تھے۔ ابوطالب بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے لیکن ابوطالب خود اس پر تیار ہوتے تو پہلے ہی دن بھتیجے کی روش سے دستبرداری کا اعلان کر دیتے اور بیٹے کو بھی محمدؐ کی تاسی سے روک دیتے مگر ابوطالب نے کبھی مخالفت میں زبان کو جنبش تک نہیں دی اور اپنی شریکِ زندگی فاطمہ بنتِ اسد کو بھی ٹوکا تک نہیں جو محمدؐ کے گرد پروانہ وار گھومتی رہتی تھیں بلکہ اس کے برعکس اپنے ہونٹوں پر مصلحت کا قفل ڈال کر منظرِ استحسان بیٹے اور بیوی کے عمل کو دیکھتے رہے۔

شعب میں ان کے ساتھ جو چالیس افراد نظر بند تھے، ان کے کھانے پینے کے ذمہ دار ابوطالب تھے۔ انہوں نے ایک مدت تک گزر بسر کا انتظام کر لیا تھا مگر نظر بندی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی اور نوبت فاقوں کی آ گئی۔ ابوطالب باہر نکلتے تو قریش سے تصادم کا خطرہ تھا پھر وہ کوئی شئے باہر سے اندر لانے بھی نہ پاتے کیونکہ محاصرہ سخت تھا۔ شعب کے اندر بنی عبدالمطلب شب و روز ہوشیار رہتے اور شعب کے باہر قریشی پہرہ دیتے، تاہم رشتے اور کنبے کے لوگ کچھ نہ کچھ سامان کسی نہ کسی طرح پہنچا ضرور دیتے تھے۔ ان ایام میں کسی دوست کی طرف سے مدد کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

شعب کی یہ آزمائش کہنے کو تو آنحضرتؐ کی تھی لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو آزمائش اس کی تھی جس نے آنحضرتؐ کی حفاظت کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ ابوطالب اتنے محتاط تھے کہ علیؑ اور محمدؐ کے لیٹنے کی جگہ روز رات کو بدل دیتے اور عموماً محمدؐ کے بستر پر علیؑ کو لٹا دیا کرتے تھے تاکہ قریش حملہ آور ہوں تو محمدؐ کے بجائے علیؑ کو، یعنی علیؑ کو کچھ ہو جاتا تو ابوطالب کو زیادہ پرواہ نہ ہوتی۔ ان کا نصب العین تو محمدؐ کو

بچانا تھا جس کی کوشش وہ دن رات کیا کرتے تھے۔

ان تمام احتیاطوں کے باوجود بنی ہاشم کے بچوں نے فاقوں پر فاقے کئے پتے اُبال اُبال کر کھائے، بھوک میں چیختے چلاتے رہے مگر ابو طالب نے ایک لحظے کے لئے بھی قریش کا مطالبہ مان لینے کا تصوّر تک نہیں کیا۔ یہ ابو طالب کی پامردی تھی جس سے دشمنوں میں بعض لوگوں کے دل پسیجے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر تین سال گزرنے کے بعد ایک دن ہشام بن عمر بن حرث نے بعض لوگوں سے کہا کہ اب ابو طالب کے بچوں کی تڑپ دیکھی نہیں جاتی۔ ابو جہل اور اس کی بیوی اُمّ جمیل نے مخالفت کی کہ انہیں اسی حال میں رہنے دیا جائے ——— ابو طالب دور سے انھیں باتیں کرتے دیکھ رہے تھے، وہ بڑھ کر آگئے اور بولے:۔

"تمہارے باہمی عہد نامے کو دیمک چاٹ گئی ہے اب اس پر صرف اللہ اور محمد الرسول اللہ کے نام رہ گئے ہیں۔"

ابو جہل نے تردید کی اور ابو طالب نے کہا۔

"مجھے میرے بھتیجے نے خبر دی ہے جو غلط نہیں ہو سکتی۔"

تصدیق کے لئے معاہدہ کعبے سے منگوا کر دیکھا گیا تو واقعی اس میں باہمی معاہدے کا ایک لفظ بھی باقی نہ رہا تھا۔ ہشام، زمعہ مطعم اور زبیر نے عہد نامے کو چاک کر ڈالا۔ اس طرح ظلم کا یہ دور ختم ہو گیا اور شعب ابی طالب کا حصار توڑ دیا گیا مگر قریش ایذا رسانی سے باز نہیں آئے۔ وہ مختلف طریقوں سے حضور کو پریشان کرتے رہے۔

۹ سنہ بعثت کو ابو جہل کچھ یہودیوں کو لے کر آیا اور آنحضرتؐ سے کہا کہ وہ نبوت کے دعویدار ہیں تو معجزہ دکھائیں اور چاند کو دو ٹکڑے کر دیں۔ چودھویں تاریخ تھی، آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ آنحضرت نے انگلی چاند کی طرف اُٹھا کر اس پر ایک خط دیا۔ معاً چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور الگ الگ ہو کر پھر آپس میں مل گئے مگر بداعتقاد ابو جہل کے دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح درپئے آزار رہا۔

جناب ابوطالب اور خدیجہ کی وفات

اعلانِ نبوت کے بعد سے سرورِ کائنات بڑے بڑے مصائب سے گزر چکے تھے مگر ابھی ان کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ شعب سے نکلنے کے ساڑھے آٹھ ماہ بعد ۸۶ سال کی عمر میں حضرت ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔ یہ آنحضرتؐ کے لئے اتنا عظیم سانحہ تھا کہ اس کا برداشت کرنا مشکل ہوگیا، اس پر غضب یہ ہوا کہ تین دن بعد جناب خدیجۃؑ الکبریٰ بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

خدیجۃ الکبریٰ صرف آنحضرت کی وفادار رفیقۂ حیات ہی نہ تھیں بلکہ محبوبہ بھی تھیں۔ عمر میں پندرہ سال بڑی ہونے کے باوجود حضورؐ کو اتنی عزیز تھیں کہ مدینے کی اطمینانی زندگی میں دوسری بیویوں کو دیکھ کر آنحضرتؐ قدم قدم پر خدیجہ کو یاد کرتے اور آپ پر ایک غم کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جس سے بعض بیویوں کو خدیجہ کے نام سے جلن پیدا ہو گئی تھی اور انہوں نے ماں کی قائم مقام بیٹی کے خلاف ایک محاذ بنا لیا تھا۔

خدیجہ کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ایک وقت وہ دکھائی دیتا ہے، جب خدیجہ کا عالیشان محل لونڈیوں اور غلاموں سے بھرا ہوا تھا۔ آپ کی ایک آواز پر دو دو چار چار کنیزیں دوڑ پڑتی تھیں۔ دولت اتنی تھی کہ ملیکۃ العرب کہلاتی تھیں پھر انہوں نے خود اپنے کو حضورؐ کی کنیزی میں دے دیا۔ اب دوسروں کو اپنی چشم و ابرو کا منتظر رکھنے کے بجائے آپ خود حضور کے چہرے کی طرف دیکھتی تھیں کہ وہ کسی بات کا اشارہ کریں تو خدیجہؑ اس کی تعمیل کر کے سعادت دارین حاصل کرلیں

خدیجہ کے مقابلے پر ناقابلِ ذکر دولت مند اور تھوڑی سی فراخ دلی دکھانے والے تاریخِ اسلام میں غنی کہلاتے ہیں مگر مورخ خدیجہؑ کا سرسری ذکر کر کے دوسری بیویوں کے جمال و شباب کا بیان کرنے لگتا ہے۔ پھر دل جلانے کے لئے خدیجہ کے بیوہ ہونے کا قصہ لے کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسری بیویوں کے کنوارپنے کا

تفاخر جتانے لگتا ہے وہ خدیجہ کے اِس شرف کو بھول جاتا ہے کہ رسُولؐ جب خدیجہ کو ملے تھے تو کنوارے تھے، دوسروں کو دو یا جو شوہر ملے۔ جہاں تک دولت اور ایثار کا تعلق ہے، اس کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ مکے نے کبھی خدیجہ کو ملیکۃ العرب کے روپ میں دیکھا تھا پھر وہ وقت بھی آیا کہ خدیجہ ایک غریب پیغمبر کی ادنیٰ کنیز کی شکل میں نظر آئیں۔ ان کی بے شمار دولت کا آخری سکہ بھی تبلیغ اسلام کے لئے خرچ ہوگیا تاہم خدیجہ مطمئن تھیں کہ وہ اور ان کا سب کچھ پیغمبر اور دینِ پیغمبر کے کام آگیا۔ دُنیا بلکہ کائنات کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور اسلام خدیجہ کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

اسلام کے دوسرے عظیم محسن حضرت ابو طالب ہیں۔ اکثر صحابہ کے آبا کفر کی موت مرے تھے لہٰذا علی کی فضیلت کو کم کرنے کے لئے یہ افسانہ تراش لیا گیا کہ ابو طالب نے آخر وقت تک کلمہ نہیں پڑھا۔ انصاف اگر دُنیا سے ناپید نہیں ہوگیا ہے تو سوچا جا سکتا ہے کہ ایک شخص، جس نے دکھانے کو اسلام قبول کرلیا لیکن اندر ہی اندر دین کی جڑیں کاٹتا رہا، دوسرا وہ جس نے صرف رسُولؐ کو بچانے کی خاطر کفار سے رابطہ رکھا اور بتقاضائے مصلحت اپنے ایمان کا کھُلا ہوا اعلان نہیں کیا، اِن دونوں میں سے کون بہتر ہے، کس نے مہتم بالشان خدمات انجام دیں؟ علی کے عناد میں اگر ابو طالب کا کسی سے مقابلہ کیا جائے تو سرکار کی پہلی قصیدہ خوانی کا شرف کسی طرح ان سے چھینا نہیں جا سکتا، وہ رہتی دنیا تک پہلے نعت خواں کہلائیں گے۔

اِس موقع پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اگر حضرت ابوطالب صرف زبان سے اعلان کردیتے کہ وہ مسلمان ہوگئے ہیں تو کیا مظاہرہ ایمان کے بعد عملی طور پر وہ ایسا کردار ادا کرسکتے جس کی بدولت انہوں نے جیتے جی بانیٔ اسلام پر آنچ نہیں آنے دی ~~ستم~~ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ عبداللہ ابنِ عباس اگر یہ کہتے ہیں کہ نزع کے عالم میں ابو طالب کلمہ پڑھ رہے تھے تو انہیں جھوٹا ٹھہرایا جاتا ہے کہ ان کی عمر

۱۳، ۱۴ سال تھی، وہ بالغ نہیں ہوئے تھے لہٰذا تصدیق معتبر نہیں۔ ابوطالب کو غیر مسلم ثابت کرنے کے لئے آخر اتنا اصرار کیوں ہے؟

وہ ابوطالب، اسلام کی رگ رگ میں جس کا خون دوڑ رہا ہے، جس کی اولاد دینِ حق کے لئے ہر دور میں سروں کی بازی لگاتی رہی، اگر اس کو عمل سے مسلمان اور قول سے موحد ہی ثابت کر دیا جائے تو ان احسانات میں کوئی کمی تو نہیں ہو جائے گی جو ابوطالب اور ان کی اولاد نے دینِ حق پر کئے ہیں۔ ہمارا مسلک اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ ہم تو ابوطالب کو اسلام کا محسن اور مسلمان سمجھتے ہیں جن کے دین کی قسم کھائی جا سکتی ہے اور ہم جن کو صحیح معنی میں مومنِ قریش سمجھتے ہیں۔ ان کی مصلحت کو تقیہ کی ایک شکل بھی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ خود انہیں نہیں تو ان کے بھتیجے کو جان کے خطرات لاحق تھے۔

خود رسولِ اکرم بھی ابوطالب سے اِس قدر مانوس تھے کہ ان کی وفات پر اندوہ کی تصویر بن گئے اور پھر تین روز بعد جب خدیجہ کا انتقال ہوا تو آپ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ آپ نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا، اور سنہ ۱۰ بعثت کو عام الحزن کا نام دے دیا۔

سفرِ طائف

خدیجہ اور ابوطالب کے بعد آنحضرتؐ مادی طور پر بے سہارا ہو گئے تھے کچھ دنوں تک آپ نے گوشہ نشینی کو طول دیا پھر طائف کے عازم ہوئے کیونکہ مکے میں کفارِ قریش کا غلبہ بڑھ گیا تھا اور ابوطالب کی رکاوٹ سامنے سے ہٹتے ہی وہ بے دھڑک حملے کرنے پر اتر آئے تھے۔ یہ سفر آپ نے نہایت خاموشی سے کیا اور صرف اپنے آزاد غلام زید بن حارثہ کو ساتھ لیا لیکن بنی ثقیف نے مکے والوں سے زیادہ بدسلوکی کی، آپ پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ لہولہان ہو گئے اور پاؤں بھی دوڑتے دوڑتے زخمی ہو گئے۔ ـــــ چھ سات سو سال پہلے یہودنے حضرت عیسٰی کا جو حال کیا تھا، طائف میں اسی منظر کو دہرایا گیا اور آپ نے مکے

کے قریب بطن نخلہ پہنچ کر قرار لیا۔

زید بن حارثہ خفیہ طور پر مکہ پہنچے اور جب مطعم بن عدی نے حمایت کا وعدہ کرلیا تو زید واپس آکر آپؐ کو مکہ لے گئے۔

حضرت عائشہ زوجۂ رسولؐ

اللہ کے بھیجے ہوئے سفیروں کو اکثر ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ آنحضرت بھی انہیں آزمائشوں سے گزر رہے تھے مگر انہیں بہرطور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنا تھا اور خداشناسی کے لئے ہر وہ راستہ اختیار کرنا تھا جس سے وہ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا سکتے۔ اس لئے آپ نے مختلف قبیلوں سے رابطہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا، طے کیا کہ بیشتر قبائل کی لڑکیوں کو اپنے حرم میں داخل کریں گے اور ایک رشتہ پیدا ہوتے پر اہلِ قبیلہ کی اکثریت تک پہنچ کر انہیں متاثر کرینگے ۱۰ سنہ بعثت میں سب سے پہلا عقد آپ نے "سودہؓ بنتِ زمعہ" سے کیا پھر ابوبکرؓ کی خواہش پر عائشہؓ داخلِ حرم ہوئیں۔ جن کی عمر اس وقت چھ سال تھی تین سال بعد آپ بالغ ہوئیں اور بیوی کا کردار ادا کرسکیں۔

آنحضرتؐ کی نظر میں بیویوں کے لئے صورت و شکل اور سن و سال کی کوئی قید نہ تھی۔ وہ ہر بے سہارا کا سہارا بننے کو تیار تھے اور ہر اس عورت کو زوجہ کی حیثیت سے قبول کرنا چاہتے تھے جس کے ذریعہ وہ اس کے رشتہ داروں تک پہنچ سکتے اور حلقۂ اسلام کو وسعت دے سکتے۔

آپ کا یہ نظریہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا اور پیغمبرِ اسلام کی ہم رشتگی سے خود اسلام کا رشتہ وسیع ہونے لگا لیکن دوسری طرف اُم المومنین عائشہ کی برتری ثابت کرنے کے لئے ایسی ایسی حدیثیں گھڑ لی گئیں جن سے آنحضرتؐ کے وقارِ نبوت پر ایسی ضرب پڑی کہ آپ کی سیرت ہی بدل کر رہ گئی۔ قدرت نے تو دنیا میں اصلابِ طاہرہ کا التزام کیا تھا مگر امت نے ایک خاص مقصد کی خاطر آپ کی وہ سیرت پیش کی ہے جس سے ایک اولوالعزم پیغمبر نعوذ باللہ جنسی مریض معلوم ہوتا ہے۔

"تاریخ احمدی نے بحوالہ ابوالفدا جناب عائشہ سے ایک روایت نقل کی ہے
"ایک دن جناب رسالت مآب میرے یہاں تشریف لائے۔ میں دردِ سر
کی شدت میں وارا سا کہہ کر کراہ رہی تھی۔ آنحضرتؐ نے میری حالت دیکھ کر فرمایا
اگر تم مجھ سے پہلے مرجاؤ، تو تم کو کیا ضرر ہے، تمہاری تجہیز و تکفین کا کفیل ہوں گا
کفن دے کر اور نماز پڑھ کر تم کو دفن کر دوں گا۔ یہ سُن کر میں نے کہا، واللہ میرا گمان
تو یہ ہے کہ میری تجہیز و تکفین سے فارغ ہوتے ہی، آپ میرے گھر میں کسی دوسری
بیوی سے ہم صحبت ہوں گے۔"

جنسیات کے سلسلے میں ام المومنین سے یہ روایت بھی ہے کہ "میری ماں
مجھے ککڑی کھلاتی تھیں تاکہ میں زفاف کے قابل ہو جاؤں۔"

خدا کا محبوب ترین رسولؐ جس کی خلقت صرف عرفانِ باری کے لئے ہوئی تھی
اس کے اسلوب زندگی کے محاسن کو سمجھتے ہوئے بھی مسلمان راوی اس کے بعض مشاغل
اور بتاتے ہیں۔

سحر بن سعد سے روایت ہے کہ "عرب کی ایک عورت رسول اللہؐ کے
لئے لائی گئی جو سر سے چادر اوڑھے ہوتے تھی۔ آنحضرتؐ نے اس سے رجوع کیا تو
اس نے کہا۔ میں اللہ کے نام پر تم سے پناہ مانگتی ہوں" آپ نے اسکو چھوڑ دیا (۲۰)

ابواسیب سے روایت ہے کہ ایک دن میں رسولؐ اللہ
کے ساتھ ایک جگہ گیا۔ ایک عورت جونیہ کو کچھ لوگ لائے
آپ نے اس کی طرف سبقت کی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ
گئی اور جب آپ نے اُس سے اپنے کو قبول کرنے کی بات کی تو
اس نے اعوذ باللہ منک کہا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ (۲۰)

یہ روایات محمد بن اسمٰعیل بخاری کی منتخب روایتوں میں ہیں۔ اِس طرح کی
کتنی ہی روائیتیں بخاری، مسلم اور دیگر کتبِ احادیث میں موجود ہیں، جن سے
رسولِ اللہ کا ایک خاص کردار واضح ہوتا ہے اور وہ جذبۂ بشری سے مغلوب ایک

ایسے انسان دکھائی دیتے ہیں جن کی روحانیت مشتبہ نظر آتی ہے۔

نتیجہ وہی نکلتا ہے جو وضع احادیث کا حاصل ہے کہ چونکہ آپ طبعاً ایسی عورتوں کے شائق تھے لہذا سب سے زیادہ جوان عورت کی طرف آپ کا التفات زیادہ تھا اور کوئی دوسری بیوی آپ کو حضرت عائشہ سے زیادہ پسند نہ تھی یہی وہ روایتیں ہیں جن کو بنیاد بنا کر کسی نے رنگیلا رسول لکھ دیا اور کسی نے صاحب عصمت پیغمبر پر نفس پروری کے الزامات تراش لیے۔ آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی ہمارا مرکزِ عقیدت ہے۔ ہم اِن روایتوں کے تاریک پہلو نظر انداز کر جائیں گے لیکن جو لوگ حضور کو ایک عام آدمی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ یہ روایتیں صرف ایک عورت کی برتری ثابت کرنے کے لئے گھڑی گئی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے پیغمبر میں خواہشاتِ نفسانی کا شائبہ تک نہ تھا، وہ تو ایک پاک و صاف بشر کی نظیر تھا جو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، ہر حالت میں قابلِ تقلید تھا جس کا ایک رُخ عیسٰیؑ ابن مریم اپنی طاہر و مطہر زندگی سے پیش کر چکے تھے۔

مکے کے حالات اب کسی حد تک معتدل تھے۔ مطعم بن عدی نے اعلان کیا تھا کہ محمدؐ اس کی پناہ میں ہیں لہذا قریش کے تشدّد کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی تھی جس سے اشاعتِ اسلام کو فائدہ ہوا اور ایک کثیر تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

شبِ معراج

انسانی جسم کا سفرِ آسمانی محیّر العقول ہے لیکن صرف ان لوگوں کے لئے جو حضورؐ کو اپنے مادّی تصور میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا نبی تو ایک پیکرِ نوری تھا جس نے ہمیں اپنے سے مانوس کرنے کے لئے جسم کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور اِسی لئے آپ کے جسم میں سایہ بھی نہ تھا۔ سورج کی شعاعیں قالبِ نورانی کو پار کر کے دوسری طرف گزر جاتیں۔ درمیان میں کوئی رکاوٹ تھی ہی نہیں تو پرتو کس چیز کا پڑتا۔ اِس وصف کے ساتھ ساتھ پاؤں میں ایسی آہٹ بھی نہ تھی جو عام آدمیوں کے پاؤں میں ہوتی ہے پھر بھی آپ ہم ہی جیسے تھے، صرف دیکھنے میں لہذا لوگوں کو بے تکلفی سے آپ

کی باتوں پر دھیان دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی۔ حضرت جبرئیل خالقِ حقیقی کی طرف سے اب بھی ہدایات لے کر آرہے تھے۔ آپ ان تمام آیات اور ان کے مفاہیم کو نزدیک و دُور کے اہل اسلام تک پہنچا رہے تھے۔ ۲۷ر رجب ۱۲ بعثت کی شب جبرئیلؑ آئے تو نور کا ایک گھوڑا ان کے ساتھ تھا۔ جبرئیل نے فرمایا کہ خداوند قدوس نے یاد فرمایا ہے۔ آنحضرتؐ بلا کسی جھجک کے گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ اصطلاحاً جس کو براق کہا جاتا ہے۔

جبرئیل براق کی لگام تھامے ہوئے تھے اور براق فضائے بسیط پر پرواز کر رہا تھا۔ گھوڑا بیت المقدس پہنچ کر ٹھہرا اور پھر منازلِ آسمانی طے کرنے لگا ایک مقام پر پہنچ کر براق رُک گیا اور جبرئیلؑ نے کہا کہ اب اگر وہ آگے جائیں گے تو ان کے پر جل جائیں گے۔ یہاں سے آپ ایک نوری تخت پر بیٹھے۔ آگے نہ پھیلی ہوئی فضا تھی اور نہ زمین و آسمان کا کوئی پتہ نشان، صرف ایک نور کا عالم تھا اور اس میں رفرف نام کا تختِ نور بہا چلا جا رہا تھا۔ منزلِ قابِ قوسین پر پہنچ کر آپ تخت سے اترے اور پاپوش اُتار کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا مگر آپ کو ہدایت ہوئی کہ اسی طرح آگے بڑھیں۔ آپ بڑھتے چلے گئے۔ سامنے ایک پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پیچھے سے آواز آرہی تھی۔ یہ آواز اس بچے سے ملتی جلتی تھی جس نے دعوتِ ذی العشیرہ میں آپ کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ پھر ایک ہاتھ برآمد ہوا جو آپ کی گود کے پالے علیؑ ابنِ ابی طالب کے ہاتھ جیسا تھا، اسی لئے علی کو یداللہ بھی کہا جاتا ہے۔

معراج میں کیا باتیں ہوئیں؟ یہ تو ختم المرسلین جانتے ہوں گے یا خود باری تعالیٰ۔ "کیا کس نے کہا، کیا کس نے سنا، یہ بات زمانہ کیا جانے"۔ ہم کو تو بس یہی معلوم ہے کہ حضوؐر پانچ وقت کی نمازوں کا تحفہ لے کر فرش پر واپس آئے۔

اس مقام پر یہ نکتہ فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگ معراجِ جسمانی کے قائل نہیں ہیں۔ حضور صرف انہیں کے لئے براق پر سوار ہو کر گئے تھے اور تختِ رفرف

قادرِ مطلق نے محض اِس لئے بھیجا تھا کہ وہ ہر طرح کے جسم کو لے کر اُڑ سکتا تھا۔ ورنہ خود جسم نوری میں ہوا کے دوش پر پرواز کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور خلّاقِ کائنات بھی چاہتا تو فضائے بسیط کو سمٹنے کا حکم دے دیتا اور حضور آناً فاناً پیدا کرنے والے کے حضور پہنچ جاتے۔ براق و رفرف کا التزام ایک تو حضورؐ کی منزلت دکھانے کے لئے کیا گیا تھا، دوسرے اس لئے بھی کہ آنحضرت کو اپنا سا بشر سمجھنے والے بھی قائل ہو جائیں کہ آپ ایسی سواری پر گئے تھے جو آسمان پر پرواز کر سکتی تھی۔

ہماری تحقیق میں یہ سفر اُمِّ ہانی کے گھر سے ہوا تھا اور اس میں اتنی دیر لگی کہ وہ گئے تھے تو دروازے کی زنجیر ہلنا شروع ہوئی تھی اور واپس آئے تو زنجیر کا ہلنا بند ہو رہا تھا۔ اِسی لئے بعض لوگ معراجِ روحانی کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

بیعتِ عقبہ

یہ وہ زمانہ تھا جب تبلیغِ دین اپنے عروج پر تھی مگر قریش ابھی اپنا کام کر رہے تھے، آنحضرت جہاں بھی جاتے، ابوجہل پیچھے پیچھے لگا رہتا اور راہ پر آتے ہوئے لوگوں کو بھڑکاتا رہتا کہ حضورؐ کا دماغ چل گیا ہے ـــــ پچھلے برس مدینے کے چھ آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور دین کی دولت لے کر واپس گئے تھے انھوں نے مزید کچھ آدمیوں کو ہموار کیا۔ ان کو لے کر وہ اسی مقام پر آ کر ملے جہاں حضورؐ نے ان کو ایمان کی روشنی دکھائی تھی۔ یہ پہلی بیعتِ عقبہ تھی جس کے بعد آنحضرت نے مصعب ابن عمیر کو ان کے ساتھ کیا۔ اِن سب نے مل کر مدینے میں اشاعتِ دین کے لئے بڑی سرگرمی دکھائی اور کافی آدمیوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا

> "دو سال بعد کوئی پچھتر افراد کے ایک وفد نے آپ کو دعوت دی کہ یثرب کو اپنا وطن بنا لیں۔ انہیں اُمید تھی کہ آپ کا وہاں آنا اوس خزرج کے باہمی مجادلے کو صلح سے بدل دے گا۔ یثرب میں یہودی بھی آنے والے مسیحا کے منتظر تھے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بت پرست ہم وطنوں کو پیغمبرِ خدا جیسے کسی نبی کے استقبال پر تیار

کر چکے تھے"۔ (۲۱)

تاریخ نے اِس معاہدے کو دوسری بیعتِ عقبہ کا نام دیا ہے جس کے بعد آنحضرت کے منتخب بارہ نقیبوں نے مدینہ واپس آکر زمین ہموار کرنا شروع کر دی۔

ہجرتِ مدینہ

مکے میں اب پہلے جیسے خطرات نہ رہے تھے مگر مدینہ زیادہ محفوظ تھا اور وہاں سے اشاعتِ اسلام کے لئے نئے حلقے ملنے کا بھی امکان تھا، لہٰذا آنحضرتؐ نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا اور مسلمان آہستہ آہستہ کسی کو بتائے بغیر مکے سے مدینہ منتقل ہونے لگے۔ خود آنحضرت بھی ایک منصوبہ بنا چکے تھے جس کا کسی کو علم نہ تھا مگر قریش کو نہ جانے کیسے خبر لگ گئی۔ وہ "دارالندوہ" میں جمع ہوئے، ہر قبیلے کے چیدہ چیدہ آدمیوں کو لیا گیا اور سب نے مل کر حضور کے مکان کو گھیر لیا۔

"یہی وہ رات تھی جب آنحضرتؐ وطنِ عزیز کو خیرباد کہنے والے تھے۔ رات کی تاریکی پھیلتے ہی تلواروں کی جھنکار کانوں میں پڑنے لگی اور آنحضرتؐ صورتِ حال سے آگاہ ہوگئے۔ حضرت علیؑ کو آپ نے پہلے سے بُلا رکھا تھا۔ قاتلوں کی توجہ بستر پر مرکوز رکھنے کی خاطر آپ نے اپنی سبز چادر حضرت علی کو اوڑھا دی، انہیں اپنے بستر پر لِٹا دیا اور خود حضرت داؤد کی طرح کھڑکی میں سے باہر نکل گئے" (۲۲)

" اصل سبب حضرت علیؑ کو چھوڑنے کا یہ تھا کہ کفارِ قریش کی چند امانتیں حضورؐ کے پاس رکھی ہوئی تھیں چونکہ وہ باعتقادِ دیانت اور بمشاہدۂ امانت حضورؐ کے پاس امانتیں رکھا کرتے تھے اور وہ حضورؐ کو "امین وصادق" کہا کرتے تھے اس بنا پر حضورؐ نے حضرت علیؑ مرتضیٰ کو اپنے بسترِ استراحت پر لِٹایا اور اپنی خاص چادرِ مبارک اُڑھا کر انھیں سُلایا لہٰذا حضرت علیؑ مرتضیٰ کرم اللہ وجہٗ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں

اپنی جان کو فدا کیا۔" (۲۳)

یہ تو ہے محدث دہلوی کی رائے، ہمارے عقیدہ میں رسولؐ کے بستر پر صرف امام لیٹ سکتا تھا اور اسی میں رسولؐ کی مشابہت پیدا ہو سکتی تھی لہٰذا حضورؐ نے پہلے ہی علی سے کہہ دیا تھا کہ رات وہ دہیں آکر گزاریں چنانچہ حضرت علی اپنا نفس اللہ کے ہاتھ بیچ کر اس کے نبیؐ کے بستر پر اس شان سے سوئے کہ ایسی نیند زندگی بھر کبھی نہ آئی تھی۔ ادھر قریش رات بھر جھانک جھانک کر دیکھتے رہے اور سوتے ہوئے علی کو رسول ہی سمجھتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضورؐ ایک مٹھی خاک لے کر باہر نکلے تھے۔ وہ انہوں نے قریش کی طرف اُڑا دی گویا ان کی آنکھوں میں جھونک دی اور صاف نکلے چلے گئے۔ تھوڑی دُور چلے ہوں گے کہ پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ آپ نے گھوم کر دیکھا تو حضرت ابوبکر تھے، آپ ٹھہر گئے۔ پھر حضرت ابوبکر کے گھر کی طرف گئے۔ وہاں حضور نے ایک اونٹنی حضرت ابوبکر سے خریدی۔ اُس پر سوار ہوئے۔ حضرت ابوبکر خود اپنی اونٹنی پر بیٹھے اور دونوں نہایت خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

صبح ہوتے کفارِ قریش نے گھر میں داخل ہو کر چادر ہٹائی تو رسولؐ کے بجائے علیؑ کو پایا اور سوال کیا کہ محمدؐ کہاں ہیں؟ علیؑ نے بڑی متانت سے جواب دے دیا "تم لوگ تو اس طرح پوچھ رہے ہو، جیسے انہیں میرے حوالے کر گئے تھے"! اِس پر دشمن بہت غضبناک ہوئے، مگر علیؑ کا ہاتھ قبضۂ شمشیر کی طرف بڑھتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ کیونکہ انہیں فوراً حضورؐ کے تعاقب میں جانا تھا۔

غارِ ثور

کفارِ قریش کو آنحضرتؐ کے بچ نکلنے پر بہت غصہ تھا۔ انہوں نے زندہ یا مردہ پکڑ لانے والے کے لئے سو اونٹوں کا اعلان کر دیا اور کئی آدمی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے آنحضرتؐ، حضرت ابوبکر کے ساتھ مکّے سے ڈھائی تین میل گئے ہوں گے کہ انہیں غارِ ثور نظر آیا۔ دونوں تعاقب میں آنے والوں سے بچنے کے لئے اس میں

داخل ہوگئے اور ان کے داخلے کے بعد ہی مکڑی نے اپنا جال غار کے دہانے پر بُن دیا دہانے سے مِلا ہوا ایک ببول کا درخت تھا۔ اس پر کبوتری نے انڈے دے دیئے جس سے یہ شُبہ ختم ہوگیا کہ اندر کوئی داخل ہوا ہے۔ اس اثناء میں دشمن تلاش کرتے ہوئے دہانے تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر ان کی آہٹ پاکر رونے لگے۔ آپ نے سبب پوچھا تو کہا کہ دشمن اِس تعداد میں ہیں اور ہم دو ہی۔ آنحضرتؐ نے تسکین دی کہ نہیں، ہم تین ہیں، دو ہم ایک خدا، اس پر حضرت ابوبکر کو کچھ تسلّی ہوئی۔ بڑا خطرناک کام کیا تھا حضرت ابوبکر نے۔ رونے کی آواز کوئی سُن لیتا تو دونوں پکڑ لیئے جاتے!

۲ ربیع الاوّل سالہ بعثت کو یہ لوگ غار میں پہنچے تھے، ۵ ربیع الاوّل کو برآمد ہوئے۔ تین روز تک ایک روایت کے مطابق عبداللہ بن ابی بکر شب میں کھانا پہنچاتے رہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت علیؑ لوگوں کی نظروں سے بچ بچا کر کھانا لے جاتے رہے۔ غرض کہ ۵ ربیع الاوّل کو یہ لوگ باہر نکلے اور مدینہ کی طرف چلنے ہی والے تھے کہ سراقہ بن جعشم نے اُنہیں دیکھ لیا مگر قریب پہنچتے ہی اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا تو وہ گڑگڑانے لگا۔ آنحضرت نے اس کو معاف کر دیا۔ سراقہ واپس ہوگیا اور حضور مدینے کی طرف چل پڑے۔ اس عرصے میں عبداللہ بن اریقط اور عامر بن فہیرہ بھی ان سے آملے اور چاروں ایک ساتھ مدینے کے راہی ہوگئے۔

مدینہ: آنحضرت کا وطن

اہل مدینہ سراپا خیر مقدم بنے ہوئے حضورؐ کے منتظر تھے۔ شہر سے دو میل پر ۱۲ ربیع الاوّل دوشنبہ کو قبا کے مقام پر آپ کا اونٹ چلتے چلتے رُک گیا اور آپ اسی کو مشیّت ایزدی سمجھ کر اُتر پڑے۔ مدینے کے مسلمانوں نے تکبیر کے نعرے بلند کئے اور مدینے کی تاریخ کا ایک نیا باب وا ہوگیا۔

یہاں آپؐ نے اسلام کی پہلی مسجد، مسجدِ قبا کی بنیاد ڈالی۔ حضرت علیؑ کے

والوں کی امانتیں واپس کرکے اِسی مقام پر حضورؐ سے آکر ملے۔ آپ خواتین اور بچوں کو ناقوں پر لے کر پا پیادہ آئے تھے۔ پیروں کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا، جس کو دیکھ کر آنحضرت رونے لگے اور اپنے مُنہ کا لعاب لگا کر زخموں کو اچھا کیا۔

اِس مقام پر چار روز قیام کرکے آپ عازم مدینہ ہوئے۔ خواہش تو ہر ایک کی یہی تھی کہ حضور اس کے مہمان بنیں مگر یہ شرف ابو ایوبؓ انصاری کو حاصل ہوا ۱۶ ربیع الاوّل جمعہ کو آپ نے محلہ بنی سالم میں پہلی نمازِ جمعہ پڑھائی۔ آگے چل کر اِسی جگہ مسجدِ نبوی تعمیر ہوئی۔ اس میں حجروں کے ساتھ ساتھ ایک مسقف چبوترہ بھی بنایا گیا جو صفہ کہلایا، جہاں نومسلم قیام کرتے تھے اور صدقے اور خیرات کی رقوم سے ان کی پرورش ہوتی تھی۔ تعمیرِ مسجد مکمل ہوتے پر اوقاتِ نماز اور ان کی رکعتوں کا تعین ہوا جو مجموعی طور پر سترہ قرار پائیں۔

ہماری تحقیق میں سنِ ہجری حضرت علیؑ کی تحریک پر جاری ہوا اور حکمِ رسوؐل سے حضرت علیؑ نے حضرت بلالؓ کو اذان کی تعلیم دی اور وہ اسلام کے پہلے مؤذن مقرر ہوئے۔

بھائی چارہ

مدینے کے حامیان و ناصرانِ اسلام رہتی دُنیا تک ضرب المثل رہیں گے کہ انہوں نے خدا کے آخری ہادی کو اس وقت پناہ دی جب اسلاف کے وطن میں اُن پر عرصۂ حیات تنگ تھا ——— مہاجرین اہلِ مدینہ کے لیے اجنبی نہیں تو نئے ضرور تھے لہذا حضورؐ نے تجویز فرمایا کہ ایک کو دوسرے کا بھائی بنا دیا جائے چنانچہ ابوبکر کو عمر کا، طلحہ کو زبیر کا، عثمان کو عبدالرحمٰن کا۔ حمزہ کو ابنِ حارثہ کا اور علی کو خود اپنا بھائی بنایا۔ اِس اخوت کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس میں مذاقِ طبیعت، انسانی فطرت اور اندازِ فکر کی بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ شاید اِسی لئے حضور نے حضرت علیؑ سے فرمایا تھا۔

"تم دنیا و آخرت دونوں میں میرے بھائی ہو"۔

عقد جناب فاطمہؑ

مدینے میں حضورؐ کو جب قدرے اطمینانی زندگی میسّر آئی تو آپ نے خدیجۃ الکبریٰ کی واحد یادگار جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی شادی پر توجہ کی۔ آپ کی ولادت ۵ سنہ بعثت میں ہوئی تھی، ۲ھ میں آپ دس سال کی حدوں کو پار کر رہی تھیں ایما پاتے ہی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں نے درخواست کر دی مگر حضور اکرمؐ نے اس کو مسترد فرما دیا اور کہہ دیا کہ فاطمہؑ کا نکاح وحی کے مطابق ہوگا۔

ہمیں حضرت ابوبکر کی نیت پر کوئی شک نہیں ہوتا۔ آپ ہر قیمت پر حضورؐ سے اتنا قریبی رشتہ استوار کرنا چاہتے تھے جس کے مقابلے پر کوئی ٹھہر ہی نہ سکے۔ اسی لئے چھ سال کی نابالغ بیٹی حضورؐ کی زوجیت کے لئے پیش کر دی تھی جو اب عملی طور پر محترم زوجۂ رسول تھیں۔ اب جناب فاطمہؑ کو اپنی زوجہ بنانے کے لئے دامانِ آرزو پھیلا دیا تھا اور خود اپنے داماد کا داماد بن جانے کی تمنا کی تھی تب بھی اسی جذبے میں کہ رسول کی واحد وارث کی شوہریت کا شرف حاصل ہو جائے۔ جلدی میں وہ اس بات کو بھول گئے کہ فاطمہؑ زہرا خود ان کی بیٹی حضرت عائشہؓ کی بیٹی ہیں۔ سوتیلی ہی سہی مگر عرب میں تو منہ بولی بیٹی کو بھی بیٹی ہی مانا جاتا تھا، جس طرح حضرت عثمان آنحضرت کے داماد تھے، اسی طرح فاطمہؑ حضرت ابوبکر کی نواسی جس سے شرعِ اسلام میں بھی عقد ناجائز یا مکروہ تھا۔

بروایت کنز العمال اس پر آنحضرتؐ نے ناگواری کا اظہار فرمایا تھا جس کے پس پردہ یہی ممنوعات تھے، جن پر یقیناً بعد میں حضرت ابوبکرؓ نے غور فرمایا ہوگا

فاطمہ کی حیثیت ہماری نظر میں تو شریکِ کارِ نبوّت کی ہے اور علیؑ، بعد پیغمبرؐ ہونے والے امام، اس لئے ہمارے نزدیک تو فاطمہؑ کا نکاح علیؑ کے علاوہ کسی اور سے ہو ہی نہ سکتا اور خالقِ مطلق کی مرضی بھی یہی تھی۔ اسی لئے علیؑ کی طرف سے کوئی تحریک ہونے کے بجائے خود آنحضرت نے علیؑ کی مرضی دریافت کی اور رضامندی کا اظہار ہونے پر ۱۵ رجب ۲ھ کو فاطمہؑ زہرا حضرت علیؑ کے

رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئیں اور ۱۹ ذی الحجہ کو رخصتی عمل میں آئی تو حضرت علیؑ نے زرہ بیچ کر دعوتِ ولیمہ کی۔

بان کی ایک چارپائی، چمڑے کا ایک گدا، ایک مشک، دو چکیاں، دو مٹی کے گھڑے، جہیز کے نمایاں سامان میں تھے، ماضی میں جن لوگوں نے ملیکۃ العرب کی شان و شوکت دیکھی تھی، اس کی اکلوتی بیٹی کی شادی پر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں گی جب کہ دخترِ خدیجہؑ خود بھی سیدہ عالیان تھی اور شہنشاہِ کون و مکان کی خصوصی ورثہ دار بھی۔

اسی سال نماز پڑھتے وقت حکمِ الٰہی پر آنحضرتؐ نے اپنا رُخ بیت المقدس سے کعبے کی طرف موڑ لیا۔ حضرت علیؑ نے فوراً آپ کا اتباع کیا، دوسروں کو اِس کی خبر بعد میں ہوئی۔

آغازِ جہاد

کفارِ مکہ کو سرورِ کائنات کے بچ نکلنے کا دُکھ تو تھا ہی اور جب مدینے میں اسلام پھیلنے کی خبریں ملیں تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگے، انہوں نے مدینے کے یہودیوں سے سازشیں شروع کردیں، حضورؐ امن کے پیغمبر تھے، انہیں جنگ و جدل سے کیا سروکار لیکن سر پر کوئی بلا آجائے تو دفاع بھی ضروری تھا لہٰذا آپ کو باربا دفاعی جنگیں کرنا پڑیں جو غزوات کہلاتی ہیں اور جن کی تعداد ۲۶ ہے، چھوٹی لڑائیوں یعنی سریات میں آپ نے دوسروں کو سردار بنا کر بھیج دیا جو گنتی میں ۳۶ ہیں۔

جنگِ بدر

کفارِ قریش میں ابوجہل اور ابوسفیان عداوت میں ہمیشہ سرِفہرست رہے تھے ان کے ساتھیوں سے کئی مرتبہ مسلمانوں کی جھڑپیں ہوئیں۔ خود مدینے کے اندر بھی دشمن پیدا ہو رہے تھے لہٰذا حضورؐ نے یہودیوں سے ایک معاہدہ کیا جس میں دیگر شرائط کے ساتھ ایک شرط یہ بھی تھی کہ دونوں میں سے کسی کی جنگ تیسرے فریق سے ہوگی تو وہ جنگ دونوں کی متصور ہوگی۔ اِس معاہدے کے باوجود یہودی سازش سے باز

نہیں آرہے تھے۔ اِس دوران قریش کے مدینے پر حملہ کرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو کسی فوجی انداز سے منظم نہیں کیا تھا لہٰذا قدرے پریشانی لاحق ہوئی۔ اس موقع پر رئیس انصار سعدؓ بن عبادہ اور حضرت مقدادؓ نے پورے تعاون کا یقین دلایا اور آنحضرتؐ تین سو تیرہ مسلمانوں کو لے کر شہر سے باہر آ گئے۔

کفار کا لشکر عتبہ بن ربیعہ کی قیادت میں مدینے کے قریب پہنچ چکا تھا جو تقریباً پچاس سواروں اور نو سو پچاس پیادوں پر مشتمل تھا۔ چاہِ بدر سے آگے بڑھ کر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ عتبہ، شیبہ اور ولید سے حمزہؓ، عبیدہؓ اور علیؑ کا سامنا ہوا۔ حمزہ نے عتبہ کو اور علی نے ولید کو قتل کر دیا۔ شیبہ عبیدہ کے ہاتھ سے زخمی ہوا تھا علیؑ نے بیک ضربِ شمشیر اس کا کام تمام کر دیا۔ علیؑ کی یہ پہلی باقاعدہ جنگ تھی، پھر بھی ان کے ہاتھ سے ۳۰ آدمی قتل ہوئے، ایک بڑی تعداد کو حضرت حمزہؓ نے جہنم واصل کیا۔ مجموعی طور پر مسلمانوں نے ایسی تلوار چلائی کہ ابوجہل اور اس کا بھائی عاص بھی مارا گیا۔ کل ستّر کافر قتل ہوئے، جن میں اُمیّہ بن خلف بھی شامل تھا عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے سابقہ عہد و پیمان کے سبب اس کو بچانے کی کوشش کی مگر انصار نے ان کی نہ مانی اور امیہ کو ٹھکانے لگا دیا۔ ابوسفیان بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اسیروں میں نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط قتل کر دیئے گئے، باقیوں کو فدیہ لے کر شرائط کے ساتھ چھوڑ دیا گیا۔

یہ جنگ رمضان ۲ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اِس کے بعد ہی روزے فرض کئے گئے اور عید الفطر کے احکام صادر ہوئے۔ اِسی سال کے آخر میں عید الاضحیٰ کا حکم آیا اور خمس واجب ہوا۔

جنگ اُحد

بدر کی شکست نے قریش کے غیظ و غضب کو اور بھڑکا دیا تھا۔ ابوسفیان بن حرب نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے عہد کیا کہ جب تک اہلِ اسلام کو مزہ نہ

چکھائے گا، اپنے سر میں تیل نہ ڈالے گا۔ اِسی طیش میں اس نے دو سو سواروں کو لے کر عریص پر حملہ کر دیا۔ ایک انصاری کو قتل کر دیا۔ مکانات اور گھاس کے ذخیرے میں آگ لگا دی اور مسلمانوں کے تیار ہو کر آنے سے قبل فرار ہو گیا۔

آہستہ آہستہ اس نے ایک بڑا لشکر جمع کر لیا اور کوئی تین ہزار سپاہ لے کر مدینے پر چڑھائی کر دی۔ جس میں سات سو زرہ پوش، تین ہزار اونٹ اور سو گھوڑے شامل تھے۔ حضورؐ اس کے مقابلے پر ایک ہزار سے بھی کچھ کم آدمی لا سکے، مدینے سے چھ میل کے فاصلے پر بمقام اُحد لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ لشکرِ اسلام میں تین علم تھے، جن کو سعدؓ بن عبادہ، جناب منذر اور علیؑ ابنِ ابی طالب لئے ہوئے تھے۔ ابوسفیان نے خالد بن ولید، عکرمہ بن ابی جہل اور عبداللہ ابنِ ربیعہ کو افسر بنایا تھا اور فوج کا علم طلحہ ابن ابی طلحہ کو دیا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی طلحہ نے میدان میں مقابل طلب کیا اور حضرت علی نے سامنے پہنچ کر پہلی ہی ضرب میں اس کی ٹانگ کاٹ دی اور آدھ مُوا چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ پھر دونوں لشکر ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔ مسلمانوں نے ستھراؤ کر دیا اور کفار بھاگنے لگے۔

حضورؐ نے پشت کی گھاٹی میں عبداللہ ابن جبیر کو تیر اندازوں کے ایک دستے کے ساتھ تعینات کیا تھا اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے کی تاکید کی تھی۔ یہ دستہ دشمن کے پسپا ہوتے ہی لوٹ مار میں لگ گیا۔ خالد بن ولید اپنی فوج کے ساتھ گھات میں لگا ہوا تھا وہ مسلمانوں کو انتشار میں دیکھ کر ٹوٹ پڑا اور اہلِ اسلام کی فتح شکست میں بدل گئی۔

اِس موقع پر چودہ آدمی آنحضرتؐ کو گھیرے ہوئے تھے تھوڑی دیر میں چودہ کے آٹھ رہ گئے۔ اِن میں حضرت ابودجانہؓ اور حضرت حمزہؓ مدافعانہ جنگ میں آگے بڑھ گئے اور دشمنوں میں گھر گئے۔ جناب حمزہؓ کو معاویہ کی ماں ہندہ لعنہا کے غلام وحشی نے نیزہ پھینک کر مارا، جس سے وہ شہید ہو گئے۔ ابودجانہؓ زخموں کی کثرت سے جنّت کو سدھار گئے۔ آپ کی لاش جب حضورؐ کے سامنے لائی گئی تو وہ گوشت کا

ایک لوتھڑا تھی۔ حضرت علیؑ اب بھی دو آدمیوں کے ساتھ حضورؐ کی حفاظت فرما رہے تھے۔ تلوار چلتے چلتے کند ہو گئی تھی۔ لہٰذا حضورؐ نے تلوار مرحمت فرمائی جو ذوالفقار تھی۔ بعض روایات کے مطابق ذوالفقار حضرت علیؑ کے لیے عرش سے اتری تھی۔

"ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ اس وقت صحابہ چار قسموں میں بٹ گئے تھے۔ صحابہ کی ایک قسم جنگ میں مصروف تھی اور وہ شہید ہو رہی تھی، دوسرا گروہ بھاگ رہا تھا اور پہاڑ کی گھاٹیوں اور کونوں میں چھپ رہا تھا اور بعض شہر میں جا کر ٹھہر گئے تھے، ان میں حضرت عثمان بن عفان بھی تھے جو جنگ کی آگ ٹھنڈی ہونے پر حضورؐ کی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔" (۲۴)

بھاگنے والوں میں کچھ نمایاں لوگ اور بھی تھے۔ "انس بن نضر بھاگے مگر پھر پلٹ پڑے کہ جب رسول اللہ ہی نہیں تو زندہ رہ کر کیا کریں گے اور وہ لڑتے لڑتے مر گئے۔"

"حضرت عمر و طلحہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ انکے ساتھ نہیں پلٹے۔"

"حضرت عمران لوگوں میں تھے جو بھاگ گئے تھے لیکن خدا نے ان کو معاف کر دیا۔" (۲۵)

"لیکن ذوالفقار حیدری اس وقت بھی بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے دل شکستہ ہو کر تلوار پھینک دی کہ اب لڑنے سے کیا حاصل۔" (۲۶)

ایک دوسری روایت تفسیر دُرِّ منثور، سیوطی اور تفسیر ابن جریر میں خود حضرت عمر کی زبان سے ملتی ہے کہ "جب جنگِ اُحد میں کافروں نے مسلمانوں کو شکست دی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اس وقت میری یہ حالت تھی کہ پہاڑی بکرے کی طرح کودتا پھرتا تھا۔" امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں اس کی صراحت کرتے ہیں کہ بھاگنے والوں میں حضرتِ عمر بھی تھے مگر وہ ابتدا میں نہیں بھاگے اور دُور نہیں گئے بلکہ

بھاگ کر پہاڑی پر رُکے رہے۔ حضرت ابوبکر علیحدہ بھاگے تھے لیکن وہ جلد ہی واپس آگئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ابوعبیدہ بن الجراح تھے۔

اِس خونریز جنگ کا عالم چشمِ فلک نے پھر کبھی نہیں دیکھا کہ اسلام کا پیغمبرؐ زخموں سے چُور چُور خون میں نہایا کھڑا تھا اور صرف ایک تھکا ہوا ہاتھ اس کی حفاظت کر رہا تھا جس میں تلوار چلانے کی سکت نہ رہی تھی۔ یہ ہاتھ علیؑ ابنِ ابی طالب کا تھا جن کے جسم پر سولہ زخم آئے تھے۔ وہ ناتوانی میں نڈھال ہوکر گر پڑتے تھے لیکن کوئی طاقت اور کوئی جذبہ پھر انہیں اٹھا کر کھڑا کر دیتا تھا۔ وہ رسُولؐ کی طرف بڑھتے ہوئے دشمنوں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ رہے تھے مگر دشمن تھے کہ پلے پڑ رہے تھے۔ آخر اس جیالے سرفروش نے کفار کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ میں ستّر مسلمان مارے گئے اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ کافروں کے مقتولین کی تعداد صرف تیئس تھی۔ جن میں سے بارہ علیؑ نے قتل کئے تھے۔

اب مفرورینِ اسلام واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ سرورِ کائنات نے علیؑ سے کہا "علی۔ تم بھی بھاگ کیوں نہیں گئے ؟"

"کیا ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو جاتا ــــــ" ! علیؑ کا جواب ایک مخفیانہ حکم لگاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھاگنے والے ایمان کی منزل سے ڈگمگا گئے تھے۔ لیکن اللہ رے رحمۃ للعالمین کا کرم کہ آپ نے سب کو معاف کر دیا۔

قریش کے لئے یہ دن بڑی خوشی کا تھا۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے مقتولین کی ناک، کان کاٹ کران کا ہار بنایا۔ گلے میں پہنا، حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکلوا کر چبایا اور ناچتی گاتی مکے واپس چلی گئی۔

اُحد سے واپسی پر مدینے میں اک کہرام مچ گیا۔ ہر گھر میں عورتیں رو رہی تھیں مگر حمزہؓ کی بہن صفیہ کے علاوہ حمزہؓ کا کوئی رونے والا نہ تھا لہذا حضورؐ کی خوشنودی کی خاطر قریش کی عورتیں حضرت حمزہؓ کے گھر گئیں اور ان پر نوحہ کیا۔

اِسی سال حضرت فاطمہ زہراؑ کے بطن سے بڑے بیٹے امام حسنؑ کی ولادت ہوئی۔

حضرتِ عمرؓ کی دختر حضرت حفصہ حضور کی زوجیت میں آئیں۔ ابوسفیان احد سے پلٹتے وقت کہہ گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہ دے گا، چنانچہ اس نے مختلف قبائل کو بھڑکایا اور مسلمانوں کو ان سے جنگ کرنا پڑی۔ واقعہ بیر معونہ پیش آیا، غزوہ بنی نضیر اور دوسرے غزوات واقع ہوئے۔ ماہِ شعبان ۴ھ میں ولادتِ امام حسینؑ ہوئی۔ حضرت امِ سلمہؓ کا عقد آنحضرتؐ کے ساتھ ہوا، اور جناب فاطمہ بنت اسد نے وفات پائی جو حضرت علیؑ کی والدہ گرامی تھیں لیکن درحقیقت وہ علی سے زیادہ حضورؐ کی ماں تھیں۔

جنگ خندق

مدینے کے یہودی، قیامِ مدینہ کے دو سال تک تو مسلمانوں کے دوست رہے پھر انہوں نے بھی اسلام کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں اور مسلمانوں سے ان کی جنگیں ہو چکی تھیں۔ بہت سے یہودی جلاوطن ہو گئے تھے لہذا یہودی بھی قریش ہی کی طرح اسلام دشمن بن گئے تھے۔ خیبر میں بھی بنی نضیر کی آبادی تھی۔ اس کے بعض سربرآوردہ لوگوں نے مکہ پہنچ کر ابوسفیان سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے ابوسفیان چار ہزار کا لشکر لے کر مکے سے نکلا۔ یہودی قبیلے چھ ہزار فوج لے کر اُن سے آملے اور دس ہزار کی جمعیت مدینے پر حملہ کرنے کیلئے بڑھنے لگی۔

آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے تین ہزار کا لشکر تیار کیا اور مدینے سے نکل کر کوہ سلع کے دامن میں آکر ٹھہر گئے۔

ابوسفیان اور یہودی بڑی تیاریوں سے آئے تھے۔ ان کے ساتھ عرب کا نامی پہلوان عمر ابن عبدود بھی تھا جو تن تنہا ایک ہزار پر بھاری سمجھا جاتا تھا اور اتنا بہادر تھا کہ لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ مسلمان دشمن کے مقابلے میں بظاہر بہت کمزور تھے، اس پر عمر ابنِ عبدود کی دھاک، لہذا حضورؐ نے سلمان فارسی کی رائے سے ایرانی طریقۂ جنگ پر اپنی فوج کے چاروں طرف خندق کھدوا دی۔

دشمن سامنے پہنچ پڑے تو مسلمانوں کے حوصلے پست ہونے لگے پھر بھی بیٹھ

روز تک اِکادُکا جھڑپوں میں مسلمانوں نے مقابلہ کیا، پھر ایک دن عمر بن عبدود گھوڑے کو خندق پھند اکر رسولؐ کے خیمے تک آگیا اور اس نے مد مقابل طلب کیا۔

آنحضرتؐ نے اصحاب کی طرف دیکھا جو سروں کو جھکائے ہوئے تھے۔ حضرت عمر نے کہا "اس نے قزاقوں کے مقابلے میں ایک اونٹنی کے بچے کو سپر کے طور پر ہاتھ میں لے لیا تھا"۔ اس بیان سے اور سراسیمگی پھیل گئی۔ عمر ابن عبدود نے پھر رجز پڑھا اور حضورؐ نے پھر اصحاب کو مخاطب کیا مگر پہلی دفعہ کی طرح اس بار بھی وہی طفلِ نوخیز اُٹھ کر کھڑا ہوگیا جس نے دعوتِ ذی العشیرہ میں حضورؐ کو لبیک کہا تھا لیکن اب وہ ایک جوان رعنا بن چکا تھا۔ پیغمبر اسلام نے پھر علیؑ کو بٹھا دیا تیسری تیسری بار عمرو ابنِ عبدود نے بڑا سخت طنز کیا۔

"کیا تم میں کوئی مرد نہیں ہے"؟

لشکرِ اسلام کا سناٹا بدستور قائم تھا۔ اس مرتبہ بھی علی ہی اُٹھ کر کھڑے ہوئے
"میں ــــــ یا رسولؐ اللہ"؟

اب کی حضورؐ نے علی کو بٹھایا نہیں کیونکہ اب اگر کوئی مقابلے پر نہ جاتا تو ابنِ عبدود خود حملہ کر دیتا اور اہلِ اسلام کی عزت خاک میں مل جاتی ــــــ آنحضرتؐ نے سر سے پا تک علیؑ کو دیکھا اور ہاتھ بارگاہ باری تعالیٰ میں اُٹھا دیئے۔

"تو نے عبیدہؓ کو بدر میں، حمزہؓ کو اُحد میں اُٹھا لیا۔ اب یہ علیؑ ہی رہ گیا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا"!

علیؑ کے چہرے پر ایک اطمینان تھا۔ آپ اجازت پاکر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ابن عبدود کی طرف بڑھے اور حضورؐ نے اعلان کیا۔

"آج کُلِ ایمان کُلِ شرک کے مقابلے پر جا رہا ہے"۔ (۲۷)

الیوم برز الایمان کلہ الی الشرک کلہ

علیؑ جب عمرو کے مقابلے پر پہنچے تو اس نے کہا۔

"تم کو لڑنے کے لئے بھیجا ہے۔ جانتے ہو، میرا نام ابن عبدود ہے"۔

"میرا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے" علیؑ نے بے ساختہ جواب دیا، پھر دونوں کے درمیان کئی مکالمے ہوئے اور آخر لڑائی شروع ہو گئی۔ طرفین سے ستر ضربوں کے تبادلے ہوئے اور آخر عمرو کی تلوار علی کی سپر کو کاٹتی ہوئی سر تک آ پہنچی علیؑ نے بھی سنبھل کر ہاتھ مارا تو عمرو زمین پر گر پڑا اور علی نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

جنگ کے دوران اس قدر گرد اُڑی تھی کہ دونوں میں سے کوئی نظر نہ آتا تھا لیکن جب علیؑ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا تو حضورؐ خوش ہو کر اُچھل پڑے اور آپؐ کے مُنہ سے نکل گیا۔

"خندق کے دن علی کی ایک ضرب کونین کی عبادت سے بہتر ہے۔"

شاہ عبدالحق محدث دہلوی ایک دوسری روایت بیان فرماتے ہیں کہ "حضرت علی مرتضیٰ کا یوم خندق مقابلہ کرنا قیامت تک میری اُمت کے اعمال سے افضل ہے۔" (۲۸)

لمبارزة علی ابن ابی طالب یوم الخندق أفضل من أعمال أمّتی الی یوم القیامة

جبرئیلؑ نے اس خوشی میں ایک رومال لا کر دیا جس پر علیؑ ولی اللہ لکھا تھا مسلمانوں میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور دوسرے لوگوں نے علیؑ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ عمرو ابن عبدود کی بہن جب بھائی کی لاش پر پہنچی تو خود و زرہ کو جسم پر پا کر بولی۔

"اگر تجھے اس قاتل کے علاوہ کوئی اور قتل کرتا تو میں ساری عمر تجھ پر روتی رہتی لیکن تیرا قاتل تو وہ ہے جس کے نسب میں کوئی عیب نہیں اور جس کو ہمیشہ سے شہر کا سردار کہا گیا ہے۔"

عمرو کے قتل کے بعد عام جنگ شروع ہو گئی۔ اسی دوران زبردست طوفان آیا اور ابوسفیان رات ہی رات سامانِ رسد ختم ہو جانے کا بہانہ کر کے وہاں سے کوچ کر گیا۔

اس جنگ کو جب عام مسلمان مورخین لکھتے ہیں تو بس اتنا ہی کہ تین آدمیوں کا

مقابلہ فلاں فلاں تین آدمیوں نے کیا اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر طوفانِ برق و باراں کے سبب لشکرِ کفار واپس ہوگیا۔ علی کی شجاعت اِن کی نگاہ میں قابلِ ذکر قرار نہیں پاتی۔

شعبان ۵ھ میں بنی مصطلق سے جنگ ہوئی۔ واپسی پر حضرت عائشہ جنگل میں رہ گئیں جو بعد میں پہنچیں۔ یہ واقعہ افک کہلاتا ہے اِسی ۵ھ میں غزوہ بنی قریظہ، سریہ سیف البحر، غزوہ بنی عیان و ذرع میں آئے۔ تیمم کا حکم صادر ہوا۔ آنحضرتؐ نے اذان میں حیّ علیٰ خیر العمل کا اضافہ کیا۔ (۲۹)

صلح حدیبیہ

ذیقعد ۶ھ میں آنحضرتؐ نے حج کا ارادہ کیا۔ مدینے کے قریب پہنچ کر چاہ حدیبیہ پر مقام کیا۔ قریش کی مزاحمت کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا، لہٰذا آپ نے صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی جو بیعتِ رضوان کہی جاتی ہے۔

کسی مختص آدمی کا نام لئے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ مخبرِ صادق کو وفاداریوں پر شک تھا ورنہ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں سے تجدید بیعت کی ضرورت کیا تھی ـــــــ!

اس دوران قریش کے ایلچی عروہ نے مشورہ دیا کہ آپ کے ساتھی جنگ میں فرار ہو جائیں گے، اس سال حج نہ کریں۔

حضرت ابوبکر نے اس پر عروہ کو گالی دی (لات کی شرمگاہ چاٹ) حضورؐ کو یہ بات ناگوار ہوئی، آپ نے حضرت عمر سے کہا کہ وہ سفیر بن کر جائیں اور قریش سے بات چیت کریں۔ انہوں نے مصلحتاً عذر کیا اور حضرت عثمان کو تجویز کر دیا۔ حضرت عثمان بھیجے گئے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، پھر سہیل بن عمرو قریش کی طرف سے آیا اور بڑی رد و قدح کے بعد ایک معاہدہ ہوا۔ جس کو حضرت علیؑ نے تحریر کیا۔

۱۔ مسلمان اِس سال عمرہ کئے بغیر پلٹ جائیں گے۔

۲۔ اگلے سال بھی تین روز سے زیادہ نہ ٹھہریں گے۔

۳۔ ہتھیاروں میں صرف تلواریں ہوں گی، وہ بھی نیام میں۔

۴۔ مکّے میں جو مسلمان ہیں، انہیں آنحضرتؐ اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے اور مدینے سے آیا ہوا کوئی مسلمان مکّے میں رہنا چاہے گا تو اُسے روکیں گے نہیں۔

۵۔ مکّے کا کوئی آدمی مدینے جائے گا تو مسلمان اُسے واپس کر دیں گے۔ مدینے کا کوئی مسلمان مکّے آئے گا تو واپس نہ کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ فریقین میں، جس سے چاہیں، صلح کریں۔

یہ معاہدہ اگرچہ بہت دب کر کیا گیا تھا، پھر بھی سہیل نے اعتراض کیا کہ فریقین کے نام میں حضرت علی نے محمد رسول اللہ لکھا ہے۔ ہم رسول اللہ نہیں مانتے، محمد بن عبداللہ لکھا جائے۔ حضرت علیؑ اس پر تیار نہیں ہوئے۔ آخر حضورؐ نے کاغذ اور قلم لے کر رسولؐ اللہ کاٹ دیا اور اس کی جگہ ابن عبداللہ لکھ دیا۔ اس حدیث کو سب مانتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے خود قلم زد کرنے اور لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی سے لکھوا دیا گیا۔ اَن پڑھ ثابت کرنے کی اتنی ہی ضد ہے تو کیا کہا جا سکتا ہے!

شرائطِ صلح ظاہری طور پر مسلمانوں کے حق میں نہیں تھیں، مگر حضورؐ رضامند ہو گئے، لہٰذا علیؑ نے بے چون و چرا لکھ دیا۔ دوسرے مسلمانوں کے تاثرات کیا تھے اس کا پتہ نہیں چلتا البتہ حضرت عمر کے منہ سے نکل گیا۔

"محمد کی نبوّت میں، جیسا مجھے آج شک ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔" (۳۰)

بات یہ ہے کہ حضرت عمر اور دوسرے کئی صحابی صلح پر راضی نہ تھے مگر حضور کا فیصلہ اٹل تھا، جس کی تصدیق خدا کی طرف سے آیۂ انا فتحنا لك بھیج کر کی گئی، پھر اس صُلح کے جو نتائج برآمد ہوئے، ان سے حضورؐ کی دور بینی کی تصدیق ہو گئی۔ اِس کے بعد حضورؐ نے حبشہ، روم، فارس، اسکندریہ، شام اور یمامہ کے حکمرانوں کو خطوط ارسال کئے اور انہیں دعوتِ اسلام دی۔ کہا جاتا ہے کہ نجاشی

شاہ حبش نے اسلام قبول کر لیا تھا، شاہ ایران نے حضورؐ کا مکتوب پھاڑ ڈالا اور آپ نے اس کو حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی بشارت دی تھی۔ قیصر روم نے آپ کے خط کو عزت و احترام سے سُنا۔ گورنر مصر نے تحفے بھیجے۔ اِن تحفوں میں دو کنیزیں ماریہ قبطیہ اور ان کی بہن شیریں بھی تھیں۔ تحائف میں دُلدُل نامی گھوڑا اور دو غلام بھی شامل تھے

جنگ خیبر

جنگ خندق میں ابوسفیان کی پُشت پر خیبر کے یہودیوں کا بھی ہاتھ تھا مگر مکمل شکست کے باوجود ان کے حوصلے پست نہ ہوتے تھے۔ وہ جلد ہی بنی اسد اور بنی غطفان سے معاہدہ کر کے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے اور انہوں نے مدینے پر حملے کا منصوبہ بھی بنا لیا، حضورؐ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے حملے سے بچنے کے لئے خود آگے بڑھنے کا عزم کیا۔ ۱۴ صفر ۷ھ کو آپؐ چودہ سو پیدل اور دو سو سوار لے کر مدینے سے نکلے اور خیبر پہنچ کر مورچہ بنا لیا۔

خیبر میں یہودیوں کے چھ قلعے تھے، جن میں بیس ہزار آزمودہ کار سپاہ موجود رہتی تھی۔ جنگ کی تیاری میں سپاہیوں کی تعداد کچھ بڑھ گئی تھی۔ مرحب عرب کا شہرۂ آفاق پہلوان تھا۔ اس کے علاوہ عنتر و حارث تھے جن کا مثل دُور دُور نہ ملتا تھا۔

آنحضرتؐ نے پہلے دن حضرت عمر کو علم دیا۔ انہوں نے جنگ کی اور بے نیل مرام واپس آئے۔ دوسرے روز حضرت ابوبکر گئے۔ انہیں بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی تیسرے دن پھر حضرت عمر کو شرف بخشا گیا لیکن آج کی واپسی میں سپاہی اور سپہ سالار ایک دوسرے کی کوتاہی کو شکست کا ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ حضورؐ نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر فرمایا:۔

"کل میں علم اس کو دوں گا ـــــــ جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند فرماتا ہے ـــــــ ایسا مرد جو کرار اور غیر فرار ہے۔"

"تمام صحابہ راہ میں دیدۂ اُمید اور چشمِ انتظار لئے قبولؐ رگا

پر بیٹھ گئے ــــــ حضرت سعد ابن وقاص فرماتے ہیں کہ میں حضورؐ کی چشم حق بیں کے سامنے گیا اور سلام عرض کر کے دو زانو ہو کے بیٹھ گیا ــــــ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں نے بجز اس روز کے امارت کو کبھی پسند نہیں کیا اور نہ کبھی خواہش کی۔" (۳۱)

ہر صحابی کے دل میں ایک ہی خواہش تھی۔ اس میں کوئی چھوٹا بڑا مستثنیٰ نہ تھا کیونکہ حضورؐ کے قول کے مطابق فتح یقینی تھی۔ کون ہوگا جس کو ایسا شرف حاصل کرنے کی آرزو نہ ہو۔ حضرت علیؑ کی طرف کسی کا خیال بھی نہ جاتا کیونکہ وہ مدینے میں صاحبِ فراش تھے اور آشوبِ چشم میں مبتلا تھے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرتؐ نے ناد علیاً مظہر العجائب اس موقع پر پہلی مرتبہ تلاوت کی اور ادھر علیؑ مدینے سے چل دیئے۔ تھوڑے وقفے سے حضورؐ نے پوچھا۔

"کہاں ہیں علی ابنِ ابی طالب ؟"

کسی نے دیکھا کہ علی پہنچ گئے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔

"وہ یہیں ہیں لیکن ان کی آنکھ اتنی درد کرتی ہے کہ وہ اپنے پاؤں تک کو نہیں دیکھ سکتے۔"

فرمایا۔ "ان کو میرے پاس لاؤ۔"

مسلمہ بن الکوع گئے اور ان کو ہاتھ سے پکڑ کر حضور کے سامنے لائے۔ حضورؐ نے ان کے سر کو اپنی مبارک ران پر رکھا اور اپنا لعابِ دہن ان کی چشم مبارک میں لگا دیا اور دعا مانگی۔ اسی وقت آنکھ سے درد جاتا رہا۔

حضورؐ نے اپنی خاص زرہ انہیں پہنائی، ذوالفقار ان کی میان میں باندھی فرمایا جاؤ۔ "پلٹ کر نہ آنا، جب تک کہ حق تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر قلعہ فتح نہ فرما دے۔" عرض کیا۔

"یا رسول اللہ۔ کہاں تک ان سے قتال کروں" ؟

حضورؐ نے فرمایا۔

"اس وقت تک، جب تک وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ محمدٌ رسولُ اللّٰہ

کی گواہی نہ دیں۔" (۳۲)

علیؑ کا جنگ کے لئے جانے کا ایک خاص انداز تھا اور آج تو مخبرِ صادق نے فتح کی بشارت دی تھی، آپ سرشاری کی کیفیت میں بڑھے اور قلعہ قموص کے سامنے پہنچ کر اپنا علم گاڑ دیا۔ مرحب کا بھائی حارث کسی فیلِ مست کی طرح جھومتا ہوا نکلا اور چشمِ زدن میں اس نے دو مجاہدوں کو شہید کر ڈالا۔ سُرخ جبّہ والے علمدار نے یہ دیکھا تو اس طرح اس پر جھپٹ پڑا جیسے شیر اپنے شکار کو دبوچ لیتا ہے۔ ایک لحظے کے بعد حارث اپنے خون میں لت پت زمین پر پڑا ہوا تھا۔

حارث کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ مرحب کی نظر لاش پر پڑی تو وہ بلبلا گیا اور بل کھاتا ہوا علیؑ کے مقابل آکر پکارا۔

"سارا عرب جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں!"

"میں حیدر ہوں ــــــ صحرائے شجاعت کا شیرِ نر!" علیؑ نے برجستہ جواب دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی حارث کے خون میں ڈوبی ہوئی ذوالفقار بلند ہوئی برق کا کوندنا تو سب نے دیکھا مگر اس پر کسی کی نظر نہیں پڑی کہ ذوالفقار کب مرحب کی ڈھال سے ٹکرائی، اس کو کاٹ کر سر میں اُتری اور گردن میں دَر آئی پھر جسم کو برابر سے دو لخت کرتی ہوئی گاڈ زمین سے جا ٹکرائی۔ یہ عقیدہ اس پر مستزاد ہے کہ جبریلؑ اس کو اپنے پروں پر نہ روک لیتے تو کرّۂ ارض بھی دو ٹکڑے ہو جاتا۔

کافروں کا خون برشِ شمشیر کے مُنہ کو لگ چکا تھا، لہذا حارث و مرحب کے بعد وہ مزید عنتر، ربیع اور یاسر جیسے سات پہلوانوں کا خون چاٹ گئی پھر علیؑ نے قلعہ قموص کے دروازے پر پہنچ کر جوشِ شجاعت میں اس پر ہاتھ ڈال دیا۔ چالیس آدمی جس آہنی دَر کو کھولتے اور بند کرتے تھے، محمدؐ کے شیر نے اس میں انگلیاں

پیوست کردیں اور اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگا کر جھٹکا دیا تو دروازہ آپ کے ہاتھ میں تھا۔ اس کو سر سے بلند کر کے آپ نے قلعہ کی خندق پر رکھ دیا جس نے لشکرِ اسلامی کے لئے پل کا کام کیا اور مجاہد اس سے گزر کر قلعہ میں در آئے فرشتے آسمان سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جبرئیلؑ نے جوشِ مسرت سے نعرہ لگایا۔

"علیؑ کے سوا کوئی مرد نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں

لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

یہ ہے معجزہ قوتِ ایمانی اور تائیدِ ربانی کا، دُنیا جس کی مختلف تاویلیں کرتی ہے اور علیؑ کا شرف کم کرنے کے لئے حوالے کے طور پر وضعی روایتیں پیش کر دیتی ہے کہ علیؑ نے بقوتِ رحمانی بابِ خیبر اُکھاڑا تھا۔ میں ان کو جھٹلاتا نہیں کیونکہ علیؑ میں جو قوت تھی وہ ان کی تھی ہی کب، ساری قوتِ رحمانی ہی تھی جو شروع سے آخر تک علیؑ کے ساتھ رہی اور آج بھی یہ اسی کا اعجاز ہے کہ جب بھی علیؑ کو پکارو چشم زدن میں جواب آتا ہے اور یہ آپ کا شرف ہے کہ خدائے بخشندہ نے ان کے نام کو بھی معجزہ نما بنا دیا ہے۔

کہتے ہیں کہ علی نے جب بابِ خیبر اُکھاڑا تھا تو پورے قلعے میں ایک زلزلہ آ گیا تھا اور صفیہ بنتِ حیّ زمین پر گر پڑی تھیں جو انجام کار اسیر ہو کر حضورؐ کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ اسی دن حضور کو ایک اور خوشی ہوئی، وہ یہ کہ حضرت جعفر طیارؓ حبش سے واپس آئے۔

فتح کے بعد قیام خیبر ہی میں زینب بنتِ حارث نے بھنے ہوئے گوشت میں زہر ملا دیا تھا جو حضورؐ نے نوش فرما لیا۔ اس کا اثر آہستہ آہستہ ہوا، اور اسی کے نتیجے میں آنحضرتؐ کی جسمانی موت واقع ہوئی۔

چند روزہ قیام کے بعد حضورؐ مدینے کی طرف واپس ہوئے تو صہبا کے مقام پر اقامت پذیر ہوئے، عصر کے وقت حضورؐ کا سر علی کے زانو پر تھا اور آپ استراحت فرما رہے تھے کہ وحی کا نزول ہوا حضرت علیؑ اسی طرح ساکت و صامت بیٹھے رہے

حتیٰ کہ حضور بیدار ہوئے تو علی سے دریافت کیا کہ عصر کی نماز پڑھ لی۔ علیؑ نے کہا کہ بیدار کیسے کرتا؟ سورج ڈوب چکا تھا۔ آپ نے علیؑ سے فرمایا۔ "اِس کو پلٹا دو" علیؑ نے انگلی سے اشارہ کیا۔ سورج بلند ہونے لگا۔ علیؑ نے نماز ادا کر لی تب غروب ہوا۔

شمس کی یہ رجعت اکثر لوگوں کے لئے قابلِ یقین نہیں ہے مگر ہمارا عقیدہ ہے علامہ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی اِس کی تصدیق کی ہے اور علامہ اقبالؒ نے ایک شعر میں اس کو تسلیم کیا ہے۔

آں کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند زمغرب آفتاب

فدک

فتح خیبر کے بعد اس زرخیز علاقے کو دعوتِ اسلام دی گئی اور فدک کے یہودی نصف زمین ذاتی طور پر آنحضرتؐ کو پیش کر کے آپ کی امان میں آگئے۔ حضورؐ نے یہ علاقہ بحکم خدا فاطمہ زہراؑ کو بطور عطیہ دے دیا اور اس کی سند لکھ دی۔ (۳۳)

اِسی سال مشہور و معروف راوی حدیث ابوہریرہ مسلمان ہوئے، انہوں نے ساڑھے تین سال حضور کا زمانہ دیکھا اور اس میں بھی دو سال بحرین میں رہے مگر ۵۳۰۴ احادیث کے راوی ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

جنگِ موتہ

حضورؐ نے دیگر سلاطین کے ساتھ والی شام شرجیل عمرو غسانی کو بھی دعوتِ اسلام دی تھی مگر اس نے آپ کے قاصد حارث ابن عمیر کو قتل کر دیا تھا لہٰذا حضورؐ نے زیدؓ کو تین ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا جس نے جمادی الاول ۸ھ میں موتہ کے مقام پر ایک لاکھ فوج کا مقابلہ کیا۔ زیدؓ کے شہید ہونے پر حضرت جعفر طیار نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے پھر عبداللہ بن رواحہ نے علم سنبھالا اور وہ بھی راہِ خدا میں شہید ہو گئے۔ ان کی جگہ کسی بہادر مسلمان نے لی اور جنگ

جاری رکھی۔

لڑائی میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی مگر کافی تعداد میں لوگ زخمی تھے لہٰذا مسلمان مدینے کی طرف واپس ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ خدا نے جعفرؓ کو زمرد کے دو پر عطا کئے ہیں۔ اسی لئے انہیں جعفرؓ طیار کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد سریہ ذات السلاسل واقع ہوا۔ اسی سال عائشہ انصاریہ نے حضورؐ کے لئے تین درجے کا ایک منبر بنوا کر پیش کیا۔

فتح مکّہ

صلح حدیبیہ کی رو سے دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تھا لیکن قریش کے حلیف قبیلہ بنی بکر نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور بنی خزاعہ نے حضورؐ سے مدد مانگی۔ قریش بنی بکر کے مددگار تھے لہٰذا حضورؐ دس ہزار فوج لے کر مکّے کی عازم ہو گئے۔

ابوسفیان اپنی کمزوریوں کے سبب جنگ پر تیار نہ تھا اس لئے اس نے صلح کا ہر ذریعہ استعمال کیا اور آخر مسجد میں جنگ نہ کرنے کا اعلان کر کے چلا گیا۔ حضورؐ اس کی چالوں سے واقف تھے۔ آپ اس کے دھوکے میں نہیں آئے اور تیاری کر کے اچانک غیر معروف راستے سے کے جا پہنچے۔ مکّے سے ۴ فرسخ پر ۱۰ رمضان ۸ھ کو "مرالظہران" کے مقام پر آپ نے پڑاؤ ڈالا۔ مجبور ہو کر ابوسفیان قبولیت اسلام پر آمادہ ہو گیا

"اس وقت ابوسفیان کے تمام پچھلے اعمال سامنے تھے اسلام کی عداوت، مدینے پر بار بار حملہ، قبائلِ عرب کا اشتعالِ آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی سازش، ان میں سے ہر عمل اس کے خون کا دعویدار تھا لیکن رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بالاتر تھی۔ اس کے تمام گناہوں پر خطِ عفو پھیر دیا، پھر بھی ابوسفیان کفر و ضلالت پر قائم رہا لیکن آخر میں حضرت عباس کے ڈرانے سے کلمۂ توحید پڑھ لیا اور پھر سر پُر غرور، جو خدا کے سامنے بھی نہ جھکتا تھا، آستانِ نبوی پر

ختم ہوگیا۔" (۳۴)

ابوسفیان جیسا سرکش اور دشمنِ اسلام آسانی سے اِس مقام پر نہ آیا تھا۔ اس میں حضرت عباسؓ کی کوشش کو بڑا دخل تھا۔ آپ نے ابوسفیان کو سطوت و شکوہ اسلام دکھا کر مرعوب کیا تھا اور ابوسفیان نے لشکرِ اسلام دیکھ کر کہا تھا۔

"عباس! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بہت قوی و عظیم ہوگئی ہے۔"

عباس نے ایک مسلمان کے لب و لہجہ میں جواب دیا تھا۔

"افسوس تجھ پر اے ابوسفیان! یہ رسالت و نبوّت ہے بادشاہت نہیں ہے۔" (۳۵)

ابوسفیان کا یہ ذہن ترجمان ہے اِس حقیقت کا کہ اس نے اسلام کی حقانیت کے بجائے حضورؐ کے جاہ و حشمت کے سامنے سر جھکایا تھا۔ جس میں حصہ دار بننے کی آرزو اس کے دل میں چھپی ہوئی تھی۔ تاریخ بعدِ رسول شاہد ہے کہ اس نے تنظیم اسلام کو شہنشاہیت کے قالب میں ڈھال دیا اور تسخیرِ ممالک کی حرص کو جذبۂ دینی سے تعبیر کیا۔

حضورؐ کے داخلۂ مکہ میں اگرچہ زیادہ دشواریاں پیش نہ آئیں پھر بھی مزاحمت ہوئی اور حضورؐ نے اعلان کر دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا، وہ محفوظ و مامون ہوگا۔ اس موقع پر حضورؐ نے اپنی چادر ابوسفیان کے کاندھے پر ڈال دی جو اس کو پناہ دینے کی نشانی تھی ـــــ حضورؐ کا یہ عمل پیغمبرانہ بصیرت کا ترجمان ہے کہ ایمان قابلِ یقین نہ ہو تب بھی ظاہری قبولیت کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ کسی وقت بھی خدا صدقِ دل کی توفیق دے سکتا ہے اور وہ نہیں تو اس کی نسل میں کوئی معاویہ بن یزید پیدا کر سکتا ہے۔

آج آپ نے سات مرتبہ طوافِ کعبہ کیا، پھر حرم میں داخل ہوئے۔ بُت جو نیچے رکھے ہوئے تھے، انہیں اپنے ہاتھ سے توڑا۔ اس کے بعد علیؑ کو اپنے کاندھے پر چڑھایا اور علیؑ نے اونچے بتوں کو اُتار اُتار کر زمین پر پھینکا جو ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔

بُت شکنی کی یہ داستان عقیدت کی آنکھ سے پڑھی جائے تو علیؑ کے مناقب فرشتوں کی زبان سے سُنے جا سکتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ علیؑ شخصیتِ واحد ہیں جنہوں نے رسولؐ کے ساتھ کعبے میں توحید کا علم نصب کیا اور ہماری نظر میں یہی علیؑ کی صحیح منزل ہے۔

سنہ ۳۰ عام الفیل میں علیؑ نے آنکھ کھول کر روئے رسولؐ کے بعد پتھر کے اِن بتوں کو دیکھا تھا تو سوچا ہو گا کہ کیا یہ صنم کدہ ہی میری پیدائش کے لئے رہ گیا تھا؟ اب سنہ ۸ھ میں تقریباً تیس سال کی عمر میں انہوں نے خالقِ مطلق کا شکر ادا کیا کہ ان کا مولد خدا کا گھر کہے جانے کے لائق ہو گیا۔ دوشِ رسولؐ پر بُت شکنی کے بعد ان کی نگاہ اُوپر کی طرف ضرور اُٹھی ہو گی اور فرشتگانِ رحمت اور ہادیانِ برحق کی ارواحِ مُقدسہ نے انہیں مُبارکباد دی ہو گی تب ہی جب وہ دوشِ رسولؐ سے نیچے اترے تو انہیں محسوس ہوا کہ عرش سے فرش پر آ گئے ہیں۔ فرطِ مسرّت سے ان کا چہرہ کِھلا جا رہا تھا اور ہونٹوں پر ایک مَلکوتی تبسم کھیل رہا تھا۔ گویا انہیں وہ سب کچھ مِل گیا ہو جس کو خدا نے انسان کے لئے مقدر کیا تھا۔

محدث دہلوی اس کی منظر کشی میں تحریر فرماتے ہیں۔

"چند بڑے بُت اُونچی جگہوں پر نصب تھے، جن تک ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا ـــــــ اِن میں سب سے اُونچا اور بڑا بُت وہ تھا، جسے ہُبل کہتے تھے۔ علیؑ مرتضٰی کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا۔

یا رسولؐ اللہ! اپنے قدم میرے کاندھوں پر رکھئے اور اِن بتوں کو گرا دیجئے۔

حضورؐ نے فرمایا

اے علیؑ۔ تم میں بارِ نبوّت اُٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔ تم میرے کندھوں پر آؤ اور اِن بتوں کو گرا دو۔

امتثالاً للامر، رسول اللہ کے دوشِ مبارک پر آئے اور ان کو گرایا۔ اس حالت میں حضورؐ نے علیؑ مرتضٰی سے پوچھا۔

"خود کو کیا دیکھتے ہو؟"

عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! میں ایسا دیکھتا ہوں کہ گویا تمام حجابات اُٹھ گئے ہیں۔ میرا سر ساقِ عرش سے جا ملا ہے۔ جدھر میں ہاتھ پھیلاؤں، وہ چیز میرے ہاتھ آجاتی ہے"

حضورؐ نے فرمایا۔

"اے علیؑ! تمہارا کتنا اچھا یہ وقت ہے کہ تم کارِ حق ادا کر رہے ہو اور میرا حال کتنا مبارک ہے کہ میں بارِ حق اٹھائے ہوئے ہوں"

محدث دہلوی نے ہمارے عقائد کی ترجمانی کی ہے لیکن دُنیا اگر علیؑ کی اِس منزلت کی قائل ہوتی تو مسلمانوں کی تاریخ کا دھارا اِس رُخ پہ نہ بہتا جس پر حضورؐ اور ابوسفیان دونوں کے نظریات اِس طرح خلط ملط ہو گئے کہ مستقبل کے آئینے میں انہیں پہچاننا مشکل ہو گیا اور پھر حق پسند آنکھ بھی ان دونوں میں امتیاز نہ کرسکی۔

قیامِ مکہ میں حضورؐ نے لوگوں کو بھیج کر کئی تبلیغی مہمات انجام دیں۔ اِن میں سے خالد بن ولید کو بنی جذیمہ کی طرف روانہ کیا۔

اِس قبیلے سے خالد کی پرانی دشمنی تھی، لہٰذا وہ لوگ ہتھیار باندھ کر آئے۔ خالد حضورؐ کے نمائندے تھے۔ اپنی حیثیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خالد نے ان کے ہتھیار رکھوا لئے، پھر ان کے سو آدمی قتل کر ڈالے۔ اِس کی شکایت اہلِ قبیلہ نے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کی۔ آپ نے تحقیق کی تو واقعہ سچا نکلا۔ حضورؐ غضب میں آئے اور دو تین مرتبہ فرمایا۔

"اے خدا! میں تیرے حضور برأت کا اظہار کرتا ہوں جو خالد نے کیا" (۳۶)

یہ واقعہ اس ذہن کا ترجمان ہے جو نو واردانِ بساط اسلام میں کارفرما تھا انہوں نے دین کے دامن میں پناہ تو لے لی تھی لیکن عرب کی صحرائی کینہ پروری

کو ساتھ لے کر گئے تھے۔ مسلمان انہیں علی کی شجاعت کا مد مقابل بنا کر سیف اللہ کا لقب دے دیں لیکن وہ غیر اسلامی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہی رہے۔ حتیٰ کہ مالک بن نویرہ کی حسین بیوی سے زنا کیا۔ حضرت عمر نے حد جاری کرنے کا اصرار کیا لیکن حضرت ابو بکر نے درگزر سے کام لیا۔ ان کے دور کی تاریخ جس کی شہادت دیتی ہے۔

غزوہ حنین

وادی حنین مکے سے تین میل نواح طائف میں واقع ہے۔ فتح مکہ کی خبر سے وہاں کے قبائل میں کھلبلی پڑ گئی۔ بنی ہوازن، بنی ثقیف، بنی جشم اور بنی سعد نے مالک ابن عوف کی سرکردگی میں مسلمانوں کے خلاف ایک اتحاد کیا اور ۱۲۰ سال کے تجربہ کار سپاہی درید ابن سمیہ کے مشورے پر بمقام "اوطاس" پانچ ہزار کا لشکر لے کر جمع ہو گئے۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی تو شوال ۸ھ کو ۱۲ ہزار مسلمانوں کو لے کر چل پڑے جن میں مکے کے دو ہزار نو مسلم بھی تھے۔ شاہ معین الدین ندوی کے بقول کسی نے کہا۔

"آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے!"

حضرت علیؑ معمول کے مطابق علمدار لشکر تھے ابھی میدان میں صفیں باندھی جا رہی تھیں کہ پہاڑیوں میں چھپے ہوئے دشمن کے تیر انداز حملہ آور ہو گئے۔ حبیب السیر اور روضۃ الاحباب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے خالد بن ولید نے میدان چھوڑا پھر نو مسلم قریش بھاگنے لگے۔ پھر بھیڑوں کے گلے کی طرح دوسرے مسلمان۔ رسولؐ پکار رہے تھے۔

"بیعت رضوان والو۔ کہاں جا رہے ہو"؟

لیکن کسی نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ حضرت براء بن عازب کی روایت ہے

"ہم نے ہوازن پر حملہ کیا تو منتشر و متفرق ہو گئے۔ اس کے بعد ہم غنائم پر متوجہ ہوئے تو انہوں نے جمع ہو کر تیروں کے نرغے میں لے لیا۔ ــــــ یہ جو فرار و پریشانی کی آزمائش ہم پر مسلط ہوئی یہ ہماری ہی غلطی کی بنا پر تھی کہ ہم دنیاوی مال و متاع کی طرف متوجہ اور اس

کے ساتھ متعلق ہو گئے۔ غزوۂ اُحد میں بھی ایسا ہی واقع ہوا تھا۔" (۳۷)

جنگ اُحد کے بعد ہزیمت یاب مسلمانوں کی یہ دوسری بھگدڑ تھی "جس میں حضرت علیؑ، حضرت عباسؓ، ابنِ حارثؓ اور ابنِ مسعودؓ کے علاوہ سب بھاگ گئے تھے۔" (۳۸)

لیکن بھاگنے والے زیادہ دُور نہیں گئے تھے لہذا جب حضرت عباسؓ نے پکارا تو ٹھہر گئے اور آہستہ آہستہ واپس ہونے لگے۔ اس دوران کفّار نے حضورؐ پر حملہ کر دیا مگر جاں نثار سینہ سپر ہو گئے۔ حضرت علیؑ نے بڑھ کر علم بردار شکر ابو جردل کو قتل کر دیا اور شدید لڑائی کے بعد کافروں کو شکست ہو گئی۔ صرف چار مسلمان درجۂ شہادت پر فائز ہوئے، ستر کافر مارے گئے، جن میں سے چالیس کو حضرت علی نے قتل کیا۔

یہ تھا حنین کا معرکہ، اس کے بعد اوطاس میں جنگ ہوئی، جس میں مسلمان کامیاب رہے۔ جنگ حنین کے مفرورین کا ایک گروہ ابھی طائف میں موجود تھا لہذا حضورؐ نے ان کا محاصرہ کر لیا لیکن یہ محاصرہ طول پکڑ گیا اور پندرہ دن گزر گئے۔

ایک دن علیؑ ہوازن و ثقیف کے بتوں کو توڑ کر نواحِ طائف سے پلٹے تو حضورؐ آپ کو تنہائی میں لے گئے اور باتیں کرنے لگے۔

"جب اس خلوت و تنہائی کا زمانہ طویل ہو گیا ——— تو صحابہ کہنے لگے کہ عجب ہے، دُور دراز کی باتیں چچا کے فرزند سے کرتے ہیں اور دوسروں سے نہیں کہتے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: میں ان کے ساتھ راز کی باتیں نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ راز کی باتیں کرتا ہے۔"

ربیع الاوّل ۹ھ میں حضرت علی نے شہرہ آفاق حاتم طائی کے قبیلہ طے کا محاصرہ کیا۔ عدی بن حاتم فرار ہو گیا۔ اس کی بہن سفانہ گرفتار ہوئی۔ حضرت علی نے نہایت احترام کے ساتھ اس کو حضورؐ کی خدمت میں بھیجا اور حضورؐ نے اس کو آزاد کر کے عدی کے پاس واپس بھیج دیا۔ اس حُسنِ اخلاق کے نتیجے میں ۱۰ھ میں وہ خود آکر مسلمان ہوا۔

طائف کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ حضور نے محاصرہ اُٹھا لینے کی ہدایت فرمائی یہ بات صحابہ کو ناگوار گذری۔ انہوں نے کہا۔

"تعجب ہے کہ ہم کوچ کر جائیں اور ہم پر طائف مفتوح نہ ہو۔ یہ کیا صورت ہوئی؟"

اس پر حضورؐ نے ان کی توبیخ و سرزنش کے لئے فرمایا۔

"تم چاہتے ہو تو جنگ کر کے دیکھ لو"

دوسرے دن انہوں نے جنگ کی اور بہت زیادہ زخمی ہوئے اور پشیمان و شرمندہ بھی، پھر کوچ کا حکم بجا لانے پر آمادہ ہو گئے۔ اور سواریوں پر سامان لادنے لگے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا۔

"جب میں نے کوچ کا حکم دیا تو ٹھہر گئے اور توقف کیا، اب خود اس کے خواہاں ہو" کہنے لگے

"یارسولؐ اللہ! ثقیف کے تیروں نے ہمیں چھلنی کر دیا۔ ان پر دعائے بد فرمائیے۔"

حضورؐ اکرم نے فرمایا

"اے خدا! ان کو ہدایت دے اور انہیں اسلام پر میرے قریب لا۔" (۳۹)

غزوۂ تبوک

اسی زمانے میں یہ خبر پھیلی کہ ہرقل روم نے عیسائی عربوں کی مدد کے لئے چالیس ہزار فوج بھیجی ہے جو شام پہنچ چکی ہے، آپ نے حفظِ ماتقدم کے تحت تیس ہزار لشکر لے کر پیش قدمی کی اور حضرت علیؑ کو مدینے میں قائم مقام بنا کر چھوڑا۔ اس پر علیؑ نے عرض کیا۔

"یارسولؐ اللہ! میں کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا۔ کیا وجہ ہے کہ اس مرتبہ مجھے چھوڑے جا رہے ہیں؟"

فرمایا۔

"اے علی! کیا تم اس سے راضی نہیں کہ بمنزلۂ ہارونؑ جو موسیٰ علیہ السلام سے نسبت ہے، مجھ سے تمہاری نسبت ہو لیکن فرق یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام نبی تھے

اور میرے بعد کسی کو نبوّت نہ ہوگی "

پھر آپ نے مقام جرب با دیں اِس کی صراحت فرمائی۔ جب علیؑ نے جا کر کہا :

لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے ناراضگی کے سبب چھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا

" لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ میں نے تمہیں اس لئے چھوڑا ہے کہ تم میرے اہلِ بیت میں میرے خلیفہ ہو اور ان کی دیکھ بھال کر سکو" (۴۰)

ابوالفدا نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ جاؤ۔ میری خلافت کرتے رہو۔

حضرت علیؑ کی واپسی کے بعد حضورؐ آگے بڑھے اور منزلِ تبوک پر پہنچے لیکن عیسائی اِس لشکر کو دیکھ کر مرعوب ہو گئے۔ کوئی مقابلے پر نہ آیا۔ پھر بھی اس کے نتائج بہت اچھے نکلے۔ ایلہ کے سردار یوحنا نے حاضر ہو کر جزیہ دینا قبول کیا اور ایک خچر پیش کیا۔ آپ نے اس کو ایک ردا مرحمت فرمائی۔ جربا اور اذرح کے عیسائیوں نے جزیہ منظور کیا۔ دومۃ الجندل کے حاکم کے لئے خالد بن ولید کو بھیجنا پڑا۔ اس نے خود مدینے آ کر اطاعت قبول کی۔

واپسی پر عُقبہ ذی فتق نام کی ایک گھاٹی پڑتی تھی جو سواری کے لئے خطرناک تھی۔ اِس لئے حذیفہ نے ناقے کی مہار تھامی، اور عمار اس کو ہنکاتے ہوئے چلے ناگاہ بجلی کی چمک میں تھوڑے فاصلے سے چند نقاب پوش سوار نظر پڑے۔ حضورؐ نے حذیفہ سے فرمایا کہ یہ منافق ہیں، مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر آپ نے ان کے نام بھی بتا دیئے، اور کہا کہ اِس راز کو ظاہر کروگے تو وہ لوگ کھُل کر سامنے آجائیں گے ـــــــ بات پھر وہی مصلحتِ پیغمبری کی تھی کہ یہ لوگ ابھی اسلام کا نام تو لیتے ہیں!

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد حضرتِ عمر نے کئی مرتبہ حضرت حذیفہ سے ان لوگوں کے نام پوچھے مگر حذیفہ نے بتائے نہیں۔ حضرت عمر کو بے چینی تھی کہ نہ معلوم کس کس کے نام بتائے ہوں!

وادیٔ الرمل

تبوک میں علیؑ کو ساتھ نہ جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مدینے سے پانچ منزل پر وادیٔ الرمل میں کچھ کافر عرب جمع ہو گئے تھے جن کی طرف سے شب خون کا خطرہ تھا لہٰذا حضورؐ نے حضرت علیؑ کو مدینے ہی میں چھوڑا تھا کہ بعد رسولؐ اگر کوئی اہل بیت اور مسلمانوں کی حفاظت کر سکتا تھا تو صرف علیؑ۔

واپس آتے ہی آپ نے پہلے حضرت ابوبکر کو بھیجا، وہ شکست کھا کر واپس آئے پھر آپ نے حضرت عمر کو بھیجا، انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر عمر عاص کو روانہ کیا۔ ان کا انجام بھی پہلوں جیسا ہوا۔ آخر میں حضرت علیؑ کو علم دے کر روانہ کیا۔ جنگ مخدوش تھی۔ حضرت علیؑ نے عام راستہ چھوڑ کر صرف رات میں سفر کیا اور نہایت خاموشی سے دشمن کے سر پر جا پہنچے۔ وہ فوج جو ابتداءً تین بہادروں کو بھاگنے پر مجبور کر چکی، وہ خود میدان سے منہ موڑنے پر مجبور ہو گئی اور علی مظفر و منصور واپس ہوئے۔

صاحب معارج النبوہ نے لکھا ہے کہ جاتے وقت بھی حضورؐ نے خود کھڑے ہو کر علی کو رخصت کیا تھا، واپسی پر بھی استقبال کیا اور خوشنودی کی سند عطا کی۔

سورۂ برأت

۹ھ میں حضورؐ نے تین سو آدمیوں کے ساتھ حضرت ابوبکر کو حج کے لئے سورہ برأت دے کر روانہ کیا مگر تھوڑی دور جاتے ہی واپس بلا لیا، اور حضرت علی کو ان کے بجائے متعین فرمایا۔ آپ مکے پہنچ کر خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اعلان فرمایا۔ آج کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ برہنہ ہو کر طواف کرے گا جس شخص سے رسول اللہؐ نے کوئی عہد و پیمان کیا ہے وہ عہد اس وقت تک نافذ و قائم رہے گا، جب تک اس کی میعاد ختم نہ ہو جائے۔ باقی لوگوں میں سے ہر ایک کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی کا کوئی حق رسولؐ پر باقی نہیں رہے گا۔

اِسی طرح دس آیتیں آپ نے پڑھ کر سنائیں، پھر قربانی کر کے اور دُوسرے واجبات انجام دے کر واپس ہو گئے۔

حضرت ابوبکر نے حضور سے اپنے واپس بلانے کی وجہ پوچھی

تو آپ نے فرمایا کہ اس فرض کو میں خود انجام دیتا یا وہ جو میرے

اہل میں ہوتا! (۴۱)

آنحضرتؐ کا یہ فیصلہ اُمورِ دینی میں مستقبل کے ہر مسئلہ نیابت کو حل کر دیتا ہے اس سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ "میرے اہل" میں حضرت ابوبکر یا ان جیسی کوئی شخصیت نہیں آتی، اِس تعریف میں تو علیؑ اور صرف علیؑ آتے ہیں۔

"میرے اہل" کے معنیٰ کو اگر محدود کر دیا جائے تب بھی اِس حقیقت میں شک نہیں رہتا کہ مہماتِ اسلامی کی انجام دہی خود رسالت مآب فرماتے یا جو اس کا اہل ہوتا ـــــ اور حضرت ابوبکر اہل نہ تھے۔

یہ تھی صرف ایک سورۃ کے اعلان کی بات، اس کے مقابلے پر اُس منصب کو پرکھا جائے جس سے پورے قرآن اور پورے اسلام کے استقرار کا مرحلہ وابستہ تھا تو کیا سورۂ برأت کا نا اہل اُس منصب کا اہل قرار پا جائے گا؟

یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ ہم منطقی طور پر سوچیں اور کوئی تاویل نہ کر سکیں تو ابوعبیدہ بن الجراح کے لب ولہجہ میں یہ کہہ دیں کہ اب تو جو ہونا تھا، وہ ہو گیا اور ایک صریحی ظلم میں عدل کے پہلو پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں۔

بعض دوسرے مواقع کی طرح آنحضرتؐ نے اِس موقع پر بھی صاف کر دیا تھا کہ آپ کی نیابت اگر کوئی کر سکتا ہے تو علی ہی۔ حضرت ابوبکر یا کسی اور کو ہرگز اس کا حق نہیں پہنچتا، لیکن اقتدار کی ہوس نے رسُول کے ہر قول اور ہر امید کو پامال کر دیا جس کے نتیجے میں تاریخ اسلام کا دامن اولادِ رسُول کے خون سے رنگین ہوتا رہا اس حق تلفی کے ذمہ دار بہر طور جس کے جواب دِہ ہیں۔

اِس سال عرب کے مختلف حصّوں سے وفود آئے اور مشرف بہ اسلام ہوتے

حضرت علیؑ نے عدیؓ بن حاتم اور مالکؓ بن نویرہ سے خود جا کر زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم وصول کیں اور یمن میں قبیلہ ہمدان کو مسلمان کیا اور ان سے خمس وصول کیا۔ اس خمس میں چند کنیزیں بھی تھیں۔ حضرت علیؑ نے ان میں سے ایک کنیز اپنے لئے منتخب کر لی جس کی شکایت بریدہ اسلمی نے حضورؐ سے کی اور حضور نے بسند مدارج النبوہ، فرمایا۔

"علیؑ کی شان میں بدگمانی نہ کرو کیونکہ وہ مجھ سے ہیں اور میں اُن سے ہوں"۔

انہیں دنوں حضورؐ نے کساء میں فاطمہؑ، ان کے شوہر اور بچوں کو لے کر اپنے اہلِ بیت ہونے کا اعلان کیا۔ آیۂ تطہیر نازل ہوئی، پھر حضورؐ کچھ وقفے سے حجتہ الوداع کے لئے روانہ ہوئے۔

حجتہ الوداع

اس سفر کا التزام حضورؐ نے خاص طور پر کیا تھا۔ جناب سیّدہ اور تمام امہات المومنین ہمرکاب تھیں۔ اصحاب کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ مکّے تک مسلسل رُشد و ہدایت کے دریا بہاتے رہے، قربانی اور مناسکِ حج ادا فرمائے اور اتنے گراں قدر خطبات دیئے جو رہتی دُنیا تک انسانیت کے لئے مشعلِ راہ رہیں گے

۱۴ ذی الحج کو مکّے سے چل کر ۱۸ ذی الحج کو خُم غدیر میں اقامت پذیر ہوئے جہاں آیۂ بلغ کا نزول ہوا۔ حضورؐ نے پالانِ شتر سے ایک منبر بنوایا اور حضرت بلالؓ سے کہا کہ اصحاب کو جمع کریں۔ حضرت بلالؓ نے آواز لگائی۔

"حیّ علیٰ خیر العمل ———— !"

ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ دیکھتے ہی دیکھتے جمع ہو گئے۔ آپ نے سرِ منبر پہنچ کر حضرت علیؑ کو اپنے برابر کھڑا کیا اور خطبہ دینا شروع کر دیا۔ فصاحت و بلاغت کے چشمے اُبل رہے تھے اور وصیت کے طور پر آپ مسلمانوں سے فرما رہے تھے۔

"میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جو ایک دوسرے سے بزرگ تر ہیں۔ ایک ہے قرآن کریم، دوسرے میرے اہلؑ بیت

دیکھو، میرے بعد اِن دونوں چیزوں میں احتیاط کرنا کہ کس طرح تم اِن سے سلوک کرتے ہو اور کیسے اِن کے حقوق ادا کرتے ہو۔ یہ دونوں چیزیں میرے بعد ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہ ہوں گی، یہاں تک کہ تم حوضِ کوثر کے کنارے مُجھ سے آکر ملو ـــــ " حق تبارک وتعالیٰ میرا مولا ہے اور میں تمام مسلمانوں کا مولیٰ ہوں"۔ (۴۲)

پھر آپ نے علی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بلند کیا۔ اتنا بلند کہ پورا مجمع دیکھ لے۔ آپ نے فرمایا۔

"جس کا میں مولیٰ ہوں یہ علیؑ بھی اُس کے مولیٰ ہیں۔ اے خدا! تو بھی اسے دوست رکھ جو ان کو دوست رکھے، اور تو اس کو دشمن رکھ جو علیؑ کو دشمن رکھے"۔ (۴۲)

ایک دوسری روایت قدرے اضافے سے ہے

"مدد کر اس کی جس نے علیؑ کی مدد کی اور ذلیل کر اُسے جس نے علیؑ کو چھوڑا اور حق کو علیؑ کے ساتھ لازم کر جس طرف علی ہوں"۔ (۴۲)

بحوالہ مشکوٰۃ علامہ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان حقائق پر مبنی ہے جس کی تصدیق صحیح مسلم اور دوسری کتابوں سے بھی ہوتی ہے۔ پھر حضورؐ منبر سے اُترے علی کے سر پر سیاہ عمامہ باندھا اور ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیا جو مبارک باد دینے کے لئے بڑھ رہے تھے۔ جبرئیلؑ بھی عرش سے ہدیۂ تبریک پیش کرنے کو آئے تھے آپ نے آنحضرتؐ کو تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا مژدہ سُنایا۔

واقعۂ مباہلہ

سنہ ۶ ھ کے آخر میں سلاطین کے بعد آپ نے مشہور و معروف کلیساؤں کو بھی دعوتِ اسلام دی تھی۔ اِس پر بنی نجران کا بزرگ راہب عبدالمسیح عاقب ایک وفد کے ساتھ مدینے آیا۔ آنحضرتؐ سے کافی مباحثہ ہوا مگر وہ قائل نہ ہو سکا۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔

"پیغمبر! ان سے کہو کہ اپنے نفسوں کو، اپنی عورتوں کو اور اپنے بیٹوں کو لا کر مباہلہ کریں۔"

عاقب نے منظور کر لیا اور ۲۴ ذی الحجہ ۱۰ھ کو اپنا وفد لے کر آ گیا۔ آنحضرت اپنے اثاثہ نبوت کو ساتھ لے کر برآمد ہوئے۔ آپ کے داہنی طرف فاطمہ زہرا بائیں طرف حسنین اور پشت پر علی دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ نصارائے نجران نے ان پر نظر ڈالی تو سکتے میں رہ گئے۔ چہروں کے تقدس، انداز کی پاکیزگی اور بشروں کی نورانیت نے ان کو ہکا بکا کر دیا۔ اپنے اندر سے انہیں ایک آواز سنائی دی۔

"انہوں نے اگر ہم پر لعنت کی اور بد دعا کر دی تو ہم ہرگز نہ بچیں گے ——!"

چند لمحات تک ایک تحیر اور سراسیمگی کا عالم رہا پھر مقدس راہب ایک فیصلہ کر کے آگے بڑھا

"ہم آپ سے مباہلہ نہیں کر سکتے ——؟"

حضور نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس نے آپ کی سرپرستی میں رہنا قبول کیا اور خراج و جزیہ دینے کا وعدہ کر لیا۔

اس واقعہ کو ہر مورخ نے لکھا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ مباہلے میں یہی افراد گئے تھے۔

خدا کے نزدیک پیغمبر اسلام کے متعلقین میں کوئی بچہ، کوئی مرد یا کوئی عورت ہوتی تو آپ اس کو ضرور شامل کرتے یعنی صرف اتنے ہی افراد پر مشتمل آپ کا پورا گھر تھا۔ اس کھلے اعلان کے بعد جو بھی اہل بیت میں شمولیت کا دعویٰ کرے وہ باطل ہوگا (۴۳)

آخری لمحات

حجتہ الوداع سے واپسی پر سرور کائنات کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ یہودی عورت نے خیبر میں جو زہر دیا تھا۔ اس کے اثرات اب نمایاں ہو رہے تھے آہستہ آہستہ آپ کی بیماری کی خبر عام ہو گئی، نتیجتہً عرب کے مختلف حصوں میں مدعیان نبوت بھی پیدا ہو گئے اور قیصر روم کی طرف سے حملے کا خطرہ بھی بڑھ گیا۔ لہذا آنحضرت

نے اُسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجنے کا فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ علیؑ کے علاوہ انصار و مہاجرین میں سے ہر شخص اُسامہ کے ساتھ جائے گا۔ جو اس جنگ میں نہ جائے گا، اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے اُسامہ کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرکے روانہ کیا اور اُسامہ مدینے سے تین میل فاصلے پر بمقام جرف مجاہدین کو جمع کرنے لگے۔ بڑی کثرت سے لوگ جمع ہوگئے لیکن حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہم میں سے کوئی نہیں آیا۔ اُسامہؓ نے ان کا انتظار کیا اور آخر آگے کی طرف چل پڑے مگر وہ بہت دور نہیں گئے تھے کہ حضورؐ کا وقتِ آخر ہونے کی خبر سُنی لہٰذا اسی مقام پر رُک گئے۔ (۴۲)

محدث دہلوی نے اس نافرمانی کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس کا سبب یہ لکھا ہے کہ اُسامہ کم سن تھے اور یہ لوگ جہاندیدہ اور جنگ آزمودہ، پھر ایک غلام زادے کی امارت پر بھی انھیں اعتراض تھا جس کی تلافی بعد میں کر دی گئی۔ عذرِ گناہ بدتر از گناہ محدث دہلوی تہہ تک نہیں پہنچ سکے۔ اصل اعتراض علیؑ کے روک لینے پر تھا اور وہ حالات پیشِ نظر تھے کہ حضورؐ کا رشتۂ حیات کسی وقت بھی منقطع ہو سکتا ہے اگر ان سب کی عدم موجودگی میں ایسا ہوتا تو جو منصوبہ ذہنوں میں ترتیب پا رہا تھا، اس پر عمل نہ ہو سکتا لہٰذا ایک منظم گروہ کی کوئی فرد جانے پر تیار نہیں ہوئی۔

اس خیال کو مستقبل کے واقعات پر منطبق کیا جائے تو صداقت کی تصدیق ہو جائے گی اور نیتوں کا وہ ثبوت مل جائے گا جس کو صرف عقلی قیاس اور ماضی کی روش سے سمجھا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ حضورؐ کی جو حالت تھی، اس سے ہر دیکھنے والا سمجھ لیتا کہ وقتِ آخر آپہنچا ہے۔ آپ کبھی جنت البقیع جاتے کبھی شہدائے بدر و اُحد کے لئے دعائے مغفرت کرتے اور موقع موقع سے لوگوں کو تلقین کرتے کہ راہ سے بے راہ نہ ہونا۔

مرض نے جب تک چلنے پھرنے کی اجازت دی، اُس وقت تک آپ ازواج کی باریوں پر ان کے گھروں میں استراحت فرماتے رہے، پھر ایک روز تمام ازواج کو جمع کر کے فرمایا۔ اب وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ہر ایک کے گھر پہنچ سکیں، کسی ایک جگہ ہی رہ سکتے ہیں۔ جہاں بھی وہ قیام کریں، ساری ازواج وہیں جمع ہو جائیں اس پر سب نے متفقہ طور پر جناب عائشہ کا گھر تجویز کر دیا۔ بیشتر مورخین نے اسی کو ایک دوسرے سے نقل کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ہماری روایات معتبرہ اس کی نقیض کرتی ہیں۔ اس روایت کے پسِ پردہ اسی جذبے کی کارفرمائی ہے کہ اُم المومنین عائشہ کا شرف بڑھایا جائے اور پیغمبر کی جواں سال اور خوبصورت بیوی پر فریفتگی کو دکھا کر ثابت کیا جائے کہ دم بھی انہیں کی آغوش میں نکلا۔ اس طرح آپ کی وہ سیرت سامنے آتی ہے جس میں جنسیات کا غلبہ بھی ہے اور نفسانیت کا پَرتو بھی اور وہ باتیں بھی جن سے دُور کے آدمی کو وہ خدا کے فرستادہ سفیر کے بجائے ایک صاحبِ ذوق شہنشاہ نظر آتے ہیں۔

ہم تک ہمارے آئمہ کی جو روایت سینہ در سینہ پہنچی ہے، وہ مختلف ہے حضرت خدیجۃ الکبریٰ آپ کی واحد شریکِ حیات تھیں، لہذا آپ نے پہلی باری ان کی بیٹی فاطمہ زہرا کو دی تھی اس کے بعد جو بیویاں رفیقۂ حیات بنیں، ان میں آنحضرتؐ نے عدل برقرار رکھا۔ شریک اور رفیق کے فرق سے ان کے درجات کا تعین کیا جا سکتا ہے ہماری روایات کی رُو سے آپ نے آخری لمحات چہیتی بیٹی کے گھر میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور ہر بیوی نے اس پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت عائشہ کو کچھ تامل تھا مگر بولیں کچھ نہیں۔

روایتی تاریخ کے معروضات پر اگر ہمارے اس علم کی تردید کی جائے تو اصلی اور وضعی روایات کی حقیقت بھی موقع محل سے گوش گزار کی جائے گی اور اس نتیجے پر پہنچنے کا پس منظر اور پیشِ منظر تحریر کیا جائے گا جو ہمارے علماء کی موقر تالیفات میں موجود ہے۔

بہر حال حضورؐ جس عالم میں بھی تھے اس میں بڑی تیزی سے اپنی منصبی ذمہ داریاں پوری کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ کو معلوم تھا کہ آپ کا وقت پورا ہو چکا ہے لہذا زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑنا چاہتے تھے مسلمانوں کو بار بار مستقبل کا لائحہ عمل دے چکے تھے جو کچھ کہنا تھا، واضح الفاظ میں کہہ چکے تھے، ہر ایک کی نیت سے بھی واقف تھے۔ لیکن بھٹکنے والے کو آخری سانس تک سنبھلنے کا موقع دینا آپ کا فریضۂ نبوت تھا تبلیغات کے کتنے ہی شاگرد تلمیذ الرحمٰن کے سامنے زانوے ادب تہہ کر چکے تھے اور مدعیِ اسلام تھے مگر آپ ان میں سے کسی کو جھٹلانا نہ چاہتے کیونکہ نہ آپ توفیقاتِ الٰہی سے مایوس تھے اور نہ ان کو کرنا چاہتے تھے۔ تاہم اسی حالت میں آپ نے اتمام حجت کی کوشش کی۔ عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے۔

"جب رسولؐ اللہ کے مرض الموت میں زیادتی ہوئی تو فرمایا کہ مجھے دوات اور کاغذ دو تاکہ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھ دوں۔ جس کی وجہ سے تم میرے بعد گمراہ نہ ہو۔ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا کہ پیغمبرؐ صاحب علیہ مرض کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں۔ ہمارے لئے کتابِ خدا کافی ہے۔ چنانچہ جب اس بات پر شور و غل ہوا تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ تم لوگوں کو لازم نہیں کہ میرے حضور میں تنازع اور اختلاف کرو"۔

"اسی پر عبداللہ ابنِ عباس فرمایا کرتے تھے کہ مصیبت اور عظیم مصیبت تھا وہ اختلاف جو ہمارے اور کتابتِ آنحضرتؐ کے درمیان حائل ہوا"۔ (۴۵)

شہاب الدین خفاجی کتاب نسیم الریاض شرح شفای قاضی عیاض میں اس کی صراحت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے حضورؐ پر ہذیان بکنے کی تہمت رکھی تھی۔ مسند احمد ابن حنبل اور صحیح مسلم نے بھی سعید ابنِ جبیر کے حوالے سے لفظ ہذیان استعمال کرنے کی تصدیق کی ہے۔ امام غزالی نے اپنی کتاب سر العالمین میں حضرت عمر کے الفاظ نقل کئے ہیں "چھوڑو اس مرد کو، یہ ہذیان بک رہا ہے"۔ حتیٰ کہ صحیح بخاری

میں دو مقامات پر اس کا تذکرہ ہے۔ البتہ محدث دہلوی اور مولانا شبلی وغیرہ نے الفاظ کا گورکھ دھندا بنا کر حضرتِ عمر کی گستاخی کو دائرہ تہذیب میں لانے کی سعی کی ہے مگر حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ حضور کو قلم دوات دیا نہیں گیا اور آپ نے برہم ہو کر سب کو باہر نکال دیا۔

پھر آپ نے بروایت روضۃ الاحباب حضرت فاطمہؑ سے کہہ کر پہلے حسنینؑ کو کو بلوایا۔ انہیں پیار کیا، پھر علیؑ سے کچھ راز و نیاز کیے، کچھ وصیتیں کیں اور دیر تک آپ کے کان میں کچھ فرماتے رہے۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ اس دوران باہر کھڑے ہوئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے ملاقات کی خواہش کی مگر آپ نے منع کر دیا۔

وفات

حضرت عائشہ بار بار فرماتی ہیں کہ رسولؐ کا سر میرے زانو پر تھا مگر یہ اچھے دنوں کی بات ہے۔ بیماری میں تو جب آپ اٹھ کر بیٹھے، سر اقدس علی ہی کے سینے پر ٹیکا رہا اور لیٹے تو کبھی زانوئے علیؑ پر اور کبھی زانوئے جناب سیدہؑ پر رکھا۔ شہزادیؑ کونین فرماتی ہیں کہ بابا کا سر میرے زانو پر تھا کہ کسی بشر نے اذنِ حضوری چاہا میں نے منع کر دیا، پھر اس نے آواز دی تو میں نے کہا۔ واپس جا۔ تیسری بار اس کی بھیانک آواز آئی تو بابا نے غفلت سے چونک کر فرمایا۔

"بیٹی! یہ ملک الموت ہے۔ تیرے در کا اعزاز ہے کہ بغیر اجازت اندر نہیں آسکتا۔ اجازت دے دو اسے۔"

میں نے مجبوراً اندر آنے کو کہہ دیا اور چند لمحے بعد بابا نے آنکھیں بند کر لیں (۴۶)

اور خلقتِ کائنات سے پہلے پیدا ہونے والا نور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

تجہیز و تکفین

۲۸ صفر ۱۱ھ، دوشنبے کے دن دوپہر کو خانۂ سیدہؑ میں برپا ہونے والا کہرام

اتنا قیامت خیز تھا کہ اس نے سکان عرش میں ایک لرزہ پیدا کر دیا۔ گھر کے باہر کھڑے ہوئے مہاجر و انصار کس حد تک اس دلدوز سانحے سے متاثر تھے، اس کا صحیح اندازہ تو نہ ہو سکا البتہ حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے سُنا گیا کہ کوئی حضورؐ کو مُردہ کہے گا تو وہ منٹ سے اس کی کھال اُڑا دیں گے۔ ایسا ہی مظاہرہ وہ مسجد میں جا کر بھی کرتے رہے ـــــ حضرت ابوبکر موجود نہ تھے وہ اپنے دیہات کے مکان گئے ہوئے تھے جو شہر سے دو ڈھائی میل واقع تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ آگئے اور حضرت عمر کو انہوں نے سینے سے لگا کر تسلی دی، تو حضرت عمر کی وہ کیفیت دُور ہو گئی۔ پھر دونوں سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف چلے گئے۔ تجہیز و تکفین کے لئے صرف بنی ہاشم اور تھوڑے سے صاحبان ایمان رہ گئے جنہوں نے اس غم میں بنی ہاشم کا ساتھ دیا۔

اب مہاجرین و انصار میں صرف گنتی کے لوگ تھے۔ ابو عبیدہ بن الجراح سعد بن ابی وقاص اور ایسے تمام لوگ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ساتھ جا چکے تھے۔ مولانا روم کے الفاظ میں جب دنیا دار صحابہ دُنیا کی محبت میں مبتلا ہوئے تو مصطفٰےؐ کو بے کفن چھوڑ دیا ـــــ اِن میں بیشتر تو اپنے منصوبے کے تحت گئے تھے اور مومنین کامل اپنی قوتِ فیصلہ سے کام لے کر اور ان کی نیّتوں کو بھانپ کر پیچھے ہو لئے تھے کہ دیکھیں، یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟

مدینے کی عورتوں میں شورِ ماتم برپا تھا۔ در و دیوار سے اُداسی برس رہی تھی آسمان کا وہ عالم تھا کہ جیسے ٹوٹ کر زمین پر آ رہے گا۔ فاطمہؑ زہرا اور امہات المومنین دفورِ غم میں نڈھال ہو رہی تھیں۔ ایمان والے پچھاڑیں کھا رہے تھے، پھر بھی حضرت علیؑ اور دوسرے ہاشمی فرض سے غافل نہیں ہوئے۔ ابو طلحہؓ نے قبر کھودی۔ علیؑ نے غسل دیا۔ جس میں عباسؓ اور قثمؓ نے مدد دی۔ اُسامہؓ اور شقرانؓ نے پانی ڈالا۔ غسل و کفن کے بعد حضرت علیؑ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ لاش قبر میں اُتاری۔ پھر علیؑ قبر سے باہر نکل آئے اور مکّے کے پردیسی کو ارضِ مدینہ کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سُپردِ خاک کر دیا گیا۔

اِن سب کو سقیفہ بنی ساعدہ کی سازش کی خبر ہو چکی تھی اور علیؑ کو بہر طور اتمامِ حجت کرنا تھا لہٰذا آپ حضورؐ کی یہ آخری خدمت انجام دے کر سیدھے سقیفہ آئے جہاں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، ابوعبیدہ اور چند دوسرے لوگ رہ گئے تھے باقی لوگ اپنی دُنیا سُدھار کر گھروں کو جا چکے تھے۔ علیؑ نے خلافتِ الٰہیہ کے منصب پر کھڑے ہو کر انہیں اپنی غلطیوں پر انتباہ دیا اور اُلٹے قدم واپس ہو گئے۔

سقیفہ کا انتخاب مسلمانوں کی تاریخ کا ایک المیہ ہے لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ علیؑ کو اس کا صدمہ ہوا۔ علیؑ نے یا فاطمہ زہراؑ نے اِس کے بعد جو کچھ کیا، وہ صرف دُنیا والوں کی تسکین کے لئے اور اپنا دنیاوی حق جتانے کے لئے، ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ رسولؐ کے بعد وہ منصوص من اللہ امام تھے اور اب تحفظ و بقائے شریعت کی ذمہ داری ان کی تھی۔ نظم و نسق کی باگ ڈور کوئی بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا، انہیں اس کی پرواہ نہ تھی۔ ہاں اگر رسولؐ کی طرح یہ منصب بھی انہیں مل جاتا تو اچھا تھا۔ تبلیغ و اشاعتِ اسلام اسی انداز پر ہوتی رہتی جس کی نظیر حضورؐ نے پیش کی تھی۔ دُنیا والوں نے جاہ و منصب کے لئے اپنا راستہ الگ بنا لیا تو نہیں اس کے لئے مسلمانوں کو کسی خلفشار میں مُبتلا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا آپ اُلٹے قدم واپس پلٹ پڑے اور اہلِ سقیفہ اپنی کامیابیوں سے سرشار اسلام کی ایک نئی راہ متعین کرنے میں لگ گئے۔

تکمیلِ نبوّت

کائنات کا سب سے پہلا انسان نبی تھا۔ اللہ کی طرف سے برگزیدہ اور خالص مشیت نے جب اسے بنانا چاہا تو کسی نے آب و گِل سے اس کا خمیر تیار کیا، کسی نے پُتلا بنایا اور منشائے الٰہی نے اس میں رُوح پھونک دی۔ پھر اس کا نام آدمؑ رکھا گیا جو آدمی کا نقشِ اوّل ہے۔ اس میں شعور پیدا کیا گیا۔ شعورِ آدمیت اور شعورِ نبوّت اور اس کا لقب صفی اللہ قرار دیا گیا۔

شعور میں خود شناسی اور خدا شناسی دونوں شامل تھے۔ یہ کہنا عقلِ سلیم

کے خلاف ہوگا کہ علم سے بہرہ ور نہیں کیا گیا۔ اس سے عین علم کے عدل پر حرف آتا ہے کیونکہ وہ نمونۂ نبوت بھی تھا اور تمثیلِ آدمیت بھی۔ علیم نے علم دیا تھا تو اپنے ہی علم کا کوئی جز ویقیناً دیا ہوگا اور علیم کا علم ہر زمان و مکان سے ماوراء ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آدم پڑھے پڑھائے، نکھرے نکھرائے عرش سے زمین پر اُتارے گئے۔

ملائکہ نے اپنے رب سے کہا تھا کہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے آدم اشرف المخلوقات تھے، ان کا علم یقیناً ملائکہ سے زائد ہوگا۔ اس علم کی حدود متعین نہیں کی جا سکتیں مگر وہ خدا کے علم سے مشتق و مُستعار تھا اس لئے اتنا ضرور ہوگا کہ فرشتوں کی زبان سمجھ سکے اور دنیا کے کسی لب ولہجہ سے نابلد نہ ہو۔

آدم کی نظیر کا اطلاق ہر نبی پر ہوتا ہے اور محمد مصطفےٰ تو خاتم النبیین اور آخر المرسلین تھے اور مسلمانوں کی عام اصطلاح میں محبوبِ ربّانی بھی۔ ان کے لئے خالقِ مطلق نے کیا کسر اُٹھا رکھی ہوگی۔ آپ کا علم ماضی، حال اور مستقبل سب پر محیط تھا۔ پھر بھی نبوّت کی حدود و قیود میں آپ کو اپنے دین کی اشاعت کرنا تھی اور بگڑے ہوئے انسان کو سدھارنے کے لئے اس کی سطح کو ملحوظ رکھنا تھا۔ اس کے لئے کسی ایک زندگی کی قید نہ تھی۔ اصلاح کا سلسلہ ایک نسل سے دوسری نسل میں بھی جا سکتا، مُبلّغ بھی ایک پُشت سے دوسری پُشت میں پیدا ہو سکتا تھا اور اپنے پیش رو کے ادھورے کام کو پورا کر سکتا تھا۔ سلسلۂ انبیاء جس کی بیّن دلیل ہے۔

نبوت آنحضرتؐ کی ذات پر ختم ہو گئی تھی۔ لہٰذا خلاقِ عالم نے دعائے ابراہیمؑ کو قبول فرما کر امامت کا ایک سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ جس کی ذمہ داری حضورؐ کے اجمالی کام کی صراحت تھی اور جن کا کام ان انبیاء جیسا تھا جو ہر مُرسل کے بعد ایک تواتر سے آتے رہے تھے اور اپنے پیش رو کی شریعت کا نفاذ جن کا منصب تھا۔

حضورؐ کے بعد اس کام کے لئے بارہ امام مختص کئے گئے تھے، جن کا کام حضورؐ کی بنائی ہوئی ڈگر پر چلنا اور اُمّت کو چلانا تھا۔ اس ڈگر پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر

ڈالی جائے تو ایک ذقت وہ نظر آتا ہے، جب آپ ایک عورت کا ہاتھ تھامے اور ایک بچے کی انگلی پکڑے ایستادہ دکھائی دیتے۔ پشت پر نسل سام کا ایک بوڑھا انسان قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھے نظر آتا ہے جس کے چہرے پر سیادت کا جلال اور بشرے پر استقامت کا کمال ہے اور جس کے تیور عرب کے صنم پرست ماحول کو للکار رہے ہیں کہ اس بچے نوجوان پر کوئی انگلی بھی اُٹھائے گا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

پھر یہ نوجوان آگے بڑھتا ہے، لوگ آتے رہتے ہیں اور کارواں بنتا جاتا ہے ایک دن یہ کارواں بے سردار ہو جاتا ہے تو اسی بوڑھے سامی کا چھوٹا بیٹا باپ کے مشن کو پورا کرتا ہے جس کو خدا ازل سے یہ منصب سونپ چکا تھا۔

حضورؐ نے مُنہ زور، باغی، اور جاہل عربوں کو انسانیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی مگر وہ محسوس کرتے کہ ان وحشیوں کی روحیں اس پاک و پاکیزہ جامے میں گھبرا رہی ہیں اور وہ بار بار اس کو اُتار پھینکنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن حضورؐ ان کو اس کا موقع نہ دینا چاہتے کیونکہ بظاہر انہوں نے سر تسلیم تو خم کر دیا تھا اور زبان پر کلمہ لا الہ بھی جاری کر لیا تھا تاہم آپ دیکھ رہے تھے کہ بار بار ان کی نظریں ماضی کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔

فطرتِ انسانی یہ ہے کہ نئے ماحول کا اثر قبول کرنے میں دقت لگتا ہے جنگلی پودا متمدن آب و ہوا میں لاکر لگایا جائے تو جڑ پکڑنے میں دیر لگتی ہے، کوئی پودا بہت جلد شاداب ہونے لگتا ہے، کوئی وقت لیتا ہے اور کوئی سوکھنے لگتا ہے۔ حضور خدا کے بھیجے ہوئے ایسے باغبان تھے جو ہر قسم کے پودے کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وہ سوکھنے والے پودے سے بھی مایوس نہ تھے۔

یہی سبب تھا کہ عبداللہ بن اُبی کے سے منافقوں کو بھی آپ نے دائرہ اسلام سے نہیں نکالا اور فتح مکہ کے دن جب ابو سفیان نے مُنہ پر مصلحتِ اسلام کا نقاب ڈال لیا تو بھی آپ نے اپنی ردا اُتار کر اس کو دے دی کہ شاید اس کرم فرمائی سے سر کے ساتھ دل بھی جھک جائے اور وہ جو مقرب بارگاہ تھے، ان کے دلوں کے

کھوٹ جب چہروں سے آشکار ہوئے، تب بھی آپ نے چشم پوشی سے کام لیا اور برابر اصلاح کے مواقع دیتے رہے، کیونکہ چور کو چوری کرتے وقت پکڑ لیا جائے تو وہ حملہ کر دیتا ہے۔ آپ نے نام نہاد مسلمانوں کو بغاوت کرنے کا موقع نہیں دیا اور جھوٹوں کو سچا کہتے رہے کہ شاید کبھی شرما کر سچ بول دیں۔

یہی سنت آپ مسلک ہدایت میں علی اور ان کے جانشینوں کے لئے چھوڑ گئے علیؑ اپنے منصب سے آشنا تھے۔ حضورؐ کا صراطِ مستقیم آپ کے سامنے تھا۔ لہٰذا مسلمانوں نے جو کچھ کیا، آپ نے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا، کیونکہ آپ کو تو ہر سطح پر ان کی اصلاح کرنا تھی، خواہ سوقِ مدینہ میں ہوتے یا تختِ خلافت پر، علی امام تھے اور وہ ماموم۔ یہ تو ان کی سمجھ کی بات تھی کہ انہوں نے حکومت کو جزوِ رسالت سمجھ لیا تھا۔ علیؑ کو تو انہیں بتانا تھا کہ نبی حضرت ایوبؑ بھی تھے اور نبی جناب سلیمانؑ بھی۔ خاتم النبیین سب کے وارث اور مجموعۂ سُنن انبیاء تھے۔ ان کی زندگی میں ہر نبی کی سیرت دیکھی جا سکتی تھی۔

اسی مسلک پر تمام آئمہ کو چلنا تھا جس کی ابتدا علیؑ سے ہوئی۔

حضورؐ کی تریسٹھ سال کی زندگی اتنی مختصر تھی کہ وہ ہر گوشۂ حیات کا احاطہ نہ کر سکتی، لہٰذا ایک طرف آپؐ نے اپنی برگزیدہ بیٹیؑ کو نسائیت کا مثالیہ بنایا، دوسری طرف علیؑ کو ساتھ لے کر حالات کے اعتبار سے ایسی نظیریں پیش کیں کہ مسلمان ان سے سب کچھ سیکھ سکیں۔ اب یہ اپنی اپنی صلاحیت کی بات ہے کہ بہت تھوڑے سے لوگ سلمانؓ، ابوذرؓ، بلالؓ، مقدادؓ، حذیفہ یمانیؓ اور عمارؓ جیسے بن سکے اور باقی عرب جاہلیت اور اسلام سے مرکب ہو گئے۔

حضورؐ کے باقی کاموں کی تشریح علی کا مقصدِ حیات تھا۔ ابو طالبؑ نے پیغمبر اسلام کی حفاظت کی تھی، علیؑ اور اولادِ علیؑ کو اسلام کے لئے سینہ سپر ہونا تھا۔ اسی کے راز و نیاز سرورِ کائنات اور علیؑ میں ہوا کرتے تھے جس پر لوگ کہتے: آپ اپنے چچیرے بھائی سے تنہائی میں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہتے ہیں۔ دلوں کے چور انہیں متوحش رکھتے تھے

مگر حضورؐ نے ہمیشہ انہیں باور کرایا کہ وہ چور نہیں شاہ ہیں۔ ـــــــ اور پھر جب آنحضرت کا وقتِ آخر آیا تو آپ رہ رہ کر مُنہ علیؑ کے کان کے قریب لے جاتے اور اسرارِ شہادت اور رموزِ امامت کی تعلیم دیتے رہتے۔

انہیں مشاغل میں رسالت کا آخری باب بند ہوگیا اور امامت کا وہ آفتاب طلوع ہوا جو قیامت سے پہلے غروب نہ ہوگا۔

پسماندگان

آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسمائے گرامی تو بہت سے تھے معروف نام محمدؐ مصطفیٰ ہے۔ آپ کے والدِ محترم عبداللہ بن عبدالمطلب اور والدہ گرامی آمنہ بنت وہب تھیں۔ ۱۷ ربیع الاوّل سنہ۱ عام الفیل مطابق ۲۸ اپریل ۵۷۱ء پیدا ہوئے اور ۲۸ صفر سنہ۱۱ھ کو شہادت پائی۔ اسی حجرے کے باہر دفن ہوئے جس میں علالت کا زمانہ گزارا تھا۔

آپ کی تیرہ بیویاں تھیں۔ خدیجہؑ، سودہؓ، عائشہؓ، حفصہؓ، زینبؓ بنت خزیمہ زینبؓ بنت جحش، جویریہؓ، امّ حبیبہؓ، صفیہؓ، میمونہؓ، ماریہؓ، ریحانہؓ، امّ سلمہؑ۔ چند کنیزیں ان پر مستزاد تھیں۔ خدیجہؑ اور زینبؓ بنت خزیمہ پہلے ہی وفات پا چکی تھیں گیارہ انتقال کے وقت زندہ تھیں۔

اولاد میں ابراہیم بطنِ ماریہؓ سے اور قاسم و عبداللہ اور جناب فاطمہؑ زہرا بطن خدیجۃؑ الکبریٰ سے تھے۔ تینوں بیٹے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ جنابِ فاطمہؑ زندہ تھیں۔ انہیں سے آنحضرت کی نسل چلی اور حسنینؑ نے حضورؐ اور حضورؐ کے دین پر اپنی مہریں ثبت کیں۔

آپ کے داماد اور چچیرے بھائی علیؑ ابنِ ابی طالب نے آپ کے بعد دینی منصب کو سنبھالا اور نیابت کا پورا حق ادا کیا۔ علیؑ کی اولاد قیامت تک اپنے دادا کی سیرت کو زندہ رکھے گی۔

سلسلۂ امامت

پہلے امام

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام

سنہ ۱۱ھ تا سنہ ۴۰ھ

سقیفہ بنی ساعدہ

لغوی معنی کے اعتبار سے "وہ جھونٹ جس سے کوئی شگوفہ پھوٹے۔ اصطلاحاً ایک ایوان خفیہ جس میں عرب مشورہ باطل کے لئے جمع ہوتے تھے" (۴۷) اس مقام پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے پہنچنے سے قبل انصار و مہاجرین جمع ہو چکے تھے اور انصار کی اکثریت اعلان کر رہی تھی کہ اس کے حقدار علیؑ ابن ابی طالب ہیں جن کے بارے میں حضورؐ نے بار بار اپنی منشاء کا اظہار کیا ہے۔ مہاجرین کی ایک تعداد مخالف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ منصب کسی کی میراث نہیں۔ حضورؐ نے تو بعض دوسرے لوگوں کے لئے بھی اظہار خوشنودی کیا ہے۔ ہم میں سے کسی کو آپ کا خلیفہ ہونا چاہیے۔

اس پر انصار نے اپنی مہمان نوازی کے حوالے سے تفوق کا اظہار کیا۔ مہاجرین نے اپنی فداکاری پر افضلیت ظاہر کی۔ جس میں حضرت ابوبکر کی ساتھیوں کی حمایت سے کافی شدت پیدا ہو گئی اور سقیفہ بنی ساعدہ ایک طرح کی سبزی منڈی بن گیا۔ انصار و مہاجرین میں ناشائستہ الفاظ کا تبادلہ ہوا، پھر نوبت ہاتھاپائی کی آ گئی۔

ایسے میں بلند آواز "حضرت عمر نے چلّا کر حضرت ابوبکر کو مخاطب کیا اور کہا۔

"آپ سب میں سن رسیدہ اور بزرگ تر ہیں، میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔"

حضرت ابوبکر نے ہاتھ بڑھا دیئے اور حضرت عمر نے بیعت کر لی، پھر ابوعبیدہ الجراح، عثمان بن عفان، سعد بن ابی وقاص اور دوسرے لوگ بڑی تیزی سے بیعت کرنے لگے۔ انصار چیختے رہے کہ انہیں یہ فیصلہ منظور نہیں، مگر کوئی رکا نہیں مہاجروں کا ایک گروہ بیعت کرتا ہی رہا، جو شاید بنا بنایا منصوبہ تھا۔

رئیس انصار سعد بن عبادہ غصّے میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکل گئے، پھر بھی مدینے میں اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کو خلیفۂ رسولؐ منتخب کر لیا ہے ــــــ یہ وہ وقت تھا جب حضرت علیؑ عرب کے نجات دہندہ کو غسل و کفن دے کر نمازِ میت پڑھا رہے تھے۔ نماز کا منظر فرشتوں نے آسمان سے دیکھا نہیں دیکھا تو اس احسان فراموش قوم نے، جس کو ہادیٔ برحق نے صحرائی درندے سے انسان بنایا تھا۔ آنحضرتؐ کے مردہ جسم خاکی کو قبر میں اُتارا گیا اور بنی ہاشم نے اُسے منوں مٹی کے نیچے چھپا دیا مگر ان میں سے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ وہ تو ہوسِ دنیا کے شور و غل میں فرشتوں کی آواز بھی سُن نہیں رہے تھے جو ان کے عمل پر انہیں قہرِ خداوندی سے ڈرا رہے تھے۔

بعض راویوں کا بیان ہے کہ تین چار روز بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ گئے تھے کہ رسولؐ کو دوسری قبر میں دفن کریں مگر ذوالفقار کو نیام میں کروٹیں بدلتے دیکھ کر کسی کی ہمت نہیں پڑی اور وہ لوگ نماز پڑھ کر واپس ہو گئے۔

سقیفہ کے اسباب و علل

اس کی کھلی اور صریح وجہ علیؑ دشمنی تھی، جس کا بنیادی پتھر حرم نبوی میں رکھا گیا تھا۔ اُم المومنین عائشہ اپنے داماد کی مخالف کیوں تھیں۔ مورخین اس کا سبب واقعۂ افک کو بتاتے ہیں جب حضرت عائشہ غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر جنگل میں تنہا رہ گئیں اور بعد میں ایک غیر مرد صفوان ابن معطل کے ساتھ واپس

آئیں تو آنحضرت آپ سے بہت دنوں تک ناراض رہے۔ عائشہ کا خیال تھا کہ علی نے حضور کو بھڑکایا ہے یہ وجہ حقیقتاً کوئی وجہ نہیں تھی، بلکہ عائشہ کا بنیادی عناد جناب فاطمہ سے تھا بعض مسلمہ روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔

"رسول اللہ کی کسی بیوی پر مجھے اتنا رشک نہیں ہوا۔ میں نے ان کو دیکھا نہیں مگر رسول اللہ جب ان کا نام لیتے تو بڑی چاہ سے کوئی بکری ذبح ہوتی تو گوشت کے ٹکڑے خدیجہ کی سہیلیوں کو بھیجتے میں پوچھتی کہ کیا خدیجہ کے سوا دنیا میں کوئی عورت ہے ہی نہیں؟ تو جواب دیتے: بیشک وہ ایسی ہی تھیں" (۴۸)

"ایک روز آپ خدیجہ کی مدح کر رہے تھے، میں نے کہا: کیا ایک پوپلی بڑھیا کا ذکر کرتے ہیں، اللہ نے آپ کو اس سے بہتر بیوی دی ہے۔ اس پر آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا۔ قسم ہے خدا کی، مجھے خدیجہ سے بہتر کوئی بیوی نہیں ملی۔ وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب لوگ میری تکذیب کرتے تھے۔ اللہ نے انھیں سے مجھے اولاد عطا کی" (۴۹)

روایات کی چھان بین میں ایسی بہت سی روایتیں ملتی ہیں جن سے اس حقیقت میں شک نہیں رہتا کہ حضرت عائشہ کا عورت پن، سیرت خدیجہ کا آنحضرت کے ذہن پر چھایا رہنا، برداشت نہ کرتا۔ آنحضرت عائشہ کو سرزنش کرتے مگر وہ باز نہ آتیں سوتے پر سہاگہ خدیجہ کی یادگار جناب فاطمہ زہرا کی طرف حضور کا التفات تھا۔

"آنحضرت جب کسی سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد نبوی میں تشریف لے جا کر دو رکعت نماز ادا کرتے، پھر فاطمہ کے گھر جا کر ان کا حال پوچھتے، اس کے بعد ازواج کے حجروں کی طرف جاتے"۔ یہی صورت سفر پر جاتے وقت بھی ہوتی۔ جناب فاطمہ کے گھر ہی سے روانہ ہوتے ______ سفر آخرت پر بھی جناب فاطمہ کے حجرے سے روانہ ہوئے جو روایت و درایت دونوں لحاظ سے صحیح ہے۔

"حضرت عائشہ اور جناب فاطمہ کے حجروں کے درمیان ایک دیوار

تھی۔ اس میں ایک دریچہ بنا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ جب عائشہؓ کے گھر ہوتے
تو اکثر جناب فاطمہؑ سے اس دریچہ کے نزدیک کھڑے ہو کر بات کر لیتے
ایک مرتبہ نصف شب کے بعد عائشہؓ اس دریچے میں آئیں تو جناب فاطمہؑ
سے کسی بات پر ناخوشگوار بات ہو گئی۔ حضورؐ کو جب اس کی اطلاع ہوئی
تو آپ نے جناب فاطمہؑ کے کہنے کے مطابق اس دریچے کو بند
کرادیا۔" (۵۰)

ان حالات میں جناب فاطمہؑ کے لیے حضرت عائشہؓ کے جذبات کو سمجھنا سامنے کی بات ہے اور ان کی روشنی میں ازواج مطہرات کے دو حلقے چھپے نہیں رہتے جن میں ایک طرف حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت صفیہؓ، دوسری طرف ام سلمہؓ اور دوسری تمام ازواج دکھائی دیتی ہیں جو شہزادی فاطمہ کی طرف دار تھیں۔

حضرت علیؑ فاطمہؑ کے شوہر تھے جن کے بارے میں جناب عائشہ کی رائے نامنصف سے نامنصف مورخ بھی جانتا ہے کہ وہ علیؑ کا ذکر سننا بھی گوارا نہ کرتی تھیں گھر کے اندر کا یہ حال تھا اور گھر کے باہر شطرنج کی ایک بساط بچھی ہوئی تھی جس کے ہر کھلاڑی نے علی کو داؤں پر لگا رکھا تھا۔

آنحضرتؐ کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے تو علیؑ کعبے میں اپنے مہد سے لے کر آنحضرتؐ کی لحد تک سوتے جاگتے ساتھ رہے تھے بلکہ اب بھی ساتھ تھے۔ فرق صرف عالم ارواح اور عالم اجسام کا تھا۔ علی کے منصب کی بات تو صرف خدا و رسول تک محدود تھی، لیکن ظاہری شرف تمام دنیا دیکھ رہی تھی۔ رہ گئیں خدمات تو ہر غزوہ کا فاتح علیؑ، محمدؐ کے محافظ علیؑ، صداقت و امانت کے سفیر علیؑ اور حد یہ کہ محمدؐ کی زندگی علیؑ: دعوتِ ذوالعشیرہ سے خم غدیر کے میدان تک ایک خطِ مستقیم کھینچا جائے تو اس پر علی کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ لوگ جو اپنے کو ممتاز اور مقرب خاص قرار دیتے ہیں اور جنہوں نے اندر سے باہر تک حضورؐ کے گرد ایک جال بُن رکھا تھا، ان کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اگر حیاتِ پیغمبر سے انہیں منفی کر دیا جائے تو کیا کمی ہو جائے گی

اسلام میں صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

لیکن اس کے برعکس علیؑ کو نکال کر دیکھیں اور ایک ایک محاذ کا جائزہ لیں تو نتیجہ کھُل کر سامنے آجائے گا: دعوتِ ذوالعشیرہ میں صداقتِ محمدؐ کی تائید کرنے والا ملے گا اور نہ فتح مکہ کے بعد ہبل کا بُت شکن۔ خندق میں عمرو ابن عبدود نے للکارا تھا تو صحابہ کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں جیسے انہیں سانپ سُونگھ گیا ہو، اور خیبر میں تو باری باری سب ہی گئے تھے پھر اُحد میں تو وہ بھی بھاگ گئے تھے جو حضورؐ کی موت کی خبر پر دیوانے ہو گئے تھے اور ہنٹر زمین پر مار مار کر کہتے تھے کہ کوئی آپ کو مردہ کہے گا تو اس کی کھال اُدھیڑ دیں گے۔ کسی نے یہ بھی سوچا کہ اُحد میں اس جذبۂ محبت کو کیا ہو گیا تھا؟ جب حضورؐ ان کے نزدیک قتل ہو چکے تھے تو ان کی لاش کو چھوڑ کر پہاڑی پر چڑھ گئے تھے۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ رحلتِ حقیقی کے وقت اتنا جنون طاری ہونے کا سبب یقیناً یہ مصلحت ہو گی کہ حضرت ابوبکر آجائیں تو منصوبے کے مطابق موت کا اعلان کیا جائے اور وہ سقیفہ کی مہم پر روانہ ہو جائیں۔

دیانت اور حق پسندی کے ساتھ واقعات کا جائزہ لیا جائے تو اشاعتِ دین کی ہر مہم میں، وہ رزم ہو یا بزم، علیؑ اور صرف علیؑ ہی کو اہمیت تھی اور حضورؐ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ صرف علیؑ ہی کو جوڑ کر تاریخ رسالت کا تکملہ ہو سکتا ہے باقی سب فاضلات میں تھے۔ ان کو خارج کر کے کسی واقعہ کا نتیجہ بدل نہیں سکتا تھا علیؑ کی وہ شخصیت ہے جس کو نظر انداز کر کے رسالت کی کوئی مہم غیر متغیر نہیں تھی علیؑ نہ ہوتے تو خود حضورؐ کو ان کی جگہ لینا پڑتی کیونکہ اور سب تو ہر موقع پر آزمائے جا چکے تھے۔

نظیر کے طور پر جنگ اُحد اور جنگ طائف کو لیا جا سکتا ہے جب مسلمان اپنی صحرائی جبلت کے تحت لُوٹ مار میں لگ گئے اور دشمن موقع پا کر حملہ آور ہو گیا تو وہ اپنے محبوب قائد کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جنگ اُحد کا واقعہ ہر ایک کو تسلیم ہے طائف میں صرف حضرت علیؑ، حضرت عباسؓ، حضرت ابنِ حارثؓ اور حضرت ابن مسعودؓ

رہ گئے تھے ـــــــ اُحد میں بھاگنے والے پھر آنحضرت کو چھوڑ گئے تھے۔ کسی جھوٹے سے جھوٹے تاریخ نگار کا بیان بھی ان کی موجودگی ثابت نہیں کر سکتا۔ کیا یہی ہے وہ فداکاری جس پر ان کے درجاتِ عالیہ بلند قرار دیئے جاتے ہیں؟

لیکن یہ سب چلے بھی گئے تو کیا ہوا؟ علیؑ تو موجود تھے لہذا رسولؐ بھی محفوظ رہے اور اسلام بھی ـــــــ اور تا قیام قیامت، جب تک علیؑ کا نام اور علیؑ کا نشان باقی ہے، محمدؐ بھی محفوظ رہیں گے اور اسلام بھی۔

عرب کے تاریخی پس منظر کو دیکھا جائے تو وطن پرستی، قساوت، باہمی جنگ و جدل، کینہ پروری، عصبیت اور بے خود غلط تفاخر، عرب کا قومی اور قبائلی مزاج تھا۔ تلوار، دولت، عورت اور شجاعت ان کا مذہب اور نسلی انتقام جذبۂ ایمان تھا۔ علیؑ کی ذات سے اِن سب پر ضرب پڑی تھی۔ رحمۃ للعالمین کی معجز بیانی اور صلۂ رحمی نے ذہنوں کو جھنجوڑا ضرور تھا اور ان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا پھر بھی بارانِ رحمت کا اثر ہر زمین پر یکساں نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ بدلے تھے تو سلمان، ابوذر، مقداد، حذیفہ یمانی، ابوایوب انصاری، مالک بن نویرہ اور بلال بن گئے تھے، مگر اکثریت میں سے بعض چھپے ہوئے ابوسفیان اور بعض کھلے ہوئے ابولہب تھے۔ علیؑ نے ان کے بزرگوں اور خردوں کو قتل کیا تھا، وہ علیؑ کو معاف نہ کر سکتے ـــــــ علیؑ کی تلوار نے کفر کی ہر سطح پر اگنے والے درخت کی جڑوں کو کاٹ دیا تھا اور بیشتر قبیلوں کے سرداروں کا خون علیؑ کی تلوار پر قرض تھا جس کو وصول کرنا پس ماندگان قبیلہ کی نسلی حمیت پر واجب ہوتا تھا جس کے لئے وہ موقع کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ کیفیت اُس طبقے کی تھی جس نے اسلام کی حقانیت کو تہہ دل سے قبول نہ کیا تھا۔ دوسرے طبقے میں وہ لوگ تھے جو چڑھتے سورج کو دیکھ کر پجاریوں میں شامل ہو گئے تھے۔ دل اسلام کو مانتا ضرور تھا مگر نیت ڈانواں ڈول ہو جاتی تھی تیسرا طبقہ اس گروہ کا تھا جو دین میں مخلص مگر قبائلی مفاد میں کسی بات کی پرواہ نہ کرتا

چوتھا طبقہ اسلام کے سچے فداکاروں اور رسول کے مخلص شیدائیوں کا تھا اور صرف یہی طبقہ دل وجان سے علی کے ساتھ تھا، باقی تین ایسے دشمن جنہوں نے رسول کی حالت خراب ہوتے ہی ایک خُفیہ منصوبہ بنالیا تھا اور اس پر وہ عمل کر رہا تھا

رسولؐ کے صحابی ہر لحاظ سے قابلِ احترام اور لائق عزت ہیں لیکن "معصومیت صرف انبیاء کے لئے خاص ہے، غیرنبی انسانوں میں کوئی شخص اس معنی میں بزرگ نہیں ہوتا کہ اس سے غلطی کا صدور محال ہے یا اس نے عملاً کبھی غلطی نہیں کی بلکہ اس معنی میں بزرگ ہوتا ہے کہ علم اور عمل کے لحاظ سے اس کی زندگی میں خیر غالب ہے، پھر جتنا کسی میں خیر کا غلبہ ہو، وہ اتنا ہی بڑا بزرگ ہے اور اس کے کسی فعل یا بعض افعال کے غلط ہونے سے اس کی بزرگی میں فرق نہیں آسکتا۔" (۵۱)

مولانا مودودی کے اس حق پسندانہ معیار پر اگر اصحاب سقیفہ کو پرکھا جائے تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ سرفہرست آجائیں گے۔ ان بزرگوں کی اسلام دوستی سے انکار نہیں ہوسکتا بلکہ حضرت ابوبکر تو اس تعریف میں ہیں کہ ایک بڑی تعداد انھیں مسلم اوّل منوانے پر بضد ہے، انہوں نے حضور کے لئے بعض بیش بہا خدمات انجام دی ہیں لیکن کئی موقعوں پر ان کا دامن بھی خودغرضی اور نافرمانی کے داغوں سے پاک نظر نہیں آتا اور حضرت عمر تو رسالت پر شک کرنے کے مرتکب بھی ہوتے ہیں بہت دُور کی باتوں سے قطع نظر کیا جائے، تب بھی اُسامہ بن زید کے لشکر کے ساتھ نہ جانا اور پیغمبر کی میّت کو پیٹھ دکھا کر انتخاب کی مہم میں لگ جانا ان کے مخلصانہ ایمان پر وہ دھبہ ہے جس کو دھویا نہیں جا سکتا۔

علیؑ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے امام تھے اس کو تسلیم نہ کیا جائے تب بھی اتنے مواقع پر حضورؐ نے علیؑ کی فضیلت کو جتایا تھا کہ اس کو نہ ماننے کے لئے چبا چبا کر بات کرنا پڑے گی اور پھر بھی انکار ممکن نہ ہوگا۔ اس کے مقابلے پر دوسروں کی برتری کی جو روایات گڑھی گئی ہیں، ان میں ساڑھے تین سال کی حیات محمدؐ میں ہزاروں آیتوں

کے راوی ابو ہریرہؓ کی روایات کی اکثریت ہے۔ ہم ان کو جھٹلانے کی کوشش نہ کریں تب بھی علیؑ کے حق میں بعض روایتیں صریح اور واضح ہیں جن پر حضورؐ کی زندگی میں سب کو یقین تھا کہ علی ہی آپ کے جانشین ہوں گے اور اکثریت علی کے دشمنوں کی تھی۔ ان دشمنوں میں کون کون شامل تھے، اس کی صراحت ایک فاضل کام ہوگا لیکن یہ بات دلیل کی محتاج نہیں کہ آنحضرت کی زندگی سے مایوس ہوتے ہی اقتدار طلب حلقے میں خفیہ خفیہ دوڑ دھوپ شروع ہوگئی تھی۔

انصار ایک طرف، مہاجر دوسری طرف، جن میں اسامہ بن زید کے لشکر کے ساتھ نہ جانے والے بھی شامل تھے، ان لوگوں میں سے کچھ تو درِ محمدؐ پر حاضر رہ کر بار بار خیریت دریافت کرتے رہے اور حضرت ابوبکر دو ڈھائی میل دور محلہ سنخ میں اپنے گھر چلے گئے، ہوسکتا ہے کہ چلتے چلتے لوگوں سے کہتے گئے ہوں کہ پیغمبرؐ زندگی سے اپنا رشتہ توڑنے والے ہیں، ان کی جانشینی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے سقیفہ میں جمع ہو جائیں۔ یہ کہنا تو بالکل غلط ہوگا کہ مدینے کی گلیوں میں کھڑے ہوئے لوگوں نے سقیفہ میں جمع ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا ——— اس پر ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس جگہ کا انتخاب قدرت نے کس سے کرایا جو مشورہ باطل کے لئے ضرب المثل تھی؟ خود بخود تو لوگ سقیفہ جمع نہیں ہوگئے۔ ماننا پڑے گا کہ کوئی معشوق تھا اس پردۂ زنگاری میں!

اگر انصار نے یہ منصوبہ بنایا تھا تو تمام مہاجروں کو اچانک اِس جگہ کی اطلاع کیسے ہوگئی اور آنحضرتؐ کے بچپن کے دوست گھر سے واپس ہوتے ہی حضرت عمر کو لے کر سیدھے سقیفہ بنی ساعدہ کیوں چلے گئے؟ بات بالکل سامنے کی ہے کہ مسلمانوں کو آنحضرت کا غم کم اور اس کی فکر زیادہ تھی کہ علی جانشینِ رسولؐ بننے نہ پائیں جس کی کھچڑی اندر ہی اندر پک رہی تھی۔

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حضورؐ نے حضرت ابوبکر کے جانشین ہونے کا اعلان کر دیا تھا، ان سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب حضورؐ نے کہہ ہی دیا تھا تو پھر سقیفہ کے التزام کی کیا ضرورت تھی؟ مسلمانوں سے انتخاب کرانا حکمِ رسولؐ کی توہین کے

مصداق تھا۔ اِس توہین کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر کسی نے غلطی سے اجتماع کا اعلان کر دیا تھا تو دوسرے لوگ کیوں گئے؟ اور حضرت ابوبکر کو تو جانا ہی نہ چاہیئے تھا۔ ان کے حق میں تو ارشادِ پیغمبرؐ ہو ہی چکا تھا۔ لوگ ان کو تو مان ہی لیتے جس طرح علیؑ نہیں گئے کہ وہ تو ہیں ہی ماموُر من اللہ امام، ان کے لئے دُنیاوی خلافت کا منصب ضروری نہیں ہے۔

اور یہ علی کی خلافتِ الٰہیہ کی صداقت ہے کہ جابر حکومتوں نے سب کچھ کر ڈالا صدیوں تک علویوں کے لئے زمین سخت اور آسمان دُور رہا۔ خاندان کے خاندان تقیہ میں اپنے آبائی مسلک کو چھوڑ بیٹھے پھر بھی دُنیا میں مسلمانوں کی ایک چوتھائی سے زائد آبادی آج بھی صرف علیؑ اور اولادِ علیؑ کی پیرو ہے۔

سقیفہ کے اس چھوٹے سے مگر تاریخی اجتماع نے اسلام کے دھارے کا رُخ ایک نئی سمت میں موڑ دیا۔ حضرت ابوبکر جمہور مسلمین کے خلیفہ ہو گئے اور حضرت علیؑ نے رسُولؐ کے دفن سے فراغت پاتے ہی امامت کا آغاز کر دیا جس کو خلافتِ بلا فصل بھی کہا جاتا ہے۔

اُحد اور خندق میں چمکنے والی تلوار کند نہ ہوئی تھی۔ بابِ خیبر کو انگلیوں سے اکھاڑ لینے والے بازوؤں میں اب بھی وہی طاقت تھی۔ سچے مسلمان سب کے سب علی کے ساتھ تھے۔ جناب فاطمہؑ زہرا کو باپ کا پُرسا دے کر وہ خدمت علیؑ میں باادب ہو کر بیٹھے تو کسی نے توجہ دلائی کہ یہ بزدل کتنی دیر مقابلے میں ٹھہر سکیں گے؟ علی نے جواباً حضور کی سُنت پر توجہ دلائی کہ کلمہ طیبہ پڑھ لینے کے بعد حضورؐ نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی منافقوں کو برداشت کیا تھا اور یہ لوگ تو اسلام کے نام پر حکومت کرنا چاہتے تھے اور جہاں تک علیؑ کا تعلق ہے وہ تو تھے ہی پیغمبرِ اسلام کے جانشین۔ اقتدار کبھی اِس منصب میں شامل نہیں ہوتا۔ آپ نے نہایت ہی مختصراً جواب دے دیا۔

"رسُولؐ کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔ یہ سب اسلام سے مُنہ پھیر کر مرتد ہو جائیں گے!"

حضرت علی جن معنیٰ میں کل ایمان تھے۔ سلمانؓ ان معنیٰ میں نصف الایمان تھے اور حضرت جتنی مرتبت کی تصدیق کے مطابق ایمان کے دس درجوں پر فائز جب کہ ابوذرؓ نو درجے کے مومن۔ یہ دونوں اپنے امام کے منشار کو سمجھ گئے، پھر مقداد اور دیگر صحابہ نے بھی علی کے مافی الضمیر اور مجبوریوں کا اندازہ کر لیا۔ ان کے ایمان کی آزمائش تو یہی تھی کہ امام وقت کی مرضی کے سامنے سرخم کر دیں۔ یہی انہوں نے کیا مگر خدمت میں حاضری سے باز نہ رہے۔

ہمارے پہلے امام نے بظاہر خانہ نشینی اختیار کر لی تھی مگر رُشد و ہدایت کے چشمے جاری تھے۔ ایمان کے متوالے در دولت پر حاضر ہوتے اور دامنِ مُراد بھر کر واپس ہوتے۔

ایک دن ابوسفیان نے آکر کہا۔

"ان لوگوں نے تمہارا حق غصب کر لیا ہے، تم چاہو تو مدینے کی گلیوں کو سواروں اور پیدلوں سے بھر دوں؟"

"ابوسفیان تو اب تک منافقت سے باز نہیں آیا۔"

علی نے ابوسفیان کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور وہ سقیفہ کے ہیرو کی گود میں جا بیٹھا جو اس کی صحیح جگہ تھی۔

پیغمبرؐ اسلام کے موقر صحابی عظیم تھے اور عظیم رہیں گے مگر انسان کی حیثیت سے جہاں وہ غلطی کریں اور اس کی نشاندہی کی جائے تو اس کو مان لینے ہی میں بڑا پن ہے اس سے صحابیوں کی عظمت کم نہ ہو جائے گی، بزرگی بہر طور اپنی جگہ پر رہے گی۔ اس سلسلے میں ایک بنیادی بات تخلیق روایات کی ہے جن سے صحابہ کرام متاثر ہوتے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض صحابی اپنے مقاصد کی خاطر اس کے مرتکب ہوئے ہوں کیونکہ صحابی انسان ہی تھے، معصوم نہیں تھے، ہوسِ اقتدار میں ٹھوکر کھا سکتے تھے

ہماری حد تک تو یہ مسلّمہ ہے کہ ہم صرف ہادیٔ برحق اور ان کے اہلِ بیت کے مقلّد ہیں۔ روایات کے جنگل میں صرف ان روایتوں کو صحیح سمجھتے ہیں جو ہمارے آئمہؑ

سے ثقہ وسائل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں یا ان روایتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں جن کے مزاج روایاتِ آئمہ سے ملتے جلتے ہیں اور جن کا آہنگ آیاتِ قرآنی کے مطابق ہوتا ہے بڑا سکون ہے اس گوشۂ عافیت میں ورنہ روایتی تاریخ کا ایک سرسری مطالعہ بھی یہ بتا دیتا ہے کہ علی کے لئے جو پیغمبرؐ کے ارشادات تھے، وہی سب کچھ آپ نے حضرت ابوبکر کے لئے بھی فرما دیا اور حضرت عمر کے لئے تو یہاں تک فرما دیا کہ پیغمبری ختم نہ ہو جاتی تو عمرؓ کو ملتی!

یہ کن خدمات کے سلسلے میں؟ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں تو ان کا کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ ہر آدمی کو پہلے ابوطالب، پھر علی ہی علی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بزرگ بھی موقع موقع سے نظر ضرور آتے ہیں اور ان کی صحابیت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن زہد و تقویٰ، علم و ایمان اور دیانت و شجاعت سب کچھ ان سے منسوب کر دیا جائے، صرف علی کا مدِ مقابل بنانے کے لئے تو یہ حق کا خون کرنے کے مترادف ہوگا لیکن ہم اپنے ہاتھ اس میں رنگنے کے لئے تیار نہیں۔

غضب خدا کا کہاں پیغمبری اور کہاں وہ کردار جس کی آدھی عمر کفر میں گزری اور آدھی عمر کا دامن تشکیک اور نافرمانی سے آلودہ ہے۔ کیا منصبِ پیغمبری ایسے ہی لوگوں کے لئے ہوتا ہے؟ لیکن ہم اس کے لئے کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے کیونکہ نبوّت کے لئے جب ازلی معصوم ہونے کی قید نہیں، صرف اپنا سا بشر ہونا ضروری ہے تو حضرت عمر کیا، کسی بڑے سے بڑے گنہگار کی کسی بات پر خوش ہو کر خدا شق الصدر کرا سکتا ہے اور خلعتِ نبوّت عطا کر کے اُس درجے پر فائز کر سکتا ہے، جہاں وہ کبھی نبی اور کبھی غلطی کرنے والا عام انسان!

منّت گزار ہیں ہم خلّاقِ مطلق کے کہ اس نے ہمیں ایک سیدھی شاہراہ پر ڈالا ہے جہاں ہمیں خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا ہے اور اللہ کا متعین کیا ہوا امام جو کچھ دے، وہ اٹل، جو کچھ بتا دے وہی حق۔

صحابی ہماری نظر میں مؤقر اور امہات المومنین واجب الاحترام لیکن وہ کسی

کی عداوت میں یا کسی دُنیاوی مصلحت کی خاطر کسی بات کو رسُولؐ کا قول قرار دے دیں تو اس کے آگے ہمارا سر قطعاً نہیں جُھکے گا جب کہ اقوالِ رسُولؐ کے متعلق خود ان کے مابین متواتر اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

"حضرت عمر سے ایک روایت سماع موتی کے متعلق پائی جاتی ہے کہ رسُولؐ نے آپ کے دریافت کرنے پر فرمایا۔

"یعنی وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے"۔

جب حضرت عائشہ نے اس روایت کو سُنا تو فرمایا کہ رسُول اللہؐ کا ارشاد یہ نہیں تھا کیونکہ اس کے خلاف نص قطعی موجود ہے کہ

"اے رسول! تو نہ مُردوں کو اپنی بات سُنا سکتا ہے اور نہ قبر میں مدفون ہونے والوں کو"۔ بخاری غزوہ بدر (۵۲)

اِن دونوں میں کون صحیح تھا؟ لوگ اس کا فیصلہ کرتے رہیں۔ اس کے برعکس ہماری روایات کی صورتِ حال یہ ہے کہ جو کچھ علیؑ مرتضیٰ نے فرمایا۔ اس کو جس امام سے بھی پوچھا گیا، اس نے زیر و زبر کی تبدیلی کے بغیر من و عن وہی دُھرادیا۔ یہ بات تھی علمِ لدُنی کی۔ اس طرح کوئی غلط حدیث کبھی بیان ہی نہیں ہوئی، کیونکہ گھر کے رموز سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہے۔ اس کے مقابلے پر اصلی اور نقلی روایات کا آمیزہ جب تیار ہوا تو سننے والے اور بیان کرنے والے دونوں جھگڑے میں پڑ گئے اور ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے

جہاں تک اس روایت کی صحت کا تعلق ہے، ہمارے نزدیک حضرت عمر کی روایت صحیح ہے کیونکہ آنحضرتؐ وفات سے چند روز قبل جنت البقیع گئے پھر جناب فاطمہؑ بھی اور علیؑ نے تو اہلِ قبر کو مخاطب کرکے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا تھا

ہم اس کے لئے کسی کو مطعون نہیں کرتے، جس کے مقاصد تھے، اس نے روایات آفرینی اور سقیفہ سازی کی تو اس کو مبارک ہو لیکن کسی کی ذات سے محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر آنچ آتی ہے تو ہم برداشت نہیں کر پاتے۔ علیؑ نے کسی کو خلافت کی طرف جانے

سے روکا نہیں، جس نے چاہا، دُنیاوی مفاد حاصل کرنے کے لئے گیا اور پھر علی کے پاس حصول دین کے لئے آیا تو آپ نے اس کو محروم نہیں رکھا۔ ہم بھی علی کے پیرو ہیں، کسی سے کوئی تعرض نہیں کرتے لیکن کوئی اہلِ بیت پر ضرب لگاتا ہے تو ہم تلملا جاتے ہیں اور حقیقت کا انکشاف ہمارا فرضِ ایمانی بن جاتا ہے۔

اِسی کے ساتھ ہم اس کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے کہ اُمہات المومنین میں سے کسی پر غلط الزام تراشی کی جائے جس کسی نے جہاں مظاہرۂ عداوت یا تشدد کیا ہے وہاں ہم یقیناً اظہارِ بیزاری کریں گے لیکن اس کے بعد ہم اپنے مولا علیؑ کے پیرو ثابت ہوں گے۔ جنگ جمل کے بعد آپ نے اُم المومنین حضرت عائشہ کے لئے جو روش اختیار کی تھی وہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہوگی۔

ناقابلِ فہم ہے ان راویوں کا ذہن جو ایک طرف تو حضرت عائشہ کی مدح سرائی میں جھوٹ سچ کی تمیز نہیں کرتے، دوسری طرف ایسی روایات بیان کرنے لگتے ہیں جن سے زوجۂ رسولؐ کی حرمت پر انگشت نمائی ہو سکتی ہے۔ یہ کرشمہ ہے روایت سازی کی بہتات کا۔ ابو سلمہ سے روایت ہے:۔

"ایک دن میں حضرت عائشہ کے بھائی کے ساتھ اُم المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے پوچھا: آنحضرتؐ غسل کس طرح فرماتے تھے؟ اُم المومنین نے بیان کیا مگر ہم پوری طرح سمجھ نہ سکے تو ہم نے کہا کہ غسل کر کے دِکھا دیں ـــــ چنانچہ بیچ میں ایک حجاب ڈالا گیا، اور پانی لا کر رکھا گیا، اور اُم المومنین نے سر پر پانی ڈالنا شروع کیا۔" (۵۳)

اس طرح اُم المومنین نے ابو سلمہ اور اپنے بھائی کی شرعی راہنمائی فرمائی ظاہر ہے کہ حجاب کے دوسری طرف سے ان لوگوں نے اُم المومنین کے عمل کو دیکھا ہوگا ـــــ اور شاید اس سے پہلے انہیں غسل کرنا آتا بھی نہیں تھا

ورنہ زبانی بتانے پر سمجھ جاتے یا پھر طریقہ غسل اتنا پیچیدہ ہوگا کہ الفاظ سے سمجھ میں نہیں آیا۔

لیکن اس بات کو مانا نہیں جا سکتا کیونکہ حضورؐ نے سب کو یونہی بتایا تھا اور ہر ایک کی سمجھ میں آگیا تھا، پھر حضرت عائشہ کے بتانے سے دونوں میں سے کوئی کیوں نہیں سمجھا؟

ظاہر ہے کہ روایت بالکل جھوٹی ہے اور صرف عائشہ کی ہمہ دانی جتانے کے لئے گڑھی گئی ہے لیکن اس سے یہ مقصد پورا ہونے کے بجائے ایک دُوسرا پہلو پیدا ہوگیا کہ اُم المؤمنین کے نسائی پیکر پر ایک نامحرم کی نگاہ پڑ گئی۔

اُمّت کی محترم ماں کی طرف سے اتنی شرعی بداحتیاطی ہمارے لئے قابلِ یقین نہیں ہے اور ہم اس کو روایتی ٹکسال کا کھوٹا سکہ سمجھتے ہیں۔

بعض ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے حضورؐ کا دامن جنسیات میں اتنا ملوث نظر آتا ہے کہ ان کی صفائی پیش کرنا آسان نہیں۔ بالخصوص حضرت اُم المومنین عائشہ اور اُم المومنین صفیہ کی باہمی چشمک دکھانے کے لئے بعض بزرگوں نے جو روایت آفریدی کی ہے، وہ سیرت محمدیؐ کا بدنما داغ ہے۔ ایسی روایتوں کو پڑھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ کیسے مسلمان تھے یہ لوگ جنہوں نے اسلام کے عظیم المرتبت ہادی کو کچھ سے کچھ بنا دیا اور اب کوئی انہیں دیکھ کر تصویر کشی کرتا ہے تو اس کو واجب القتل ٹھہرایا جاتا ہے۔ حرمتِ محمدؐ پر حملہ کرنے والا یقیناً گردن زدنی ہے لیکن جھوٹی روایت سازی کرنے والوں کے گریبان پکڑنا بھی انصاف کا تقاضا ہوگا۔

ایسے حالات میں ہمارا گوشہ عافیت بڑا غنیمت ہے، جہاں ہر کردار نورِ شیئت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور زمانے کے ممکن گرد و غبار کی زد سے بھی باہر ہے۔

دربارِ خلافت

امام کی حیثیت سے علی کا فیصلہ تھا کہ مسلمانوں کو جب ان کی رہبری کی ضرورت ہوگی تو آپ اپنے آپ کو پیچھے نہ رکھیں گے، پھر بھی آپ دربارِ خلافت میں گئے اور سیّدہ کونین نے بھی اتمامِ حجت کیا ورنہ کہہ دیا جاتا کہ مطالبہ ہی نہیں کیا ورنہ جس کا حق تھا، اس کو ضرور دیا جاتا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علی کے احتجاج پر جب حضرت عمر نے کورا جواب دے دیا تو آپ نے ابوعبیدہ بن الجراح کو توجہ دلائی اور ابوعبیدہ نے تسلیم کیا۔

"تم سچ کہتے ہو، حق ہے تمہارا لیکن اب سب مسلمانوں نے اتفاق کر لیا ہے تم بھی مان جاؤ۔"

علیؑ خاموشی سے چلے آتے لیکن ابھی رسولؐ کی اکلوتی وارث باقی تھی۔ وہ ایک نظیر قائم کرنے کے لئے بھرے دربار میں آگئیں ـــــــ اُمِ ایمن دونوں بیٹے اور دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں بھی انگلی پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ تھیں۔ شاید رسولؐ کی بیٹی کو ان بچیوں سے کہنا تھا کہ وقت پڑ جائے تو کسی ظالم کے دربار میں اسی طرح چلی جانا ـــــــ علیؑ اور ان بچوں نے فدک کے سلسلے میں سیّدہ کے حق میں شہادت دی مگر اس کو مسترد کر دیا گیا۔

جواب شہزادی کو بھی وہی ملا، جو علی کو ملا تھا ـــــــ اس موقع پر سیّدۂ طاہرہ دربار میں ایک خطبہ دیتی نظر آتی ہیں اور جواب میں پھر حدیثِ رسولؐ پیش کی جاتی ہے کہ انبیاء اپنی وراثت نہیں چھوڑتے۔ اس حدیث سے صرف حضرت ابوبکر اور اُمّ المومنین عائشہ واقف تھیں، باقی کسی مسلمان کو علم نہ تھا۔ ہر ایک کو حضرت ابوبکر کی زبانی معلوم ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ سیّدہ کونین کے احتجاج پر حضرت ابوبکر راضی ہو گئے تھے اور انہوں نے فدک کی سند لکھ کر سیّدہ طاہرہ کو دے دی تھی مگر عین اس وقت حضرت عمر کہیں سے آگئے، انہوں نے کاغذ رسولؐ کی بیٹی سے لے کر نوچ ڈالا اور کہہ دیا کہ رسولؐ کی

ہر شئے امت کی ہے۔

اس واقعہ سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں پہلی تو یہ کہ حدیث توریث کے راوی نے اپنے عمل سے خود اپنی بیان کردہ حدیث کو جھٹلا دیا۔ دوسرے یہ کہ حضرت عمر کا حکم خلیفہ کے حکم پر حاوی تھا۔ کہنے کو حضرت ابوبکر سربراہِ مملکت تھے لیکن سکّہ حضرت عمر کا چلتا تھا۔

اس ہٹ دھرمی کا اثر اگرچہ جناب فاطمہؑ زہرا پر صرف اتنا ہی پڑا کہ ان کی مالی حالت خستہ رہی اور اس کا مقصد بھی یہی تھا، کیونکہ رسولؐ کی اولاد اگر معیشت کی طرف سے مطمئن ہوتی تو خطرہ تھا کہ کہیں تیاری کر کے وہ انتخابِ سقیفہ کے خلاف اٹھ نہ کھڑی ہو لہذا اس کا التزام پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا اور یہ صرف ام المومنین عائشہ اور حضرت ابوبکر کا منصوبہ تھا۔ حضرت عمر سے روایت ہے۔

"جب ابوبکر نے اس روایت کو بیان کیا تو علیؑ اور عباسؓ نے ان کو جھوٹا، گنہگار اور خائن ٹھہرایا۔" (۵۴)

جلال الدین سیوطی کا بیان بھی اسی قسم کا ہے کہ اس کے راوی صرف حضرت ابوبکر ہیں، انہوں نے بی بی عائشہ کو اپنا شریک کر لیا تھا۔ اس منصوبے میں اوّلیت حضرت ابوبکر ہی کو حاصل رہی ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایک طرف حضورؐ فدک جناب فاطمہ کو تحریری طور پر دے دیتے۔ دوسری طرف وہ ابوبکر کو علیحدہ لے جاتے اور کان میں کہہ دیتے کہ انبیاء اپنی وراثت نہیں چھوڑتے۔ ان کی وارث صرف امت ہوتی ہے۔ حرف آتا ہے عدل خداوندی پر ــــــ کتنے ہی نبیوں کی وارث ان کی اولاد ہوئی، صرف خاتم المرسلین کی اکلوتی بیٹی کو قدرت نے وراثت سے محروم کر دیا۔

کیا مسلمانوں میں ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں ہے کہ بعد کے مسلمانوں نے اسی فدک کے بارے میں متضاد فیصلے کئے پھر بھی مسلمان اس حدیث کو وضعی نہیں کہتے۔

ابوبکرؓ و عمرؓ کی نظر میں فدک مال مسلمین تھا مگر عثمان نے مروان کی ملک بنا دیا۔

معاویہ نے اپنے بیٹے یزید، عمر بن عثمان اور مروان بن حکم کے درمیان مساوی تقسیم کر دیا۔

عمر بن عبدالعزیز جیسے فقیہہ و متقی نے فدک اولاد جناب فاطمہؑ کو واپس کر دیا۔

یزید بن عبدالملک نے پھر چھین لیا۔

پہلے عباسی حکمراں ابوالعباس سفاح نے عبداللہ بن حسن مثنیٰ ابن حسنؑ کو دے دیا

منصور نے لے لیا۔

مہدی بن منصور نے پھر فدک بنی فاطمہؑ کو پلٹا دیا

موسیٰ بن مہدی نے لے لیا

مامون رشید نے پھر بنی فاطمہؑ کا حق انہیں دے دیا۔

متوکل نے اپنے زمانے میں اپنے حجام کو دے دیا جو پھر واپس نہیں ہوا۔

اس طرح پیغمبر اسلام نے اپنی زندگی میں بیٹی کو جو عطیہ دیا تھا، وہ ایک حجام کی اولاد میں ہمیشہ کے لئے پہنچ گیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اور کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ حدیثِ وراثت کو حضرتِ ابوبکر کے بعد خود حضرت عثمان نے غلط سمجھا تھا ورنہ مالِ مسلمین کو کسی فرد کی ملک بنانے کی خطا نہ کرتے اور عمر بن عبدالعزیز جیسے مسلمان سے تو خطا کی نسبت ہی نہیں دی جا سکتی۔ انھوں نے اپنے عمل سے فتویٰ دیا تھا کہ حدیث توریث قطعاً غلط تھی۔ اب مسلمان فیصلہ کریں کہ اس وضعی حدیث کے نتائج اگرچہ خلافت کے مفاد میں نکلے ہوں مگر اس سے رسول کی بیٹی کو جو صدمہ پہنچا اس کے نتیجے میں بنتِ پیغمبر جس جس سے ناراض رہی، خود پیغمبرِ اسلام کے الفاظ میں اس کا انجام کیا ہوگا؟

"جس نے فاطمہؑ کو ناراض کیا، اس نے مجھے ناراض کیا اور جس سے میں ناراض ہوا، اس سے خدا ناراض ہوا۔"

خدا کرے، یہ سخن گسترانہ استدلال حق پسندوں کو مشتعل کرنے کے بجائے ایک دعوتِ فکر دے!

اِس موقع پر اگر دربارِ خلافت کے اس منظر کا تصور کیا جائے، جب تختِ خلافت پر مسلمانوں کے "صدیق" متمکن تھے اور حدیث توریث کی واحد گواہ عائشہ صدیقہ کی شخصیت ان کے ساتھ تھی۔

دوسری طرف رسُولِ اسلام کی اکلوتی بیٹی، جو خود رسُول کے لئے واجب التعظیم رہی تھی، آیۂ تطہیر کی چادر اُوڑھے ہوئے، صدیقۂ طاہرہ کا کردار ادا کر رہی تھی اور اتمامِ حجت کے لئے فدک کا ہبہ نامہ دکھا رہی تھی۔ اس کی تائید ایک صدیق اکبر کر رہا تھا جو بہر نوع تمام حاضرین سے افضل تھا مگر ان دونوں کو جھٹلا دیا گیا اور رسُول کی تحریر کو بے قیمت قرار دے دیا گیا، یہ کہہ کر کہ رسُول کو اپنی زندگی تک کے لئے دینے کا حق تھا، اس کے بعد نہیں۔

ایک مُتبنّٰہ صدیق نے دوسرے صدیق کی شہادت کو غلط ٹھہرایا اور صدیقۂ طاہرہ کا دعویٰ مسترد کر دیا ـــــــ بالفاظِ دیگر اس کا اعلان کیا کہ علیؑ و فاطمہ زہرا دونوں نے ناجائز مطالبہ کیا تھا ـــــــ کتنی ستم ظریفی ہے کہ آج جس کو جھوٹا قرار دیا گیا، کل جب اپنی قوتِ فیصلہ جواب دے گئی تو مقدمات کے فیصلوں کے لئے اُسی سے رجوع کیا اور اس کے فیصلوں کو حتمی مان لیا۔

رسُول کی بیٹی گریاں و نالاں واپس ہو گئی اور گھر آ کر باپ کی صفِ ماتم پر بیٹھ گئی ـــــــ امامِ وقت خاموش تھا۔ میدان کی شجاعت اور مردانگی کے جوہر حضورؐ کی زندگی میں دکھا چکا تھا۔ اب اس سے بڑا امتحان پیش آنے والا تھا۔ ضبط و صبر کا امتحان، جس کے لئے رسُول کا مسند نشین تیار تھا۔

اس غیر معمولی تحمل کے باوجود اربابِ سقیفہ کو علیؑ اور علیؑ کے دوستوں کی طرف سے ایک کھٹکا لگا رہتا کہ نہ جانے کب وہ مطالبۂ حق کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں لہٰذا بیتِ سیدہؑ میں ہر آنے جانے والے پر نگاہ رہتی۔ یہ نہیں سوچا کسی نے کہ رسُولؐ کے بعد صاحبانِ ایمان جاتے تو کہاں جاتے لہٰذا جب کسی کا دل امنڈتا تو وہ آنسو بہانے کیلئے علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا جس کو کسی منصوبہ سازی پر محمول کیا جاتا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ منصوبے ہمیشہ سے خانۂ سیدہ زہرا کے بجائے حجرۂ جناب عائشہ میں بنائے جاتے تھے جس کی شہادت حضورؐ کے ارشادِ گرامی سے ملتی ہے۔

"ابن عمر کہتے ہیں کہ ایک دن جناب رسولِ خدا حضرت عائشہ کے گھر سے برآمد ہوئے اور نکلتے وقت فرمایا کہ اس گھر سے کفر کا سر نکلے گا جسطرح کہ شیطان کے سینگ نکلتے ہیں۔" (۵۵)

اور بعد رسولؐ وہی ہوا کہ ایک دن اسی حجرے میں کچھ طے کر کے حضرت عمر ایک جماعت کے ساتھ نکلے اور جنابِ فاطمہؑ کے دروازے پر دستک دینے لگے۔

اُم المومنین کی منزلت اپنی جگہ پر لیکن تاریخی حقائق کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ جناب عائشہ دروازے سے جھانک کر دیکھ رہی ہوں کہ اب کیا ہوتا ہے حضرت علی باہر آئے تو حضرتِ عمر ان کے رُو برو کھڑے تھے، جنابِ فاطمہ پس دروازہ ایستادہ تھیں۔ بدر و حنین کے فاتح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والا حیاتِ محمد میں زندہ پلٹ کر نہ جاتا مگر آج علی کی حیثیت بدل گئی تھی۔ وہ اپنے وقت کے امام تھے لہذا انہیں غصّہ آنے کے بجائے حضرت عمر پر رحم آیا، حضرت عمر نے بھی نزاکت کو محسوس کر کے مُنہ دروازے کی طرف کیا اور کرخت آواز میں کہا

"بنتِ رسول اللہ! خدا کی قسم، آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں لیکن لوگ اسی طرح آپ کے گھر میں جمع ہوتے رہے تو میں آپ کے گھر میں آگ لگا دوں گا۔" (۵۶)

علامہ شبلی نے دبی زبان میں اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے۔

"اگرچہ سند کے اعتبار سے اس روایت پر ہم اپنا اعتبار ظاہر نہیں کر سکتے کیونکہ اس روایت کے رواۃ کا حال ہم کو معلوم نہیں ہو سکا تاہم درایت کے اعتبار سے اس واقعہ کے انکار کی کوئی وجہ نہیں حضرت عمر کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں۔" (۵۷)

اگر حضرت عمر کے الفاظ کو دھمکی ہی تصور کیا جائے تب بھی اس منظر کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکے گا، جب سرکار ختمی مرتبت چند ہفتے قبل اسی دروازے پر آکر کہا کرتے تھے۔ السلام علیکم یا اھل البیت النبوہ! آج وقت اتنا بدل گیا تھا کہ دُنیا ادب سے بات کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی تھی اور اس کے بعد بھی سنتِ رسولؐ پر عمل کرنے کا دعویٰ تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حضرت ابوبکر کو مرتے وقت اپنی تین غلطیوں پر بہت پچھتاوا تھا جس کا اظہار انہوں نے عبدالرحمٰن ابن عوف سے کیا تھا۔ ان تین باتوں میں اہم ترین بات یہ تھی کہ کاش وہ بابِ فاطمہ کی بے حرمتی نہ کراتے! اس واضح اقبالِ جرم کے بعد بھی علامہ شبلی روایت و درایت کی باتیں کرتے ہیں۔

ابن قتیبہ، طبری اور دوسرے مورخین نے بھی لکڑیوں کا ذکر کیا ہے۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ معصومہؑ نے سختی کا جواب سختی سے دیا اور کہا۔

"دفان ہو میرے دروازے سے ورنہ میں سر کے بال کھولتی ہوں اور خدا سے فریاد کرتی ہوں۔"

کتنا اعتماد تھا معصومہؑ کو پیدا کرنے والے پر مگر مسلمانوں کے قائد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اور دروازے کو اس زور سے ڈھکیلا کہ وہ رسولؐ کی چہیتی بیٹی پر گر پڑا۔ شہرستانی کے الفاظ میں

"آنے والے نے شکمِ مبارک پر ضرب لگائی ــــــ یہاں تک کہ محسن شہید ہوئے اور چیخ کر کہا کہ گھر میں جو بھی ہے اسے جلا دو۔" (۵۸)

اس واقعہ کو بہت سے علماء نے لکھا ہے اور اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ دروازہ معصومہؑ کی کوکھ پر گرا۔ اس کی ضرب سے پیٹ میں جناب محسن کی شہادت واقع ہوئی پھر انہوں نے علیؑ کے گلے میں رسی باندھی اور کھینچتے ہوئے دروازے کے باہر لے گئے۔ بعض نے تحریر کیا ہے کہ جناب فاطمہؑ زہرا نے بال کھول کر بددعا کی دھمکی اسی وقت دی تھی اور جلالت سیدہ سے خائف ہو کر لوگوں نے علیؑ کو چھوڑ دیا تھا۔

فاتح خیبر کا گلا اور رسی! ایک ناقابلِ یقین حقیقت ہے لیکن یکسوئی کے ساتھ غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ علیؑ کی حیثیت اس وقت کیا تھی۔ وہ رحمۃ للعالمین کی مسند پر نیابت کا منصب ادا کر رہے تھے اور جہاد بالنفس کی منزل میں تھے، آپ نے ایک لحظہ کے لئے آنکھیں بند کر کے دیکھا تو عیسٰی کو رسن بستہ

کشاں کشاں دار کی طرف بڑھتے پایا ختم المرسلین کا جانشین عالم نوریں نوح کو طوفان سے نکال چکا تھا۔ وہ صبر کی آزمائش میں عیسیٰؑ سے پیچھے کیونکر رہتا۔ اس نے اپنے کو مظلومیت کے دھارے پر ڈال دیا اور اس میں کوئی بے عزتی محسوس نہیں کی ورنہ عمرؓ ہوتے یا طلحہؓ و زبیرؓ، اگر ذوالفقار نیام سے باہر آجاتی تو مدینہ تو مدینہ صحرائے عرب میں خون کے دریا بہہ جاتے لیکن علیؑ کس پر تلوار اُٹھاتے، پیغمبر اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں پر اور وہ بھی ان پر جو خیر و شر کی مخلوط منزل پر کھڑے ہوتے تھے۔

علیؑ نے سوچا! ابھی نہیں، خیر کا بچا کھچا حصّہ بھی تم میں سے نکل جائے تو میرا بیٹا کسی ریگ زار میں آج کی کمی پوری کردے گا!

غرض فاطمہؑ زہرا کی فریاد پر سب نے علیؑ کو چھوڑ دیا اور چلے گئے۔

چشم تصور سے دیکھا جائے تو علیؑ نے صبر و ضبط سے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا، اس کی نظیر تاریخ انبیاء میں بھی نہیں ملے گی۔ فاتح بدر و حنین کے بازوؤں میں قوّت تھی۔ لوگ میدان میں نکل آنے کے لئے آپ کی ایک آواز کے منتظر تھے ذوالفقار نیام سے برآمد ہونے کے لئے مچل رہی تھی لیکن قبضۂ ذوالفقار پر رسالتمآب کا ہاتھ رکھا ہوا تھا، علی اس کو کیونکر ہٹا دیتے لہٰذا بزدل بھیڑیوں کو بیچارگی سے دیکھ کر رہ گئے۔

یہ تشدّد اور زیادتیاں صرف اس لئے ہو رہی تھیں کہ حضرت علیؑ حضرت ابوبکر کی بیعت کرلیں جس کا مطلب یہ تھا کہ ابوبکرؓ نے خود رسولؐ سے بیعت طلب کی تھی۔ ——— مانا کہ رسولؐ کی بعض احادیث، وہ اصلی ہوں یا نقلی حضرت ابوبکر کے حق میں جاتی تھیں مگر وہ سب اس تنبیہہ کو بھول گئے تھے جو حضورؐ وقتاً فوقتاً ان کو دیتے رہتے تھے۔ آخری دنوں میں سر منبر سب کو مخاطب کرکے کہا تھا۔

"میں اس سے خوف نہیں رکھتا کہ تم میرے بعد شرک میں مبتلا ہو گے لیکن میں خوف رکھتا ہوں کہ تم پر دُنیا غالب آجائے گی۔ تم اس کے شائق ہوگے، فتنہ میں پڑو گے اور ہلاک ہوگے، جس طرح کہ وہ ہلاک ہوئے جو تم سے پہلے تھے۔"

آنحضرتؐ علم پیغمبری سے مستقبل کو دیکھ رہے تھے۔ اسی لئے بار بار مختلف لوگوں کو مخاطب کر کے تنبیہ کر رہے تھے، پھر (بحوالہ اسد الغابہ) ایک دن آپ نے علیؑ سے بھی کہہ دیا: "علی تم مثلِ کعبہ ہو، کعبہ خود کسی کے پاس نہیں جاتا، لوگ کعبے کے پاس آتے ہیں۔ تم بھی خود کسی کے پاس نہ جانا، لوگ خود آئیں تو انہیں مایوس نہ کرنا۔"

حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا

"ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے زمین پر چار خط کھینچے اور فرمایا۔

تم جانتے ہو، یہ کیا ہے؟

لوگوں نے کہا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔

فرمایا۔ جنتی عورتوں میں سب سے زیادہ افضل چار بیویاں ہیں:۔

خدیجہؓ بنتِ خویلد، فاطمہؑ بنت محمدؐ، مریمؑ بنتِ عمران اور آسیہؓ بنت مزاحم اہلیہ فرعون"۔ (۶۰)

بعض راویوں نے اس حدیث میں جناب ہاجرہ اور جناب سارا کا اضافہ کیا ہے مگر جناب خدیجہ ہر روایت میں اسم آغاز ہیں جن کے بعد جناب فاطمہ زہرا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ خدیجۃؑ الکبریٰ نے وہ بساط بچھائی تھی جس پر کھڑے ہو کر حضورؐ نے اللہ اکبر کا آوازہ بلند کیا تھا اور خدیجہؓ کے بعد ان کی عظیم المرتبت بیٹی نے ان کی آواز میں آواز ملائی تھی۔ زہراؑ بہر طور شریکِ رسالت تھیں، ۲۸ صفر کو حضورؐ تکمیل دین کر کے چلے گئے تو زہراؑ کا منصب بھی پورا ہو چکا تھا۔ علیؑ نے امامت کے لئے اپنی رفاقت کا احساس دلایا تو رسولؐ کی عظیم المرتبت بیٹی نے اس کام کے لئے زینب کو تجویز کر دیا جو باپ کا ساتھ تو نہ دے سکیں مگر چھوٹے بھائی حسینؑ کے لئے تسخیر کوفہ و شام کی مہم انجام دیتی رہیں۔

جناب فاطمہ ملیکۃ العرب کی بیٹی تھیں مگر جب آپ نے آنکھ کھولی تو حضورؐ پر کفار قریش کی یلغار تھی۔ آپ نے بھی ماں کے ساتھ حضورؐ کی خدمت کی۔ اکلوتی بیٹی تھیں مگر بچپن فقر میں گذرا، البتہ والدین کے ساتھ دوسری بزرگ خواتین کا اتنا

پیار ملا کہ آپ اس کو کبھی فراموش نہ کرسکیں۔ فاطمہ بنت اسد، اسماء بنت عمیس ام ہانی ہمشیرہ جناب ابوطالب، ام ایمن، سب آپ کو آنکھوں کا تارا سمجھتی تھیں اور آپ تھیں بھی اسی قابل۔ قدرت نے آپ کو نکھار سنوار کر کھینچا تھا۔

جب آپ کم سن تھیں تو حضورؐ اپنے زانو پر بٹھاتے، لبوں کے بوسے لینے اور آپ کو اپنی زبان چُسایا کرتے تھے۔

کتنے ہی معجزات آپ سے منسوب ہیں اور آپ کی عصمت کی شہادت تو خود باری تعالیٰ نے دی ہے۔

ابھی آپ پانچ سال کی تھیں کہ ماں کے سائے سے محروم ہوگئیں مگر فاطمہ بنت اسد، اُم ایمن، اُم سلمہ نے اس کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔ آنحضرتؐ کی ہجرت کے پندرہ روز بعد آپ مدینہ پہنچیں۔ یکم ذی الحج ۲ھ کو حضرت علیؑ کے ساتھ آپ کا عقد ہوا۔ ۲۴ رذی الحج کو رخصتی عمل میں آگئی۔

جناب فاطمہؐ اپنی ذات سے عورتوں کے لئے ایک مثالیہ تھیں۔ ایک بیٹی ایک بیوی اور ایک ماں۔ بیوی کی حیثیت سے آپ نے کسی موقع پر حضرت علیؑ کو شکایت کا موقع نہ دیا، شوہر سے کوئی ایسی فرمائش نہیں کی جس کو وہ پورا نہ کر سکتے۔ آپ گھر کے تمام کام خود انجام دیتیں، جھاڑو دینا، چرخہ کاتنا، کھانا پکانا چکی پیسنا اور بچوں کی دیکھ بھال اور تنہا آپ، مگر کبھی تیوری پر بل نہیں آتے۔ ۷ھ میں جب جناب فضہ کنیز کی حیثیت سے گھر کی فرد بنیں تو ایک دن یہ سارے کام وہ کرتی تھیں، دوسرے دن خود سیدۂ عالم۔ اطاعت کا یہ عالم تھا کہ کبھی حضرت علیؑ سے رنجش تو درکنار شکر رنجی بھی نہیں ہوئی۔

پردے کی اتنی پابند تھیں کہ حجرہ مسجد سے متصل ہونے کے باوجود کبھی باہر جھانک کر بھی نہیں دیکھا کہ آپ کی نظر کسی نامحرم پر نہ پڑ جائے یا کوئی نامحرم آپ کو نہ دیکھ لے۔

آپ عورتوں کے لئے جہاد بالنفس کی پابند تھیں مگر زخمیوں کی مرہم پٹی کے

لئے میدان میں جانا ثابت ہے، مباہلہ میں آپ وفد کی روح رواں تھیں۔

خواتین کے لئے حضورؐ کے تمام ارشادات کو سامنے رکھ کر جناب معصومہؑ کا جائزہ لیا جائے تو آپ ان سب کا نمونہ عمل تھیں۔ مثلاً:۔

"عورت کا جہاد شوہر کے ساتھ حسنِ سلوک ہے"۔

"عورت اگر خاوند کا حق ادا نہیں کرتی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اللہ کے حقوق بھی ادا نہیں کرسکتی"۔

"اگر خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ شوہروں کو سجدہ کریں"۔

مختصر سی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا، جب آپ نے حضرت علیؑ کی رضا جوئی کو ملحوظ نہ رکھا ہو، حالانکہ آپ خواتینِ جنت کی سیّدہ تھیں۔ آپ کے مقابلے پر دوسری عورتوں کا جائزہ لیا جائے تو آپ کی عظمت کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضورؐ کی نظر میں آپ کی اتنی قیمت کیوں تھی۔

"حضور کی عادت کریمہ یہ تھی کہ جب فاطمہ علیہا السلام کو دیکھتے تو کھڑے ہوجاتے اور متوجہ اور مستقبل ہوکر ان کا بوسہ لیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے"۔ (۶۱)

محدث دہلوی کے علاوہ اکثر مورخین نے بھی حضورؐ کے اس عمل کو صراحت کے ساتھ لکھا ہے اور حضورؐ کے اس معمول کی تو حضرت عائشہ اور دوسری خواتین نے تصدیق کی ہے کہ سفر کی روانگی کے وقت سب کے آخر میں اور واپسی پر سب سے پہلے مایۂ ناز بیٹیؑ ہی سے ملتے تھے۔ اس کا سبب محبت پدری ہی نہ تھی، خود جناب فاطمہؑ زہرا کے محاسن ذات تھے۔ جس کا خود خلّاق عالم نے بھی کئی موقعوں پر اعتراف کیا ہے۔

گھریلو اور اخلاقی ذمہ داریوں کے دوش بدوش حق عبودیت ادا کرنے میں

بھی آپ بیش بیش تھیں۔ تہجد گزار، شب زندہ دار، جب آپ سجادۂ عبادت پر ہوتیں تو آپ کے چہرے سے ایسا نور ساطع ہوتا کہ دُور دُور تک ماحول منور ہو جاتا تھا۔

بنتِ رسولؐ کی سیرت کو دیکھ کر خود اُمہات المومنین کا جائزہ لیا جائے تو ماں کے علاوہ کوئی مقابلے پر ٹھہرتا ہی نہیں۔ ہمارا مقصود کسی کی اہمیت کو کم کرنا ہرگز نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تحقیق میں اگر کوئی عظیم ہے تو اس کو عظیم تر بنائیں۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ کثرت ازدواج میں جہاں حضورؐ کی دوسری مصلحتیں تھیں وہاں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ ہر ذہن اور ہر مزاج کی عورت حرم میں داخل کریں اور اس کو نباہ کر دکھا دیں تاکہ اُمت کے کسی مرد کو کوئی بُری عورت مل جائے تو وہ یہ نہ کہہ سکے کہ ایسی عورت آنحضرتؐ کو ملتی تو گزارا محال ہو جاتا!

بلاشبہ ہمارے عقیدے میں جناب فاطمہ زہراؑ انتخاب مشیت تھیں تب ہی تو آپ بار بار بارگاہ احدیت سے نوازی گئیں۔ کبھی جبرئیل نے بچوں کی گہوارہ جنبانی کی، کبھی طباق جنت اور حسنینؑ کے لئے خلعت ہائے سبز و سرخ لے کر حاضر ہوئے۔

آپ کی شان میں کتنی ہی احادیث مروی ہیں۔

"فاطمہؑ دنیا میں بھی سیدہ ہیں اور جنت میں بھی عورتوں کی سردار۔"

"جس نے آپ کو تکلیف پہنچائی۔ اُس نے رسولؐ کو تکلیف پہنچائی اور جس نے رسولؐ کو تکلیف پہنچائی، اُس نے خدا کو۔"

"فاطمہؑ میرا جزو ہے۔"

"نزول آیۂ تطہیر کے بعد آنحضرتؐ نماز صبح کے وقت درِ فاطمہؑ پر جا کر آواز دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے خدا نے تمہیں ہر آلودگی سے پاک کیا ہے۔"

یہ تھی عظمت فاطمہ زہراؑ کی خدا اور رسولؐ کی نگاہ میں۔ رسولؐ کے بعد چھ ماہ کی زندگی میں آپ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، اس پر کتنا ہی ملمع چڑھایا جائے مگر تاریخ بھلا نہیں سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹی کو باپ سے بہت محبت ہوتی ہے مگر اتنی محبت کہ ۲۸ صفر کے بعد آنکھوں سے آنسو رُکے ہی نہیں۔ پپوٹے متورم ہو گئے۔ دیدے سُرخ

پڑ گئے مگر فاطمہ کبھی بلند آواز سے کبھی ہچکیوں سے روتی ہی رہیں۔ اس گریہ زاری کو بھی اُمت برداشت نہ کر سکی مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ اس سے ان کا سکون برباد ہوتا ہے۔ آخر فاطمہؑ نے یہ معمول بنا لیا کہ صبح کو ام ایمن کے ساتھ بچوں کو لے کر نکل جاتیں اور دن بھر جنت البقیع میں روتی رہتیں۔ بقیع کی اس جگہ کو آج بھی بیت الاحزان کہا جاتا ہے۔

خود جناب فاطمہؑ نے اپنے تاثرات کو نظم کا قالب عطا کیا ہے۔

"بابا آپ کے بعد مجھ پر وہ مصیبتیں پڑیں کہ اگر روشن دنوں پر پڑتیں تو وہ تیرہ و تار ہو جاتے۔"

لوگ کہتے ہیں نہ گھر پھونکا گیا نہ دروازہ گرایا گیا مگر اس کو کیا کہیں گے کہ پیٹ کے ایک حصے پر ضربِ شدید کا نشان تھا اور اس میں سخت تکلیف تھی جس کے نتیجے میں اسقاط ہوا اور اندر کی چوٹ سے پھر معصومہ سنبھل نہ سکیں اور ایک روایت کے مطابق ۷۵ دن کے اندر وفات پا گئیں۔

یہ انتقال نہیں تھا، قتل تھا جس کو روایتوں اور تاویلوں کے گورکھ دھندے میں پھنسا کر چھپایا نہیں جا سکتا۔ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔

رسولؐ کی علیہ منزلت بیٹی اتنی مختصر مدت میں باپ سے جا ملی مگر اپنے بعد درد کی وہ داستان چھوڑ گئی جو رہتی دُنیا تک ظالم و مظلوم میں ایک حد فاصل رہے گی۔ آپ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور کئی دوسرے لوگوں کو معاف نہیں کیا بلکہ وصیت کی کہ یہ لوگ میت میں شریک نہ ہوں اس شمول میں جناب عائشہ بھی تھیں

۳ رجمادی الثانی ۱۱ھ یکشنبہ کو دونوں بچوں کی انگلیاں پکڑ کر قبر رسولؐ پر آ کھڑی ہوئیں۔ قبر و منبر کے درمیان دو رکعت نماز ادا کی اور بچوں کو مسجد میں علی کے پاس چھوڑ کر گھر آ گئیں۔ حضورؐ کی چادر اٹھائی، غسل کر کے آپ کا بچا ہوا کفن پہنا، حجرے میں داخل ہوئیں اور مصلائے عبادت پر جا بیٹھیں۔ تسبیح و تحلیل کی آواز آنا بند ہوئی تو اسماء زوجہ جعفر طیار نے حسب عادت آپ کو پکارا، جواب نہ ملا تو اسماء

حجرے میں داخل ہوئیں اور دیکھا کہ سیدہ عالیان اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھیں۔

آپ کی وصیت کے مطابق امیرالمومنین نے خود غسل دیا، کفن پہنایا اور اس تابوت میں لٹایا جو آپ کے لئے تختے کے بجائے خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔ اس تابوت میں اندر کا جسم نظر نہ آتا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیل جانے پر امیرالمومنین اس تابوت کو لے کر چلے۔ دونوں بیٹے، عقیلؓ، سلمان فارسیؓ، ابوذرؓ، مقدادؓ، عمارؓ اور بریدہ کاندھا دیتے ہوئے لے چلے۔ بیٹی کی یہ شان بھی باپ سے بہت مطابقت رکھتی تھی۔ باپ کے لئے بھی قدرت نے یہی التزام کیا تھا کہ کوئی منافق اس منزل میں قریب نہ آئے یہی صورتِ حال سیدہ فاطمہؑ کے لئے بھی تھی۔

منقول ہے کہ علیؑ نے جنت البقیع میں ایک جیسی چالیس قبریں اپنی عظیم المرتبت شریکِ حیات کے لئے کھودی تھیں تاکہ کوئی صحیح قبر کا نشان نہ پا سکے۔ ان میں سے ایک قبر میں جسمِ اطہر کو سپردِ خاک کر دیا۔

دُنیا کو اہلِ بیت سے جو عناد تھا وہ علیؑ کو معلوم تھا۔ وہی ہوا کہ ایک جماعت خبر پا کر آ گئی۔

"ہم پیغمبرؐ کی میت میں بھی شریک نہیں ہو سکے تھے۔ سیدہ کی لاش کو نکال کر پھر سے دفن کریں گے۔"

علیؑ کی خاموشی اور صابرانہ کردار نے بزدلوں کو شیر کر دیا تھا، چالیس قبریں ایک سی بنی تھیں اور سب زمین کے برابر کر دی گئی تھیں۔ وہ ایک قبر کی طرف بڑھے ان کا عزم دیکھ کر علیؑ نے اُس قبر کے ایک طرف ایک پاؤں اور دوسری طرف دوسرا پاؤں رکھ دیا اور ہاتھ قبضۂ شمشیر پر ڈال دیا۔

سیدہ کی حرمت کا سوال تھا۔ علیؑ شریکِ کارِ رسالتؐ کی اتنی تذلیل برداشت نہ کر سکتے۔ آپ نے منافق مسلمانوں کو للکارا۔

"ہمت ہو تو آگے بڑھو ــــــــ"

علیؑ کا چہرہ غصّے سے لال ہو رہا تھا اور تیور سے خیبر شکن کا جلال ٹپک رہا

تھا۔ نام نہاد بہادروں کے جسموں میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ کسی نے کہا:

"رسولؐ کی حدیث ہے ۔علیؑ جب مٹی کے گھوڑے پر سوار ہوں تو ان کے سامنے نہ جانا۔"

کون کون اس جماعت میں تھا؟ نام لیں گے تو لوگ بگڑ جائیں گے مگر تھے بڑے بڑے سیاسی لوگ، فوراً بات کو بدل دیا۔

"ہم تو فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔ ——— !"

سب نے فاتحہ پڑھا اور چلے گئے۔

غرض کہ صدیقہ، طاہرہ، ذکیہ، رضیہ، بتول اور سیدہ، عرف عام میں فاطمہ زہراؑ کو آغوشِ قبر میں لٹا کر علیؑ اس طرح واپس ہوئے جیسے سب کچھ لٹا کر جا رہے ہوں۔ گھر پہنچ کر آپ کو محسوس ہوا گویا بابِ رسالت ۲۸ صفر کے بجائے آج ۳ جمادی الثانی سنہ ۱۱ھ کو بند ہوا۔

آپ نے چار بچے یادگار چھوڑے۔ حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، جناب زینبؑ، جناب اُم کلثومؑ

سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کو پیغمبرؐ اور اولادِ پیغمبرؐ سے کتنا بیر تھا کہ فرضی روایات سے ہر ایک کے کردار مسخ کر کے رکھ دیئے۔ پیغمبرؐ کو تو جو کچھ بنایا، اس کے نتائج وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہتے ہیں۔ اولاد اپنے خون سے مفروضہ رسوائی کے دھبوں کو دھوتی رہی پھر بھی روایتیں جو وضع ہو گئی تھیں انہوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سچی روایتوں کے برابر جگہ بنا لی، پھر انہیں اتنی بار دُہرایا گیا کہ لوگ بلا سوچے سمجھے انہیں کو سچ سمجھتے ہیں۔

منجملہ اور روایتوں کے ایک روایت فاطمہ زہراؑ کی چھوٹی بیٹی غریب اُم کلثومؑ کی بھی ہے۔ ان کے لئے کہہ دیا گیا کہ چار پانچ سال کی عمر میں سنہ ۱۷ھ اور سنہ ۲۰ھ کے درمیان حضرت عمر نے ان سے عقد کیا۔ ایک نے کہا اور حکومت کے زیرِ سایہ سب بیان کرنے لگے۔ کہاں حضرت اُم کلثومؑ اور کہاں حضرت عمر ابنِ خطاب!

تاریخ شاہد ہے کہ باغِ فدک کے مقدمہ میں حضرت اُم کلثومؑ اتنی بڑی تھیں کہ آپ نے گواہی دی تھی اور نابالغ کی گواہی کو رد کر دیا گیا تھا۔ اس طرح آپ کی عمر تین سال ضرور ہوگی۔ یہ واقعہ ۱۱ھ کے اوائل کا ہے۔ جس لڑکی سے حضرت عمر نے عقد فرمایا، وہ چار پانچ سال کی تھی۔ جب کہ اُم کلثوم کی عمر اس حساب سے ۱۸ھ میں دس گیارہ سال ہو جاتی ہے، لہٰذا روایت جھوٹی ٹھہرتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُم کلثوم بنت علیؑ کا عقد محمدؓ ابن جعفرؓ کے ساتھ اسی زمانے میں ہوا۔

۱۸ھ یا ۱۹ھ میں جس لڑکی کی عمر چار پانچ سال تھی۔ اس کی پیدائش یقیناً ۱۳ھ یا ۱۴ھ میں ہوئی ہوگی، جب کہ جناب فاطمہ زہراؑ کا انتقال ۱۱ھ میں ہو چکا تھا یعنی اس روایت کی رُو سے جناب اُم کلثومؑ، سیدہ کونینؑ کی وفات کے دو سال بعد پیدا ہوئیں۔ دروغ گورا حافظہ نہ باشد۔

پھر اس بات کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ جناب حفصہؓ، اُم کلثومؑ کی نانی ہوتی تھیں۔ جس کو عرب کے معاشرے میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اس رشتے سے حضرت عمر ام کلثومؑ کے پرنانا تھے۔ اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ حضرت عمر جناب فاطمہؑ کے بھی خواستگار ہوئے تھے۔ ماں کی طرف سے مایوسی ہوئی تو بیٹی کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ عرب کی ضرب المثل حمیت میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ان عقلی دلائل کے بعد حقیقت حال گوش گزار کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ جس اُم کلثوم سے حضرت عمر نے عقد کیا تھا وہ علیؑ کی بیٹی نہیں تھی بلکہ حضرت ابوبکر کی بیٹی تھی ——— اور اس کلثوم کے بارے میں بھی بعض روایات ہیں کہ صرف بات چیت ہوئی تھی۔ عقد کی نوبت نہیں آئی۔

"اُم کلثوم ابوبکر کی دختر تھی۔ اس کی ماں کا نام اسماء بنت عمیس تھا۔ اسماء ابتداً جعفرؑ طیار کی بیوی تھی، پھر ابوبکر کے نکاح میں آئی۔ جس سے عبد الرحمٰن اور ام کلثوم پیدا ہوئے۔ اس کے بعد علی ابن ابی طالب نے اسماء سے عقد کر لیا اور اُم کلثوم اپنی ماں

نوٹ:۔ عبد الرحمٰن کے بجائے محمد ہونا چاہیئے۔

کے ساتھ علیؑ کے گھر آگئی۔ پھر عمر ابن خطاب نے ام کلثوم بنت ابوبکر سے نکاح کر لیا۔" (۶۲)

ان سب پر مستزاد یہ حقیقت ہے کہ حضرت ام کلثومؑ واقعہ کربلا میں موجود تھیں تو کبھی کسی نے کہا کہ عمر ابن خطاب کی بیوہ شام کے دربار میں گئی تھی؟ سچ ہے، جھوٹ کا حافظہ نہیں ہوتا پھر ۱۶۱ھ میں وہ راوی بھی مر چکے تھے جنہوں نے اپنی مصلحت سے اس روایت کا شاخسانہ چھوڑا تھا۔

کتنی دشمنی تھی مسلمانوں کو بنت رسولؐ سے کہ قبر میں بھی چین نہ لینے دیا اور اس کی بیٹی کو رسوا کر کے صغیر سنی کی ایک مثال پیش کر دی لیکن چاند پر خاک ڈالنے سے کبھی خاک نہیں پڑتی۔

دربارِ خلافت اور علیؑ

خلافت کی گرفت اب مضبوط ہو چکی تھی۔ مہاجرین کی اکثریت اور انصار کی ایک بڑی تعداد نے بیعت کر لی تھی کیونکہ انہیں زندہ رہنا تھا۔ اہل اقتدار سے ٹکر لینے کی سکت کسی میں نہ تھی، بالخصوص ان حالات میں جب کہ حضرت علیؑ نے کنارہ کشی کر لی تھی۔ علی کے ساتھ تھے تو وہ لوگ جو منصوص من اللہ امام کو پہچانتے تھے۔

عام لوگوں کا خمیر عرب کی آب و ہوا میں تیار ہوا تھا پھر حکومت جو کچھ کر رہی تھی، وہ پیغمبر اسلام کے نام پر اور اصولِ اسلامی کا حوالہ دے کر لہذا کچھ تو حالات کو سمجھ ہی نہ سکے اور کچھ سمجھے بھی تو مفاد دنیا کو پسِ پُشت نہ ڈال سکے۔ ایسے میں بقائے اقتدار اور فوائد ذاتی کے لئے کسی پر ظلم بھی ڈھایا گیا تو فقہ و حدیث کا جواز پیدا کر کے، خواہ وہ احادیث اور وہ اصول من گھڑت ہی کیوں نہ ہوں۔

فاطمہؑ اور آلِ فاطمہؑ کے ساتھ جو سلوک رکھا گیا، اس کو شرعی تاویلات سے جائز قرار دے دیا گیا اور اس پالیسی کا سنگِ بنیاد پڑ گیا جس کو آگے چل کر شام میں معاویہ نے ارتقائی جامہ پہنایا۔

علیؑ سب کچھ سمجھتے تھے مگر اس کا علاج تلوار اُٹھانے کے علاوہ کچھ نہ تھا اور

علیؑ تلوار اٹھا نہ سکتے تھے کیونکہ وہ امام تھے سلمانؓ و ابوذرؓ کے بھی اور ابوبکر و عمر کے بھی۔ رسولؐ کی پوری زندگی علیؑ کے سامنے تھی جس پر انہیں من و عن عمل کرنا تھا۔ خود رسولؐ نے جنہیں برداشت کیا تھا، علیؑ کو بھی برداشت کرنا تھا۔ اس لئے آپ نے اسلام اور اہلِ اسلام دونوں کے لئے ایک لائحہ عمل بنا لیا تھا۔ اسلام کی صحیح صورتِ حال اپنے اقوال و اعمال سے ہر موقع پر پیش کرتے اور مسلمانوں کو من حیث القوم پنپنے کے لئے مشوروں سے نوازتے رہتے۔ یہی اصول آپ کے حلقے کے اہل ایمان نے بھی اپنایا، جن میں سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ و عمارؓ شامل تھے۔

یہ کہنا بہت سی دوسری باتوں کی طرح غلط ہے کہ علیؑ نے جناب فاطمہؑ کے انتقال کے چھ ماہ بعد بیعت کر لی تھی۔ علیؑ امام نہ ہوتے تب بھی وہ اور دشمنِ زہراؑ کی بیعت!

دوستوں نے جھوٹ کے سر پر سینگ لگا دیئے ـــــــ ان سے پوچھا جائے کہ بیعت کر لی تھی تو حضرت عمر نے اپنے بعد سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کی شرط کیوں لگائی تھی، کوئی تھا ضرور نامزد لوگوں میں، جس سے سیرتِ شیخین کو ٹھکرا دینے کا خدشہ تھا، اور جب علیؑ نے قرآن و سنتِ نبیؐ پر عامل رہنے کی حامی بھر لی تھی تو اس کو مانا کیوں نہیں گیا؟ کیا سیرتِ شیخین سیرتِ نبیؐ سے مختلف تھی؟ اپنے عمل سے خود ثابت کر دیا کہ خلافت کے دو دور، دورِ نبوتؐ سے پوری مماثلت نہ رکھتے ورنہ سیرتِ شیخین اور سیرتِ نبیؐ کو الگ الگ قرار نہ دیا جاتا۔

جھوٹی روایتیں بیان کروا دینے سے حقائق پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ سچ یہ ہے کہ علیؑ تو علیؑ، علیؑ کے کسی پیرو نے بھی بیعت نہیں کی، صرف تعاون کیا، وہ بھی تختِ خلافت پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی خاطر نہیں بلکہ مذہب و ملت کے لئے جس کی قیادت پر محمد مصطفیٰؐ کا نام لکھا ہوا تھا۔

عملی زندگی میں آپ بار بار دربارِ خلافت میں گئے مگر اکثر و بیشتر اس وقت جب اربابِ اقتدار کسی فقہی مسئلے میں فیصلہ نہ کر سکے یا اس وقت جب جنگی مصالح

میں کسی اہم رائے کی ضرورت ہوتی۔ عموماً آپ کا جانا بُلانے پر یا استدعا کرنے پر ہوا۔ امام کی حیثیت سے آپ انکار نہ کر سکتے۔ دینی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانا آپ کا کام تھا۔

خلافت اوّل کی تسخیری مہمات

سقیفہ کے انتخاب خلافت کے بعد حضرت ابوبکر مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز کر چکے تھے۔ اس کا اُٹھان مایوس کن تھا پھر بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ آنحضرتؐ کی سنت کو باقی رکھیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے اُسامہؓ بن زید کو اُس مہم پر روانہ کیا جو ان کی عدم شرکت اور حضورؐ کی وفات کے سبب ملتوی ہو گئی تھی۔ یہ مہم چالیس روز میں سر ہو گئی اور اُسامہ پلٹ کر آ گئے اس میں یقیناً حضرت ابوبکر کی تلافی مافات کا تصور تھا اور یہ نظریہ بھی کہ اس طرح بنی ہاشم کا ایک طرف دار اُدھر سے ٹوٹ کر اِدھر آ جائے گا

اس کے بعد حضرت ابوبکر نے مدعیان نبوت پر توجہ کی۔ اسود عنسی، طلیحہ بن خویلد، مسیلمہ کذاب اور اس کی بیوی سجاح بنت خویلد کا استیصال کیا۔ اب دو گروہ باقی تھے۔ ایک مرتدین کا، دوسرا منکرین زکوٰۃ کا۔ مرتدین میں نعمان بن منذر لقیط بن مالک اور بعض دوسرے سردارانِ قبائل۔ ہو سکتا ہے کہ خاندانِ رسالت کے ساتھ مسلمانوں کے سلوک سے وہ متاثر ہوئے ہوں اور انہوں نے سمجھا ہو کہ یہی اسلام ہے تو اس سے توبہ بھلی۔ حضرت ابوبکر نے ان کا قلع قمع کیا، پھر زکوٰۃ نہ دینے والوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

شاہ معین الدین ندوی کے بقول صحابہ کبار میں سخت اختلاف تھا کہ وہ زکوٰۃ کے منکر بھی سہی مگر مسلمان تو ہیں، ان پر تلوار اُٹھائی نہیں جا سکتی مگر حضرت ابوبکر نہیں مانے ——— یہ قبائل درحقیقت خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور اس کو آلِ محمدؐ کا حق قرار دیتے تھے۔ ان میں مالک بن نویرہ حاکم بطاح بھی تھے جو آنحضرتؐ کی طرف سے تحصیل صدقات و زکوٰۃ پر متعین تھے۔ حضورؐ کی

خبر رحلت پر مدینے آئے تھے اور بلا بیعت کئے واپس چلے گئے تھے۔

"مالک عرب کے مشہور شاعر و شہسوار تھے اور ایک نامور شخصیت کے مالک۔ ان کا شمار حق پسندوں میں ہوتا تھا حضرت ابوبکر نے خالد بن ولید کو تعینات کیا۔ خالد نے عین نماز میں ان پر حملہ کیا اور مالک کو اکثر ساتھیوں سمیت قتل کر دیا اور اسی رات مالک کی حسین و جمیل بیوی اُم تمیم بنت منہال کو برائے نام عقد میں لا کر اس سے زنا کیا۔ (۶۳)

حضرت عمر سے خالد کی عداوت ایام جاہلیت سے چلی آ رہی تھی۔ مدینے واپس آنے پر حضرت عمر نے خالد پر زنا کا فتویٰ لگایا، مگر حضرت ابوبکر نے صرف اتنا کیا کہ اُم تمیم کو طلاق دلوادی ـــــــ یہ تھی ابتدا ظلم و ستم کی ہوا خواہان آلِ محمدؐ پر، اسی لئے مالک بن نویرہ کو کشتۂ محبت امیرالمومنین کہا جاتا ہے سعد بن عبادہ بھی اسی تعریف میں ہیں۔ وہ حضرت عمر کے دور میں قتل کئے گئے۔

حضرموت کے قبائل کا شمار بھی منکرین زکوٰۃ میں کیا جاتا ہے لیکن ان کے نظریات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

"ہم اسی وقت تک خدا و رسولؐ کے حکم کے تابع تھے جب تک صاحبِ شریعت ہم میں موجود تھا۔ اب اس کی طلبی میں فرمانِ الٰہی پہنچ چکا ہے، اگر اس کے اہل بیتؑ میں کوئی اس کی جگہ مقرر ہوا ہے تو ہم اس کی اطاعت کریں گے ابوقحافہ کے بیٹے کی حکمرانی کیسی!"

"حارث ابن سراقہ کے ان تاثرات کے بعد اشعث ابن قیس کے الفاظ حضرموت کے ہزاروں افراد کے محسوسات کے ترجمان ہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ اہل عرب ابوبکر کے خاندان یعنی تیم بن مرّہ کی اطاعت اختیار نہ کریں گے اور بطحا کے سرداروں یعنی بنی ہاشم کا ساتھ نہ چھوڑیں گے کیونکہ یہی لوگ معدنِ رسالت اور لائقِ امامت ہیں"۔ (۶۴)

ان قبائل سے افواجِ خلافت کے زبردست معرکے ہوئے، گھمسان کے رن پڑے مگر انہیں شکست ہوئی۔ حضرت ابوبکر نے اپنی بیٹی اُم فروہ کا عقد اشعث کے ساتھ کر دیا اور اس کے بعد اس کا رویہ بدل گیا۔

مولانا شبلی الفاروق صـ۸۲ پر لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ سقیفہ چلے جاتے تب بھی کوئی ان کی تائید نہ کرتا۔ کیوں، کیا پورا مدینہ اولادِ رسولؐ کا دشمن تھا، کیا علیؑ کے مقابلے میں اسلام کے لئے دوسروں کی خدمات کچھ زیادہ تھیں؟ بات صرف اپنے محبوب کرداروں کے اعمال پر پردہ ڈالنے کی ہے ورنہ کیا تختِ خلافت اور کیا صحرائے عرب، علیؑ اور ان کے ساتھی، تختہ الٹ کر رکھ دیتے اور یہ قبائل پہنچ جاتے تو ابوسفیان کی زبان میں مدینے کی گلیاں سواروں اور پیدلوں سے بھر جاتیں لیکن منصبِ امامت نے علی کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے اور خدا کی طرف سے علی کو اجازت مل جاتی تو عرب میں صرف اتنے ہی مرتد نہ ہوتے بلکہ اکثریت اپنے عزائم میں منہ کی کھا کر اسلام سے روگرداں ہو جاتی۔ اس میں کون کون ہوتا؟ اس کا فیصلہ اہلِ دانش خود کر سکتے ہیں۔

ان مہمات سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکر نے رومی اور ساسانی حکومتوں کی طرف توجہ کی، جن سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ حضورؐ کے حینِ حیات میں شروع ہو چکا تھا۔ خالد بن ولید دربارِ خلافت سے جرنیل بنا کر بھیجے گئے۔ ان سے ایرانیوں کی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ بیشتر میدان خالد کے ہاتھ رہے جو مسلمانوں کی عام تاریخ کا حصہ ہیں۔

اس جنگ کو نامکمل چھوڑ کر خالد مدینے واپس ہوئے اور حضرت ابوبکر نے انھیں رومیوں کی سرکوبی پر متعین فرما دیا۔ چند چھوٹی چھوٹی جنگوں کے بعد فیصلہ کن معرکوں کے منصوبے بن ہی رہے تھے کہ حضرت ابوبکر کا انتقال ہو گیا اور خالد کو واپس بلا لیا گیا۔

علیؑ کے حلقہ بگوش اپنے آئمہ کے علاوہ کسی کو امیر المومنین تسلیم نہیں کرتے مگر

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو بھی نہ مانا جائے ان میں پہلا نام حضرت ابوبکر کا ہے۔ انہوں نے اچھا یا بُرا جو کچھ کیا، ہم اس کے معترف ہیں۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ نے اندرونِ خانہ جو سازشیں کیں، ان سے حضرت ابوبکر بری الذمہ نہیں ہو سکتے پھر سقیفہ بنی ساعدہ میں جو کچھ ہوا، اس سے بھی ان کا دامن صاف نظر نہیں آتا، پھر بھی مسلمانوں کے دُنیاوی مفاد میں انہوں نے بعض کارہائے نمایاں انجام دیئے، تاریخ مسلمانان جس کی ممنون رہے گی۔

حضرتِ ابوبکر کے شرف و فضائل میں بہت سی روایات منقول ہیں کتنی اصلی اور کتنی جعلی؟ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن تمام جعلی حدیثوں کو اصلی مان لیا جائے تب بھی فضیلت کے روشن اور تاریک پہلو باقی رہتے ہیں ——— پہلا شرف یہ ہے کہ مسلم اوّل اور یارِ غار تھے، دوسرے حضورؐ نے بار بار آپ کی صداقت کی تصدیق فرمائی، تیسرے یہ کہ آپ حضورؐ کی محبوب ترین بیوی اُم المؤمنین عائشہ کے پدر محترم تھے۔

ہم کسی پیغمبرؐ کے لئے اس کے قائل ہی نہیں ہیں کہ وہ جمال و شباب پر فریفتہ ہوئے ہوں۔ اُن کی نظر میں تو زہد و تقویٰ، سیرت و کردار موجب شرف ہوتا ہے، پھر ہمارا نبی تو بغیر حکم الٰہی سانس بھی نہ لیتا تھا۔ اس کے لئے نوسن سے اُتری ہوئی حضرت حفصہ اور جواں سال حضرت عائشہ دونوں برابر تھیں۔ آپ کی نظر میں جس کسی کی کوئی قیمت تھی تو اس کی سیرت کی بناء پر۔ چنانچہ عملی زندگی میں خدیجۃ الکبریٰؑ کی جو قدر و منزلت تھی وہ اس وجہ سے نہ تھی کہ جناب خدیجہ اپنے وقت کی حسین ترین عورت تھیں بلکہ خدیجہؑ کی قربانی، آپ کا ایثار، منزلتِ ایمانی سبب امتیاز تھی جو ہمیشہ باقی رہی اسی سے اُم المؤمنین عائشہ جلتی رہتی تھیں۔

زوجہ کی حیثیت سے حضرت عائشہ کا درجہ بھی وہی تھا جو رسولؐ کی کسی دوسری بیوی کا۔ بعض گڑھی ہوئی حدیثیں ملتی ہیں کہ خدا نے جبرئیلؑ کے ذریعہ آپ کو سلام

کہلایا۔ ظاہر ہے کہ خدا کی نظر میں جو چیزیں پسندیدہ ہیں وہ جناب عائشہ میں پائی جاتی ہوں گی تب ہی تو اتنی عزت بخشی گئی۔ اس کا فیصلہ عبادت کے خضوع و خشوع اور ریاضتِ نفس کے استغراق کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے مگر اس سلسلے میں محدثین کے قلم کی روشنائی نے کام نہیں کیا اور ایسی کوئی حدیث نظر نہیں آتی۔ دلیل کے طور پر مباہلہ کو لیا جا سکتا ہے۔ جب طاہرین کا ایک معیار مقرر ہوا تو نہ کسی خوبصورت صفیہؓ کا پتہ چلتا ہے اور نہ عائشہ حمیرا کا۔ وہاں تو صرف حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کی عظیم المرتبت بیٹی ہی منتخب مشیت ہوتی ہے۔ مردوں، بچوں اور عورتوں میں تنہا اسی کی ذات محورِ مباہلہ بنتی ہے: فاطمہؑ کے باپ اور شوہر، فاطمہؑ کے بچے اور خود فاطمہؑ۔ یہ تھا قطعی فیصلہ خوشنودیٔ الٰہی کا۔ اس کے بعد بلا سبب گھما پھیر کر باتیں کی جاتی ہیں اور فضائل سیر کے دریچے وضعی احادیث کی دستکوں سے وا کئے جاتے ہیں۔

دوسری فضیلت صداقت کی ہے اور اسی کی بنا پر حضرت ابوبکر کو صدیق کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اس کے لئے ایک معیار بنانا پڑے گا کہ کیا عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، کیا کبھی رسولؐ سے بے وفائی نہیں کی؟ ہم کچھ نہیں کہتے، خود اپنی روایتی تاریخ کا جائزہ لے لیں، بچپن کے دوست تھے، پسینے پر اپنا خون گرانے والے، لیکن شعب ابی طالب میں نامہ و پیام کا سلسلہ تک باقی نہیں رکھا۔ بنی ہاشم کے کچھ لوگ چاروں طرف سخت پہرہ ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ سامان پہنچا دیتے تھے مگر آپ نے کبھی کوئی کوشش بھی کی ہو تو ہم جھوٹی سے جھوٹی روایت کو بھی سن لیں گے۔ کیا یہی تقاضا تھا بچپن کے یارانے کا اور مسلم اوّل ہونے کے ادعا کا۔

بات آگئی اولیت اسلام کی تو ہمارے نظریئے سے یہ بحث ہی بیکار ہے کیونکہ ہم تو پنجتن پاک کو تخلیق اوّل مانتے ہیں، اسلام و قرآن سے بھی پہلے، ہر چیز سے پہلے: محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ اور ان کے ذیل میں باقی آئمہ۔ محمدؐ محورِ اسلام اور بقیہ تمام محافظِ اسلام۔ ان ذواتِ مقدسہ کی سیرت و کردار

کا نام ہی اسلام ہے تو ان کے لئے "اسلام لانے" کا محاورہ ہی کیوں استعمال کیا جاتا ہے۔

ہاں اس کا سلسلہ باہر کے لوگوں سے شروع ہو سکتا ہے تو ان میں اگر حضرت ابوبکر نے پہل کی ہے تو یقیناً وہ افضل ہیں لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض روایات اس کے خلاف بھی ملتی ہیں۔ تاہم یہ ہمارا مبحث نہیں ہے، وہ پہلے اسلام لائے ہوں یا بعد میں لیکن اکثر مواقع پر ان سے بے وفائی ضرور سرزد ہوئی۔ جنگ اُحد میں ابوعبیدہ بن الجراح کے ساتھ رسولؐ کو تنہا چھوڑ کر پہاڑی پر چڑھ گئے۔ طائف میں بھی ایسا ہی کردار ادا ہوا مگر زیادہ دُور نہیں گئے۔ اُسامہؓ بن زید کے لشکر کے ساتھ تاکید پیغمبرؐ کے باوجود نہیں گئے بلکہ حضورؐ کو عالم نزاع میں چھوڑ کر کئی میل دُور اپنے گھر روانہ ہو گئے، جب کہ دوسرے لوگ شب و روز درِ رسالت پر حاضری دیتے رہے، پھر جب آپ واپس آئے تو میت کو بیٹھ دِکھا کر سقیفہ بنی ساعدہ میں اپنا انتخاب کرانے کے لئے دوسروں کو بھی ساتھ لے گئے۔

بعض باتیں اور بھی ہیں جن کا اعتراف خود حضرت ابوبکر نے آخر وقت میں کیا تھا۔

حدیث توریث اگر سچی ہے تو وہ صدیق ورنہ غیر صدیق، اور چونکہ اس حدیث کو غلط قرار دینے والے علیؑ، فاطمہؑ، حسنینؑ، فاطمہؑ کی کم سن بیٹیاں اور اُم ایمن تھیں، اس لئے ہم تصور میں بھی ان کی بات کو جھوٹی نہیں سمجھ سکتے لہٰذا اس حدیث کو وضعی احادیث میں شامل کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی کا صدیق ہو تو اُسے مبارک ہمارے صدیق اکبر تو علی ابن ابی طالب ہیں جو قیامت تک رہیں گے۔

مسنحن گسترانہ طور پر اسلام میں شرف اوّلیت کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہر بچہ اپنی نوع ولادت میں فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اس میں علیؑ، ابوبکرؓ، عمرؓ، ابوعبیدہؓ اور ابوسفیان میں کوئی تخصیص نہیں علی کا جہاں تک تعلق ہے وہ کعبے میں پیدا ہوئے، رسولؐ کی آغوش میں آنکھ کھولی

دُنیا میں پہلی چیز جو دیکھی، وہ رسُول کریم کا چہرۂ اقدس تھا، پھر آپ کی زبان چوس چوس کر پروان چڑھے اور آپ ہی کے زیرِ سایہ بچپن کی منزلیں طے کرتے رہے حتیٰ کہ دعوتِ ذی العشیرہ میں پیغمبر اسلام کی حمایت کا اعلان کیا۔

وہ بچہ جس نے آنکھ کھول کر اسلام کو دیکھا، زبان کو حرکت دی تو کلام الٰہی کی تلاوت کے لیے، رسُول کے پیچھے اس طرح چلتا رہا، جیسے بکری کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے، پھر اس بچے نے آغوشِ لحد تک ماں کا ساتھ نہ چھوڑا، اس بچے کے لئے کون حکم لگا سکتا ہے کہ کب اس نے ماں کی زبان سمجھنا شروع کی اور کب وہ ماں کے ایما سے آشنا ہوا؟

اس کے مقابلے میں بات کسی صدیق یا کسی فاروق ہی کی نہیں ہے بلکہ سارے عرب کی ہے کہ پیدا ہوئے تو فطرتِ اسلام پر، پرورش پائی تو کفر کی گود میں اور جوان ہوئے تو ایّامِ جاہلیت کے ماحول میں۔ کون انسانی درندگی کے رسم و رواج میں کتنا آلودہ ہوا، کسی پر فحاشی کا رنگ کس قدر چڑھا؟ اس کے تجزیئے کی ضرورت نہیں، کیونکہ قبولِ اسلام سے ہر ایک یکساں طاہر و مطہر ہو گیا، البتہ حلقہ بگوشِ دینِ مبین ہونے کے بعد اگر کسی کے پاؤں ڈگمگائے تو وہ دائرۂ ارتداد سے باہر نہیں جا سکتا۔

ہم اس روشنی میں کسی کا زندگی نامہ کیوں مرتب کریں۔ ہمیں تو اپنے ممدوحین کی بات کرنا ہے، ان کی سطح پر ہم کسی کو نہیں پاتے، لہٰذا گنتی میں بھی نہیں لاتے پھر بھی کسی سے کوئی کارنمایاں انجام پایا ہے تو اس کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں اور اسی تعریف میں حضرت ابوبکر کو بھی لاتے ہیں۔

سرسید کا قول تھا کہ "حضرت ابوبکر کی خلافت دراصل حضرت عمر ہی کی خلافت اوّل تھی"۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ۲۹ صفر ۱۱ھ سے ۲ جمادی الثانی ۱۳ھ تک کا زمانہ بھی ایسا قرار پائے گا جس میں زمامِ حکومت تو حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں تھی مگر اس کو حرکت حضرت عمر دیتے تھے۔ اس طرح اس دور کے امتیازات

کا سہرا ابھی حضرت عمر ہی کے سر بندھا ہے تاہم اس دور میں جو مرحلے سر ہوئے، ان پہ نام حضرت ابوبکر کا لکھا ہے۔

خلافت دوم

حضرت ابوبکر نے اپنے بعد خلافت کے لئے حضرت عمر کو نامزد کر دیا تھا۔ اس لئے تجہیز و تکفین سے فارغ ہوتے ہی تختِ خلافت پر متمکن ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کی بیعت کر لی۔ حالانکہ ان کا انتخاب شوریٰ کے ذریعے عمل میں نہ آیا تھا۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ بنائے جانے کے لئے شوریٰ کی قید نہ تھی شوریٰ کا شاخسانہ صرف حضرت علیؑ کو محروم کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تھا، ورنہ حضرت ابوبکر کے بعد ایک بار پھر سقیفہ بنی ساعدہ میں گہماگہمی ہوتی اور حضرت عمر کو کسی دوسرے امیدوار خلافت کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ یہ احسان ہے حضرت ابوبکر کا حضرت عمر پر کہ انہوں نے سابقہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر کسی سعد بن عبادہ کو مسئلہ خلافت میں دراندازہونے نہیں دیا۔ بعض مستند روایات کی رو سے آغاز خلافت کے بعد ایک دن حضرت عمر نے اعتراف کیا کہ جب حضورؐ نے کاغذ اور قلم دوات مانگا تھا تو حضرت عمر نے جان بوجھ کر نہیں دیا، کیونکہ آپؐ علیؑ کی محبت میں اکثر جادۂ انصاف سے گزر جاتے تھے اور ایسی باتیں کر جاتے جس سے اسلام کو نقصان پہنچتا تھا اور حضرت عمر کو اسلام سے محبت تھی لہذا انہوں نے حضورؐ کو ایک مضرت رساں کام سے باز رکھا۔ بقول حضرت عمر حضور علیؑ ہی کے حق میں وصیت لکھ دیتے تاکہ مسلمانوں میں آئندہ کوئی خلفشار پیدا نہ ہو۔ حضرت ابوبکر بھی شاید اس نکتے کو سمجھتے تھے۔ تب ہی انہوں نے ممکن انتشار سے مسلمانوں کو بچا لیا اور حضرت عمر کو نامزد کر دیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وصیت نامے کے "ابتدائی الفاظ لکھوائے ہی تھے کہ ضعف سے غش آ گیا، حضرت عثمان نے اپنی طرف سے حضرت عمر کا نام لکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش آیا تو تحریر پڑھوا کر سُنی، حضرت عمر کا نام سُن کر بے اختیار زبان سے اللہ اکبر نکل گیا اور فرمایا:

خدا تم کو جزائے خیر دے، تم نے میرے دل کی بات لکھ دی۔" (۶۵)

اِن لوگوں میں واقعی آپس میں اتنی ہم آہنگی تھی کہ ایک دوسرے کے مافی الضمیر کو جانتا تھا یا ہو سکتا ہے کہ خود اس کی رائے بھی یہی ہو۔

غنیمت تھا کہ حضرت ابوبکر مرتے دم تک حاضر دماغ رہے۔ ان پر حضور کی طرح کوئی ہذیانی کیفیت طاری نہیں ہوئی ورنہ وہ اس کام کو انجام نہ دے سکتے جس کو حضور نہ کر سکے تھے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اسلام کا پیغمبر مسلمانوں کو کتنا پیارا تھا کہ اس کے آخر وقت میں خود اس کے ساتھ اور وفات کے بعد اس کی اولاد کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ یکساں رہا اور بعد کے لوگ بھی کتنے عاشقِ رسول ہیں کہ آج تک بدسلوکی کرنے والوں کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

اس طرح مسلمانوں کے دوسرے دورِ خلافت کا آغاز ہوا جس کے دامن پہ بددیانتی اور حق تلفی کے داغ ضرور ہیں لیکن جس کے افق پر فتوحات کا وہ آفتاب چمکتا نظر آتا ہے جس نے عراق و شام اور مصر کو اسلام اور اہلِ اسلام سے آشنا کرا دیا۔ ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر کو صحرائی جبلت اور عربوں کی فطرت سمجھنے میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ انہوں نے ایسے جرنیلوں کا انتخاب کیا جنھوں نے روم و ایران میں تہلکہ ڈال دیا اور حکومتوں کے پرخچے اُڑا دیئے۔

خالد بن ولید ۱۷ھ میں معزول ہو گئے۔ حضرت عمر سے ان کی دشمنی کے کے بازار اور عکاظ کے میلے میں ہوئی۔ مالک بن نویرہ کے قتل کے بعد سے اضافہ ہو گیا اور حضرت عمر اپنے عہد میں ان پر اعتماد نہ کر سکے۔ ابوعبیدہ جراح، مثنیٰ، سعد بن ابی وقاص، عمر عاص اور دوسرے بہادروں نے سکندر اعظم کی یاد تازہ کر دی۔ شام فتح ہونے پر یزید بن ابوسفیان کو گورنر بنایا جا چکا تھا۔ ابوموسیٰ اشعری کو بصرے کا حاکم بنایا گیا اور تسخیر کا سیلاب آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ اِسی لئے جاہ طلب دُنیا نے انھیں عمر اعظم کے لقب سے بھی پکارا ہے۔

عربوں کی مسلسل فتوحات بلاشبہ حضرت عمر کی قیادت اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہیں مگر اس دوران پیغمبر کا حقیقی نائب جس کو حقِ خلافت سے محروم کر دیا گیا تھا، بے تعلق نظر نہیں آتا۔ علی کے بجائے کوئی اور ہوتا تو جل بھن کر کباب ہو جاتا، لیکن علی، امام کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ رہے تھے ــــــ انہوں نے کتنی ہی بد خلقی کی ہو پھر بھی تھے رسول کے اُمتی، اور جو کچھ کر رہے تھے وہ اسلام کا نام لے کر، لہٰذا علیؑ کسی مقام پر دامن کش نہیں ہوئے بلکہ جب خلیفہ نے مشورے کے لئے بلایا تو بلا تامل برمحل مشورہ دیا اور حضرت عمر جب خود جانے کو تیار ہوئے تو مرکز کے دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی قبول کی، کیونکہ آپ کا مقصد تو اشاعت اور استقرار اسلام تھا، وہ کسی عنوان سے بھی ہوتا، اس سے آپ کا مقصدِ تخلیق پورا ہو رہا تھا ــــــ اس میں خامیاں ضرور تھیں تو علی ان کو دُور کر سکتے تھے۔

جنگوں کی تفاصیل خود جرنیلوں کے تدبر کا نتیجہ ہیں جن کو ہر مورّخ نے اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ ہمارے مسلک میں جو قیود اور شرعی پابندیاں ہیں ان کو سامنے رکھ کر ان جنگوں کو دیکھا جائے تو ان میں اکثر مقامات پر آدابِ اسلام کے بجائے عربوں کی قساوت اور بربریت بھی پائی جائے گی۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ عرب جب ایرانی علاقوں پر قابض ہوئے تو انہوں نے ساسانی تمدن کا اتباع کیا اور تاریخ عالم میں پہلے فاتح کی نظیر قائم کی جو مفتوح سے متاثر ہوا۔ اسلام کے نقطہ نظر سے کسی قوم کی اچھی باتوں کو اپنانا کوئی بری بات نہیں ہے لیکن عرب کی سادگی ایران کی ترقی بھڑک سے چوندھیا رہی تھی اور زرق برق پوشاکوں سے اپنے کو ملبوس کر رہی تھی۔ جس سے جذبۂ اسلام کی روح کمزور پڑنے لگی تھی۔

شام میں ۱۳ھ سے بنی اُمیہ کی حکومت تھی۔ ۱۸ھ میں یزید بن ابو سفیان گورنر بن چکے تھے اور رومی جاہ و جلال دمشق کے دربار میں داخل ہو چکا تھا جس نے آہستہ آہستہ غلبہ حاصل کر لیا اور مدینے کے معاشرے سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہ گیا۔

حضرت عمر کا گیارہ سالہ دورِ حکومت ۲۹ ذی الحجہ ۲۳ھ کو تمام ہوا۔ توسیع مملکت کے دُنیاوی مطمعِ نگاہ سے یہ ایک زرین عہد تھا جس کے بعض اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے۔ پھر بھی اس میں پیغمبرانہ جبروت کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی بلکہ تسخیرِ عالم کے اس خواب کی ابتدا نظر آتی ہے جو مستقبل بعید میں پورا ہوا اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے سجادہ نیابت پر بیٹھ کر اتنے ممالک فتح نہ کرتے اور تسخیر کا دھارا زیادہ تیز رو نہ ہوتا تو اس کو بہت جلد استحکام میسّر آجاتا اور فاتحینِ عالم میں ان کا درجہ بہت بلند ہوتا، تاہم ان کی دانشمندی اور سیاسی سُوجھ بُوجھ داد لیئے بغیر نہیں رہتی کہ انہوں نے عرب کے نسلی مزاج کو پہچان کر صحرائیوں کو وہ راستہ دکھا دیا جس پر ایمان کی مُہر تو لگی ہوئی تھی مگر مالِ غنیمت کی منزلیں بھی دُور دُور تک تابندہ تھیں۔

ان کی موت ایک بڑا سانحہ تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ کے پارسی غلام ابو لولو نے نماز پڑھتے میں آپ پر حملہ کیا اور آپ شہید ہو گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ابو لولو فیروز نجار اور آہن گر تھا۔ حضرت عمر سے اس کی دشمنی تھی۔ ایک دن وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ اس نے ایک نئی قسم کی چکی بنائی ہے اور خلیفہ سے اس کا افتتاح کرانا چاہتا ہے۔ آپ نے رضامندی ظاہر کر دی اور وہ چلا گیا۔

وقتِ مقررہ پر آ کر وہ حضرت عمر کو لے گیا اور اپنے ہاتھ سے چکی چلانے کی استدعا کی۔ حضرت عمر نے زور لگا کر چکی کو گھمایا تو اس کے اندر چھپی ہوئی ایک چھری اس تیزی سے نکلی کہ آپ کے پورے پیٹ کو چاک کر گئی اور آپ دوسرے ہی دن اس زخم سے انتقال کر گئے۔

ابو لولو فیروز موقع ہی پر مر گیا یا مار ڈالا گیا تاہم مغیرہ بن شعبہ کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

حضرت عمر کا اسلام کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن رسولؐ کے حینِ حیات وہ

جن جن مواقع پر ڈانوا ڈول ہوئے اور جو لغزشیں ان سے سرزد ہوئیں ان پر ملمع چڑھانے سے نہیں چڑھتا۔ ہم ان کی نیت پر شک نہیں کرتے لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں کہ پیغمبر کی نیابت شروع ہی سے ان کی منزل نظر تھی۔ اس مقصد کے لئے جو گروہ انہوں نے بنایا اور ام المؤمنین عائشہؓ کے تعاون سے جو سازشیں کیں وہ سب اپنی جگہ پر ہیں اور یہ بھی مسلّم ہے کہ ان میں اُس وقت تک کامیابی نہ ہو سکتی جب تک علیؑ کو راستے سے ہٹایا نہ جاتا اور اس پر وہ قادر نہیں تھے۔ البتہ عوام کی نگاہ میں علیؑ کی منزلت کم کی جا سکتی تھی تو وضعی روایات کا سہارا لیا گیا اور ابو ہریرہ جیسے لوگ انہیں مل گئے۔

روایات کا حربہ اس عہد کے لحاظ سے ایک کامیاب حربہ تھا۔ جس کی ابتداء تو اس زمانے میں ہوئی مگر حضرت معاویہ نے اس کو بام عروج پر پہنچا دیا اور اتنی روایات در آمد کرائیں کہ اصل و نقل کا امتیاز ہی ختم کر دیا۔

آلِ محمدؐ افضل بھی تھے، شجاعت، زہد و تقویٰ، علم، حسب و نسب اور سیرت و کردار میں، اور رسولِ اسلام کی قرابت سے حقدار بھی جس کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ خلافت کو تدبر و حکمت سے اپنا لیا گیا تھا تو پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے تھا کہ انہیں اس جگہ پہنچا دیا جائے جہاں سے وہ کوئی آواز بلند ہی نہ کر سکیں۔ اس لئے انہیں ہر طرح نشانۂ ستم بنایا گیا۔

محبت و جنگ میں سب جائز ہوتا ہے، جس پر اربابِ خلافت نے پورا عمل کیا اور بعد کے مسلم سلاطین نے اس لائحہ عمل کو پروان چڑھایا۔

اگر حالات کو دُنیاوی آنکھ سے دیکھا جائے تو حضرت عمر ایک کامیاب ترین مدبر تھے لیکن دین مقدس کی علم برداری کے ساتھ اُن کا جواز کسی طرح نہیں مل سکتا۔ آپ نے بعض قابلِ قدر اصلاحات بھی کیں مگر بعض بدعتیں بھی سرزد ہوئیں جن کا کوئی شرعی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ حضورؐ نے اگر کسی بات کو جائز قرار دیا تو اس کو ناجائز قرار دینے کا حق حضرت عمر کیا، ان کے بڑوں کو بھی نہ تھا۔ تاریخ الخلفاء۔

سیوطی کی رو سے آپ نے متعہ کو بند کرایا بلکہ اسکو حرام قرار دیا۔ مروج الذہب کے بیان کے مطابق ۱۴ھ میں تراویح کو رائج کیا جو آج تک جاری ہے مگر دورِ رسالت اور عہدِ خلافت اوّل میں اس کا کوئی وجود پایا نہیں جاتا۔

ہماری نظر میں حضرت عمر کی شخصیت کے دو رُخ ہیں ـــــ ایک تو وہ جس میں ان کے خونخوار جرنیلوں نے یرموک سے ساحل نیل تک اسلام کے نام سے مسلمانوں کا بول بالا کیا، دوسری طرف ایوانِ خلافت پر ان کے گاڑے ہوئے علم کی پرچھائیں اتنی دُور تک گئی کہ سادات کے خون کے دھبے بھی اس میں چھُپ گئے اور تاریخ کی خوردبین بھی ان کو دیکھ نہیں سکتی۔

خلافت سوم

نامزدگی کا سلسلہ حضرت ابوبکر سے چلا تو یہاں تک پہنچا کہ حضرت عمر نے اپنے بعد چھ آدمیوں کو نامزد کیا۔ علیؑ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعدؓ اور عبدالرحمٰنؓ اور وصیت کی کہ ان چھ میں سے جو قرآن و سنت اور سیرت شیخین پر عمل کرنے کی حامی بھرے اس کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ جانتے تھے کہ علیؑ نے بیعت نہیں کی تو سیرت شیخین کو قبول کیسے کریں گے۔ علیؑ نے ایک عالمانہ جواب دیا کہ سیرت شیخین میں جہاں سیرت نبویؐ ہے اس پر عمل کریں گے۔ سیرت شیخین غالباً سیرت نبویؐ سے مختلف تھی لہذا علیؑ کی شرط مانی نہیں گئی۔ عثمان نے ہر بات قبول کرلی اور وہ خلیفہ بن گئے۔

یہ تاریخ کا تیسرا المیہ ہے جس کا آغاز یکم محرم ۲۴ھ سے ہوا اور جس میں حضرت علیؑ پھر سیاسی ہتھکنڈوں کا شکار ہوئے مگر انہیں اس کی پرواہ کب تھی؟ وہ بدستور اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ حضورؐ نے چالیس سال عربوں کو انسان بنانے میں گزارے تھے، علیؑ مسلمانوں کو مسلمان بنانے میں لگے رہے۔

ایوان خلافت میں چند روز تک ایک سکوت سا طاری رہا، پھر چہل پہل شروع ہوگئی۔" ابتدا میں کچھ دنوں تک حضرت عثمان نے فاروقی نظام میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا صرف

مغیرہ بن شعبہ کو حضرت عمر کی وصیت کے مطابق کوفہ کی ولایت سے معزول کرکے ان کی جگہ سعد بن ابی وقاص کو مقرر کیا۔" (۶۶)

باقی سب کو بدستور اپنی اپنی جگہوں پر باقی رکھا۔

حضرت عمر کا قاتل ابولولو مغیرہ بن شعبہ کا غلام تھا۔ غالباً حضرت عمر کو شک تھا کہ اس نے مغیرہ کے اشارے پر ایسا اقدام کیا اس لئے وہ مغیرہ کو سزا دینے کی تاکید کرگئے ـــــــ اسی زمانے میں اسکندریہ، آرمینیہ اور آذربائیجان میں بغاوتیں ہوئیں مگر وہ فرو کردی گئیں۔

عمرو ابن عاص والیٔ مصر پر حضرت عمر کے دور سے خیانت کا شبہ تھا حضرت عثمان نے ان کو معزول کردیا اور ابن ابی سرح کو پورے مصر کا حکمراں بنادیا۔ اس نے ۲۷ھ میں طرابلس فتح کیا۔ اسی زمانے میں حضرت عثمان نے حضرت معاویہ کے زیر تحت علاقے میں اضافہ کیا۔ ۲۹ھ میں ابوموسیٰ اشعری کو معزول کیا گیا۔ ۳۰ھ میں ولید بن عقبہ کی جگہ کوفہ میں سعید ابن العاص کا تقرر ہوا۔ اسی سال طبرستان فتح ہوا۔ خراسان، طخارستان، کرمان اور سجستان پر مکمل قبضہ حاصل کیا گیا اور حضرت معاویہ نے اپنے علاقوں کو وسیع تر کرلیا۔

حضرت عثمان کو ایک بنی بنائی زمین حکومت کے لئے مل تھی مگر ان کی عمر بہت زیادہ ہوگئی تھی، پھر وہ کمزور بھی تھے۔ اس پر مستزاد ان کی اقربا پروری اور غلط پالیسی۔ ان سب نے مل جل کر حالات کو ناہموار کردیا۔

"حضرت عمر بڑے عاقبت اندیش تھے، انہوں نے اپنے زمانے میں اکابر قریش کو، جن کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہوسکتا تھا، مدینہ کے باہر نکلنے نہیں دیا۔ حضرت عثمان نے یہ قید اٹھادی یہ لوگ مدینے سے باہر نکلے تو خاندانِ رسالت کے تعلق سے لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بن گئے۔" (۶۷)

کہا جاتا ہے کہ عبداللہ ابن سبا نام کا کوئی یہودی تھا، جس نے حضرت عثمان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا، لیکن یہ صرف تاریخ کا مفروضہ ہے۔ ایسا کوئی آدمی موجود نہ تھا، بلکہ حضرت عثمان نے اپنے رشتہ داروں کو کھل کھیلنے موقع دیا تھا جس سے عوام پر نت نئی زیادتیاں ہو رہی تھیں اور لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔

حضرت معاویہ والی شام نے اتنی مضبوط حکومت بنا لی تھی کہ خلافت بھی اس سے ٹکر نہ لے سکتی ———— شورش جب زیادہ بڑھی تو صحابہ نے حضرت علیؑ کے ذریعہ حضرت عثمان پر اثر ڈالا اور حضرت عثمان نے بدعنوان عاملوں کی اصلاح کے لئے بعض اقدامات بھی کئے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا بلکہ زیادتیاں بڑھتی ہی گئیں۔ حضرت عثمان کے طویل دورِ خلافت پر ایک نظر ڈالی جائے تو انہوں نے اپنے وفاداروں کی تعداد بڑھانے کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز بھی اُٹھا دی تھی۔

حکم بن عاص دشمنِ رسولؐ تھا۔ حضورؐ نے اس کو مدینے سے نکال کر طائف بھجوا دیا تھا۔ حضرت عثمان نے اس حکم کو منسوخ کر کے اس کو واپس بُلا لیا، اور زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور کر دیا۔

یہی صورت حضرت عثمان کے چچیرے بھائی مروان بن حکم کی تھی۔ اس کے لئے آنحضرتؐ کا حکم تھا کہ مدینے سے ایک فرسخ کے اندر نظر آئے تو اس کا خون مباح ہو گا۔ حضرت عثمان نے بُلا کر اس کو اپنا داماد بنایا، اپنا مشیر خاص مقرر کر دیا اور باغ فدک جمیع مسلمین سے چھین کر اس کو دے دیا۔

بنی اُمیہ کے لئے خزانے کا مُنہ کھول دیا۔ حارث ابن حکم کو تین لاکھ درہم عبداللہ ابن خالد کو تین لاکھ درہم اور اپنے چچا ابوسفیان کو دو لاکھ درہم عنایت فرمائے ———— اسی تقویت پر ایک روز ابوسفیان حسنینؑ کو لے کر روضۂ رسولؐ پر گیا تھا اور پکار کر کہا تھا۔

"محمد! تم نے پیغمبری کا ڈھونگ رچایا تھا۔ عرب کی سرداری ہمارا حق تھی ہم

نے اس کو لے لیا۔"

پھر ایک دن مدینے کے بھرے بازار میں بنی ہاشم کو للکارا تھا لیکن حقیقتاً اس کا مخاطب الیہ حضرت علیؑ تھے

"ہاشمیو! آؤ دیکھو، ہمارے بچے حکومت کی گیند سے کھیل رہے ہیں "

ولید بن عقبہ ایک مشہور بدکار اور شرابی تھا، نشے میں نماز پڑھا دیتا تھا، حضرت عثمان نے اس کو مختلف عہدوں پر نوازا۔

سعید بن عاص نے بعض صحابیوں پر مظالم کئے تھے، حضرت عثمان نے اس کو باعزت عہدے عطا کئے۔

عبداللہ بن سرح کا قتل بروز فتح مکہ آنحضرت نے مباح کر دیا تھا، حضرت عثمان نے اس کو حاکم بنایا۔

عامر بن قیس مشہور صحابی رسولؐ تھے۔ ان کی توہین کی اور عبداللہ بن عامر کو شام کی طرف جلاوطن کیا۔

جلاوطن ہونے والوں میں حضرت جندب بن جنادہ المعروف ابوذرؓ غفاری بھی تھے۔ آپ اتنے جلیل القدر صحابی تھے کہ جنگِ مصطلق پر جاتے وقت حضورؐ آپ کو مدینے میں اپنا قائم مقام بنا گئے تھے۔ حضرت عثمان کی بدعنوانیوں سے دل برداشتہ ہو کر آپ شام چلے گئے تھے مگر وہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کرتے رہے اور حضرت معاویہ نے سخت قید و بند کے ساتھ ایک اونٹ پر بٹھا کر آپ کو مدینے بھیج دیا۔ حضرت عثمان نے پہلے تو ان کا معاشرتی مقاطعہ کرایا، پھر ربذہ کی طرف جلاوطن کر دیا جو ایک بے آب و گیاہ ویرانہ تھا۔

مروان نے حضرت ابوذرؓ کو ایک اونٹ پر سوار کرایا اور اعلان کیا کہ جو انہیں پہنچانے جائے گا، اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔

امیر المومنین بحیثیت امام مسلمانوں پر تلوار نہ اٹھانے کے پابند تھے مگر حضرت ابوذرؓ رکنِ ایمان تھے اور یوں بھی حضرت عثمان کا حکم آپ کے لئے واجب التعمیل

تو نہ تھا۔ آپ اپنے بھائی عقیل، بھتیجے عبداللہ ابن جعفر، عمار یاسر اور دونوں بیٹوں کو لے کر چلے۔ عمالِ خلافت نہایت بے عزتی کے ساتھ صحابی رسولؐ کو لے جا رہے تھے ـــــــ اس صحابی کو جس کے لئے حضورؐ کی کئی حدیثیں تھیں۔ جس کے بارے میں مشہور ارشادِ پیغمبرؐ ہے کہ روئے زمین پر ابوذرؓ سے زیادہ کوئی ذی نطق صادق القول اور حق گو نہیں ہے، مکے کے صادق و امین کی یہ سند حضرت ابوذرؓ کی پیشانی پر چمک رہی تھی اور حضرت عثمان کے کارندے ان کو اونٹ پر بٹھائے اونٹ کو ہنکاتے جا رہے تھے کہ امیرالمومنین پہنچ گئے۔ مروان مانع ہوا۔ حضرت علیؑ نے ایک چابک مروان کے اونٹ کو رسید کیا اور فرمایا۔

"دور ہو، خدا تجھے جہنم رسید کرے ـــــــ"

پھر آپ نے ابوذرؓ کی مشایعت کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ابوذرؓ عارفِ اسرارِ رسالت و امامت تھے۔ ان سے اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی، وہ اُتر کر سب سے گلے ملے حسنینؑ کی پیشانیوں کو بوسہ دیا۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ منزلِ آخر کی طرف جا رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرما دیا تھا: "ابوذر! تمہیں جلا وطنی میں موت آئے گی"۔

مدینے کے باہر تک علیؑ آپ کے ساتھ گئے۔ حضرت ابوذرؓ ایک بار پھر گلے ملے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو الوداعی نظروں سے دیکھا، لبوں سے کچھ کلمات ادا کئے اور ابوذرؓ اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ روتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

واپسی پر حضرت علیؑ سے حضرت عثمان کا بڑا سخت مکالمہ ہوا مگر حضرت عثمانؓ کے لئے ضبط کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ پورا دارالخلافہ امنڈ آتا تب بھی علیؑ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔

ابوذرؓ نے حق رسالت و امامت ادا کر دیا تھا۔ ربذہ میں کچھ بکریاں پال کر آپ گزر بسر کرنے لگے۔ پھر بکریاں یکے بعد دیگرے مرنے لگیں اور ابوذرؓ بھوک کی شدت سے جاں بلب ہو گئے اور اسی عالم میں آپ کی روح نورِ رسالتؐ کی

کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔

آپ نے بیٹی کو وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد ٹیلے پر جا کر کھڑی ہو جانا ایک قافلہ گزرے گا، اس کو آواز دے کر بُلا لینا۔ لڑکی بلندی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ قافلہ نظر آگیا۔ اس نے آکر حضرت ابوذرؓ کی تجہیز و تکفین کی۔ بیٹی نے حسب ہدایت آخری بکری جو بچ رہی تھی، اس کو ذبح کر کے اہل قافلہ کی ضیافت کی۔ قافلہ حضرت ابوذرؓ کی بیوی اور بیٹی کو لے کر روانہ ہو گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قافلہ مالکِ اشتر کا تھا اور کچھ کسی اور کا بتاتے ہیں۔

عبداللہ ابن مسعودؓ کا مرتبہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ حضرت عثمان کے حکم سے غلاموں نے انہیں اس زور سے زمین پر پٹکا کہ ان کی دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ خطا ان کی یہ تھی کہ انہوں نے اپنا جمع کیا ہوا قرآن عثمان کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اسلام کے لئے عمار یاسر کی خدمات بیان کی محتاج نہیں۔ آپ کی برگزیدہ ماں سمیہؓ کو ابوجہل نے نیزے سے شہید کیا تھا اور پھر یاسرؓ کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ عمارؓ صحابی رسولؐ بھی تھے اور صحابی امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب بھی۔ آپ حضرت عثمان کو سمجھانے کے لئے گئے تو انہوں نے غلاموں سے اتنا پٹوایا کہ عمارؓ کا پیٹ پھٹ گیا، ایک پسلی ٹوٹ گئی اور جسم کے دوسرے حصوں پر چوٹیں آئیں۔ بہت بوڑھے تھے۔ بے ہوش ہو گئے۔ غلاموں نے مُردہ سمجھ کر باہر پھینک دیا۔ حضرت اُم سلمہؓ اُٹھوا کر لے گئیں اور علاج کرایا ــــــ عمارؓ کے پدر عالیمقام یاسرؓ اور مادر گرامی سمیہ اسلام کے شہدائے اولیں تھے۔ خود ان کے مقابلے میں حضرت عثمان کی کیا قیمت تھی ــــــ؟

ان لوگوں کے علاوہ کتنے ہی بزرگوں کے ساتھ حضرت عثمان نے اہانت آمیز برتاؤ کیا۔ جس سے ایک عام نفرت پھیل گئی، اور ہر طرف بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔ اسی زمانے میں آپ نے محمدؐ بن ابی بکر کو شام کا گورنر مقرر کیا لیکن مروان نے ایک خفیہ خط عبداللہ ابن ابی سرح کو لکھ دیا کہ محمد کو پہنچتے ہی قتل کر دینا۔ یہ

خط راستے میں محمدؒ بن ابی بکر کے ساتھیوں نے پکڑ لیا اور واپس آ کر دار الخلافہ کا محاصرہ کر لیا
بغاوت کی آگ پہلے ہی پھیل چکی تھی۔ مدینے کے لوگ بھی آ کر محمدؒ بن ابی بکر کے شریک ہو گئے۔

حضرت علیؑ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے حسنینؑ کو بھیجا اور رسولؐ کے نواسے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے کہ کسی کو اندر جانے نہ دیں مگر لوگ عقب سے سیڑھیاں لگا کر چڑھ گئے اور حضرت عثمان کی ڈاڑھی نوچی ، مگر ان کے گڑ گڑانے پر چھوڑ دیا۔ پھر دوسرے لوگ گئے۔ انہوں نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا۔ ان کی بیوی نائلہؓ نے بچانے کی کوشش کی تو تلوار ماری، جس سے نائلہ کی انگلیاں کٹ گئیں ____ مورخین قاتلوں کے نام یقین سے نہ لکھ سکے، لیکن ان میں کنانہ بن بشر، عمرو بن الحمق اور طلحہ بھی شامل تھے۔

تین روز تک ان لوگوں کا مدینے پر قبضہ رہا۔ حضرت عثمان کی لاش کوڑے کرکٹ میں پڑی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ جانور ان کی ایک ٹانگ کھا گئے تھے ____ پھر حضرت علیؑ کی مداخلت سے یہ لاقانونیت ختم ہوئی اور حضرت عثمان کو قبر میسر آ سکی۔

۸ ار ذی الحجہ ۳۵ھ کو ۱۲ سال کی خلافت کے بعد اس دور کا خاتمہ ہو گیا۔ ستر سال کی عمر میں آپ تخت خلافت پر بیٹھے، بیاسی سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

حضرت علیؑ نے بار بار حضرت عثمان کی بداعتدالیوں پر نکتہ چینی کی تھی لیکن اس قتل میں ان کا ہاتھ نہ تھا۔ ایسا ہی کرنا ہوتا تو پیغمبرؐ کی تجہیز و تکفین کے بعد کس نے آپ کی شمشیر کو باہر نکلنے سے روکا تھا مگر آپ حصولِ اقتدار کے لئے کشت و خون کو پسند نہ کرتے، لہٰذا ان کے حقوق غصب کیے گئے۔ ساتھیوں اور بہی خواہوں کو تہہ تیغ کیا گیا، ذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی مگر آپ نے اُف نہیں کی ایک کمزور خلیفہ کے قتل کی سازش میں بھلا کیا شریک ہوتے لیکن آنحضرتؐ کے حینِ حیات مدینے میں جو شطرنجی بساطِ سیاست بچھائی گئی تھی اس کے کھلاڑی ایک

دوسرے کی جگہ لیتے رہے تھے۔ اُن کھلاڑیوں نے علیؑ کو معاف نہیں کیا اور فوراً آپ کا نام لے لیا۔

حضرت عثمان اگرچہ ایک کامیاب حکمران ثابت نہیں ہوئے مگر ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں اور کمزوریاں بھی، جن میں سے بعض کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے "حضرت عمر خدا کی خاطر اپنے اقربا کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں ـــــــ ابوبکر و عمر بیت المال کے معاملے میں اس بات کو پسند کرتے تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقربا کو بھی اسی حال میں رہنے دیں مگر میں اس میں صلہ رحمی کرنا پسند کرتا ہوں" (۶۷)

اس کا نتیجہ مولانا مودودی کے بقول یہ نکلا کہ " ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے بلکہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سُلگ اُٹھیں جن کا شعلہ خلافتِ راشدہ کے نظام ہی کو پھونک کر رہا" (۶۸)

اسپرٹ آف اسلام ص۲۳۶ پر بھی اس قسم کی ایک رائے ملتی ہے:

"پہلے دو خلفائے راشدین نے ان کی حب جاہ کو حدود کے اندر محدود رکھا تھا اور ان کی ریشہ دوانیوں اور مکارانہ سازشوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا تھا۔ حضرت عثمان کے مسند نشین ہوتے ہی وہ سب کے سب مدینے میں آکر جمع ہو گئے۔ ان کا خلیفہ بننا تھا کہ نفرت کا وہ آتش فشاں پھٹ پڑا اور ہوس رانی اور تن پرستی کا وہ فاسد مادہ بہہ نکلا جس نے اسلامی دنیا کا سینہ دہلا دیا اور اس کے بہترین اور اشرف ترین نفوس کو لقمۂ اجل بنا دیا۔"

خلافت چہارم

حضرت عثمان نے خلافت کیلئے کسی کو نامزد نہ کیا تھا اور نہ کوئی انتخابی مجلس بنائی تھی لہذا خود مسلمانوں کو اس کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس وقت مدینہ اور نواح مدینہ کی صورت وہ نہیں تھی جس میں آلِ فاطمہ کو سانس لینا دشوار ہوتا۔ حضرت عثمان کی بدعنوانیوں نے پچھلے ماحول کو بدل دیا تھا لیکن حصول

اقتدار کے لئے داؤں پیچ کرنے والے ابھی موجود تھے۔

بصرے کے لوگ طلحہ کے حق میں تھے اور کوفے والے زبیر کے حامی، مگر اہلِ مدینہ ان دونوں کو خونِ عثمان سے بے تعلق نہ سمجھتے، اس لئے علیؑ کے نام کا آوازہ بلند ہوگیا ـــــــ حضرت علیؑ اپنے کو اس جھنجھٹ میں ڈالنا پسند نہ کرتے لیکن امام برحق کی حیثیت سے جب بالاتفاق ہدایت خواہی کا مطالبہ ہوا تو آپ انکار نہ کرسکے اور ذی الحجہ ۳۵ھ کی آخری تاریخوں میں آپ نے مسلمانوں کی دنیادی قیادت کی باگ ڈور بھی ہاتھ میں لے لی، جس کو عرفِ عام میں چوتھی خلافت کہا جاتا ہے۔

پیغمبرِ اسلام کو گزرے ہوئے چوبیس سال ہوچکے تھے۔ آپ نے قوم کو جو مزاج دیا تھا، وہ اگرچہ پوری طرح قبول نہیں کیا گیا تھا پھر بھی اس نے عربوں کی قدیم فطرت کو کسی حد تک دبا لیا تھا اور اکثریت حق شناسی کی طرف مائل تھی۔ خلافت کے تین ادوار میں اگرچہ نام اسلام ہی کا لیا گیا تھا لیکن ذاتی مصلحتوں نے وضعی روایتوں کے ذریعہ اسلام کی صورت بگاڑ دی تھی تاہم ابھی یہ صورت پہچانی جاسکتی تھی اور مسلمانوں کو دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ یہ ہادیٔ عرب کے پیرو ہیں۔

اِن حالات میں علیؑ اصلی قرآن و سنت لے کر آرہے تھے جس کی قبولیت کا اللہ حافظ تھا مگر علیؑ کرتے بھی کیا؟ وہ تو پیدا ہی اِسی کے لئے ہوئے تھے، اِسی لئے آپ نے بسم اللہ کہہ کر اس حیثیت سے بھی اپنے منصب کا آغاز کر دیا۔

حضرت علیؑ کے حریفوں کا پہلا گروہ بدلی ہوئی شکلوں میں اسی طرح موجود تھا۔ اس کے برعکس خود علیؑ کے حق پرست ساتھی کم ہوگئے تھے نئی نسل میں کچھ مقلدین سامنے آئے تھے۔ پھر بھی وہ سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ کا بدل تو نہ ہوسکتے تھے۔

سلمان فارسی کا نام روزبہ تھا۔ آپ حضرت عیسیٰؑ کے آخری وصی تھے، دس بار غلام بنا کر بیچے گئے۔ آخر میں آنحضرت نے خرید کر آزاد کر دیا۔ سلمانؓ کا درجہ

حضورؐ کی نگاہ میں اتنا بلند تھا کہ انہیں اپنے اہلِ بیت میں شمار کرتے تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے انتخاب کے بعد بارہ آدمیوں نے طے کیا کہ حضرت ابوبکر کو بھری مجلس میں منبر سے اُتار لیں۔ ان میں چھ مہاجر مقداد بن اسود، ابوذر غفاری، سلمانؓ فارسی بریدہ اسلمی، خالد بن سعید، عمار یاسر اور چھ انصار، عثمان بن حنیف، سہل بن حنیف، خزیمہ بن ثابت، ابیّ بن کعب اور ابوایوب انصاری شامل تھے۔ جب یہ لوگ حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا۔

"اگر تم ایسا کرو گے تو یہ لوگ شمشیر بکف میرے پاس آئیں گے کہ ابوبکر کی بیعت کرو اور ویسا ہی جواب انہیں دینا پڑے گا، حالانکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ اُمت میرے بعد عہد و پیمان توڑ دے گی، تم سے غداری کرے گی ـــــ اس وقت تم ناصر و مددگار پانا تو جنگ کرنا ورنہ میرے پاس آنے تک صبر کرنا۔"

مجالس المؤمنین میں ابان بن تغلب کی یہ روایت اُس دور کی صورت حال پیش کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کس طرح پہلے ہی سے انتخاب خلافت کی زمین ہموار کر لی گئی تھی ورنہ عام مسلمانوں کے اہلِ بیتِ رسولؐ سے منحرف ہو جانے کی کوئی وجہ تو معلوم نہیں ہوتی جب کہ علیؑ ہر اعتبار سے افضل تھے۔ اسی روایت سے وہ جھوٹ بھی کھُل جاتا ہے کہ سب نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ علیؑ اور ان کے کسی پیرو نے کبھی بیعت نہیں کی۔ مسلمان ہونے کے رشتے سے خود حضرت علیؑ ہی کی طرح تعاون کیا اور جب وقت پڑا تو مسلم مفاد کی خاطر آڑے آئے۔ حضرت سلمانؓ فارسی کا بھی زندگی بھر یہی وطیرہ رہا۔

خلافت کی طرف سے انہیں ایذا بھی پہنچائی گئی، اس قدر مارا گیا کہ گردن ٹیڑھی ہو گئی مگر سلمانؓ محبت علیؑ میں ثابت قدم رہے۔ ۳۶ھ میں آپ نے مدائن میں وفات پائی اور امیرؑ المومنین نے مدینے سے جا کر تجہیز و تکفین کی۔

حضورؐ کے جلیل القدر صحابہ میں ایک عظیم نام مقداد کا ہے۔ آپ عمرو بن ثعلبہ

حضرمی کے بیٹے تھے جو اپنے قبیلے سے بھاگ کر مکّے آگئے تھے۔ یہاں اسود بن یغوث زہری نے انہیں پناہ دی اور بیٹا بنا لیا۔ اسی نسبت سے مقداد بن اسود کہے جاتے تھے آپ کو حضورؐ کا اتنا تقرب حاصل تھا کہ ایک روز آپ نے فرمایا:۔

خدا نے مجھے چار آدمیوں کی محبت کا حکم دیا ہے۔ علیؑ، مقدادؓ، سلمانؓ اور ابوذرؓ مقدادؓ کا شمار اُن سات آدمیوں میں ہے، جنھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔

آپ حضرت علیؑ کے فدائی تھے۔ سوائے علیؑ کے کسی خلیفہ کی بیعت نہیں کی۔ اس پُر آشوب دور میں بھی اہلِ بیت کی مدح خوانی کرتے رہے۔ انتخاب کے بعد چار ہزار کا ایک لشکر مسجد نبوی میں جمع ہوا تھا، اُس نے ڈرانے دھمکانے کے لیے بنی ہاشم کے ساتھ محبان آلِ رسولؐ میں مقداد کا نام بھی لیا تھا۔ آپ نے ۳۳ھ میں وفات پائی۔

خالد بن سعید

پورا نام ابو سعید خالد بن سعید بن عاص بن اُمیّہ تھا۔ مجالس المومنین کی روایت ہے کہ آپ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے لئے جا رہے تھے کہ راہ میں حضرت ابوبکر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ آپ نے خواب بیان کیا۔ حضرت ابوبکر بھی ساتھ ہو لئے اور دونوں ایک ساتھ حضور کی خدمت میں پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

دورِ رسالت میں حضرت خالد صدقات یمن کے والی تھے۔ ابان بن سعید والی بحرین، دوسرے بھائی عمرو بن سعید سما، خیبر یہ وغیرہ کے حاکم تھے۔ انتخابِ سقیفہ کے بعد تینوں بھائی استعفیٰ دے کر واپس چلے آئے۔ دورِ خلافت میں ان لوگوں نے کئی بار علیؑ کے حق میں سخت احتجاج کیا اور تکلیفیں سہیں۔ صفر ۱۴ھ میں بمقام مرجہ حضرت خالد کو قتل کیا گیا۔

ابی بن کعب

پورا اسم گرامی ابی بن کعب بن قیس خزرجی انصاری تھا۔ بڑے جلیل القدر صحابی عظیم المرتبت مجاہد، فقیہہ، قاری قرآن اور کاتبِ وحی تھے۔ عمر بھر اولادِ رسولؐ کے

حق کے لئے جہاد باللسان کرتے رہے، اتنے جری اور بہادر تھے کہ سرِعام سقیفہ کی سازش کو اچھالتے تھے۔ سخت سے سخت ایذا سہی، دُرّے کھائے مگر حق گوئی سے باز نہیں آئے اور بیعت نہیں کی۔ ۱۵ھ میں وفات پائی۔

بلال بن رباح حبشیؓ

مشہور ہے کہ بلال کو ان کے ظالم وکافر آقا سے حضرت ابوبکر نے خرید کر آزاد کیا تھا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر کی مالی حالت اُن دنوں ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ کوئی غلام خرید سکتے، وہ اس کے محرک ضرور ہوئے تھے لیکن حضرت بلالؓ کو خریدا تھا، حضرت عباس ابن عبدالمطلب نے اور خرید کر حضرت ابوبکر کو دے دیا تھا۔ (۶۹)

حضرت بلال لانبے، دُبلے پتلے اور کمزور انسان تھے۔ آپ کا رنگ بہت کالا نہیں تھا بلکہ گندمی تھا، حضرت علیؑ کے تربیت یافتہ تھے اور اسلام کے پہلے موذن تھے انتخابِ خلافت کے بعد مدینہ چھوڑ کر چلے گئے تھے مگر اہلِ بیت رسولؐ کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے۔ جنابِ فاطمہؑ نے وفات کے دن آپ سے ظہر یا عصر کی اذان دینے کو کہا تھا۔ جیسے ہی آپ کی زبان سے اشهد ان محمدالرسول اللّٰہ نکلا، شہزادیؑ رحلت فرما گئی تھیں۔

چونکہ آپ نے بیعت سے صاف انکار کر دیا تھا لہٰذا عموماً مدینے کے باہر ہی رہا کرتے، جب آتے تو خدمتِ امیرالمؤمنینؑ کے علاوہ کہیں نہ جاتے۔ ۲۰ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ ان سب پر یہ آفتیں صرف اس لئے ٹوٹیں کہ انہوں نے خلافت کے ناجائز انتخاب پر مُہرِ تصدیق ثبت نہیں کی۔ رسولؐ نے انہیں سندِ ایمان عطا کی تھی۔ انہوں نے ایمان کی لاج رکھی۔ کوئی جلا وطن کیا گیا، کسی نے تشدد سے بچنے کے لئے خود جلا وطنی اختیار کی۔ ربذہ، دمشق اور مختلف مقامات پر مر گئے، مگر ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ ان کی نظیریں آج بھی منزلِ صداقت میں چراغِ راہ ہیں۔

اسی طرح کے کچھ لوگ اور بھی تھے جو موت کی آغوش میں سو چکے تھے۔ زندہ

لوگوں میں جس کسی نے خلافتِ امیرؑ کی خبر سنی، وہ یا تو خود حاضر خدمت ہوگیا یا اس نے کسی ذریعہ سے رابطہ قائم کیا۔

بیعت کرنے والوں میں سارا مدینہ تھا اور اطراف و جوانب کے لوگ بھی آگئے صرف ایک جماعت کنارہ کش رہی جس میں سعد بن ابی وقاص، عبداللہ ابن عمر، سعید ابن زید، زید ابن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری شامل تھے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ، پیغمبر اسلام کے شاگرد رشید تھے لہذا پہلے ہی مرحلے میں آپ نے تقسیم اموال کے اس دستور کو منسوخ کر دیا جس کی نمایاں خصوصیت شخصی امتیاز تھا۔ حضرت عمر نے جس کو مرتب کیا تھا اور جو مساواتِ محمدیؐ کے خلاف تھا۔

اگلے دن جب لوگ اپنے حصے لینے آتے تو چھوٹے بڑے کے فرق کے بغیر ہر ایک کو برابر کا حصہ دیا گیا لیکن علیؑ عدل کی مسند پر ظلم کو روا رکھنے والے نہ تھے انہوں نے اپنی روش میں کسی تبدیلی سے انکار کر دیا۔ انجام کار پہلے ہی دن سے ایک مخالف گروہ پیدا ہوگیا اور طلحہ و زبیر عثمانی گروہ سے جا ملے۔

دوسرا اقدام حضرت علیؑ نے یہ فرمایا کہ عہدِ عثمانی کے تمام نااہل اور ظالم عمال کو برطرف کر دیا اور ان کی جگہ نئے عامل مقرر کئے۔ سہل ابن حنیف کو معاویہ بن ابی سفیان کے بجائے شام کا عامل بنایا مگر انہیں شام کے ایک دستہ فوج نے راستے ہی سے واپس کر دیا اور سہل نے بغیر اجازت امیرؑ خونریزی نہیں کی۔

حضرت معاویہ حاکم شام

حضرت معاویہ اب دمشق میں خلافتِ مدینہ کے عامل نہ رہے تھے بلکہ عملی طور پر بادشاہ بن چکے تھے ـــــــــــ ماضی کی تاریخ کا ایک جائزہ لیا جائے تو قبل اسلام ہی سے بنی اُمیّہ کا شام سے تجارتی رابطہ تھا اور لوگ ابو سفیان سے واقف تھے۔ شام جب مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو پہلا گورنر یزید بن ابو سفیان اور معاویہ بن ابو سفیان کو بنایا گیا۔ بالفاظ دیگر شام کو اسلام سے معرفت بنی اُمیّہ کے ذریعہ ہوئی اب اگر ابو سفیان کے اسلام کی حدیں متعیّن کی جائیں تو اس کے خال و خد اس اسلام سے

مختلف ملیں گے، حضرت محمد مصطفیٰ نے جس کی رونمائی کی تھی۔

اگر کوئی ابوسفیان کے اسلام کو صحیح مانتا ہے تو خدا مبارک کرے۔ ہم نے تو شروع ہی سے اس کو اصولِ اسلام اور رسوم جاہلیت کا آمیزہ پایا بلکہ ہمیں تو ہمیشہ دین کے خول میں بے دینی کا مرکب نظر آتا رہا۔

کوئی رضی اللہ عنہ کہے یا رحمۃ اللہ علیہ لیکن ابوسفیان تھا وہی جو حضور کی نبوت کو بادشاہت سمجھتا تھا اور جس نے علیؑ کو مقابلے کے لئے سواروں اور پیدلوں کی پیش کش کی تھی اور جب اس سازش میں ناکامی ہوئی تو اُدھر چلا گیا جہاں اس کی پذیرائی کی گئی اور جہاں سے اس نے شام کو اپنی نسلی حکومت کے لئے حاصل کر لیا۔

مسلمانوں کی تاریخ پر مقصدی روایات کی اتنی دھند پڑ چکی ہے کہ تاریخ کے اصلی نقوش دکھائی دینا مشکل ہے لیکن من پسند کرداروں کو منطقی دلائل اور تاویلوں سے اجاگر نہ کیا جائے تو غیر جانبدار آنکھ کچھ نہ کچھ دیکھ ضرور سکتی ہے اور کوئی عقل کی روشنی استعمال کرے تو اسلام کا نقاب چہرے پر پڑے ہونے کے باوجود اصل صورت نظر آنا ناممکن نہ ہوگا۔ ابوسفیان چڑھتے ہوئے سورج کا پجاری تھا۔ اس کو سرداری کا منصب درکار تھا۔ کافر بن کر ملتا یا مسلمان بن کر اور جب مسلمان بن کر سرداری کے بجائے حکومت بلکہ بادشاہت مل گئی تھی تو مسلمان کیوں نہ بنا رہتا۔

حضرت معاویہ اسی کے بیٹے تھے انہیں کوئی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کرتا مگر خالص مسلمان ہرگز نہیں تھے بلکہ اموی مسلمان تھے۔ ہاشمی مسلمانوں کے ازلی دشمن۔ انہوں نے ہاشمی پیغمبرؐ کو بُرا نہیں کہا تو یہ کسران کے باپ اور بیٹے نے پوری کر دی۔ البتہ انہوں نے ایک ثواب ضرور حاصل کیا کہ علیؑ، اولادِ علیؑ اور محبانِ علی پر تبرّا کرنے کی رسم شروع کر دی اور جہاں علیؑ دوستی کا گمان بھی ہوگیا وہاں اتنے مظالم ڈھائے کہ تاریخ کے بھی آنسو نکل پڑے۔

"اُم المومنین اُمِّ سلمہ نے آنحضرت کا ایک قول بیان فرمایا ہے کہ جو شخص علیؑ کو بُرا کہے وہ جہنمی ہے" اس کے بعد علیؑ پر تبرّا کرنے

والوں کا اسلامی تشخص کسی دلیل کا محتاج نہیں رہتا۔ بحوالہ البدایہ و النہایہ

(۶۲)

——— اور یوں بھی دونوں میں کسی لحاظ سے کوئی مطابقت پائی نہیں جاتی۔ بنیادی تضاد تھا علیؑ اور معاویہ میں۔ علیؑ کو حق پہنچتا تھا خلافت کا، رسولؐ کے رشتے سے بھی اور اپنی افضلیت کی بنا پر بھی۔ انصار و مہاجرین کی ایک بڑی تعداد آپ کے اشارے کی منتظر تھی اور آپ کی تلوار کا لوہا سارا عرب مان چکا تھا مگر مسلمانوں کو خونریزی سے بچانے کے لئے آپ نے تلوار نہیں اُٹھائی جب کہ اس کا جواز بھی موجود تھا کہ سقیفہ میں بنی ہاشم کی نمائندگی نہیں تھی۔ برخلاف اس کے معاویہ کو کسی طرح استحقاق ہی نہ تھا۔ علم و فضل، نجابت و شرافت، عدالت و شجاعت ہر اعتبار سے علیؑ کے سامنے بے قیمت تھے، پھر کل تک ایک صوبے کے عامل رہے تھے آج انہوں نے خلیفۂ وقت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

کوئی انہیں صحابیٔ رسولؐ کہتا ہے اور کوئی کاتبِ وحی۔ صحابی تو ابن اُبیّ بھی تھا اور رہ گئی کاتبِ وحی ہونے کی بات تو کون سی آیت ان سے لکھوائی گئی کچھ خطوط ضرور ان سے لکھوائے گئے تھے تو اتنا شرف مل گیا کہ ظلم کے پہاڑ بھی ڈھائیں تو خطائے اجتہادی۔ خدا کے لئے موت کو یاد کریں اگر خدا پر ایمان ہے تو یہ ہٹ دھرمی اور ستم پروری آخرت میں بہت مہنگی پڑے گی۔

حضرت معاویہ کا یہ مختصر سا تعارف اُس حریف کا تعارف ہے جس کا سابقہ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ کو کرنا پڑا اور جس نے پہلی ہی منزل پر علم بغاوت بلند کر دیا۔ دوسرے عامل بھی معاویہ سے زیادہ مختلف ثابت نہیں ہوئے مگر انہوں نے بغاوت نہیں کی کیونکہ ان کے پاس فوجی طاقت نہیں تھی۔ یعلی بن اُمیّہ نے یمن اور عبداللہ بن عامر نے بصرہ چھوڑ دیا اور خزانہ اپنے ساتھ لے گئے۔

جنگ جمل

حضرت عائشہ ان دنوں حج کے لئے مکے گئی ہوئی تھیں۔ واپسی پر راہ میں قتلِ

عثمان کی خبر ملی تو اس امید پر آگے بڑھتی رہیں کہ خلافت طلحہ کو ملی ہوگی اور شاید اسی امید پر طلحہ نے قتلِ عثمانؓ میں شرکت بھی کی تھی مگر حضرت عائشہ کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ علیؑ خلیفہ ہو گئے۔ بے ساختہ ان کے مُنہ سے نِکلا "کاش یہ خبر سننے سے پہلے میں مر گئی ہوتی" ——— پھر آپ نے فرمایا:
"خدا کرے کہ آسمان زمین پر پھٹ پڑے اور مَیں اس میں سما جاؤں"!

حضرت عائشہ اسی مقام سے پلٹ پڑیں۔ اس دوران طلحہ و زبیر بھی آن سے آملے۔ عبد ابن اُم کلاب نے کسی انتقامی ارادے سے باز رکھنے کے لئے کہا۔

"مادرِ گرامی! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ عثمان کافر ہو گئے ہیں۔ انھیں مار ڈالو آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی ——— ہمارے نزدیک تو عثمان کا قاتل وہ ہے جس نے حکم دیا۔"

پھر عبد ابن اُم کلاب نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"اب لوگوں نے اس عظیم المرتبت کی بیعت کر لی ہے جو ہر گمراہی کو دُور کر دے گا اور ہر کجی کو سیدھا کر دے گا ——— وفا کیش بد عہدوں اور غداروں جیسا نہیں ہوتا۔"

حضرت عائشہ نے جواب دیا۔

"عثمان کو قتل کرنے کی بات صرف میری نہیں تھی دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کہتے تھے" ——— مگر اب جو میں کہہ رہی ہوں وہ قطعی ہے۔" (۷۰)

طلحہ و زبیر ایک منصوبہ بنا کر آئے تھے۔ انہوں نے قتلِ عثمان کا الزام علیؑ پر لگا دیا اور جناب عائشہ کو انتقام لینے پر آمادہ کر لیا۔

علیؑ کے عدل اور حق پرستی نے ایک تعداد کو ابتدا ہی میں علیؑ سے برہم کر دیا تھا۔ اُدھر یمن اور بصرے کے خزانے کا ایک حصہ حضرت عائشہ کو مِل گیا تھا۔ رہی سہی کسر معاویہ نے پوری کر دی اور مسلمان خونِ عثمان کے نام پہ عائشہ کے پرچم تلے جمع ہونے لگے۔

مکے کی مرکزیت نے طلحہ و زبیر کو پروپیگنڈے کے مواقع فراہم کر دیئے اور حامیانِ سقیفہ کی اولاد حضرت عثمان کا خون بھرا کرتہ اور نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں لے کر بصرے کی طرف چل پڑی۔ دو ہزار کا لشکر صفر ۳۶ھ میں روانہ ہوا پھر اس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔

آنحضرتؐ نے کئی بار جناب عائشہ کو اشارۃً سمجھایا تھا "ایک عورت اونٹ پر سوار ہو کر جنگ کے لیے نکلے گی"۔

پھر کھلے لفظوں میں کہا تھا "حوآب کے کتے تم پر بھونکیں تو پلٹ جانا"۔

چلتے چلتے جب اُم المؤمنین چشمہ حوآب پر پہنچیں تو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سُنیں۔ آپ کو حدیثِ رسولؐ یاد آگئی مگر طلحہ و زبیر نے کہہ دیا کہ یہ حوآب نہیں ہے آخر حضرت عائشہ بڑھتی رہیں۔

مورّخین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ حضرت عائشہ حوآب سے واپس ہو رہی تھیں مگر چالیس آدمیوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ یہ حوآب نہیں ہے۔ قسم کھانے والوں کے سردار تھے، حضرت زبیر اور حضرت طلحہ، جن کا شمار شروع ہی سے امیدوارانِ خلافت میں ہوتا تھا اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت انہیں خلیفہ بنانے پر مُصِر تھی۔

خود حضرت عائشہ کا بھی یہی خیال تھا کہ حضرت عثمان کے بعد طلحہ یا زبیر مسند نشین خلافت ہوں گے مگر ان کے بجائے علیؑ کا نام کان میں پڑا تو وہ میدان میں اُتر آئیں ـــــ حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے کلام اللہ ہاتھ میں لے کر جھوٹی قسمیں کھائیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ وہ گھر میں ہوتے یا باہر ابوذر کے فرش پر ہوتے یا تختِ خلافت پر، اپنے مقصد کے لئے جھوٹی قسم کھا لینا ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا۔ اس کے بعد یہ کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا کہ خلافت حاصل کرنے کے لئے کوئی جھوٹ نہیں بولا گیا۔ کوئی غیر جانبدار انصاف کی فریاد سننے پر تیار ہو تو حقیقت اب بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔

امیرالمومنین حضرت معاویہ سے لڑائی کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ حضرت عائشہ کے میدان میں آجانے کی خبر ملی۔ آپ وقتی طور پر پریشان ہو گئے۔ حضرت عائشہ کے دل میں آپ کی طرف سے جو عداوت تھی، اس کا تجربہ بار بار کر چکے تھے مگر یہ خیال بھی نہ تھا کہ حرم رسولؐ کی نمائندہ عورت جنگ میں جرنیلی کے فرائض انجام دے گی اس لئے بصرے کے قریب پہنچ کر حضرت علیؑ نے لشکر کو روکا اور صلح کی ہر ممکن کوشش کی مگر طلحہ و زبیر نے آپ کی چلنے نہ دی اور آخر فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آٹھہریں۔

علیؑ نے مسلمانوں کے خلاف تلوار نہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا مگر اب دینِ اسلام خطرے میں تھا اس لئے خیبر و خندق میں چمکنے والی تلوار ایک مرتبہ نیام سے باہر آگئی

صبح ہوتے ہی دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں تو امیرالمومنین نہتے دشمن کے پروں میں گھس گئے اور زبیر و طلحہ کو رسولؐ کی حدیثیں یاد دلانے لگے۔ زبیر نے وعدہ کیا کہ وہ نہ لڑیں گے مگر طلحہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کے سر پر خلیفہ بننے کا بھوت سوار تھا۔ علیؑ کے واپس آتے ہی فوجِ مخالف سے تیر برسنے لگے اور کئی آدمی شہید ہو گئے مگر آپ نے جوابی کارروائی کرنے نہ دی

دوسری صبح کو امیرالمومنین نے مسلم نامی مردِ مجاہد کو قرآن سر پہ لے کر میدان میں بھیجا۔ طلحہ نے پہلے ہی وار میں اس کے دونوں ہاتھ قلم کر دیئے۔ دوسرا وار اس کے سینے پر کیا اور وہ مع قرآن کے زمین پر آرہا۔ اب امیرالمومنین نے اپنے بیٹے محمد حنفیہ کو حملے کا حکم دیا۔ محمد آندھی کی طرح اٹھے اور طوفان کی طرح دشمنوں پر چھا گئے۔

زبیر میدان سے ہٹ چکے تھے۔ مروان ایک مدت سے طلحہ کی گھات میں تھا اس نے اپنے غلام کی آڑ لے کر زہر میں بجھا ہوا تیر طلحہ پہ مارا تو وہ ختم ہو گئے، دوپہر ڈھلتے ڈھلتے لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ امیرالمومنین نے بلند آواز میں سب کو پناہ دی پھر محمد بن ابی بکر کو عائشہؓ کی خبر گیری کو بھیجا وہ بہن کی ہودج کو عزت و احترام کے ساتھ ایک طرف لے گئے۔

حضرت عائشہؓ بہت شرمندہ تھیں۔ کہتی تھیں کہ کاش ایسا قدم اٹھانے سے قبل

انہیں موت آگئی ہوتی۔

جنگ میں حضرت عائشہ کے ۱۶۷۹۲ آدمی مارے گئے۔ حضرت علیؑ کے صرف ۱۰۷۰ انصار شہید ہوئے۔ زبیر ایک طرف کو نکل گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی ان کا ذاتی دشمن تھا، جس نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر قتل کر دیا۔ حضرت علیؑ کے کئی فدا کار اور سرفروش بھی قتل ہوئے۔ جن میں ثمامہ ابن مثنی، ہند ابنِ عمر، عنیہ بن ہیثم، سبحان بن سوحان اور زید بن محدود ح بھی شامل تھے۔

جنگ جمل کے بعد حضرت علیؑ نے مدینے کے بجائے کوفے کو دارالخلافہ بنا لیا کیونکہ یہ جگہ بیچوں بیچ میں تھی اور یہاں سے مملکت کی دیکھ بھال مقابلۃً بہتر طریقے سے ہو سکتی تھی۔

جنگ صفین

حضرت علیؑ کے جنگِ جمل میں اُلجھ جانے سے حضرت معاویہ کو تیاری کا بہت موقع مل گیا۔ یہ جنگ بلاشبہ طلحہ اور زبیر کی سازش سے ہوئی تھی لیکن معاویہ نے بھی اس میں کردار ادا کیا تھا۔ اس کے دو مقصد تھے ایک تو یہ کہ خلافت کی فوجی طاقت کچھ کمزور پڑ جائے گی اور ہر دو صورت میں فائدہ معاویہ کا ہوگا اگر اتفاق سے حضرت عائشہ کامیاب ہو گئیں تو معاویہ فوراً اپنی پوری طاقت سے پہنچ جائیں گے اور خلافت پر قبضہ کر لیں گے۔ بصورت دیگر حضرت علی تھکی ہاری فوج ان کے مقابلے میں لا سکیں گے اور پھر جنگ کے نتیجے میں ایک نئے حلقے کے دل میں علیؑ کی کدورت بڑھ جائے گی۔ حضرت علیؑ اس سے واقف تھے مگر جنگ سر پہ تھوپ دی گئی تھی تو ان کو لڑنا ہی پڑی اور کوفے پہنچ کر آپ نے بڑی تیزی کے ساتھ عمال کا تقرر کرنا شروع کر دیا۔

سہل بن حنیف کو مدینہ، قیس بن سعد کو مصر، عبداللہ ابن عباس کو بصرہ، اشعث بن قیس کو آذربائیجان، یزید بن قیس کو مدائن، عمر بن ابی سلمہ کو بحرین، مصقلہ بن ہبیرہ کو اردشیر خرہ، منذر ابن جارود کو اصطخر، زیاد بن ابیہ کو فارس، قدامہ بن عجلان کو

کسکر، عدی بن حاتم کو بہرہ سیر، ربعی بن کاس کو سیستان، خلید بن کاس کو خراسان اشتر نخعیؒ کو موصل سے شام تک کا حاکم بنایا۔ اشتر سے معاویہ کے عاملوں کے کئی مقابلے ہوئے مگر اشترؒ نے کسی کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔

اس دوران معاویہ اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے۔ حضرت علیؑ نے ان حالات میں بھی آداب اسلام کو ملحوظ رکھا اور معاویہ کو خط لکھا تاکہ مسلمانوں کا خون نہ بہے انہوں نے عثمان کے قاتلوں کو تلاش کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ معاویہ نے اس کا امید افزا جواب نہ دیا بلکہ شام میں حضرت علیؑ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ حضرت علیؑ نے پھر خط لکھا مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چار و ناچار امیرالمومنینؑ کو مقابلے کے لئے نکلنا پڑا۔ ابو مسعود انصاری کو آپ نے کوفے میں اپنا قائم مقام بنایا اور شوال ۳۶ھ میں اسی ہزار فوج کے ساتھ شام کی طرف پیش قدمی کی۔

معاویہ کو اس لشکر کی روانگی کا پتہ چلا تو وہ بھی دمشق سے روانہ ہو کر صفین پہنچ گئے اور نہر فرات پر قبضہ کر لیا۔ خلیفۂ اسلام کا لشکر بھی مقابلے میں آکر خیمہ زن ہوا تو پانی کا سوال پیدا ہوا اور مجبوراً حضرت علیؑ نے بزور شمشیر پانی لانے کا حکم دیا۔

> چنانچہ "عراقی فوج کا ایک دستہ چشمے پر پہنچا۔ ابوالاعور نے روکنا چاہا، دونوں میں مقابلہ ہوا، عراقی دستے نے شکست دے کر چشمے پر قبضہ کر لیا، لیکن حضرت علیؑ نے شامیوں کا پانی بند نہیں کیا۔ بلکہ اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ پانی لے کر لوٹ آئیں"۔ (۷۱)

اس عرصے میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اور صلح کی بات چیت بھی لیکن معاویہ کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ اگر کوئی نرم آدمی پیغام صلح لے کر جاتا تو اسے حکومت اور دولت کا لالچ دیا جاتا اور اگر سخت آدمی جاتا تو صاف انکار ہو جاتا مقابلہ تھا ایک دیندار بلکہ عین دین اور ایک فتنہ پرور مسلمان کا بلکہ اس عیسائی کا جو اپنے سینے میں زنار چھپائے ہوئے تھا۔ آنحضرتؐ نے منافقین کو بھی مسلمان مانا تھا۔ اس لئے معاویہ کو بھی مسلمان کہنا پڑے گا حالانکہ حقیقتاً ان کا نہ کوئی مذہب تھا

اور نہ مسلک، دولت ان کا دین اور اقتدار ان کا ایمان تھا۔

"وہ پہلا شخص تھا جو بیٹھ کر وعظ کرتا، پہلا امیر جس نے ذاتی خدمت گاری کے لئے مخنث مقرر کئے، پہلا رئیس جو اپنے مصاحبوں سے کھلم کھلا ہنسی ٹھٹھا کرتا، ہوشیار اور کنجوس مگر ضرورت کے وقت بڑا فیاض، بظاہر مذہبی مراسم کا پکا مگر اپنی حرص و آز کی تجاویز کی تکمیل کے وقت کسی شخص یا خدائی حکم کی پرواہ نہ کرنے والا۔" (۷۲)

حضرت علیؑ اصول اسلام کے پکے تھے اور معاویہ ہر طریقے اور ہر قیمت پر خلافت کے متمنی۔ وہ تو خونِ عثمان کی دیت میں تختِ مدینہ چاہتے تھے۔ تخت مل جاتا تو صلح کر لیتے حضرت علی اس طرح دینے والے نہ تھے لہذا انجام جنگ تھا جو ہو کر رہی۔

جنگ جمل میں بھی حضرت علیؑ نے پہلے ایک نوجوان کو قرآن لے کر بھیجا تھا۔ آج بھی اتمام حجت کے لئے وہی کیا۔ نتیجہ جو وہاں نکلا تھا، وہی یہاں بھی نکلا۔ ایک نوجوان درجۂ شہادت پر فائز ہو گیا۔ علیؑ نے پورے جاہ و جلال کے ساتھ اپنے گھوڑے کو ایڑ دی اور لشکرِ شام پر حملہ کر دیا۔ علی کی تلوار بہت دنوں کے بعد چمکی تھی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ آپ جس طرف جاتے گیندوں کی طرح سر اچھل اچھل کر دور جا گرتے۔ اس طرح شام ہو گئی۔

ایک ہفتے کی جنگ میں شام کی فوج کا ستھراؤ ہو گیا۔ علیؑ کی شجاعت اور حقانیت مسلّم لیکن سازش اور خیانت میں معاویہ کا جواب نہ تھا۔ انہوں نے اپنے بھائی عتبہ بن ابوسفیان کے ذریعہ اشعث بن قیس اور خالد بن معمر کو توڑ لیا اور دن بھر کی جنگ کے بعد وہ رات آ گئی جو لیلۃ الحریر کہی جاتی ہے۔ اس رات شام کی سطوت و شوکت کا قُل پڑھا جا چکا تھا اور صبح ہوتے علی کا شہرہ آفاق کمانڈر مالکِ اشتر لڑتے لڑتے معاویہ کے خیمے تک پہنچ چکا تھا کہ عمر عاص کے مشورے سے معاویہ نے ایک ہزار قرآن نیزوں پر بلند کرا دیئے

یہی قرآن تھا جس کو جنگ کی ابتدا میں علیؑ نے بھیجا تھا مگر اس کی بے حرمتی کی

گئی تھی۔ آج شکست سے بچنے کے لئے ایک منصوبہ بنا کر وہی قرآن بلند کئے جا رہے تھے آگے کئی نیزوں پر دمشق کا بڑا قرآن اور اس کے پیچھے ایک ہزار قرآن۔ آپ کے صاحبِ ایمان ساتھی اس فریب کو سمجھ رہے تھے مگر معاویہ کے خریدے ہوئے اشعث بن قیسؓ اور خالد بن عمر سامنے آ گئے کہ فیصلہ کتابِ خدا پر رکھ دیا گیا ہے۔ جنگ روک دی جائے حضرت علی نے سمجھایا کہ فتح قریب ہے یہ لوگ میدان چھوڑنے ہی والے ہیں اس دھوکے میں نہ آؤ مگر کوئی نہ مانا اور بیس ہزار آدمیوں نے امیرؑ المومنین کو گھیر لیا جن میں ایک تعداد خود شام کے آدمیوں کی تھی۔

یہ بڑا نازک وقت تھا حضرت علی کے لئے۔ آپ ان سب کو انجام تک پہنچا سکتے تھے اور شام کے لشکر کو بھی شکست دے دیتے مگر نتیجہ یہ نکلتا کہ خود آپ کی فوج کا ایک حصہ ٹوٹ کر معاویہ کی طرف چلا جاتا جو بعد میں آپ کے مقابل آتا اور قرآن کو درمیان میں لا کر آتا ہی تو ہو رہا تھا کہ معاویہ ایک یقینی شکست سے بچ رہے تھے تو یہ شکست بعد میں بھی دی جا سکتی تھی اور اس کا بھی امکان تھا کہ قرآن کی رو سے جو فیصلہ ہوتا، وہ صحیح ہوتا۔ لہذا آپ خاموش ہو گئے لیکن مالک اشتر معاویہ کی پشت پر آخری ضرب لگانے کیلئے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس لئے غداروں نے حضرت علی پر زور دیا کہ انہیں واپس بلالیں۔ حضرت علیؑ نے پیغام بھیجا مگر مالک نہیں رکے۔ آخر معاویہ پر اٹھنے والی تلواروں کا رخ علیؑ کی طرف ہو گیا، لہذا علیؑ نے پھر کہلا بھیجا کہ ان کی جان خطرے میں ہے۔ مجبوراً مالک کو تلوار نیام میں رکھنا پڑی اور وہ دل شکستہ و مایوس پلٹ آئے۔

مالکِ اشتر کے لئے علیؑ کے پیغام کی وہی صورت تھی جو علیؑ کو ارشاداتِ پیغمبرؐ سے پیش آئی تھی۔ وہاں اقتدار کی خاطر تلوار بے نیام نہ کرنے کا حکم تھا۔ یہاں جیتی ہوئی جنگ ہار جانے کے لئے تلوار نیام میں رکھ لینے کی تاکید اور الفاظ بھی ایسے کہ مجھے اگر زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو پلٹ آؤ ــــــ یہ الفاظ خالی جا ہی نہ سکتے تھے مالک نے جہاد بالنفس کیا اور تلوار روک لی۔

بغیر زرہ کے لڑنے والا سورما کم از کم موت سے ڈرنے والا تو نہ تھا۔ انہوں نے تو مالک کا چلتا ہوا ہاتھ روکنے کے لئے عام الفاظ کا استعمال کیا تھا اور جنگ صرف مسلمانوں کو ایک سبق دینے کے لئے رد کی تھی۔ دل ہی دل میں کہا ہوگا:۔

" تم نے طائف میں اپنے رسولؐ کا کہنا نہیں مانا، محاصرہ اٹھانے کے بجائے جنگ کی اور اس کا نتیجہ بھگتا ـــــــ آج مجھے جیتی ہوئی جنگ روک دینے پر مجبور کر رہے ہو۔ انجام کار پچھتانا پڑے گا۔"

طے یہ ہوا کہ دو حکم مقرر کئے جائیں وہ فیصلہ کر دیں۔ معاویہ نے عمرو بن العاص کو نامزد کیا۔ غداروں نے اصرار کیا کہ ادھر سے ابو موسیٰ اشعری کو بھیجا جائے۔ حضرت علی عبداللہ ابن عباس یا مالک اشتر کو متعین کرنا چاہتے تھے لیکن اشعث بن قیس اور اس کے ساتھی پھر اڑ گئے۔ حضرت علیؑ پھر مخمصے میں پڑ گئے مگر صورتِ حال یہ تھی کہ علی اشعث کا کہنا مانتے یا اپنی فوج میں باہم تلوار چلواتے۔ بڑی سخت منزل تھی لیکن علیؑ اس سے بڑی آزمائشوں سے گزر چکے تھے لہٰذا آپ نے بڑے ضبط سے کام لے کر ابو موسیٰ اشعری کو نامزد کر دیا۔

بادی النظر میں ہر آدمی یہ کہہ دے گا کہ قرآن بلند کرتے یا سنگِ اسود لے کر آجاتے کھلا ہوا فریب تھا، علیؑ نے اس کو کیوں مانا اور اپنی مرضی کا حکم مقرر کرنا تو ان کے اختیار کی بات تھی۔ اشعث کون ہوتا تھا حکم چلانے والا لیکن یہ اندازِ فکر تو ہم دنیا داروں کا ہے۔ ایسا ہی ہوتا تو علیؑ رسولؐ کی تدفین کے دوسرے ہی دن بنی ہاشم، مہاجرین اور انصار جو ان کے ساتھ تھے اور جن میں انصار سعد بن عبادہ اور ابو ایوب انصاری بھی شامل تھے، ان سب کو لے کر سقیفہ بنی ساعدہ پر چڑھ دوڑتے، کون تھا جو علیؑ کی تلوار کے سامنے آتا۔ فتح ہو جاتی، اقتدار مل جاتا لیکن فرائضِ امامت پر حرف آجاتا اور علیؑ کی حیثیت صرف فاتحِ عرب کی بن کر رہ جاتی۔

علیؑ میدانِ جنگ میں بھی امام ہی تھے ان کے سامنے دین ہی دین تھا۔ آپ اشعث کے ضمیر کو جھانک کر دیکھ چکے تھے۔ اس کے ماتھے پر منافقت کی لکیروں کو پڑھ چکے تھے انہیں اسلام کی اشاعت کرنا تھی۔ اس لئے آپ نے اتمامِ حجت کے لئے ابو موسیٰ اشعری کو مان لیا۔

سب جانتے ہیں کہ اشعری کیا تھے اور حکمین کا فیصلہ بھی عالم آشکار ہے مگر ہم اس مغالطے میں نہیں آتے کہ اشعری دھوکہ کھا گئے۔ دھوکہ کسی کو نہیں ہوا۔ معاویہ کا منصوبہ بھی یہی تھا کہ اشعری علیؑ اور معاویہ دونوں کو برطرف کریں اور عمر عاص صرف علیؑ کی طرفی کرکے معاویہ کی خلافت کا اعلان کردے، اور جنگ ایک تلخی کے ساتھ ختم ہوجائے ابوموسیٰ اشعری بظاہر فریب خوردہ چلے گئے لیکن عمر بھر خزانۂ دمشق سے وظیفہ لیتے رہے۔

عہدنامہ ہوجانے پر لوگ پچھتائے کہ وہ سیاسی چوٹ کھا گئے مگر اب جنگ پر ان کا اصرار بے کار تھا۔ علیؑ حکم بنانے کے بعد دوبارہ جنگ نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ وقت کا مورّخ دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھ دیتا کہ حکمین نے علیؑ کے خلاف فیصلہ دیا لہٰذا انہوں نے نہیں مانا ——— انبیاء و مرسلین کو ہمیشہ ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے اور ایسے ہی لمحات میں ان کی آزمائش ہوئی ہے۔

خلیفۂ وقت کے خلاف معاویہ کی بغاوت کو خطائے اجتہادی کا نام دیا جاتا ہے۔ کہاں معاویہ اور کہاں اجتہاد! کتنے دن انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں گزارے تھے اور دین سے ان کی کتنی واقفیت تھی جو اجتہاد کے اہل قرار دیئے جاتے۔ مجتہد تو ان کے پیش رو ابوبکر و عمر بھی نہیں تھے، البتہ بعض اور لوگ جو مجتہد کہے جا سکتے، ان میں عبداللہ ابنِ عباس اور ابنِ مسعود کے نام لئے جا سکتے ہیں! امام فخرالدین رازی، امام غزالی وغیرہ۔ ہم اپنے ائمہ کے اسمائے گرامی اپنے لئے مخصوص رکھتے ہیں کیونکہ وہ مجتہد نہیں امام تھے۔

اجتہاد کے لئے یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اجتہاد اصول میں نہیں ہوتا، فروعات میں کیا جاتا ہے اور علیؑ کی ذاتِ گرامی اصولِ دین میں تھی ——— پھر حضرت معاویہ کے ان اجتہادات کو کیا کہا جائے گا؟ جن میں اصحابِ رسولؐ کا قتل اور علیؑ پر تبرا بھی شامل ہے۔

کتنی ستم ظریفی ہے کہ ایک خطاوار اسلام کی گنہگاری کو خطائے اجتہادی سے تعبیر کیا جائے ——— !

کوئی مانے یا نہ مانے، ہم معاویہ کو جنگ صفین کا فاتح قرار دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس جنگ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو خارجی بنایا اور اتنے ہی عمائدین اسلام کو موت کے گھاٹ آتارا، زمانہ پھر جن کی نظیریں پیش نہ کرسکا

عمار یاسر

آپ کا پورا نام عمار بن یاسر کنیت ابوالیقظان تھی۔ آپ کی ماں اور باپ دونوں رسولؐ کی حمایت میں شہید ہوئے۔ رسولؐ آپ کو سراپا ایمان کہا کرتے تھے۔ حضرت امیرالمومنین کے فدائی تھے۔ آپ کی مدح سرائی اور طرفداری میں بڑی آزمائشوں سے گزرے مگر کبھی پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ ۹۴ سال کی عمر میں خلیفۂ برحق کی طرف سے لڑنے آئے تھے۔ جوانوں کی طرح جنگ کی، بہت سے آدمی مارے، پھر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

پیغمبر اسلام کی مشہور حدیث ہے کہ عمار کو باغیوں کا ایک گروہ قتل کرے گا۔ شہادت کی خبر جب معاویہؔ کو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ علیؑ ان کو لڑوانے کے لئے لائے تھے، وہی ان کے قاتل ہیں۔

حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ باغی گروہ عمار کو میدان میں لائے گا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ باغی گروہ ان کو قتل کرے گا اور ظاہر ہے کہ ان کو قتل معاویہ کے گروہ نے کیا تھا نہ کہ حضرت علیؑ کے گروہ نے۔

> "جنگ جمل میں حضرت زبیر کے ہٹ جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد یاد تھا اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت علیؑ کے لشکر میں حضرت عمار بن یاسر موجود ہیں"
>
> "قتل عمار کے بعد یہ بات ظاہر ہوگئی کہ حق علیؑ کے ساتھ تھا" (۷۳)

ہاشم بن عتبہ

ابو وقاص کے پوتے اور سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے تھے، چچا کے مسلک کے خلاف عمر بھر حضرت علی کی نصرت میں پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ آپ میدان جنگ میں دوڑ دوڑ کر ایک ساتھ کئی کئی دشمنوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ اس لئے آپ کا لقب

مرخال پڑ گیا، بہت دوڑنے والا۔ جنگ صفین میں بہت سے دشمنوں کو مار کر شہید ہوئے
پھر آپ کا بیٹا عتبہ بن ہاشم بہت سے موذیوں کو قتل کر کے درجۂ شہادت پر پہنچا۔

اویس قرنی

یمن کے ایک گاؤں قرن میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام عامر بن جزر تھا اُونٹ کے بالوں کا کمبل اُوڑھے ہمہ وقت ایک وارفتگی کے عالم میں رہتے تھے۔ مشہور ہے کہ آپ دیکھے بغیر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے اتنے عاشق تھے کہ جنگِ اُحد میں آپ کا ایک دانت شہید ہو جانے کا واقعہ سُن کر خود اپنا دانت توڑ لیا تھا۔ حضور اپنے علم سے آپ کو جانتے تھے اور کئی مرتبہ فرمایا کہ قرن کی طرف سے بوئے دوست آتی ہے۔ آپ نے حضرت عمر کے ذریعے ان کو سلام کہلایا تھا۔ حضرتِ عمر نے انہیں تلاش کر کے ملاقات کی۔ آنحضرتؐ کا خرقہ پیش کیا اور اپنے زہد کا اظہار کرتے ہوئے کہا

"کون ہے جو ایک روٹی دے کر اس خلافت کو خرید لے"

حضرت اویس نے جواب دیا

"عقل والا تو اس خرید و فروخت پر راضی نہیں ہوگا۔ تم سچے ہو تو خود خلافت چھوڑ کر چلے جاؤ۔"

پھر حضرت عمر نے فرمایا۔

"اویس میرے لئے دعا کرو ———"

اویس نے مسکرا کر جواباً کہا

"میں ہر نماز کے بعد جمیع مومنین و مومنات کے لئے دعا کرتا ہوں۔ تم مومن ہو تو میری دعا تم تک ضرور پہنچے گی اور اگر مومن نہیں ہو تو اپنی دعا ضائع نہیں کروں گا۔"

امیرؑالمومنین جب صفین کے لئے لشکر جمع کر رہے تھے تو حضرت اویس خود آ کر ملے۔ مروج الذہب اور روضۃ الاحباب کا بیان ہے: حضرت علیؑ موضع ذیقار

میں فروکش تھے کہ ایک ضعیف و نحیف شخص پیٹھ پر زادِ راہ لادے ہوئے، پانی کی چھاگل لٹکائے لشکر گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ "میں قرن کا اویس ہوں" "حاضرِ خدمت ہوا ہوں کہ آپ کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کر دوں۔"

امیر المومنین نے آپ کو گلے لگایا اور کہا کہ آپ تلوار اٹھانے کے لائق نہیں ہیں مگر آپ نہیں مانے۔ میدانِ جنگ میں نصرتِ اسلام کی اور لڑتے ہوئے مارے گئے۔

اویسؓ قرنی کے سے کتنے ہی بزرگ تھے، جنھوں نے علی کی حمایت میں تلوار اٹھائی تھی۔ جیسے آنحضرتؐ کے پہلے میزبان حضرت ابو ایوب انصاری۔ آپ نے بھی حقِ جہاد ادا کیا اور زخمی ہوئے۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ سقیفہ میں علیؑ موجود ہوتے تو نتیجۂ انتخاب وہی نکلتا جو چالاکی سے نکالا گیا۔

ان تمام ذواتِ مقدسہ کی جنگِ صفین میں موجودگی دلالت کرتی ہے اس حقیقت پر کہ حق و باطل کی اس لڑائی میں صحابۂ کرام علیؑ کی طرف سے رسولِ اکرم کی نمائندگی کر رہے تھے۔ (۲۴)

اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے علیؑ کے ساتھ ہونے کی ایک بین دلیل اور بھی تھی اور وہ تھا لشکرِ اسلام کا نشان جو کبھی ہاشمؑ، عبدالمطلبؑ اور ابو طالبؑ کے ہاتھ میں رہا تھا اسی نشان کو لے کر عبدالمطلب ابرہہ سے ملنے گئے تھے پھر اس کو حضورؐ نے دوسرے رسم و رواج کی طرح مشرف بہ اسلام کر کے دین کا علم قرار دے دیا تھا۔ یہی علم حمزہؓ کے ہاتھ میں رہا تھا اور جعفرؓ طیار کے ہاتھ میں بھی اور آج خیبر و خندق کے بعد علیؑ اس کو لے کر معاویہ کے مقابلے پر جا رہے تھے اور اس قوت سے متصادم ہونے کا ارادہ رکھتے تھے جو اسلام سے ٹکر لینے کے لئے اُمنڈ کر آئی تھی۔

وقت اور مابعد وقت کے مورخین کے لئے ایک دعوتِ فکر ہے کہ ایک طرف رسولؐ کی پیغمبری کا نشان تھا تو دوسری طرف کیا ہوگا؟ جب کہ شہنشاہیت کے اس نشان کی وضع قطع بھی بدلی ہوئی تھی اور رنگ بھی مختلف تھا اور یہ بات مسلّم ہے کہ وہ اور جو کچھ بھی ہو مگر اسلام کا علم نہ تھا۔

بریدہ بن حصین اسلمی

پیغمبر اسلام کے مقرب تھے اور حضرت امیرالمومنین کے مخصوص اصحاب میں شامل تھے۔ آپ کو جب حضرت رسالت مآب کی خبر رحلت ملی تو اپنے قبیلے میں ایک علم سجایا۔ اس کو لے کر مدینے آئے اور در جناب سیّدہ پر نصب کر دیا۔ اس کی اطلاع حضرت عمر کو ہوئی تو بلا کر ان سے کہا۔

"سب نے تو ابوبکر کی بیعت کر لی ہے، تم مخالفت کیوں کر رہے ہو؟"

"میں تو صرف اس گھر کے مالک کی بیعت کروں گا جہاں میں نے علم نصب کیا ہے" حضرت بریدہ نے کہا۔ اتنے میں بہت سے صحابہ جمع ہو گئے اور دُرّوں سے ڈرا دھمکا کر بیعت حاصل کر لی ــــــ جنگ صفین میں امیرالمومنین کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے اور شہادت کا شرف حاصل کیا۔ امیرالمومنین کے دو شعروں کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"خدا قبیلہ اسلمیہ کے اُس گروہ کو جزائے خیر دے جو خوبصورت تھے اور ہاشم کے گرد قتل کر دیئے گئے۔ وہ ہیں بریدہ و عبداللہ اور مالک کے دونوں بیٹے منقذ و عروہ۔ یہ سب معزز و مکرم افراد میں داخل ہیں۔"

مالک ابن تیہان

آپ کا پورا نام ابوالہیثم مالک بن تیہان انصاری ہے۔ آپ عقبہ کی دونوں بیعتوں میں شریک تھے۔ پیغمبر اسلام کی تقریباً تمام جنگوں میں جہاد کا شرف حاصل کیا۔ جنگ صفین میں خزیمہ بن ثابت کے دوش بدوش جوہر شہادت دکھائے، اور شہادت پائی۔

خزیمہ ابن ثابت

آپ اس مرتبے کے صحابی تھے کہ حضور نے آپ کی گواہی کو دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا۔ معرکۂ صفین میں جناب عمار یاسر کے ساتھ تلوار سونت کر حملہ کیا تو دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے اور لڑتے لڑتے مارے گئے۔

حذیفہ یمانی

پورا نام حذیفہ ابن یمان علسی تھا۔ رسالت مآب کے معتبر صحابی تھے۔ غزوہ تبوک سے واپسی پر جب حضورؐ پر منافقین کا حملہ ہوا تھا تو حضورؐ نے آپ کو اور عمار یاسر کو ان کے نام بتائے تھے۔ اس راز کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بیعت امیرؑ المومنین کے بعد چالیس روز زندہ رہے۔ مدائن میں وفات پائی۔ آپ کے دو بیٹے صفوان اور سعید تھے دونوں نے جنگ صفین میں حق جہاد ادا کیا اور شہادت پائی۔

عبداللہ ابن بدیل خزاعی

آپ کی کنیت ابو ربیعہ تھی۔ حضورؐ کے ممتاز اور بہادر صحابیوں میں گنے جاتے، بیشتر غزوات میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ جنگ صفین میں دو زرہیں پہنے ہوئے تھے۔ دو تلواریں لئے رجز خواں تھے۔

" سوا صبر و توکل کے کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ ہاں فوج کے اگلے حصے میں اس طرح چلنا ہے جیسے اونٹ چشمے کے حوض پر وارد ہوتے ہیں ـــــــ خدا جو چاہتا ہے حکم لگاتا ہے اور کرتا ہے۔"

امیرؑ المومنین کے لشکر میں پیادوں کے سردار تھے۔ جذبۂ جہاد کی سرشاری میں معاویہ تک پہنچ گئے اور محافظوں کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ پھر معاویہ کے لوگوں نے آپ پر اتنے پتھر برسائے کہ زخموں سے چور چور ہو کر شہید ہو گئے ـــــــ معاویہ نے ان کی لاش کو دیکھ کر ایک شعر پڑھا۔

" قبیلہ خزاعہ کی عورتیں بھی قدرت رکھتیں تو مجھ سے لڑنے کے لئے میدان جنگ میں آجاتیں۔"

آپ کے بھائی عبدالرحمٰن ابن بدیل بھی اسی جنگ میں نصرت امیرؑ المومنین کرتے ہوئے شہید کئے گئے۔

عقیل بن مالک

معاویہ کی طرف سے جنگ صفین میں شرکت کے لئے آئے تھے سربرآوردہ

اور مشہور ترین بہادر تھے۔ صلح کی گفتگو میں اپنے امیر کی زیادتی دیکھ کر حق کی طرف مائل ہو گئے اور معاویہ سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ علی ابن ابی طالب خلیفہ رسولؐ، وصی ابن عم اور داماد ہیں۔ ان سے لڑوں گا تو عاقبت خراب ہو گی۔ معاویہ نے جل کر انہیں کھانے میں زہر دلوا دیا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔

حارث بن مرّہ

جناب امیرؑ، معاویہ سے دوسری جنگ کے لئے صفین کی طرف جا رہے تھے کہ راہ میں خباب اور ان کے ساتھیوں کے قتل کا حال معلوم ہوا۔ آپ نے حارث بن مرّہ کو تحقیق کے لئے بھیجا تو انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔

یہ تھے آسمانِ رسالت کے درخشندہ ستارے جو عرصہ صفین میں ڈوب گئے منصف مزاج علمائے اہلِ سنت مولانا مودودی سمیت میدانِ صفین میں علیؑ کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ان تمام اصحابِ نبیؐ کا خون معاویہ کے سر جاتا ہے۔ مسلمان اب ان سے محاسبہ تو نہیں کر سکتے مگر انہیں شرع اسلامی کی رو سے قاتل تو گردان سکتے ہیں۔

نہروان کا پس منظر

صفین میں حضرت معاویہ نے جو دیرانز زہر مسلمانوں کو دیا تھا اس کا اثر کسی مرض متعدی کی طرح ہونے لگا اور صفین سے کوفے پہنچتے پہنچتے لوگوں کے نظریات میں اتنا اختلاف پیدا ہو گیا کہ وہ آپس میں ٹکرانے لگے۔ کوئی اشعث بن قیس کو برا کہتا، کوئی ابوموسیٰ اشعری سے بیزاری کا اظہار کرتا اور جب حکمین کا فیصلہ سامنے آ گیا تو ان اختلافات نے گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کی شکل اختیار کر لی اور پھر کوفے کی مسجدیں ان تنازعات کی آماجگاہ بن گئیں۔ ایک گروہ نے تو حضرت علیؑ کو بھی سخت سست کہنا شروع کر دیا۔

انتخاب سقیفہ کے بعد تلوار نہ اٹھانے پر جب ایک دوست نے اس کا سبب پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ یہ سب مرتد ہو جائیں گے۔ اس وقت اس گروہ کی کیفیت لگ بھگ ویسی ہی تھی۔ انہوں نے کہنے کو تو اسلام کی رسی بہت مضبوطی سے

پکڑ رکھی تھی لیکن اس رسی میں اتنے قسم کا مونج لگا ہوا تھا کہ اس کو اصولِ اسلامی کی رسی کہا نہ جا سکتا۔

حضرت علیؑ نے پہلے تو ان کی زیادہ مخالفت نہیں کی مگر جب وہ تشدد پر اُتر آئے تو تادیب کرنا پڑی اور خوارج ہر طرف سے سمٹ کر نہروان میں جمع ہونے لگے۔ ان میں ایک تعداد حضرت معاویہ کے وظیفہ خواروں کی بھی تھی جو زہریلے الفاظ سے ہوا دے کر آگ کو اور بھڑکا رہے۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ حضرت علیؑ اُدھر اُلجھ جائیں اور شام پر حملے کی تیاری نہ کر سکیں۔

خارجیوں کا کوئی ایک نظریہ نہ تھا، کوئی ابوبکر و عمر کا قائل تھا، کوئی عثمان کو مانتا تھا مگر علیؑ کے خلاف سب ہی تھے۔ ایک مرتبہ خارجیوں نے معتزلہ فرقے کے بانی واصل کے والد عطا کو پکڑ لیا اور جب انھوں نے اپنے کو مشرک بتایا تب چھوڑا۔ ایک بار حضورؐ کے صحابی عبداللہ بن خباب کو گرفتار کر لیا اور علیؑ کے لئے اچھے الفاظ استعمال کرنے کے جرم میں ذبح کر ڈالا۔ اس پر جناب امیرؑ نے ان کی سرکوبی کا عزم کر لیا۔ چنانچہ آپ ایک لشکر کو لے کر نہروان کی جانب چل پڑے۔

جنگ نہروان

خوارج کے مقابلہ پر پہنچ کر امیرؑ المومنین نے مطالبہ کیا کہ حریث و عبداللہ کے قاتلوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے تو وہ بغیر لڑے واپس ہو جائیں گے اور انہیں مہلت دیں گے اپنے عقائد پر غور کرنے کی۔ خوارج نے جواب دیا کہ وہ سب ہی حریث و عبداللہ اور دوسرے مسلمانوں کے قاتل ہیں۔ اس پر امیرؑ المومنین نے خود آگے بڑھ کر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، پھر بھی وہ راہِ راست پر نہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی کو بات چیت کرنے کے لئے طلب کیا۔

عبداللہ بن الکوا خارجیوں کے نمائندے کی حیثیت سے آیا اور لاجواب ہو کر چلا گیا مگر خوارج نے سر نہ جھکایا۔ مجبوراً امیرؑ المومنین نے ان کے مقابلے پر لشکر کی صف بندی کا حکم دیدیا، تاہم لڑائی میں پہل نہیں کی اور اعلان کرایا۔

"جو عبداللہ اور مسلمانوں کے قاتل نہیں ہیں وہ ادھر آجائیں یا جو جماعت کو چھوڑ کر کوفہ یا مدائن جانا چاہیں وہ چلے جائیں، انہیں معاف کر دیا جائے گا۔"

یہ سن کر فروہ بن نوفل پانچ سو سواروں کے ساتھ علیحدہ ہو گیا۔ سو آدمی لشکرِ امیر المومنین سے آملے۔ اسی اثنا میں ایک خارجی نے بڑھ کر مسلمانوں کے تین آدمی مار دیئے اور امیر المومنین کا نام لے کر للکارا۔ آپ نے بڑھ کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس درمیان کچھ خارجی اپنے ساتھیوں سمیت اور الگ ہو گئے، باقی لوگوں نے مقابلہ کیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ خارجیوں کے تین ہزار آدمی قتل ہوئے امیر المومنین کے لشکر کے آٹھ آدمی شہید ہوئے۔ نو خارجی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کی پیشین گوئی آپ نے پہلے سے فرما دی تھی۔

نہروان کی طرف جاتے وقت ایک نصرانی منجم سامنے سے آرہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "مسلمانوں کا ستارہ پستی میں ہے۔ طالع کمزور ہے۔ جنگ کے لئے نہ جاؤ۔"

حضرت نے مسکرا کر فرمایا۔

"تیرا حساب غلط ہے۔ ہمارے دس سے کم آدمی مارے جائیں گے اور دشمن کے دس سے کم آدمی بچیں گے۔"

وہی ہوا کہ چار ہزار میں سے ۳۹۹۱ خارجی قتل ہوئے اور لشکرِ امیر کے صرف آٹھ آدمی شہید ہوئے۔ یہ دس کا اشارہ علمِ لدنّی کی طرف سے مستقبل بعید کے اعشاری نظام کی علامت تھا جس کو اس وقت کوئی نہیں سمجھا، بعد کو دنیا کی سمجھ میں آیا۔

یوں تو امیر المومنین کی ہر سانس اشاعتِ اسلام میں گزری لیکن آپ کو حالات نے قرار ہی نہ لینے دیا۔ پھر بھی جنگِ جمل کے بعد آپ نے نئے علاقے حاصل کرنے پر توجہ دی جہاں پیغمبرِ اسلام کے دین کو روشناس کرایا جا سکتا۔

حضرت عثمان نے ۳۶ھ میں حکیم بن جبلہ العبدی کو ایک دستہ فوج کے ساتھ سندھ بھیجا تھا جو ساحلی علاقوں کو دیکھ کر واپس آگیا تھا۔ پھر حضرت عثمان نے دشوار گزار راستوں کے سبب یہ مہم ملتوی کر دی تھی ——— حضرت علیؑ کو فتوحات کی

فہرست میں کوئی اضافہ مقصود نہ تھا بلکہ آپ کا مطمعِ نگاہ صرف تبلیغِ دین تھا اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ کچھ خارجی مکران جا کر پناہ گزین ہوئے ہیں اور وہاں اپنی قوت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ نے ایک دستہ فوج روانہ کیا، مگر وہ کوئی کارگزاری دکھا نہ سکا۔

اوائل ۳۹ھ میں عبداللہ ابنِ عباس نے آپ کی ہدایت پر حارث بن مرّہ عبدی کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا۔ انہوں نے مکران و سیستان کے بعض مقامات پر حملہ کیا اور سندھ کے ملحقہ علاقوں پر قبضہ کیا۔ حارث بن مرّہ ایک مدت تک وہاں رہے۔ اس دوران مسلمانوں کے حسنِ اخلاق اور اخوت نے مقامی باشندوں کو بہت متاثر کیا۔

حارث نے مالِ غنیمت کے ساتھ ہندو اسیروں اور ایک ہزار کنیزوں کو بھی بھیجا تھا۔ اسیروں کو رہا کر دیا گیا تھا اور کنیزیں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ اسیروں نے واپس ہو کر آلِ رسولؐ کی انسانیت کا ایسا بیان کیا کہ برہمنیت کے ستائے ہوئے انسان خود بخود اسلام کے گرویدہ ہو گئے اور بعض نے خود حارث بن مرّہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ (۷۵)

سیستان اور مکران کے بعض وہ علاقے بھی مسخر ہوئے جن میں برسہا برس سے ایران کے شہرۂ آفاق تاجدار ضحاک کی نسل حکمران تھی اور اس دور کے فرماں روا کا نام شنسب تھا۔

"وہ امیر المومنین، اسد اللہ الغالب، علیؑ ابن ابی طالب کے عہد میں تھا اور بدست مبارک آنحضرت کے ایمان لایا اور فرمان حکومت غور کا بخط مبارک شاہ ولایت پناہ پایا۔" (۷۶)

اس طرح وہاں سے لے کر سندھ کے قریبی حلقوں تک اسلام کی ہمہ گیریت کا سکہ بیٹھ گیا اور آلِ محمدؐ کی حلقہ بگوشی کا کلمہ پڑھا جانے لگا جو بعد کے متصوفین کی

کوششوں سے اب تک جاری ہے ـــــــ اور جس کے لئے شہاب الدین غوری فاتح ہندوستان کا فخریہ جملہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ غزنی میں جو کچھ بھی ہوا مگر "غور میں کبھی علی اور اولادِ علی پر تبرّا نہیں ہوا۔"

نہروان کے بعد جنگِ صفین میں فریب کھانے کا امیرؑ المومنین کے بہی خواہوں کو بہت صدمہ تھا اور وہ معاویہ کو فوراً جواب دینا چاہتے تھے مگر بیچ میں خارجی آٹپکے، لہٰذا ان سے فراغت پاتے ہی آپ نے پھر صفین کی طرف بڑھنے کا عزم کیا لیکن لشکری مختلف بہانے بنانے لگے۔ کسی نے کہا تھک گئے ہیں۔ کسی نے تلواریں کند ہو جانے اور تیر ختم ہو جانے کا بہانہ کیا۔ بیشتر نے کوئی نہ کوئی عذر لنگ پیش کیا۔

امیرالمومنین نے بہت سمجھایا مگر اکثریت راضی نہیں ہوئی۔ آخر آپ نے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ہر قسم کے نشیب و فراز گوش گزار کئے مگر لشکر والے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہی حضرت معاویہ کا منشاء تھا ـــــــ بات یہ تھی کہ عرب و عراق کے لوگ صرف مالِ غنیمت کے لئے لڑتے تھے۔ حضرت علیؑ کا سخت عدل و انصاف طبیعتوں پر بار بن گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں غیر تو غیر خود ان کے بھائی عقیل ایک بار دمشق چلے گئے مگر علیؑ پر سبّ و شتم برداشت نہ کر سکے لہٰذا پلٹ آئے حضرت عقیل کے دمشق جانے کی وجہ کوئی مصلحت بھی ہو سکتی ہے

مومنِ خالص اب بھی امیرؑ المومنین کے حکم پر سر کٹانے کو تیار تھے مگر عام مسلمان اُکتا گئے تھے ـــــــ ادھر حضرت معاویہ نے شام کے خزانوں کے مُنہ کھول دیئے تھے اور کوفہ و بصرہ والوں کے گھر بھر دیئے تھے۔ شام کے جاسوس خلیفہ کے لشکر میں گھُل مِل کر ان کے کانوں میں زہر گھول رہے تھے اور بغیر لڑے بھڑے دولت کے انبار لگا دینے کے وعدے کر رہے تھے۔

علیؑ کی طرف سے ایسی کسی بات کا امکان نہ تھا لہٰذا مجبوراً کوفہ واپس ہونا پڑا۔ حضرت معاویہ صرف جنگی چالیں چلنے ہی کے ماہر نہ تھے۔ گھروں میں پھوٹ ڈالنے میں بھی انہیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ انہوں نے اس عرصے میں کوفے کے اندر بھی اپنے پنجے گاڑ دیئے تھے اور شہریوں میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے تھے جو خطبوں کے

دوران بھی خلیفہ کو ٹوک دیتے۔ عدل پسند علیؑ کسی غصّے کے بجائے نرمی سے اس کا جواب دیتے۔

خارجی نہروان میں بُری طرح پٹ جانے کے بعد بھی ختم نہ ہوئے تھے۔ ان کے پاس نہ جانے کہاں سے دولت آجاتی کہ آئے دن مختلف مقامات پر سر اٹھانے لگتے تھے چنانچہ سکرہ میں اشرف بن عوف شیبانی نے علمِ بغاوت بلند کیا جس کو اسرس بن احسان نے جاکر قتل کیا۔ ہلال بن علفہ کو معقل بن قیس نے مارا۔ اشہب بن بشر کو جاریہ بن قدامہ نے ٹھکانے لگایا۔ سعید تیمی مدائن کے قریب سعد بن مسعود کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ ابو مریم سعدی کو بھی جنگ کرکے ختم کیا گیا۔ خریت بن راشد کوفے میں امیرالمومنین سے گستاخی کرکے بھاگ گیا تھا۔ زیاد بن حفصہ نے کافی تگ و دو کے بعد اس کو قتل کیا۔

حضرت معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ حضرت علی چین سے بیٹھنے نہ پائیں اور اس قابل نہ رہیں کہ اس پر سرکشی کر سکیں۔ اس مقصد میں وہ کامیاب تھا اور امیرالمومنین ہر ممکن سعی کے باوجود فوج کو از سر نو مرتب کرنے کا موقع نہ پا رہے تھے۔

دمشق کا اسلحہ خانہ

مدینے میں کبھی روایت سازی کی ایک ٹکسال کھلی تھی جو ۲۰-۱۹ھ میں دمشق منتقل ہو گئی۔ دورِ عثمانی کے آغاز تک اس میں قدرے سست روی سے کام ہوا، پھر اچانک تیزی آگئی اور برق رفتاری سے کام ہونے لگا ـــــــــ اس ٹکسال میں تنخواہ دار یا اعزازی ملازم نہیں تھے بلکہ ایک دینار فی روایت اُجرت مقرر ہوئی تھی۔ روایت کی اہمیت اور راوی کی شخصیت کے لحاظ سے اس شرح میں اضافہ ہو جاتا اور ضرورت کے مطابق روایت گھڑنے پر راوی کو گراں قدر انعام سے نوازا بھی جاتا تھا۔

فنکار کا معیار اس کی عمر، ذہانت اور کہنہ مشقی پر منحصر ہوتا۔ نسل اور خاندان کو بھی ایک اہمیت حاصل تھی۔ کوئی شخص خود مکے یا مدینے کا ساکن ہوتا یا نہ ہوتا مگر اس کے باپ دادا کا تعلق کسی طرح بھی آنحضرتؐ کے دور سے ثابت ہو سکتا تو اس کا رشتہ اس ٹکسال سے جڑ سکتا تھا۔ یقیناً اس ٹکسال نے بڑی بیش بہا خدمات انجام

دین اور دیکھتے ہی دیکھتے روایتی سکوں کے انبار لگ گئے اور پھر اس میں اتنا اضافہ ہوا کہ بعد کے محدثین کے لئے ان کا جمع کرنا دشوار ہو گیا۔

ہمارا معیار روایت کو پرکھنے کا یہ ہے کہ اس کا سلسلہ مقدس اور معتبر وسائل سے حضورؐ تک پہنچتا ہو اور روایت کی قرآن کے مزاج سے ہم آہنگی ہو۔ اس ٹکسال کا معیاً صرف یہ تھا کہ آلِ محمدؐ کے خلاف جاتی ہو اور جو روایتیں آنحضرتؐ سے اپنی اولاد کے لئے منسوب ہیں، ویسی ہی معاصرین کے لئے گڑھی جائیں۔

زہد و تقویٰ، عدل و انصاف، علم و دانش اور شجاعت و دیانت اگر علیؑ سے منسوب ہیں تو وہی خصوصیات روایات کی اساس پر دوسروں میں بھی دکھادی جائیں۔ ملیکۃ العرب حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کی دولت اشاعتِ اسلام کے کام آئی تو کسی دوسرے کو دین کے مقاد میں زر و مال سے اتنا مستغنی ثابت کیا جائے کہ اس کا لقب ہی غنی پڑ جائے۔ خاتونِ اوّل اگر عمر میں زائد ہونے کے باوجود آنحضرتؐ کو محبوب تھیں تو کسی کم سن اور خوبصورت لڑکی پر حضورؐ کی اتنی فریفتگی کا بیان کیا جائے کہ کوئی اُم المومنین اس کے مقابلے پر ٹھہر ہی نہ سکے، خواہ ان مساعی میں پیغمبرؐ کی سیرت ہی مسخ کیوں نہ ہو جائے۔ رسولؐ کی بیٹی کے گھر پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہو تو کسی بی بی کو جبرئیلؑ کے ذریعہ خدا سلام کہلوائے۔ مقصود صرف اتنا تھا کہ آلِ نبیؐ کی منزلت اور قیمت کم کر دی جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ مساعی بھی جاری رکھی جائیں کہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے کردار بدلی ہوئی شکلوں میں دنیا کے سامنے آئیں تاکہ ان کی نا اہلی محتاجِ ثبوت نہ رہے۔ اصل حقدار کو اس کے حق سے محروم کرنے کے لئے دُنیا میں جو کچھ کیا جاتا ہے وہ سب کیا جائے تاکہ غاصب کو غاصب کہا نہ جا سکے۔

ان ریشہ دوانیوں کی بنیاد رسولؐ اسلام کی زندگی ہی میں رکھی جا چکی تھی اور زمین کو آہستہ آہستہ ہموار کیا جا رہا تھا۔ بدیہی طور پر جب وقت آیا تو پہلے سے بنایا ہوا منصوبہ کامیاب ہو گیا۔ علیؑ کو تو ایسی کسی بات کی پرواہ نہ تھی، البتہ آپ کے بعض ساتھی سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ وغیرہ اپنے کو نہ روک سکے اور انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ

پہنچ کر علی کے حق میں سعد بن عبادہ سے ایک آواز اُٹھوائی جو نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

انصارِ مدینہ کی کوشش یقیناً کامیاب ہوتی، اگر علیؑ اور بنی ہاشم وہاں موجود ہوتے ــــــ علیؑ کی اہلیت، استحقاق اور مُنہ کی مروّت کسی کی کچھ چلنے نہ دیتی، مگر وہ ہوتے ہی کیوں؟ سب جانتے تھے کہ علیؑ رسُول کی میّت چھوڑ کر جانے والے نہیں ہیں اس لئے ایک غیر نمائندہ مجمع میں، ایک پارٹی یعنی بنی ہاشم کے بغیر من مانی کر لی گئی۔ اس کا رونا نہیں ہے کہ خلافت علیؑ کو نہیں ملی۔ رونا ہے تو اس کا کہ اس کے بعد رسُول کی اولاد سے بہت ہی ناروا اور بے رحمانہ سلوک کیا گیا اور اسی کو دیکھ کر حضرت معاویہ کی ہمّت پڑی کہ نہ صرف آلِ محمدؐ بلکہ محمدؐ کے برگزیدہ صحابیوں کی بھی بے حُرمتی کریں اور انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیں۔

دمشق کی ٹکسال ایسے ہی اغراض و مقاصد کے لئے کام کر رہی تھی جو انجام کار اسلحہ خانے کا جزو بن گئی ــــــ حضرت مُعاویہ نے امارت کی سند مدینے سے حاصل کی تھی۔ جاہ و حشم اور سیاست دربارِ ہرقل سے مستعار لی پھر اس میں اضافہ کیا۔

روم میں دشمنوں کو راستے سے ہٹانے کے لئے زہر کا استعمال ہوتا تھا معاویہ نے اس میں اجتہاد کیا۔ زہر کا متقطر کرایا اور اس کی اقسام ایجاد کرائیں، پھر ان زہروں کو اسلحہ خانے میں داخل کر دیا۔

سازش اور تلوار وراثت میں ملی تھی۔ اس میں معاویہؓ کی ذاتی صلاحیت نے چار چاند لگا دیئے ــــــ یہ والیٔ شام کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے مقابلے پر جو فریق تھا، وہ پیغمبر کا صحیح جانشین تھا۔ اس کی طرف سے ان حربوں کا جواب ایسے حربوں سے دیا ہی نہیں جا سکتا، وہاں تو جھوٹ، فریب، سازش، بددیانتی، رشوت، ہر بات کا جواب صداقت تھی اور کوفیوں، عراقیوں اور شامیوں کو روکھی پھیکی صداقت درکار نہ تھی، انہیں تو دین و ایمان کے نام پر دولت چاہیئے تھی۔ اس کے لئے جائز و ناجائز کا امتیاز نہ تھا، اسی کے وہ برسوں سے عادی رہے تھے جو علیؑ سے ممکن نہ تھی۔ یہ علیؑ

کے صادقانہ جبر دت کی بات تھی کہ ضمیر فروش کچھ کہنے کے بجائے لیت و لعل کرتے رہے۔

ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر معاویہ کے فوجی دستے مقبوضات خلافت پر حملے کرتے رہے اور علوی عاملوں کی طرف سے ان کا دفاع ہوتا رہا۔ آخر معاویہ نے مصر پہ دھاوا بول دیا جس پر ان کی نظریں شروع ہی سے لگی ہوئی تھیں۔

مصر، ایک مقبوضۂ خلافت

زمانے کی روایت کے مطابق اس دور میں مسلمانوں کے تین مدّبر تھے معاویہ بن ابی سفیان، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، تدبُّر ان ہی معنی میں، جن میں آج مستعمل ہوتا ہے اور اس میں مطلب براری کے لئے کوئی عمل ناروا نہیں ہوتا۔ ان میں ایک کا اضافہ سعد بن عبادہ کے بیٹے "قیسؓ" سے ہو سکتا تھا جو امیرالمومنینؑ کے طرف دار تھے اور آپ کے وقت میں مصر کے والی تھے۔

معاویہ نے ان کو خریدنے کی بہت کوشش کی مگر قیس معاویہ کے فریب میں نہیں آئے۔ امیرالمومنین کو ان سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن مصر کے ایک وفد نے جب قیس کی شکایت کی تو امیرالمومنین کو سوچنا پڑا پھر بھی وہ قیس کو ہٹانا نہ چاہتے لیکن بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ قیس پر اتنا اعتماد نہیں کر سکتے جتنا محمد بن ابی بکر پر

حضرت محمد بن ابی بکر جناب امیرؑ کی نظر میں مثل محمد حنفیہ کے تھے۔ چنانچہ آپ نے محمد بن ابی بکر کو بھیج دیا کہ قیس کی مدد کریں ——— یہ بات قیس کو ناگوار ہوئی اور وہ استعفیٰ دے کر مدینے چلے گئے۔

حضرت معاویہ نے جب عمرو بن العاص کو مصر کی تسخیر کے لئے مامور کیا تو اس سے قبل ہی وہاں سازش کا جال بچھا دیا۔ شام سے قربت کے سبب یوں بھی مصری بنی اُمیہ کے حق میں تھے اور معاویہ نے پہلے سے وہاں کے عمائدین کو خرید رکھا تھا ——— یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شام و مصر میں آلِ محمدؐ کا صحیح تعارف بھی نہ ہوا تھا ان کی جو تصویریں پیش کی گئی تھیں، وہ بلا تشبیہ اولادِ نوحؑ کی تھیں بلکہ لوگ یہی جانتے تھے کہ حضورؐ کے قریب ترین رشتہ دار خود معاویہ ہیں۔

ان حالات میں مصر پر استقرار حکومت کے لئے واقعی قیس بن سعد جیسے جرنیل کی ضرورت تھی مگر وہ مصر سے جا چکے تھے۔ وفادار اور باصفا محمد بن ابی بکر نے بڑے استقلال کے ساتھ ہر طرف کی خبر رکھی اور جب مصریوں نے بغاوت کی تو یزید بن حارث اور محمد بن جیہان کو ان کی سرکوبی کے لئے متعین کیا، مگر دونوں مارے گئے پھر حضرت محمد بن ابی بکر نے بنی کلب کے ایک سردار کو روانہ کیا۔ اس نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ نتیجے میں ہر گلی دکوچہ بغاوت کے نعروں سے گونج اٹھا اور محمد بن ابی بکر نے حضرت علی سے مدد مانگی۔

مالک اشتر

حضرت علیؑ کا سرمایہ اب صرف مالکِ اشتر رہ گئے تھے، آپ نے انہیں مصر روانہ کر دیا۔

حضرت معاویہ کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے حاکم قلزم سے رابطہ قائم کیا جو پہلے ہی دمشق کے حلقۂ تزویر میں پھنسا ہوا تھا۔ معاویہ نے اپنے اسلحہ خانے کا خاص زہر پہلے سے اس کے پاس بھجوا دیا۔ مالک عرب کے شجاعانِ رزم گاہ میں تھے۔ کون تھا جو سامنے آکر مقابلہ کرتا؟ حاکم قلزم نے مکر سے کام لے کر مالک کی دعوت کا اہتمام کیا اور اس زہر کو کھانے میں ملوا دیا۔ ایک روایت کے مطابق شہد میں ملا کر دے دیا۔ جس کے پیتے ہی مالک اشتر جاں بحق ہو گئے ——— شجاعت میں علی کا مدِ مقابل اگر کوئی تھا تو مالک اشتر۔ جنگ صفین میں مالک کے کشتوں کی تعداد علی کے مقتولین سے ایک کم تھی، جس پر مالک کو تفاخر ہوا۔ علیؑ نے مالک کی بہادری کی تعریف کی، اور کہا، تم تو سامنے پڑنے والے دشمن کو سامنے سے ہٹا دیتے تھے، مجھے یہ بھی دیکھنا پڑتا تھا کہ اس کی نسل میں کوئی دیندار ہونے والا تو نہیں ہے۔ مالک کے ایمان پر حضرت علیؑ کو بڑا اعتماد تھا، اسی لئے یہ بات کہہ بھی دی تھی۔

امیرؑ المومنین مالک کے انتقال کی خبر سے اتنے افسردہ ہو گئے تھے گویا وہ خود آدھے مر چکے ہوں۔ آپ نے فرمایا:۔

"خدا رحم کرے مالک پر۔ وہ میرے لئے ویسے ہی تھے جیسے میں رسولؐ اللہ کے لئے!"
یہ مالک کا شرف تھا جو پیغمبرؐ کے جانشین نے ان کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے تھے
مالک کا قبیلہ کوفے کی آبادکاری سے قبل ارضِ نینوا سے دُور کوفے کے نواح میں آباد تھا جو نخ کا علاقہ کہلاتا تھا۔ مالک کے برادر بزرگ کا نام عبداللہ تھا شجاع جنگ آزما، متدین، بلند کردار، قول کے دھنی اور فرزند شمشیر۔ مالک نے قبیلے کی سرداری اور سیرت معزز باپ سے ورثے میں پائی۔

جنگ قادسیہ کے بعد سے اس قبیلے کا مدینے سے رابطہ رہا اور حق پرستی کے رجحان کے سبب وہ آلِ محمدؐ کا حلقہ بگوش رہا ——— ایک معرکے میں مالک کی ایک آنکھ کے اوپر تلوار کا زخم آگیا تھا لہذا آپ اشتر کے نام موسوم ہو گئے پھر یہی آپ کا لقب قرار پا گیا۔

حضرت علیؑ نے جب کوفے کو دارالخلافہ بنایا تو بارگاہِ امامت میں مالک کا تقرب بہت بڑھ گیا اور آپ صفِ اوّل میں بھی ممتاز اور منفرد ہو گئے ——— آخر آپ نے اپنی جان حق کی حمایت میں قربان کر دی اور رہتی دُنیا تک شجاعت و وفا آپ سے منسوب ہو کر رہ گئی۔

مصر کی سیاست پر مالک اشتر کی شہادت کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ حضرت معاویہ نے بڑی تیزی سے اپنی چالیں چلنا شروع کر دیں، اور عمر عاص کی سازشوں سے معاویہ بن خدیج اور معاویہ بن مسلم نے ایک بڑی جمیعت کے ساتھ علم بغاوت بلند کر دیا امیرالمومنین انتہائی پریشانی میں محمد بن ابی بکر کو کمک بھیجنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سو دو سو آدمیوں سے زیادہ تیار نہ ہوتے۔ بڑی دقت سے دو ہزار آدمی مالک بن کعب ارحبی کی سرکردگی میں روانہ کئے گئے مگر ان کے پہنچنے سے قبل عمرو عاص مصر میں وارد ہو گیا اور جنگ شروع ہو گئی۔

محمد بن ابی بکر چار ہزار فوج لے کر مقابلے کے لئے نکلے مقدمۃ الجیش کی کمان کنانہ بن بشر کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ نہایت شجاع اور بہادر

تھے، بڑی بہادری اور پامردی کے ساتھ شامیوں کا مقابلہ کیا۔ جو دستہ آگے بڑھتا، اسے پسپا کر دیتے۔ یہ رنگ دیکھ کر عمرو بن العاص نے معاویہ بن خدیج کو اشارہ کیا۔ اس نے کنانہ کو گھیر لیا اور ہر طرف سے شامی ان پر ٹوٹ پڑے۔ کنانہ نے گھوڑے سے اتر کر لڑنا شروع کر دیا لیکن تنہا ایک شخص کا جم غفیر سے مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ بالآخر وہ لڑتے لڑتے مارے گئے۔ کنانہ مصری فوج کے قوتِ بازو تھے۔ ان کے قتل ہوتے ہی مصریوں نے میدان چھوڑ دیا۔ محمد بن ابی بکر روپوش ہو گئے لیکن معاویہ بن خدیج نے ڈھونڈھ نکالا اور عمرو بن العاص نے نہایت بیدردی کے ساتھ قتل کرا دیا۔" (۷۷)

ایک معتبر روایت میں یہ بھی ہے کہ "عمرو بن العاص نے محمد کو زخمی حالت میں گدھے کی کھال میں سلوا دیا تھا، پھر اس کو جلوا دیا۔"

کہا جاتا ہے کہ محمد بن ابی بکر کا غلام سالم جب آپ کا پیرہن لے کر مدینے پہنچا تو معاویہ کی بہن ام المومنین ام حبیبہ نے ایک بھنا ہوا مینڈھا "تحفتہً" حضرت عائشہؓ کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا۔

"محمد بن ابی بکر اسی طرح بھون ڈالے گئے تھے ۔۔۔۔۔"

حضرت عائشہؓ کو اس سے اتنا صدمہ ہوا کہ آپ نے پھر کبھی بھنا ہوا گوشت نہیں کھایا۔ اس دن کے بعد سے ہر نماز میں آپ معاویہ، عمرو عاص اور معاویہ بن خدیج کے لئے بددعا کیا کرتی تھیں۔

اس واقعہ سے ایک بدیہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ آنحضرت کی حیات طیبہ میں کوئی ام المومنین خواہ اپنی ازدواجی حیثیت کے علاوہ کچھ اور نہ رہی ہو لیکن آپ کی وفات کے بعد ہر ام المومنین کی ہمدردیاں صرف اپنے قبیلے میں مرکوز ہو کر رہ گئیں اور بعض میں تو حق و ناحق کی تمیز بھی باقی نہیں رہی تھی۔ یہی صورت ام حبیبہ کی بھی تھی۔ چونکہ ام المومنین عائشہؓ معاویہ کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں اور معاویہ بھی انہیں

اپنی راہ کا کانٹا قرار دیتے تھے لہٰذا بھائی کے زندہ جلا دیئے جانے کی خبر اُم حبیبہ نے اُم المومنین عائشہ رضؓ کو بھُنی ہوئی ران بھیج کر دی اور ان کا کلیجہ کباب کر دیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاویہ کی بہن بھی بھائی سے کم بے رحم اور سنگ دل نہ تھی۔ یہ حقیقتاً آنحضرتؐ کا دل گردہ تھا کہ آپ نے ایسی ہر عورت کو نباہ دیا۔

بے محل نہ ہوگا، اگر بنی اُمیّہ کی افترا پردازی کی ایک داستان اور گوش گزار کرتا چلوں، جو یزید بن معاویہ کے بعض حمایتی وقتاً فوقتاً اُڑاتے رہتے ہیں کہ واقعہ کربلا سرے سے واقع ہی نہیں ہوا، کیونکہ یزید بن معاویہ تو معرکہ روم میں حضرت ابو ایوب انصاری کے ساتھ مارا جا چکا تھا۔ اس کی قبر قسطنطنیہ کی دیوار تلے بنی ہوئی ہے ـــــ ان کی اطلاع کے لیے یہ بات بتانا ضروری ہے کہ خود معاویہ بن ابوسفیان کی فوج میں معاویہ نام کے پانچ جرنیل موجود تھے اور شہریوں میں تو نہ جانے کتنے لوگوں کے نام معاویہ ہوں گے۔

دو جرنیل معاویہ بن خدیج اور معاویہ بن مسلم تو صرف مصر کے محاذ پر تھے۔ جن سے عمرو بن العاص نے محمد بن ابی بکر کے قتل کی سازش کی تھی۔ یوں تو ہر آدمی کے منہ میں زبان ہوتی ہے۔ جھوٹ سچ جو چاہے کہتا چلا جائے لیکن اتنی احتیاط تو کرنا ہی چاہیئے کہ جھوٹ آسانی سے پکڑا نہ جائے۔ کہنے والے کو اتنی تحقیق تو کر ہی لینا چاہیے کہ کس کس معاویہ نے بادشاہ کی خوشنودی کیلئے اپنے بیٹوں کے نام یزید رکھے، اور ان میں سے کون سا یزید بن معاویہ جنگ روم میں مارا گیا ـــــ تاریخ اگر اسی طرح افسانوی رنگ اختیار کرتی رہی تو لوگوں کا اعتماد تاریخ پر سے ختم ہو جائے گا۔

حضرت علیؑ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے کلیجہ پکڑ لیا۔ محمد بن ابی بکر آپ کو حسنین سے کم پیارے نہ تھے۔ انھیں محسوس ہوا کہ جیسے واقعی ان کا بیٹا درجہ شہادت پر فائز ہو گیا، مگر آپ اس آزمائش میں بھی پورے اترے۔

محمد بن ابی بکرؓ

حضرت امیرالمؤمنین کا کہنا تھا کہ محمد، ابوبکر کے صُلب سے آپ کا بیٹا ہے یہ قول محمد کے شرف کی دلیل ہے۔ حسب و نسب کے لحاظ سے آپ اسماء بنت عمیس کے بطن سے ابن ابوبکر بن قحافہ تھے۔ اسماء سب سے پہلے حضرت جعفر طیار کو بیاہی تھیں۔ ان سے عبداللہ بن جعفر پیدا ہوئے۔ جعفر طیّار کی جنگِ موتہ میں شہادت کے بعد حضرت ابوبکر کی زوجیت میں آئیں اور ان سے محمد پیدا ہوئے۔ اسماء کی والدہ ہند، اُم المؤمنین میمونہؓ اور عباس بن عبدالمطلب کی زوجہ ام الفضل کی بہن تھیں۔

حضرت ابوبکر کے مرنے کے بعد اسماء کو حضرت علیؑ کی زوجیت کا شرف حاصل ہوا۔ محمد بن ابی بکر کے ساتھ ان کی بہن اُم کلثوم بھی تھیں، جن سے پانچ سال کی عمر میں حضرت عمر کا عقد کرنا بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت عمر نے خلافت کے دبدبے میں اُم کلثوم بنت ابی بکر کا رشتہ حضرت علیؑ سے مانگا تھا مگر آپ نے صغیر سنی یا کسی دوسرے سبب سے انکار کر دیا تھا۔

حضرت محمد بن ابوبکر کی تربیت امیرالمؤمنین نے بیٹے ہی کی طرح کی تھی اور انہوں نے اس کا حق بھی ادا کر دیا۔

۱۰ھ میں حجۃ الوداع کی روانگی کے وقت آپ کی ولادت ہوئی تھی حضرت عائشہؓ نے نام رکھا تھا۔ صفر ۳۸ھ میں آپ کی شہادت ہوئی۔

محمد عبادت گزار، صاحب اجتہاد اور بہادر تھے۔ محبت اہلِ بیت کا درس آپ نے اپنی ماں سے پایا تھا۔ اسماء نے ان کی خبر شہادت پر اس کردار کا مظاہرہ کیا۔ جس کی نظیر صرف کربلا میں ملتی ہے۔ محمد کی موت کو آپ نے اپنی سربلندی کی علامت قرار دیا اور اس پر فخر محسوس کرتی رہیں۔

اب بساطِ سیاست پر بنی اُمیّہ کے تسخیری خانے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے اور شام کی فوجیں خلیفۂ وقت کے علاقوں پر چھاپے مار رہی تھیں۔ حضرت علیؑ کے

کے باوفا جاں نثار موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے۔ صرف حق کے دانے رہ گئے تھے ایسے میں عبداللہ ابن عباس نے بھی منہ پھیر لیا۔

دُنیا علی سے روگرداں ہو چکی تھی۔ سرفروشی کے لئے گنتی کے افراد باقی تھے جن میں ابنِ عباس کا شمار بھی تھا۔ پھر بھی حضرت علیؑ سیاستِ الٰہیہ سے سرمو ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ شاید اسی لئے دوسروں کی طرح عبداللہ ابن عباس بھی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے اور بیت المال کا ایک حصّہ محفوظ کرنے لگے۔ جس کی اطلاع ابوالاسود تخرّ ایلچی نے امیرالمومنین کو دے دی۔ آپ نے ابنِ عباس کو خط لکھا، اور اس خط و کتابت میں تلخی پیدا ہو گئی۔

علیؑ نکے کے صادق و امین کے جانشین تھے انہوں نے دیانت کے لئے اپنے حقیقی بھائی عقیل کی ناراضگی کی پرواہ نہ کی تھی اور بیت المال سے ان کے حصّے سے زائد ایک کوڑی نہ دی تھی۔ امام وقت کی حیثیت سے آپ کی نظر میں سب برابر تھے۔ آپ عبداللہ ابن عباس کی پرواہ کیا کرتے، ادھر عبداللہ بھی صورتِ حال کو سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے جو کچھ سمیٹ سکتے تھے، سمیٹا اور بصرے میں زیاد بن سمیہ کو اپنا قائم مقام بنا کر مکے کو سدھار گئے۔

شام کی یلغار

حضرت معاویہ تاراجی کی مہم شروع کر چکے تھے۔ ۳۹ھ میں انہوں نے نعمان بن بشر کو دو ہزار فوج کے ساتھ عین التمر روانہ کیا، مگر اس کو مالک بن کعب کے ہاتھوں شکست ہوئی۔

اسی سن میں انہوں نے سفیان بن عوف کو چھ ہزار آدمی دے کر انبار و مدائن روانہ کیا۔ حضرت علیؑ کی طرف سے سعید بن قیس مقابلے کے لئے پہنچے تو وہ لوٹ مار کر کے جا چکا تھا۔

پھر حضرت معاویہ نے عبداللہ بن مسعدہ فزاری کو تیمار روانہ کیا جو مکّے اور مدینے پہنچا۔ حضرت علیؑ کی طرف سے مسیب بن نجبہ مقابلے پر آئے۔ فزاری

ہزیمت یاب ہوا اور قلعہ بند ہوگیا۔ مسیب نے قلعہ میں آگ لگادی مگر معافی مانگنے پر چھوڑ دیا۔

ضحاک بن قیس تین ہزار سپاہ کے ساتھ داقوصہ کے نشیبی علاقوں پر حملہ آور ہوا امیرالمومنین نے حجر بن عدی کو متعین کیا۔ حجر نے اس کے انیس آدمی قتل کئے اور لشکر کو مار بھگایا۔

ذی الحج ۳۹ھ میں حضرت معاویہ نے حج میں خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد ہی معاویہ نے عبدالرحمٰن بن قباث کو جزیرہ بھیجا مگر اس کو کمیل بن زیاد کے ہاتھوں ایسی شکست ہوئی کہ اس کے لشکر کا بڑا حصہ کٹ گیا۔

صدقات وصول کرنے کے سلسلے میں ایک مقابلہ شام کے سالار فوج زہیر بن مکحول اور علیؑ کے جرنیل عبداللہ اشجعی کے درمیان ہوا جس میں زہیر ہارا گیا۔

دومتہ الجندل میں مسلم بن عقبہ معاویہ کی طرف سے آیا تھا۔ اس کو علی کے جرنیل مالک بن کعب نے بری طرح پسپا کیا۔

۴۰ھ میں بسر بن ابی ارطاط معاویہ کے حکم پر مدینے پہنچا، کئی گھر مسمار کر کے مکہ آیا۔ وہاں سے یمن روانہ ہوا۔ یمن پہنچ کر اس نے عبدالمدان، ان کے بیٹے اور عبداللہ بن عباس کے دو کم سن بچوں کو قتل کیا۔ حضرت علیؑ کی طرف سے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود مقابلے کے لئے پہنچے تو بسر بھاگ نکلا۔ آخر جاریہ اور وہب مکہ، مدینہ ہوتے ہوئے کوفہ واپس ہو گئے۔

حضرت معاویہ کی پالیسی غالباً صرف بدامنی اور قتل و غارت گری تھی۔ گئے گزرے حالات میں بھی ان کے لشکروں کو شکست پر شکست ہو رہی تھی کیونکہ حضرت علیؑ کے ساتھ جتنے بھی لوگ رہ گئے تھے وہ میدانِ جنگ کی موت کو شہادت قرار دیتے، لہٰذا دشمن ان کے سامنے سے بچ کر نکل نہ پاتا اور شام کے غارت گر بزدلی میں جان دیتے یا پیٹھ دکھا جاتے، لیکن حضرت علیؑ عوام کے محافظ تھے وہ

بے گناہ شہریوں کا خون دیکھ نہ سکتے۔ اس لئے بعض لوگوں نے صلح کرانے کی کوشش کی تو آپ نے مفادِ عامہ کی خاطر ہاتھ بڑھا دیا۔ ۴۰ھ میں ایک معاہدہ ہوگیا جس کی رد سے شام و مصر اور مغرب کے علاقے پر معاویہ کی حکومت تسلیم کرلی گئی۔

خانہ جنگی کا یہ خاتمہ ایک طرف معاویہ کے منصوبوں کے لئے مہلت تھا دوسری طرف علیؑ کے لئے صفین کا جواب دینے کا موقع فراہم کر رہا تھا، لہذا دونوں اس پر مطمئن ہوگئے۔ معاویہ تو اس لئے مطمئن تھے کہ علیؑ نے ان علاقوں پر ان کی حاکمیت تسلیم کرلی تھی اور علی اس لئے کہ وہ یکسو ہوکر مسلمانوں کے مفاد پر توجہ دے سکیں گے۔

شہادت سے پہلے

امیرالمومنین کے دونوں بازو شکستہ ہو چکے تھے۔ ۹۴ سال کے عمار یاسر صفین میں ساتھ چھوڑ گئے۔ مالک اشتر معاویہ کے زہر سے دنیا کو خیرباد کہہ گئے تھے قوم ایک قنوطیت کا شکار تھی اور معاویہ کی چیرہ دستی کے سبب خلافت کا رعب و داب ختم ہو رہا تھا۔ علیؑ نے تمام زندگی کبھی شکست کا منہ نہ دیکھا تھا صفین میں انہیں اگرچہ حقیقی ہزیمت نہ ہوئی تھی پھر بھی انہوں نے سیاسی شکست کھائی جس کا انہیں ملال تھا اور اس سے زائد غم اس کا کہ ایک غاصب نے ان کے علاقے پر قبضہ کر رکھا تھا اور خیبر و خندق میں چمکنے والی تلوار کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔

ایک دن بڑے مجمع سے خطاب کے دوران آپ نے جذبات میں ڈوب کے کہا "کہاں ہیں میرے وہ بھائی جو سیدھی راہ پر چلتے رہے اور حق پر گزر گئے کہاں ہیں عمار، کہاں ہیں ابن تیہان، کہاں ہیں ذوالشہادتین، کہاں ہیں ان جیسے دوسرے بھائی، جنہوں نے مرنے پر عہد و پیمان کئے تھے اور جن کے سروں کو فاسقوں کے پاس بھیجا گیا تھا ——— !"

پھر آپ ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتے رہے، آنسو رخساروں پر بہتے رہے اور آپ اسی لہجے میں بولتے رہے گویا راہِ حق میں جہاد کرنے والوں کو خراجِ تحسین

پیش کر رہے ہوں ـــــ بولتے بولتے آپ سنبھلے پھر آواز بلند فرمایا :۔

"جہاد، جہاد ـــــ خدا کے بندو جہاد !

دیکھو میں آج لشکر تیار کرتا ہوں ۔ جو خدا کی طرف بڑھنا چاہے، وہ بڑھے

آپ نے ایک لمبی سانس لی اور کہتے رہے

"میری خلافت قبول کرنے کے بعد شورش پسندوں نے ہنگامہ کیا ـــــ خیر خدا نے ان کی پریشانیوں سے نجات دی ۔ انہیں ذلیل کیا ۔ ان کی کوششوں کو ناکام بنایا اور ان کا انجام بُرا کیا ـــــ ایک جماعت جو اسلام میں فتنے پھیلا رہی ہے ہوا و ہوس پر عمل پیرا ہے ۔ اسلام میں غلط فیصلے کرتی ہے مگر وہ چیز جس کی مدعی ہے اس کی ہرگز سزاوار نہیں ـــــ میں تمہیں سرزنش کرتے کرتے اور سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں ۔ تم مجھ سے صاف کہہ ہی دو کہ آخر چاہتے کیا ہو"؟

"تم اگر دشمن کی طرف کوچ کرنے کو تیار ہو تو یہ مرضی ہے ۔ نہیں چلنا چاہتے تو صاف صاف بتا دو تاکہ میں کوئی رائے قائم کر سکوں ـــــ خدا کی قسم ۔ اگر تم میرے ساتھ جنگ کے لئے نہ چلو گے اور اس وقت تک نہ لڑو گے جب تک احکم الحاکمین ہمارے مابین فیصلہ نہ کر دے تو میں تمہارے لئے بدُعا کردوں گا اور خود روانہ ہو جاؤں گا، خواہ میرے ساتھ دس ہی آدمی کیوں نہ ہوں ۔

شام کے اوباش اور فریب خوردہ لوگ گمراہی کی مدد کرنے اور باطل پر متحد ہونے میں تم سے زیادہ ثابت قدم ہیں ، حالانکہ تم جادۂ ہدایت اور راہ حق پر ہو اور وہ مسلک باطل پر ـــــ شام والے بھی تمہارے ہی جیسے انسان ہیں ایک مرتبہ مرنے کے بعد دوبارہ قیامت تک زندہ نہ ہوں گے"!

سرداران فوج اس خطبے پر بہت شرمندہ ہوئے ۔ انہیں یقین ہو گیا کہ حضرت امیرالمومنینؑ جو کہتے ہیں وہ کر گزریں گے جو سرداروں کے لئے بڑی ذلّت کی بات ہوگی ۔ انہوں نے باہم مشورہ کر کے امیرالمومنینؑ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا ـــــ

پھر سب نے اپنے اپنے قبیلوں کو جمع کیا۔ معقل ابن قیس نے بصرہ جاکر لوگوں کو آمادہ کیا اور ایک بڑا لشکر کوچ کے لئے تیار ہو گیا۔

امیرالمؤمنین نے زیاد بن حفصہ کو بطور ہراول متعین کیا۔ دس دس ہزار کے لشکر حسینؑ ابن علیؑ، قیس ابن سعد اور ابوایوب انصاری کی سرکردگی میں تیار کئے اور چونکہ رمضان سر پر تھا اس لئے روانگی رمضان پر ملتوی کر دی گئی۔

حضرت معاویہ بھی اپنی تدابیر سے غافل نہ تھے مگر علیؑ کے تصوّر سے ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ جنگ صفین کا منظر انہیں یاد آجاتا اور خدشہ پیدا ہو جاتا کہ کہیں پھر ویسا ہی ہوا تو کیا ہوگا ـــــ انہوں نے علیؑ کے لئے ایک ذہنی منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس خبر کے کان میں پڑتے ہی ایک عزم کر لیا۔ اپنا قاصد اشعث بن قیس کے پاس بھیج دیا۔ پھر کیا ہوا؟ اس کا اندازہ نوعیتِ واقعہ سے کیا جاسکتا ہے

عبدالرحمن ابن ملجم ایک عورت قطامہ پر عاشق تھا جس کے باپ اور بھائی جنگ نہروان میں قتل ہوئے تھے۔ اس بنا پر وہ علیؑ کی سخت دشمن تھی۔ اس نے ابن ملجم سے کہا تھا کہ مہر میں تین ہزار درہم، ایک غلام، ایک مطربہ لونڈی اور علیؑ کا سر درکار ہے۔ اتنی چیزیں بیک وقت ابنِ ملجم کے لئے ممکن نہ تھیں۔ اشعث نے جب اس کو اس کام کے لئے آمادہ کرنا چاہا تو اس کو ایک ہی مہم میں ساری شرائط پوری ہوتے نظر آنے لگیں اور وہ فی الفور قطامہ کو اپنے پہلو میں محسوس کرنے لگا۔

قطامہ کا ایک آدمی وردان اس کے ساتھ تھا۔ ابن ملجم نے مزید احتیاط کے طور پر شبیب بن بجرہ کو بھی لے لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اشعث بن قیس نے اس کو ساتھ کیا تھا۔ یہ تینوں مسجد کے سامنے خیمہ لگا کر فروکش ہو گئے اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

امیرالمؤمنین نماز صبح کے لئے تشریف لائے تو یہ تینوں مسجد میں موجود تھے اور اشعث بن قیس تھوڑے فاصلے سے موجود تھا۔ ابن ملجمؒ اور شبیب آپ کے

بالکل پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ جیسے ہی آپ پہلا سجدہ کر کے اُٹھے۔ شبیبؑ نے تیزی کے ساتھ کھڑے ہو کر وار کیا جو خالی گیا، دوسرا وار ابن ملجمؒ نے کیا جو سر اقدس پر پورا بیٹھا اور سر میں دماغ تک شگاف پیدا ہو گیا۔ تلوار زہر آلود تھی وہ اپنا کام کر گئی

ابن ملجمؒ تلوار چلاتا ہوا سُرعت کے ساتھ بھاگا۔ نمازی پیچھے دوڑ پڑے تھے مغیرہ بن نوفل نے اپنی چادر ابن ملجم پر پھینکی وہ اس میں اُلجھ گیا اور دوسرے لوگوں نے اس کو پکڑ لیا۔ شبیبؑ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

راویوں نے اس سلسلے میں شام کا حقِ نمک ادا کیا ہے اور معاویہ کو خون سے بری الذمہ کرنے کے لئے خارجیوں کی ایک جماعت کا شاخسانہ چھوڑا ہے ـــــ اور یہ شاخسانہ بھی سیاق و سباق سے درست کہ تین خارجیوں نے معاویہ بن ابی سفیان عمرو بن العاص اور حضرت علیؑ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ سامنے کا سوال ہے کہ معاویہ اور عمرو عاص سے ان خارجیوں کو کیا عداوت تھی؟ جب کہ ان کی تنظیم خود ان دونوں ہی کی ساختہ و پرداختہ تھی اور جمل کی طرح نہروان کی جنگ بھی علیؑ کے سر اس لئے تھوپی گئی تھی کہ آپ کی عسکری طاقت کمزور پڑ جائے اور کوئی دوسرا معرکہ صفین پیش آنے کا امکان ختم ہو جائے۔

حالات بادی النظر میں ایسے ہی ہو گئے تھے اور یہی سمجھ کر معاویہ نے غارت گری کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر اس میں ان کی فوجوں کو مُنہ کی کھانا پڑی۔ یہ نتیجہ خلافِ توقع تھا۔ معاویہ کو یہ اندازہ نہ تھا کہ صداقت کی راہ میں مُٹھی بھر سرفروش بھی بڑے سے بڑے لشکر کو تہہ و بالا کر سکتے ہیں ـــــ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساز باز سے کام لے کر جڑ ہی کو کاٹ دینے کا عزم کیا اور اشعث بن قیس کے ذریعے زر کثیر دے کر عبدالرحمٰن ابن ملجم کو اس خدمت پر مامور کر دیا۔

ابن ملجم نے بھی سوچا کہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو دنیا ہی میں جنت مل جائے گی ورنہ پس ماندگان اور قطامہ تو عیش و آرام سے گزر کریں گے ہی اور یوں بھی ذہنی طور پر حضرت علیؑ کی طرف سے اس کو اتنا بھر دیا گیا تھا کہ وہ علیؑ کے

نام سے بھی نفرت کرتا تھا ـــــــ اس پر قطامہ کے حاصل کرنے کی طلب نے اس کو از خود رفتہ کر دیا۔

ایک سُنی عالم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ صفین میں حضرت عمر اگر معاویہ کے مقابل ہوتے تو وہ کبھی قرآن بلند کر دینے کے فریب میں نہ آتے۔ دوسرے نے کہا:۔ یہ صحیح ہے مگر حضرت عمر کا صرف ایک رُخ تھا۔ معاویہ کے ہزار رُخ تھے وہ کوئی اور صورت پیدا کر لیتے۔

بڑی نکتہ رسی کی بات تھی اور بالکل صحیح عرفان تھا انہیں معاویہ کا کہ خلیفہ کا خون بھی ہو گیا اور معاویہ کے خنجر پر نہ کوئی داغ آیا اور نہ ان کے دامن پر کوئی چھینٹ۔ دراصل یہ کوئی قتل نہیں تھا بلکہ کراماتِ سیاست تھی جس کے بعد تاج و تخت خلافت کے خود اپنی طرف کھنچ کر آجانے کی توقع وہ کر سکتے تھے۔

امیر المومنین کی شہادت

بعض معتبر روایات شاہد ہیں کہ حضرت امیرالمومنین کو علمِ لدنی سے اپنی موت کا علم ہو گیا تھا اور ماہِ رمضان شروع ہوتے ہی اشاروں اور کنایوں میں آپ اپنی اولاد کو بتا بھی رہے تھے۔ ۱۷ رمضان کا دن گزرنے کے بعد آپ کو ایک اضطراب سا تھا۔ شب کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارا۔ صبح کو وقت سے پہلے بیدار ہو گئے اور مسجد میں پہنچ گئے۔

ابنِ ملجم آپ کا جانا پہچانا ہوا تھا۔ اسرارِ مشیت سے بھی آپ واقف تھے مگر مجرم اُس وقت تک مجرم نہیں ہوتا جب تک ارتکابِ جرم نہ کرے۔ ابن ملجم کی تلوار سر پر پڑی تو آپ کے مُنہ سے نکلا۔

"بربّ کعبہ، میں کامیاب ہوا ـــــ!"

اس کامیابی میں کیا کیا رموز پنہاں تھے، اس کو آپ ہی جانتے ہوں گے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ قاتل کے ہاتھ میں جس نے تلوار دی تھی، آپ اس کو بے نقاب کر رہے تھے لیکن ہٹ دھرم دُنیا نے اس کو بھی وضعی روایتوں کے پردے میں چھپا

دیا اور آج صحیح صورتِ حال سامنے رکھنے پر بھی ماننے کو تیار نہیں۔

اطلاع پاتے ہی حسنینؑ، حضرت محمد حنفیہ، حضرت عباس اور دوسرے بنی ہاشم آگئے۔ امیر المومنین کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ جراحوں کو فوراً بلایا گیا۔ ٹانکے دلوائے گئے مگر تلوار زہر آلود تھی۔ حضرت معاویہ کے اسلحہ خانے میں جو مہلک ترین زہر تھا اس میں ایک ماہ تک بجھی ہوئی تلوار کا زخم جراحوں کے بس کا ثابت نہ ہوا، اور ۲۱ رمضان کو شب ڈھلنے پر آپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مرنے سے قبل آپ نے بہت سی وصیتیں کیں حسنؑ کو اسرارِ امامت تعلیم فرمائے سارے بیٹے اور بیٹیوں کو امام حسنؑ کے سپرد کیا۔ عباس کا ہاتھ امام حسین کے ہاتھ میں دیا۔ اس طرح حضرت عباس کو حضرت امام حسینؑ کی نصرت کی تلقین کی۔ آپ ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے جو رسولؐ آپ کے سپرد کر گئے تھے۔

وارثان مابعد

خدیجۃ الکبریٰ کی اکلوتی بیٹی آپ کی شریکِ حیات تھیں۔ پیغمبرؐ اسلام کی اس سنت پر بھی عمل پیرا رہے کہ جناب فاطمہؑ زہرا کی زندگی میں کسی عقد کا تصور بھی نہیں کیا ـــــ دنیا کو نہ جانے آپ کی ذاتِ گرامی سے کتنا بغض ہے کہ اس امتیاز کو بھی چھین لینے کی کوشش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ عکرمہ کی دختر سے عقد کرنا چاہتے تھے مگر حضورؐ ناراض ہوئے اس لئے نہیں کیا۔ یہ اعتراض حقیقتاً علیؑ پر نہیں ہے بلکہ ہادی دین پر خود غرضی کا الزام ہے کہ امت کو تو عدل کی شرط کے ساتھ چار شادیوں کی اجازت دے دی مگر اپنی بیٹی کا مسئلہ آیا تو ناگواری کا اظہار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدیجۃ الکبریٰ کے سامنے بھی کسی عورت کی کوئی قیمت نہیں تھی اور آپ کی بیٹی فاطمہؑ زہرا تو سیدۃ النساء العالمین تھیں۔ علیؑ کو اس سے زائد کیا چاہیئے تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ علیؑ اس معاملے میں خود پیغمبرؐ سے زیادہ خوش نصیب تھے کہ انہیں صورت میں عینِ جمال، سیرت میں سراپا کمال بیوی ملی تھی جو رسولؐ کے لئے محترم اور پروردگار کی نظر میں عزیز و محتشم

تھے، وہ بنتِ عکرمہ یا کسی دوسری عورت کے بارے میں سوچ کر کفرانِ نعمت تو نہ کر سکتے

حضرت علیؑ کی ازدواجی زندگی صحیح معنیٰ میں ساڑھے آٹھ سال یا نو سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جس کو آپ کبھی فراموش نہ کر سکے ـــــــ یوں تو بعد میں آپ نے دس عورتوں سے عقد فرمایا جو تقاضائے بشری تھا اور اس سے زائد کا مقصد منشائے مشیّت کو پورا کرنا تھا۔ رحلت کے وقت آپ کی چار بیویاں موجود تھیں۔ جناب امامہ جناب اسماء، جناب لیلیٰ و اُم البنین۔ بارہ بیٹے اور سولہ بیٹیاں یادگار تھیں۔

محمد حنفیہ

پانچ بیٹے، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت عمرؓ بن علی، حضرت عباسؑ اور حضرت محمد حنفیہؒ یادگارِ عصر گزرے ـــــــ محمد حنفیہؒ مردِ فقیہہ و متقی تھے آپ کی والدہ گرامی قبیلہ حنفیہ بن لجیم سے تھیں۔ نام خولہ عرفیت حنفیہ تھی۔ محمد حنفیہ کی ولادت ۱۶ھ اور وفات ۸۱ھ میں ہوئی۔ شجاعت ماں اور باپ دونوں سے پائی تھی مگر داہنے ہاتھ کی انگلیاں ایک زرہ کو ہاتھ سے چھوٹی کرنے میں بیکار ہو گئی تھیں۔ اس لئے سفر میں امام حسینؑ کا ساتھ نہ دے سکے۔

حضرت علیؑ کی شہادت یقیناً شام کے لئے دل خوش کن ہوئی ہو گی لیکن کوفے میں کہرام مچ گیا اور مدینے میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ رسولؐ کی میّت گنتی کے لوگوں نے اٹھائی تھی، لیکن علیؑ کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا۔ دوست تو شریک تھے ہی، دشمنوں نے بھی مشایعت کی تاکہ ان پر شریکِ قتل ہونے کا شبہ نہ کیا جا سکے۔ کوفے سے پانچ میل اور بغداد سے ایک سو بیس میل کے فاصلے پر آپ کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔

اسپرٹ آف اسلام میں آپ کی شہادت پر میجر اوزبرن کا ایک تبصرہ نقل کیا گیا ہے کہ:۔

"حضرت علیؑ کی موت ایک ایسے شخص کی موت تھی جو ان تمام افراد میں، جن کی یاد تاریخِ اسلامی نے محفوظ رکھی ہے، سب سے صادق القلب اور افضل ترین مسلمان

تھا۔ اگر حضرت علی سات سو سال پہلے دُنیا میں آئے ہوتے تو انھیں عیسوی کلیسا کی طرف سے ولایت کا درجہ عطا ہوتا اور اگر تیرہ صدیوں بعد آتے تو ان کی ذہانت، قابلیت، نیک سیرتی اور شجاعت مہذّب دُنیا سے خراجِ تحسین حاصل کرتی۔ ایک حکمراں کی حیثیت سے وہ بہت پہلے پیدا ہو گئے۔ ان میں صداقت پسندی، حلم و تواضع اور رحمدلی کی جو صفات تھیں، ان کے ہوتے ہوئے بنی اُمیّہ کی غداریوں اور دروغ بافیوں سے نبٹنا ان کے بس کا کام نہ تھا۔"

اس تبصرے میں ایک اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ برگزیدۂ عرب کے ہادی نے حکومتِ الٰہیہ کے لئے جو زمین تیار کی تھی اور اپنے نائبِ برحق کو جو مزاج حکمرانی عطا کیا تھا، ان دونوں کے مابین اگر کوئی فصل واقع نہ ہوتا اور مسلک نظم و نسق میں مفاد پرستی اور مصلحت کی رُکاوٹیں کھڑی نہ کر دی جاتیں تو نبیؐ کے بعد بھی صداقت رفتاری میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا لیکن اس کو اسلام کی بدنصیبی ہی کہنا چاہیئے کہ علیؑ کو موقع اُس وقت ملا، جب وہ ابتدائی فرمانرواؤں کے بعد تیسرے کی خود غرضانہ اقربا پروری پوری بساط حکومت پر اپنے پنجے گاڑ چکی تھی اور دلوں کے ایمانِ خالص پر حرصِ دنیا کی مہریں ثبت ہو چکی تھیں۔ ایسے میں شاگرد تو شاگرد اگر خود استادِ مطلق بھی آتا تو اس کو بھی انہیں حالات سے گزرنا پڑتا جن سے ابو طالب کا بیٹا دوچار ہوا۔

علیؑ: ایک نشانِ تجلّی

عقیدے کی روشنی میں علیؑ کے فضائل اَن گنت ہیں۔ مسجودِ ملک، استادِ جبریل، مولودِ کعبہ، نائبِ رسولؐ، مددگارِ انبیاء، صاحبِ ذوالفقار، لسان اللہ، نفس اللہ، وجہ اللہ، ید اللہ، قسیم الجنّۃ والنار، مالک لوائے حمد، ساقی کوثر وغیرہ وغیرہ۔ آیۂ تطہیر، آیۂ صالح المومنین، آیۂ ولایت، آیۂ مباہلہ، آیۂ نجویٰ، آیۂ اذن واعیہ، آیۂ اطعام، آیۂ بلّغ، سورہ ھل اتیٰ، آپ کی شان میں نازل ہوئیں۔ سرورِ کائنات کی کتنی ہی حدیثیں آپ سے متعلق ہیں: حدیث مدینہ، حدیث سفینہ، حدیث نور، حدیث منزلت، حدیث خیبر، حدیث خندق، حدیث طیر، حدیث ثقلین، حدیث غدیر وغیرہ

پیغمبرِ اسلام کے بعد آپ کائنات کے لئے ہادیٔ برحق تھے لہٰذا آپ نے اپنی ذات سے اکلِ حلال حاصل کرنے کی ایک نظیر قائم کی۔ مزدور کی حیثیت سے کام کیا مٹی ڈھوئی کنویں سے پانی کھینچا، باغ سینچا اور دُنیا کو بتایا کہ کسبِ معاش جائز طریقہ سے حاصل کیا جائے تو کوئی کام چھوٹا نہیں ہوتا۔ اُجرت میں آپ عموماً جَو لیا کرتے تھے جناب فاطمہؑ زہرا خود چکی پیس کر آٹا تیار کرتیں اور روٹی پک کر تیار ہوتی تو عموماً مانگنے والوں کو دے دی جاتی۔ اہلِ بیت اطہار کو اکثر بغیر کچھ کھائے سونا پڑتا تھا۔

علیؑ علم، شجاعت، ایمان، دانائی، حکمت، ذہانت اور جُود و سخا کا پیکر تھے سب سے پہلے جامعِ قرآن، مُصنّف، خطیب اور شاعر، مرنے سے کچھ دن پہلے مسجدِ کوفہ میں سرِ منبر فرمایا تھا "پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے"۔ مگر دنیا نے اس سے فائدہ نہ اُٹھایا، اور کچھ ہی دنوں بعد ۶۲ سال کی عمر میں یہ نشانِ کنزِ مخفیہ ہمیشہ کے لئے غائب ہوگیا۔

آپ کے خطبات کا مجموعہ نہج البلاغہ کے نام سے موجود ہے۔ باقیات میں سے بعض خطبات منظرِ عام پر آتے جا رہے ہیں۔ کلام کا ایک حصّہ دیوان حضرت علیؑ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ باقی کلام نہیں ملتا۔

علامہ اقبال	مسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؑ
مولانا روم	افتخارِ ہر نبی و ہر ولی

دوسرے امام

(امیر المومنین) حضرت امام حسن علیہ السلام

رمضان ۳ھ تا ۲۸ صفر ۵۰ھ

تعارف

سرورؐ کائنات کا پہلا نواسہ ۱۵ رمضان ۳ھ کو پیدا ہوا کسی نے اس کا نام حمزہ تجویز کیا تھا مگر حضرت جبرئیلؑ ایک رومال لے کر حاضر ہوئے جس پر حسن لکھا تھا اس لئے آپ کا نام حسن رکھا گیا اور عرفیت، ہارون وصی موسیٰ کے بیٹوں کے نام شبّر و شبیّر کی رعایت سے شبّر قرار دی گئی۔

پیغمبرؐ اسلام نے باپ کی طرح بیٹے کو بھی اپنی زبان چسائی، پھر آپ سیدۂ عالمیان کے دودھ سے پرورش پانے لگے —— آپ کی تربیت کے لئے صرف حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کا نام کافی ہوگا لیکن مستزاد یہ کہ مدینۃ العلم اور باب مدینۃ العلم دونوں سے فیض حاصل کیا۔ پھر رسولؐ کے بعد کا پُر آشوب دور بھی دیکھا حضرت علیؑ کی خلافت ظاہری میں آپ پوری طرح جوان تھے۔ جنگ صفین میں جوہر شجاعت دکھائے۔ بعد کے زمانے میں حضرت معاویہ کی سازشیں بھی آپ کے علم میں تھیں اور وہ دور بھی یاد تھا جب امیر المومنین معاویہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے لیکن لوگوں نے تعاون نہیں کیا۔

نوٹ:۔ مولف کے نزدیک ہمارے تمام آئمہ ہی امیر المومنین ہیں لیکن بعض روایاتؑ کی بنا پر مسئلہ اختلافی ہے اس لئے بریکٹ میں کر دیا گیا۔

زمانے کی بے وفائی

حضرت علی کی شہادت کے بعد جب آپ کو بالاتفاق منصبِ خلافت پر بٹھایا گیا تو حالات روزِ روشن کی طرح آپ کے سامنے تھے۔ کوفہ شامی جاسوسوں اور خلافت کے غداروں سے بھرا ہوا تھا۔ اشعث ابن قیس، عمرو بن حریث۔ شیث ابن ربعی، عمار بن ولید، حجر بن عمر، عمران بن سعد، ابو بردہ بن موسیٰ اشعری۔ اسمعیل بن طلحہ اور اسحٰق بن طلحہ کتنے ہی لوگ تھے جن کا دمشق سے رابطہ تھا۔ خارجیوں کے نام ان سے الگ لیے جاتے ہیں مگر یہ تاریخی خیانت ہے۔ عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن الکوا۔ اشعث بن قیس اور شمر ذی الجوشن وغیرہ بھی انہی میں شامل تھے۔ یہ معاویہ کی سیاست تھی کہ وہ علیحدہ علیحدہ دو گروہوں کو ایک ہی ہدایت دیتے تاکہ ایک کی خبر دوسرے سے ملتی رہے۔

ان بگڑے ہوئے حالات میں بھی جوہر خالص ابن علی کے پاس موجود تھا قیسؓ بن سعد، عدیؓ بن حاتم، معقلؓ ابن قیس ریاحی اور زیادؓ بن صعصعہ وغیرہ وہ افراد تھے جنھوں نے ایسے ہی حالات میں علی ابن ابی طالب کا ساتھ دیا تھا اور علی کی شخصیت کا سہارا لے کر بے غیرتوں کو غیرت دار بنا کر لڑنے پر تیار کر لیا تھا لیکن فی الوقت شام کے اسلحہ خانے سے زر و جواہر کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ ساری قوم لوٹنے میں لگ گئی آخر جس طرح مسلمانوں نے اُحد میں رسُول کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح آپ کے نواسے کے گرد چند ہوا خواہ باقی رہ گئے۔ ایسے میں بنی ہاشم بھی متحد نہ رہ سکے۔

عبداللہ ابن عباس نے علیؑ سے روگردانی ضرور کی تھی مگر شام کی پناہ میں نہیں گئے اور چند روز بعد سنبھل بھی گئے مگر ان کے چھوٹے بھائی عبیداللہ ابن عباس نے یہ بھی کر دکھایا اور امام حسنؑ کے لشکر سے نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ معاویہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی طرح شب کی تاریکی میں روز کچھ نہ کچھ آدمی جاتے رہے اور اس کا اثر عام سپاہیوں پر بُرا پڑتا رہا۔ پھر بھی قیس بن سعد اور عدی بن حاتم طائی بددلی کو دُور کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔

حضرت معاویہ ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر بغداد سے دس فرسخ پر خیمہ زن تھے

جن کے مقابلے پر جناب امام حسن علیہ السلام نے بارہ ہزار فوج بطور ہراول بھیجی اور باقی لشکر کے ساتھ خود عقب میں بڑھ رہے تھے۔ صفین کا کھلاڑی مکر و فریب کا ہر داؤں پہلے ہی عمل میں لا چکا تھا اور اپنے آدمی اس نے امام حسنؑ کے لشکر میں جمع کر دیئے تھے۔ اس موقع پر اس نے ایک طرف تو قیس کے لشکر میں یہ خبر اڑائی کہ امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر لی لیکن جہاندہ قیس خود اسی میدان کے شہسوار تھے، معاویہ ان سے بازی کیا لے جاتے مگر امام حسنؑ کے ساتھیوں میں جب یہ خبر پھیلی کہ قیس نے صلح کر لی تو وہ بد دل ہو گئے اور ایسے میں معاویہ کے آدمی ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

"حسنؑ اپنے باپ کی طرح کافر ہو گئے ہیں ——— !" ظاہر ہے کہ یہ الفاظ امویوں ہی کے ہو سکتے تھے، کوئی پیرو علی تو یہ گستاخی کر ہی نہ سکتا۔ اس کے بعد یہ لوگ امام حسنؑ کے خیمے میں در آئے۔ سامان لوٹ لیا۔ مصلیٰ نیچے سے کھینچ لے گئے یہاں تک کہ دوشِ مبارک سے ردا تک اتار لی۔ منصوبہ یہ تھا کہ امام حسن علیہ السلام کو گرفتار کر کے معاویہ کو پہنچا دیں لیکن ان کا زور نہ چلا۔ امامؑ کے فداکار آپ کو بچا لے گئے اور مدائن کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں معاویہ کے آدمیوں نے آپ پر حملہ کیا اور ایسا خنجر مارا کہ ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

مدائن پہنچ کر آپ نے علاج کرایا۔ اس اثنا میں شام کا جرنیل عبداللہ ابن عامر بیس ہزار فوج لے کر مقابلے کے لئے آ پہنچا اور اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ خود معاویہ ایک بڑا لشکر لے کر آ رہے ہیں۔ اس سے امام حسنؑ کے لشکریوں میں سراسیمگی پیدا ہو گئی۔ امام حسنؑ خیبر شکن کے بیٹے تھے۔ طبعاً امن پسند ضرور تھے اور زہد و تقویٰ آپ کے خمیر میں تھا مگر جنگ میں پیٹھ دکھانا شرافتِ نسل سے بعید تھا۔ پھر بھی غور طلب یہ امر تھا کہ چھوٹی سی فوج اور اس کی بھی ہمتیں پست۔ ایک لشکرِ قہار کا مقابلہ کیونکر کیا جا سکتا تھا!

صلح حسنؑ

صلح حدیبیہ امام حسن علیہ السلام کی دیکھی ہوئی بات نہ تھی لیکن امام کو علم لدنی ہوتا ہے اور بزرگوں سے بھی اس کی تفاصیل سن رکھی تھیں۔

سقیفہ کے انتخاب کے بعد عظیم المرتبت باپ کی خاموشی کو آپ نے بچشم خود دیکھا تھا اور یہ آپ ہی تھے جنہوں نے چھوٹے بھائی کی ہمراہی میں بھری مجلس میں حضرت ابوبکر کو ٹوک دیا تھا۔

"اترو میرے نانا کے منبر سے ـــــ !"

کچھ دنوں پہلے کی بیچارگی کو بھی انہوں نے محسوس کیا تھا۔ آج آپ انہیں حالات میں تھے جن سے امیرالمومنین دوچار رہے تھے۔ مسلمانوں کا رنگ طبیعت نانا کی موت پر معلوم ہو چکا تھا۔ ایک امام کے لئے دوسرے امام کی سیرت سنت کا درجہ رکھتی ہے، لہذا آپ نے اقتدار کے لئے مسلمانوں کا خون نہ بہانے کا فیصلہ کیا۔ مورخ اس کو آپ کی کمزوری پر محمول کرتا ہے مگر اس سے پہلے یہ الزام حضرت علیؑ ابن ابی طالب پہ لگانا پڑے گا، جنہوں نے سقیفہ کے بعد نیام میں مچلتی ہوئی ذوالفقار کو تھپک کر سلا دیا تھا اور اپنے صحابیوں کے کھولتے ہوئے خون کو نرم گفتاری سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ لہذا آپ کے بیٹے نے بھی طے کیا کہ وہ تو منصوص من اللہ ہے۔ خلافت ظاہری یا اقتدار اگر مسلمان آپ کے پاس رکھنا نہیں چاہتے تو خوں ریزی کیوں کی جائے؟ علیؑ نے خلافت خود تو حاصل نہیں کی تھی، مسلمانوں نے دروازے پر حاضر ہو کر پیش کی تھی تو آپ نے قبول کر لیا تھا۔ اب تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب واپس لینا چاہتے تھے تو بزور شمشیر روکنے کی سعی کیوں کی جاتی۔ آپ نے فیصلہ کر لیا کہ آپ صرف فرائض امامت ادا کرتے رہیں گے۔ معاویہ کئی بار صلح کی پیشکش کر چکے تھے آپ نے حامی بھر لی جو مفادِ اسلام، احساس فرض اور نفس کشی کی آخری منزل تھی، اور اس کے بعد شرائطِ صلح مرتب ہو گئے۔

۱۔ معاویہ نظم حکومت میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کریں گے۔

۲۔ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳۔ شام و عراق، حجاز و یمن ہر جگہ کے لوگ محفوظ و مامون ہوں گے۔

۴۔ شیعان علیؑ اور اصحاب علیؑ جہاں بھی ہیں یا ہوں گے، ان کے جان و مال عزت و ناموس ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

۵۔ معاویہ کی طرف سے حسن ابن علی یا حسین ابن علی یا خاندانِ رسالت کی کسی فرد کو خفیہ یا علانیہ ڈرایا دھمکایا نہ جائے گا اور نہ ان کو نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۶۔ امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی شان میں جامع مسجد اور قنوت میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ بند کر دیئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

۲۵ ربیع الاوّل ۴۱ھ میں کوفے کے قریب انبار میں فریقین کا اجتماع ہوا اور دونوں نے دستخط کر دیئے۔

حضرت معاویہ کی عہد شکنی

امام حسنؑ نے بڑے ضبط و تحمل اور صبر و استقلال کے ساتھ یہ سب برداشت کیا کہ اس طرح پرسکون حالات میں انہیں تبلیغ کا موقع میسّر آجائے گا۔ معاویہ نے سیاسی اقتدار مضبوط ہوتے ہی نخیلہ میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے کہا۔

"جنگ سے میرا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو، روزہ دار بن جاؤ یا حج و زکوٰۃ کی پابندی کرو۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو۔ میرا مقصد تو حکومت پر مکمل تسلط حاصل کرنا تھا، وہ میں نے کر لیا۔ رہ گئے شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کئے ہیں، وہ میری ٹھوکر پر ہیں۔ چاہوں تو پورا کروں، چاہوں نہ کروں"!

اس تقریر پر مجمع ساکت رہ گیا مگر اب کس میں دم تھا کہ زبان کھول سکتا۔

اور صحیح کہا تھا معاویہ نے، انہوں نے واقعی ایک شرط بھی پوری نہیں کی آخر امام حسنؑ کوفے کی سکونت ترک کرکے مدینے آگئے۔

آلِ محمدؐ کا اب اقتدار سے کوئی تعلق نہ رہ گیا تھا مگر ظالم خواب میں بھی اپنے

خدشات سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس لئے حضرت معاویہ اب بھی امام حسنؑ کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے تھے، انہوں نے ایک لحظہ کے لئے بھی امام حسنؑ کو فراموش نہیں کیا، تلوار اور زہر دو کاری حربے ان کے پاس تھے۔ تلوار کو حضرت معاویہ نے آزمایا تھا مگر امام حسنؑ بچ گئے تھے پھر وہ تلوار کی زد ہی سے ہٹ گئے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اب اگر کھلم کھلا تلوار کا استعمال کیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ بغاوت ہو جائے اس لئے زہر کا استعمال مصلحتِ وقت کے مطابق ٹھہرا اور معاویہ نے اس کے استعمال کے لئے مہرے تلاش کرنا شروع کر دیئے۔

امام حسنؑ کی شہادت

موصل کا ایک آدمی محبِّ اہلِ بیت تھا۔ وہ طمعِ دنیا میں پھنس گیا۔ اس نے بصرے کے سفر کے دوران موصل کے قیام میں تین مرتبہ امام علیہ السلام کو زہر دیا مگر اس نے اثر نہ کیا۔ آخر وہ پکڑا گیا اور ہلاک ہوا۔

مدینے میں بھی حضرت معاویہ نے امام حسنؑ کی ایک بیوی جعدہ بنت اشعث کو توڑ لیا تھا۔ ایک ہزار دینار سُرخ، پچاس مصری خلعت اور یزید سے شادی ہو جانے کے لالچ میں بدنصیب عورت نے کئی بار کھانے میں زہر ملایا مگر اس کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ آخر جعدہ نے اس پانی میں زہر ملا دیا جو امام سوتے سوتے اُٹھ کر پیتے تھے۔ آپ صبح نماز کے لئے بیدار ہوئے تو وہ پانی اُٹھا کر پی لیا اور پیتے ہی حالت غیر ہو گئی۔ آپ نے بچا ہوا پانی مع برتن زمین پر ٹپکا تو زمین اُبلنے لگی۔ امامؑ کا کلیجہ زہر کے اثر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ امام حسینؑ بھائی سے لپٹ کر رونے لگے امام حسنؑ نے سنبھل کر سب لوگوں کو صبر کی تلقین کی، امام حسینؑ کو وصیتیں کر کے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور ۲۸ صفر ۵۰ھ میں بعمر ۴۷ سال سپردِ خاک کر دیئے گئے

"جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ مدینے میں اس کی مثال نہ ملتی ایک شریکِ جنازہ کا بیان ہے کہ اگر سوئی پھینکی جاتی تو کثرتِ اژدھام سے زمین پر نہ گر سکتی تھی۔" (۲۸)

یہ خبر جب دمشق پہنچی تو معاویہ نے جشن منایا۔ اس کے بعد جعدہ بنتِ اشعث اپنا انعام پانے کے لئے وارد ہوئی۔ معاویہ نے کہا۔ تو جب امام حسنؑ کی نہ ہوئی تو کسی اور کی کیا ہوگی؟ کہا جاتا ہے کہ معاویہ نے ہاتھ پاؤں بندھوا کر جعدہ کو دریائے نیل میں ڈلوا دیا تھا۔

اہلِ بیتِ رسولؐ کے لئے یہ سانحہ عظیم تھا لیکن مصائب ان کا مقدر بن چکے تھے انہوں نے بڑے ضبط سے پیغمبرؐ کے بڑے نواسے کا جنازہ اُٹھایا اور روضۂ رسولؐ کی طرف لے کر چلے۔ قریب پہنچے تو ایک مجمع سدِ راہ تھا ـــــ مورخین نے اس موقع پہ بددیانتی کا ثبوت دیا ہے کہ اُم المؤمنین عائشہؓ نے اجازت دے دی تھی مگر مروان نہیں مانا ـــــ مروان کی کیا ہمت تھی کہ عائشہ اجازت دے دیتیں اور وہ راستہ روک لیتا اور اس کو مان بھی لیا جائے تو حضرت عائشہ خچر پر سوار وہاں کیا کر رہی تھیں جس کی بعض مورخین نے تصدیق کی ہے۔

واقعات پر مسلسل تاریخی ملمع سازی کے باوجود بعض مؤرخوں نے واضح الفاظ میں حضرت عائشہ کا جواب لکھ دیا ہے۔

"انھوں نے فرمایا: یہ جگہ میری ہے میں اس میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔" (۷۹)

جگہ ان کی تھی یا نہیں؟ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے فی الوقت تو زیرِ بحث یہ بات ہے کہ پیغمبرؐ کے نواسے کو نانا کے پہلو میں دفن نہیں ہونے دیا گیا اور ام المؤمنین خود اپنے نواسے کی میت روکنے کے لئے سدِ راہ ہوگئیں۔

امام حسینؑ، محمد حنفیہؒ، عبداللہ ابن جعفرؑ اور عباسؑ ابن علیؑ، قاسم بن محمد اور بنی ہاشم کی بڑی تعداد اور ہزاروں محبانِ اہلِ بیت کی موجودگی میں امام کا جنازہ کون روک سکتا، تلواریں بے نیام ہوگئیں مگر امام حسنؑ نے پہلے ہی چھوٹے بھائی کو وصیت کر دی تھی کہ جھگڑا نہ کرنا۔ آپ نے بڑی بے چارگی سے بھائیوں کو سمجھایا اور جنازہ لے کر جنت البقیع کی طرف چل پڑے لیکن پیچھے سے تیروں کی باڑھ پڑی

اور کئی درجن تیر جنازے میں پیوست ہو گئے۔ ایک بار پھر صورتِ حال قابو سے باہر ہو گئی لیکن امام حسینؑ نے پھر سنبھال لیا اور بڑے بھائی کو جنت البقیع میں لے جا کر دفن کر دیا۔

ازدواج و اولاد

آپ نے مختلف اوقات میں نو شادیاں کیں۔ اُم فروہ، خولہ، اُم بشیر ثقفیہ رملہ، اُم اسحٰق، اُم الحسن، بنت امرالقیس، جعدہ بنت اشعث، آٹھ بیٹے اور سات بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ نسل صرف جناب زید اور جناب حسن مثنیٰ سے چلی زید نے بعمر ۹۰ سال انتقال فرمایا۔ جناب حسن مثنیٰ کی شادی جناب فاطمہ بنت حسین سے ہوئی تھی۔ سلیمان بن عبدالملک نے ۹۷ھ میں آپ کو زہر دلوا دیا تھا جس سے آپ نے ۵۲ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

سیرت

آپ کی صورت حضورِ اکرمؐ سے بہت مشابہ تھی۔ مفسرِ قرآن، عابد و زاہد، عالم، ہمہ داں، تہجد گزار، رحمدل، وسیع النظر، سخی اور پاپیادہ حج کرنے کے بہت شوقین تھے۔ توکّل، اخلاق اور حسنِ عمل آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ مہمان نوازی خمیر میں داخل ان باتوں کے باوصف شجاعت میں علی ابن ابی طالب کے وارث اور اتنے شجاع تھے کہ امیرالمومنین نے جمل و صفین میں آپ کو علمدار لشکر بنایا تھا۔ اہلِ بیتؑ سے متعلق ہر حدیث اور ہر آیت میں شامل تھے۔ سید شباب اہلِ جنت تھے اور خدا کی طرف سے رسولؐ کے دوسرے جانشین۔

مخالف مورخین نے آپ کو کثرت ازدواج کے الزام سے مطعون کیا ہے یہ سوچے بغیر کہ وہ سنتِ پیغمبریؐ کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس بہتان کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو شرعاً اس کا جواز خود فقہاء کی سمجھ میں آ جائے گا۔ رسولؐ کی اس سنت کا مقصد تنتا کحوا وتنا سلوا (نکاح کرو اور نسل بڑھاؤ) ہوتا ہے۔ ہمارا کوئی امام عام انسانوں جیسا تو نہیں۔ اس کا ہر کام مقصدی تھا۔

کسی نے کسی امام سے پوچھا تھا کہ بیوی کے پاس کب جانا چاہیئے؟ جواب ملا کہ جب ضرورت ہو۔ یہ ضرورت وسیع المعنیٰ ہے اور امام کے سامنے تو ضرورت تھی نسلِ رسولؐ کا قتلِ عام پیشِ نظر تھا۔ ایسے میں اولاد کثرت سے چھوڑ نہ جاتے تو کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہتا۔

حضرت معاویہ کا شاطرانہ دورِ حکومت

حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت امام حسنؑ سے جو جنگیں ہوئیں ان میں معاویہ نے جو تدبیریں کیں اور زہر و تلوار کے جو حربے استعمال کئے وہ مادی نظریئے سے بھی بمشکل روا رکھے جا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی خلافت حاصل کرنے کا امیدوار اگر ان کا مرتکب ہو تو سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جانبدار قلم ایسے ہر عیب کی تاویل ڈھونڈھ لے اور کفر کو اسلام ثابت کرنے کا تہیہ کر لے۔

حضرت معاویہ کا کردار اگر آج کے دور میں بروئے کار آتا تب بھی انسانی زاویہ نگاہ سے دنیا چیخ اٹھتی۔ آج بھی کوئی قوم جنگ میں زہریلے بم استعمال کر لیتی ہے تو خلق اللہ میں مطعون ہوتی ہے نہ کہ چودہ سو سال پہلے والیٔ شام نے رُوم سے درآمد کئے ہوئے قاتل زہر سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارا ـــــ دشمن بھی ایسے جو حق و صداقت کے علم بردار تھے اور جن کے کرداروں پر انگلی نہ اٹھائی جا سکتی۔

شجاعت کا جہاں تک تعلق ہے وہ ان میں عام سطح سے زائد نہ تھی وہ کسی طرح اولادِ رسولؐ کا مقابلہ نہ کر سکتے لیکن مکاری میں اولادِ رسولؐ کیا، بڑے بڑے سامنے نہ ٹھہر سکتے۔ ہاں ان ہی جیسا کوئی ہوتا تو دانت کھٹے کر دیتا۔ جیسے امام حسنؑ کے سپہ سالار قیس تھے، جو رئیس انصار سعد بن عبادہ کے بیٹے تھے۔ قیس بن سعد کو امام حسنؑ کی صلح ایک نظر نہ بھائی تھی مگر کرتے کیا، باپ نے مسلمانوں کے خلاف تلوار نہ اٹھائی تھی تب بھی سعد بن عبادہ نے ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی۔ بیٹے نے تلوار رکھ دی تو سعد کے جانشین قیس نے بیعت نہیں کی اور وہ بیعت کیوں کرتے معاویہ سے وہ کسی طرح کم تو نہیں تھے بلکہ شجاعت میں زیادہ تھے۔

اور ہوا بھی ویسا ہی کہ معاویہ نے ہزار جتن کر ڈالے۔ کتنے ہی قاصد بھیجے۔ صلح کی آسان سے آسان شرائط پیش کیں مگر قیس ان کے جھانسے میں کہاں آنے والے تھے انہوں نے ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ قیس کے پاس بیس ہزار سپاہ تھی اور معاویہ ان کے مقابلے میں لاکھوں کا لشکر لا سکتے تھے لیکن مرد میدان قیس قطعاً ہراساں نہ تھے ان کو اپنے قوتِ بازو پر یقین تھا کہ مقابلہ ہوگا تو چھکے چھڑا دیں گے۔ اُدھر معاویہ کی سوچ یہ تھی کہ اگر قیس سے ٹکر ہوئی اور انہیں شکست ہوگئی تو دوسروں کی ہمت بڑھ جائے گی اور خلافت ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے معاویہ نے قیس کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ مدائن پہنچ کر چہار جانب سے چوکنا بیٹھ گئے ایک مدّت کے بعد انہوں نے معاویہ سے اپنی شرائط پر صلح کر لی اور بیعت نہیں کی۔

سچ تو یہ ہے کہ معاویہؓ صرف اللہ کے حق پرست سفیروں کے مقابلے پر شیر تھے ان پر ان کے تمام عیّارانہ حربے کامیاب ہوتے رہے۔ ایک کو پشت سے تلوار کا وار کر کے، دوسرے کو زہر دلوا کر ٹھکانے لگا دیا۔ سامنے سے آکر ضرب لگانا ان کے بس کا نہ تھا اور رسُول کے جانشین اسی طریقۂ جنگ کے قائل تھے۔ عرصہ صفین میں آج بھی امیرُالمومنین کی آواز گونج رہی ہے۔ تاریخ نے جس کو محفوظ کر لیا ہے ایک دن آپ نے جنگ شروع ہونے سے قبل میدان میں آکر للکارا تھا۔

"معاویہ کیوں خلق اللہ کو کٹوا رہا ہے۔ میدان میں آجا۔ میرے اور تیرے درمیان فیصلہ ہو جائے!"

معاویہ نے کوئی جواب نہ دیا تو عمر عاص نے کہا

"سچ تو کہتے ہیں علیؑ۔ جھگڑا تو تمہارا اور ان کا ہے تم دونوں ہی فیصلہ کر لو"

"شیر کے مُنہ میں جھونک دینا چاہتا ہے مجھے" معاویہ نے جواب دیا اور کہا "تاکہ میرے بعد تو خلافت پر قبضہ کر لے"۔

عمر عاص اس کی تردید کیا کرتا۔ وہ تو خود میدان میں مارے دہشت کے

علیؑ کے سامنے گھوڑے سے گر گیا تھا اور علی کی تلوار سر پر چمکتے دیکھ کر اس نے اپنے کو ننگا کر دیا تھا۔ علیؑ نے لاحول و لا قوۃ کہہ کر ہاتھ روک لیا تھا اور منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

علیؑ کی للکار پر معاویہ یا عمر عاص کوئی میدان میں نہیں آیا۔ ان کی جگہ باران تیر نے علیؑ کا استقبال کیا اور پھر دونوں فوجیں متصادم ہو گئیں۔

یہی انداز شام کے ابتدائی دورِ حکومت سے چلا آرہا تھا۔ حصولِ خلافت کے لئے شروع میں جس کسی نے گروہ بندی کی۔ غلط روایتیں گڑھوائیں یا آلِ محمدؐ کی مفلوک الحالی کے اسباب فراہم کئے، وہ اس پیمانے پر نہ تھے۔ ان میں کبھی کبھی اولادِ رسولؐ کی قدر دانی کے مناظر بھی مل جاتے لیکن جب سے معاویہ تختِ خلافت کو مدینہ اور کوفہ سے دمشق اُٹھا لائے تھے، اس وقت سے تو بنی ہاشم پر زمین سخت اور آسمان دُور ہو گیا تھا۔ گویا ان کا بانیٔ اسلام سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ حق تھا تو بنی اُمیّہ کا، وراثت تھی تو بنی اُمیّہ کی، اہلیت تھی تو بنی امیّہ میں، اہلِ بیتؑ کچھ تھے ہی نہیں —— کوئی ان کے ساتھ کچھ سلوک کرتا تو رحم کھا کر۔

ہندوستان کی عورتوں میں ایک محاورہ ضرب المثل ہے "نوچو اُس کی ڈھاڑی جس نے پہلی راہ بگاڑی"۔ اس محاورے کی صداقت سے انکار نہیں بلا شبہ دیوار کی بنیادی اینٹ ٹیڑھی نہ ہوتی تو عمارت میں اتنی کجی پیدا نہ ہو سکتی لیکن دمشق میں اسلام کا جو محل تعمیر کیا گیا تھا، اس میں بنیادی کجی سے بہت زائد کجی پیدا کر دی گئی تھی۔ اس محل کی آرائش میں قیصر و کسریٰ کا رنگ غالب تھا اور اس کو مدینہ کی سادگی سے کوئی ربط ہی نہ رہ گیا تھا۔

حدیث سازی

اس صنعت میں اوّلیت کا سہرا مدینہ والوں کے سر بندھا ہے لیکن اس کو عروج پر معاویہؓ نے پہنچایا۔ پہلے انہوں نے خلفائے ثلاثہ کی شان میں حدیثوں کے انبار لگواتے اور جیسی حدیثیں حضرت علیؑ سے متعلق تھیں ان سے بہتر یا

ان جیسی ایک ایک موضوع پر کئی کئی حدیثیں تصنیف کرائیں اور ان کی اتنی تشہیر کی کہ اصل حدیثیں لوگوں کو یاد ہی نہ رہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آیاتِ قرآنی کی غلط تفسیروں کے لئے علماء کی ایک ٹیم متعین کی جو منبروں پر اور کبھی کبھی بازاروں میں ان کے فرضی مطالب بیان کرتی رہی۔ ان مطالب میں اصل ممدوحین کو پسِ پشت ڈال کر آیتوں کی نسبت دوسروں سے دی جانے لگی۔ مثال کے طور پر مباہلے میں جانے والوں کے علاوہ اہلِ بیت میں ازواج اور دوسرے سب لوگ شامل کئے گئے جن میں بنی اُمیّہ کو خصوصیت حاصل ہے بلکہ اگر اس توسیع پسندی کو ڈھیل دی جائے تو اس میں تمام اُمّت آجاتی ہے۔

حدیث سازی کی اس دُھوم دھام میں یہ فیصلہ ناممکن ہے کہ کون کس پر بازی لے گیا۔ جامعین کا ذخیرہ اتنا بتاتا ہے کہ علیؑ کا کوئی شرف ایسا نہیں ہے جو دوسروں کو نہ ملا ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خود آنحضرتؐ کے طُرّہ ہائے امتیاز بھی آپس میں منقسم ہو گئے۔

حضورؐ کو اہلِ عرب نے صادق و امین مانا تھا تو بعد میں صدیق و امین سامنے آگئے ــــــ لیکن ہمارے خیال میں ابو عبیدہ بن الجراح کو امین الامت کا لقب اس لئے دیا گیا تھا کہ علی شبِ ہجرت سے امین رسالت قرار پا گئے تھے۔

حیرت بالائے حیرت اس پر ہوتی ہے جب خالد بن ولید کو ید اللہ اور لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار کے مقابلے پر سیف اللہ لکھا جاتا ہے، حالانکہ انہوں نے جنگِ اُحد کے بعد اسلام قبول کیا اور بعد کی کسی جنگ میں کوئی کارِ نمایاں انجام نہیں دیا۔ فتح مکہ کے وقت حضورؐ نے ایک مہم پر بھیجا تھا تو ذاتی عداوت میں ایک قبیلے کو تہہ تیغ کر دیا تھا اور حضورؐ نے ان کے فعل پر باری تعالیٰ سے پناہ مانگی تھی۔

اس کے بعد ایک سال میں کون سا کارِ نمایاں انجام دیا کہ سیف اللہ بن گئے۔

ابن عرفہ المعروف بہ نطفویہ کا شمار بزرگ ترین علماء و محدثین میں ہوتا ہے، آپ

اپنی کتاب تاریخ میں ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

"صحابہ کے فضائل کی اکثر جھوٹی روایتیں بنو امیہ سے تقرب حاصل کرنے کے لئے گڑھتے اور بناتے تھے۔ اس لئے کہ بنو امیہ صحابہ کے لئے جھوٹی حدیثیں گڑھوا کر اور رواج دے کر یہ گمان کرتے تھے کہ اس سے بنو ہاشم کی توہین و تذلیل ہوتی ہے"

پھر ایک سب سے بڑا ستم یہ ڈھایا کہ راویوں میں ہمارے آئمہ کرام کا نام لیا جانے لگا کہ فلاں امام نے یہ حدیث بیان کی۔ وہ تو غنیمت ہے کہ اکثر متعصب جامعین نے ان حدیثوں کو لیا ہی نہیں جن کی نسبت اماموں سے ہے۔ بعض نے کچھ حدیثیں شامل کر لی ہیں تو ہم انہیں بغیر تحقیق کے معتبر نہیں سمجھتے۔

میزان، سیرۃ النعمان، آثارِ مرفوعہ، مشکوٰۃ اور صحیح مسلم کی رو سے اتنی حدیثیں وضع کی گئیں جن کا شمار مشکل ہے۔ حضرت ابوہریرہ قدیم فنکار تھے۔ انہیں اس فن میں مہارت تامہ حاصل تھی لیکن بعض دوسرے بھی ان سے پیچھے نہیں رہے۔ ابو سعید بصری سے ۳۰۰، احمد جوئباری سے ایک ہزار، احمد بن محمد سے ۵۰۰، احمد بن محمد بن فضل سے تین ہزار، جعفر بن زہیر سے چار سو، عبدالرحیم بن حبیب فاریابی سے ۵۰۰، عبدالکریم بن ابی العوجانہ سے چار ہزار، عمر بن جارون بلخی ستر ہزار بزرگا زندیق سے چودہ ہزار احادیث منقول ہیں۔

احمد بن محمد بن عمر کو حدیثیں مسخ کرنے میں ملکہ حاصل تھا اور بعض ایسے تھے جو فی البدیہہ موقع کے لحاظ سے گڑھ لیا کرتے تھے، جیسے حسن بن عمر نخعی۔ سعد بن طریق، زید بن رفاع کذاب، محمد بن عمر واقدی۔ یہ صنعت اس زمانے میں انتہائی عروج پر تھی اور اصل احادیث کے الفاظ اتنی روانی سے بدلے جاتے تھے کہ صبح کو جو حدیث سُنائی گئی، شام کو اس حدیث کے الفاظ بدل گئے۔ اس لئے جامعین احادیث کو بڑی دشواریاں پیش آئیں اور حدیثِ ثقلین کئی کئی طرح سے بیان ہو گئی، کہیں عترتی، کہیں عترتی و اہلِ بیتی ہے، کہیں صرف سُنتی ہے، کہیں سُنتی و عترتی وغیرہ۔ جامع احادیث بے چارہ کیا کرتا، اس نے تو جو پایا وہ نقل کر دیا۔

ان احادیث سے بنی امیہ کا مقصد ضرور پورا ہوا اور آلِ محمدؐ کی شخصیتیں، وقار اور سیرتیں سب مجروح اور مسخ ہوگئیں لیکن ان کے ساتھ توحید، رسالت اور کردار پیغمبرؐ بھی بچ نہ سکے، بالخصوص دینِ اسلام کی ہمہ گیری اور آفاقیت پر وہ کاری ضرب لگی کہ اس کی صداقت پر حرف آگیا۔ فاران کی چوٹی سے بلند ہونے والی آواز نے ضمیرِ انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن اب اس آواز میں اتنی آوازیں مخلوط ہوگئی تھیں کہ وہ پہچانی نہ جاتی۔

خدا کے بارے میں چند حدیثیں قابلِ ملاحظہ ہیں۔

اس کے بیٹھنے سے عرش چرچراتا ہے، جیسے نئی زین کسی سوار کے بیٹھنے سے آواز دیتی ہے۔

خدا تخلیق کائنات سے پہلے ابر میں اُڑتا پھرتا تھا۔

خدا اپنی پنڈلی کھولے گا تو مومنین و مومنات سجدے میں گر جائیں گے۔

دوزخ تشنہ ہے، خدا اپنی پنڈلی ڈالے گا تب وہ بھرے گا۔

ملک الموت موسیٰ کی روح قبض کرنے گئے تو موسیٰ نے اس زور کا طمانچہ رسید کیا کہ ملک الموت کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔

خاتم المرسلینؐ کی عزت افزائی اس طرح کی گئی:۔

میں اور ابوبکر دو گھوڑے تھے۔ دونوں نبوت کے لئے دوڑ رہے تھے میں آگے نکل گیا، مجھے نبوت مل گئی۔ وہ پیچھے رہ گئے تو خلیفہ بنے۔

سیاسی مقاصد کے حصول میں شروع ہی سے تین چیزیں پیشِ نظر تھیں اسلام پیغمبرؐ اسلام اور اہلِ بیتؐ۔

اسلام میں وضعی احادیث کے ذریعہ اتنی لچک پیدا کر دی گئی کہ اس کو اپنے مقاصد کی خاطر کسی بھی سانچے میں ڈھالا جا سکے۔

پیغمبرؐ کی حیثیت ایک عام آدمی کی متعین کی گئی جو کبھی نبی ہوتے تھے اور کبھی دنیا دار بشر ـــــ اس دنیا دار بشر کے لئے جنسیات کی کہانیاں ذخیرۂ روایات

میں پائی جاتی ہیں اور یہی دُنیا دار بشر جواں سال اُمّ المومنین عائشہ رضؓ کے لئے ایسی باتیں کر گزرتا تھا جن کے سبب یورپین مورخین نے مطعون کیا ہے۔

سلسلۂ نبوّت ان پر ختم ہو چکا تھا ورنہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر خلیفہ ہونے کی بجائے نبی ہوتے۔ ایام جاہلیت کی زندگیوں کے داغ نکالنے کے لئے انشقاق صدر کر لیا جاتا اور انہیں طاہر کر کے تختِ نبوت پر بیٹھا دیا جاتا۔

آنحضرتؐ کے کردار کو مسخ کرنے میں یہی نظریہ کارفرما تھا تاکہ اپنی لغزشوں کا جواز پیدا ہو سکے اور اسی لئے حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے روایتوں کے ذریعے ایسے واقعات منسوب کر دیئے گئے جو نبی تو نبی کسی محتاط آدمی میں بھی پائے نہیں جاتے۔

"علقمہ نے عبداللہ کے حوالے سے روایت کی ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ ظہر کی نماز پڑھانے کھڑے ہوئے تو چار کے بجائے پانچ رکعت پڑھا دی۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا تو آپ نے سہو کے دو سجدے ادا فرمائے۔" (۸۰)

"ایک دوسری روایت میں ابوہریرہ سے منقول ہے کہ ایک بار حضورؐ کو چار رکعت پڑھانا تھی مگر آپ نے دو ہی رکعتوں پر نماز ختم کر دی۔ ایک شخص نے ادب کے ساتھ ٹوکا تو آپ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ آپ نے واقعی دو رکعتیں ہی پڑھائی تھیں؟ حاضرین نے تصدیق کی تو آپ پھر نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہو گئے اور مزید دو رکعتیں پڑھا دیں۔"

سہو و نسیان کا یہ مواد شاید اس لئے فراہم کیا گیا کہ حضرت عمر نے کاغذ قلم دوات مانگنے پر فرمایا تھا کہ یہ شخص معاذ اللہ ہذیان بک رہا ہے ایسا شخص جو زندگی میں اتنی بھول کا عادی رہا ہو، وقت آخر میں وہ بہکی بہکی باتیں کر سکتا ہے کسی کی غرض کچھ ہو، روایتیں لاکھوں گڑھ لی جائیں لیکن ہمارا نبی ہر خطا و نسیان سے پاک تھا۔ اس سے غلطی تو غلطی ترک اولیٰ کا امکان بھی نہ تھا اور نہ ہم ایسی بے ہودہ روایات کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ ہماری روایت کا سلسلہ سیدھا

اور صاف ہے اور درایت کا اصول بالکل واضح۔

خدا مبارک کرے انھیں روایات کا یہ جنگل، جنھوں نے اس کا التزام کیا، نبی کی سیرت کو مجروح کر کے آپ کے اہلِ بیت پر دستِ ستم دراز کیا اور وہ سب کچھ پایا جس کی انہیں آرزو تھی۔

بنی اُمیّہ اور معاویہ کا مقصد اولیں حصولِ خلافت تھا یا زائد سے زائد یہ کہ اولادِ رسُول کو اتنا پریشان حال اور بدنام کر دیا جائے کہ وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے لیکن بڑا ظلم ڈھایا انہوں نے کہ توحید میں شرک شامل کر دیا اور سیرتِ رسُول کو اتنا بدنما بنا دیا کہ وہ ایک بلند کردار آدمی بھی باقی نہ رہے۔ (۸۱)

پیغمبر اسلام کو معراج جسمانی نہیں ہوئی۔

آپ میں جنسی ہوس اس درجہ تھی کہ شب و روز اپنی گیارہ بیویوں کے پاس جاتے تھے۔

آپ کے دل پر اکثر پردے پڑ جایا کرتے تھے۔

آپ کے باپ دادا سب کافر تھے۔

ابوطالب بالکل مفلس تھے۔

علیؑ نے عثمان کو قتل کیا۔

علیؑ و فاطمہؑ نماز صبح ادا نہیں کرتے تھے۔

امام حسنؑ کی بے شمار بیویاں تھیں۔

ایسی ہی بے شمار حدیثیں ہیں جن کو شہرت دے کر ہادیٔ برحق اور ان کے نائبین کی سیرتوں کو آلودہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا خمیازہ آج مسلمانوں کو بھگتنا پڑتا ہے اور ہر دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر کیچڑ اچھلتی رہتی ہے۔

ظلم کا طوفان

امام حسن علیہ السلام نے شرائط صلح میں ہر بات کا تحفظ کر لیا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ خلافت سے دستبرداری کے بعد معاویہ کی دشمنی ختم ہو جائے گی اور کسی کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے گا مگر محسوس ہوتا ہے کہ بات صرف خلافت کی نہ تھی بلکہ دشمنی تھی، اس صداقت سے جو رسولؐ سے ان کی اولاد میں منتقل ہوئی تھی اور عداوت تھی اس نسل کی خون سے جو رسولؐ کے بعد ان کی اولاد کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اس لئے معاویہ نے خلافت پاتے ہی ہر علاقے میں جابر اور ظالم عمال کو متعین کیا اور انہوں نے جاتے ہی محبانِ اہلِ بیت کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ، زیاد بن سمیہ کو بصرہ اور ابوہریرہ کو مدینہ کا گورنر بنایا گیا اور زیاد کی مدد کے لئے سمرہ بن جندب کو مقرر کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی عموماً ایسے ہی لوگ بھیجے گئے جو دشمنِ آلِ رسولؐ تھے۔

حضرت ابوہریرہ تاریخ کی مسلّمہ شخصیت ہیں آپ ابتداً ایک فلاکت زدہ یہودی تھے۔ ۷ھ میں اسلام لائے۔ ساڑھے تین سال حضورؐ کا زمانہ دیکھا۔ اتنی مختصر سی مدّت میں بے گنتی اور بے شمار حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔ ۲۱ھ میں حضرت عمر نے آپ کی کارگزاری پر بحرین کا حاکم بنا دیا تھا مگر خیانتِ مجرمانہ کے باعث معزول ہوئے پھر معاویہ نے آپ کے جوہرِ قابل کی قدر دانی کے صلے میں مدینے کی امارت سونپ دی۔ آپ کے ہاتھ سادات کے خون میں تو نہیں رنگے لیکن دروغ بیانی سے حق و صداقت کا اتنا خون ہوا کہ تاریخ اسلام آج بھی آپ کے نام پر کراہنے لگتی ہے۔

زیاد ایک پیشہ ور کنیز سمیہ کا بیٹا تھا جس کو ابوسفیان نے گھر ڈال لیا تھا مگر زیاد کو اپنا بیٹا تسلیم نہیں کیا تھا۔ لہٰذا عام طور پر خیال کیا جاتا کہ وہ بنی امیہ کا دشمن ہے اور ان کے ہاتھوں بک نہیں سکتا۔ امیرالمومنین نے بے خطر سمجھ کر اس کو امارت کے عہدے پر فائز کر دیا تھا ——— حضرت معاویہ نے سیاسی مصلحت کے تحت اپنا بھائی تسلیم کر لیا اور کرفہ اس کے سپرد کر دیا۔

شروع میں مغیرہ بن شعبہ کوفے کا گورنر تھا۔ اس نے سینکڑوں علی والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے وظائف بند کر دیئے ــــــ وہ علیؑ اور ان کی اولاد پر تبرا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ گالیاں بھی دیتا تھا۔ معاویہ کسی بات پر اس سے ناراض ہو گیا تو اس کو بصرہ کے بجائے کوفے کا گورنر بنا دیا اور بصرے میں سمرہ بن جندب با اختیار ہو گیا۔

زیاد کوفے کے ہر شیعہ کو جانتا تھا۔ اس نے پہنچتے ہی ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ محبانِ علیؑ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر گرفتار کیا، کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے، کسی کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اندھا کر دیا کسی کو زندہ دفن کر دیا، کسی کو گھر میں آگ لگا کر جلا ڈالا، ظلم کی کوئی حد اس نے اُٹھا نہ رکھی۔ قید خانے شیعوں سے بھر دیئے اور جو بچ گئے انہیں شہر بدر کر دیا۔ کوفہ و بصرہ میں مجموعی طور پر ایک لاکھ پچاس ہزار اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ بدلہ دیا زیاد بن ابوسفیان نے علیؑ کے حسنِ اخلاق کا۔

بصرے میں سمرہ بن جندب زیاد کا ماتحت تھا وہ زیاد سے کم ظالم نہ تھا اس نے آٹھ ہزار آدمی قتل کئے۔ بُسر بن ارطاۃ نے تیس ہزار شیعوں کو قتل کر کے معاویہ کی خوشنودی حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے عراق و شام اور عرب میں ہر جگہ حُبِ علی گردن زدنی قرار پا گیا۔ یہی وہ حالات تھے جہاں سے تقیہ کی ضرورت پیدا ہونے لگی۔

شیعوں کے قتل اور گرفتاری کے لئے معاویہؓ نے اپنے عمال کو سخت تاکید کی تھی لہٰذا کسی جگہ کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ زیاد نے عبداللہ بن ہاشم مرقال کو گرفتار کر کے دمشق بھیجا۔ جمیل بن کعب ثعلبی رئیس قبیلہ ربیعہ پکڑ کر لائے گئے۔ جاریہ بن قدامہ تمیمی پابہ زنجیر کر کے بصرہ سے لائے گئے۔ معاویہ نے ایک ایک کو بھرے دربار میں بُلایا۔ سخت کلامی کی نوبت آئی۔ تشدد کا ہر حربہ استعمال کیا گیا مگر ان میں سے کسی نے محبت علیؑ سے مُنہ موڑنے کی حامی نہیں بھری۔ آخر میں تنگ آ کر معاویہ نے وقفے وقفے سے انہیں قتل کر دیا۔ انہیں میں صعصعہ بن صوحان عبدی بھی تھے آپ

شروع میں مغیرہ بن شعبہ کوفے کا گورنر تھا۔ اس نے سینکڑوں علی والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے وظائف بند کر دیئے ــــــ وہ علیؑ اور ان کی اولاد پر تبرا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ گالیاں بھی دیتا تھا۔ معاویہ کسی بات پر اس سے ناراض ہوگیا تو اس کو بصرہ کے بجائے کوفے کا گورنر بنا دیا اور بصرے میں سمرہ بن جندب با اختیار ہوگیا۔

زیاد کوفے کے ہر شیعہ کو جانتا تھا۔ اس نے پہنچتے ہی ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ محبانِ علیؑ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر گرفتار کیا، کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے، کسی کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اندھا کر دیا کسی کو زندہ دفن کر دیا، کسی کو گھر میں آگ لگا کر جلا ڈالا، ظلم کی کوئی حد اس نے اٹھا نہ رکھی۔ قید خانے شیعوں سے بھر دیئے اور جو بچ گئے انہیں شہر بدر کر دیا۔ کوفہ و بصرہ میں مجموعی طور پر ایک لاکھ پچاس ہزار اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ بدلہ دیا زیاد بن ابوسفیان نے علیؑ کے حسنِ اخلاق کا۔

بصرے میں سمرہ بن جندب زیاد کا ماتحت تھا وہ زیاد سے کم ظالم نہ تھا اس نے آٹھ ہزار آدمی قتل کئے۔ بُسر بن ارطاۃ نے تیس ہزار شیعوں کو قتل کر کے معاویہ کی خوشنودی حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے عراق و شام اور عرب میں ہر جگہ حُبِ علی گردن زدنی قرار پاگیا۔ یہی وہ حالات تھے جہاں سے تقیہ کی ضرورت پیدا ہونے لگی۔

شیعوں کے قتل اور گرفتاری کے لئے معاویہؓ نے اپنے عمال کو سخت تاکید کی تھی لہٰذا کسی جگہ کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ زیاد نے عبداللہ بن ہاشم مرقال کو گرفتار کر کے دمشق بھیجا۔ جمیل بن کعب ثعلبی رئیس قبیلہ ربیعہ پکڑ کر لائے گئے۔ جاریہ بن قدامہ تمیمی پابہ زنجیر کر کے بصرہ سے لائے گئے۔ معاویہ نے ایک ایک کو بھرے دربار میں بُلایا۔ سخت کلامی کی نوبت آئی۔ تشدد کا ہر حربہ استعمال کیا گیا مگر ان میں سے کسی نے محبت علیؑ سے مُنہ موڑنے کی حامی نہیں بھری۔ آخر میں تنگ آکر معاویہ نے وقفے وقفے سے انہیں قتل کر دیا۔ انہیں میں صعصعہ بن صوحان عبدی بھی تھے آپ

جلاوطن کر دیئے گئے۔ عالم غربت میں موت کو لبیک کہہ گئے ـــــــ ایک طویل فہرست ہے علیؑ کے ان سرفروشوں کی جنہوں نے ننگی تلواروں کی چھاؤں میں بھی حُبّ علی کے نعرے بلند کئے۔ حجر بن عدی ان میں ایک درخشاں نام ہے۔

کوفہ میں زیاد کا قتل عام جاری تھا مگر وہ اس قدر چالاک تھا کہ کمزوروں کو چھانٹ چھانٹ کر قتل کر رہا تھا۔ حجرؓ کی طرف اس نے مصلحتاً دست ستم دراز نہ کیا تھا۔ ایک دن اس نے حجرؓ کی موجودگی میں حضرت علیؑ کے لئے گستاخانہ الفاظ استعمال کئے۔ حجر سے ضبط نہ ہو سکا، آپ نے بھرے مجمع میں اس کو ملامت کی زیاد نے معاویہ کو لکھ بھیجا اور معاویہ نے حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا مگر حجر کوئی تر نوالہ نہ تھے جن کو زیاد چٹ کر جاتا۔ مقابلے کی نوبت آگئی حجر کے ساتھیوں نے محمد بن اشعث کوتوال کے چھکے چھڑا دیئے۔ آخر امان دینے کا فریب کر کے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ گیارہ آدمی آپ کے ساتھ پکڑے گئے۔

ارقم بن عبداللہ کندی، شریک بن شداد حضرمی، صیفی بن شبل۔ قبیصہ بن ضبیعہ عبسی، کریم بن عفیف خشعمی، عاصم بن عوف بجلی۔ ورقا بن سمی بجلی، کدام بن حیان عبدالرحمٰن بن حسان عنزی، محرز بن شہاب، عبداللہ بن حربہ سعدی۔

زیاد نے وعدہ خلافی کر کے ان کو دمشق بھیج دیا، پھر دو آدمی اور گرفتار کئے عتبہ بن اخنس اور سعید بن غزان ہمدانی ان دونوں کو بھی ان کے بعد روانہ کر دیا معاویہ نے ان سب کے لئے ہدایت کی کہ جو علیؑ اور اولادِ علیؑ پر لعنت کرے اس کو چھوڑ دیا جائے باقی لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔

حجر بن عدی صحابی رسولؐ تھے اور صحابی امیرالمومنینؑ بھی۔ وہ محبت علیؑ کو کیا چھوڑتے، انہوں نے سخت جوابات دیئے اور واجب القتل قرار پائے مگر ارقم بن عبداللہ کندی، کریم بن عفیف خشعمی، ورقا بن سمی بجلی، عبداللہ بن حربہ سعدی عتبہ بن اخنس، سعید بن غزان ہمدانی اور عبدالرحمٰن بن حسان عنزی کو اہل دربار کی سفارش پر معاویہ نے واپس بلا لیا۔ ان میں عبدالرحمٰن کو زیاد کے پاس واپس بھیج

دیا گیا۔ اس نے انہیں زندہ گڑوا دیا۔ باقی لوگوں کو معاویہ نے رہا کر دیا کیونکہ ان کے لئے سفارش کرنے والوں نے کہا تھا کہ وہ علیؑ کی مدح نہ کریں گے۔ حجر اور ان کے چھ ساتھیوں نے رات بھر نمازیں پڑھیں اور صبح کو ایک ایک کرکے قتل کر دیئے گئے ـــــ خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک باطن پر!

"حضرت حسنؒ بصری فرماتے ہیں :۔ حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مُہلک ہو۔ ایک ان کا اُمّت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا، درآنحالیکہ اُمّت میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے، ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا، ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا تھا۔ تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں۔ چوتھے، ان کا حُجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا۔" (۸۲)

حُجر کی وصیت کے مطابق ان کی ہتھکڑیاں، بیڑیاں اتاری نہیں گئیں اور نہ غسل و کفن دیا گیا بلکہ اسی حالت میں دفن کر دیا گیا۔

جناب عمرو بن حمق خزاعی بھی اسی دَور کے شہیدوں میں ہیں۔ کہا جاتا ہے حضرت سلمانؓ کا جو درجہ دربارِ رسالت میں تھا وہی درجہ حضرت عمروؓ کا بارگاہِ امیرالمومنین میں۔ مرزع نامی بزرگ بھی شہیدوں کی طویل فہرست میں شامل ہیں جنہوں نے علی کی محبت میں جان دینے کی ریت قائم کی۔ اوفی بن حصین کو زیاد نے بے دردی سے قتل کیا۔ عبداللہ بن یحییٰ حضرمی گوشہ نشین ہو گئے تھے مگر معاویہ نے گرفتار کرکے قتل کرا دیا۔ محمد بن حذیفہ دمشق کے قید خانے میں ڈال دیئے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

سب سے زیادہ محیر العقول یہ واقعہ ہے کہ دربار شام کی مغنیہ نے قتلِ علیؑ کے جشن میں گانے سے انکار کردیا تھا جب اس کو دُرّے لگائے گئے تو اس نے فی البدیہہ گانا شروع کردیا۔

"حرب کے بیٹے معاویہ کو بتا دو کہ ہمیں مطعون کرنے والوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک نہ پہنچے۔ اس نے ایسے شخص کو قتل کیا ہے جو بہترین خلق تھا۔ ماہِ رمضان میں ہمیں دردمند کیا۔"

ایک مغنیہ کا یہ عمل اتنا گستاخانہ تھا کہ اس کے سر پر ایک لکڑی کی شدید ضرب لگائی گئی جس نے بھیجے کو پاش پاش کردیا اور مدحِ علیؑ کے جرم میں وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ مغنیہ کے کس گوشۂ قلب میں عقیدتِ علیؑ کی شمع روشن تھی جس کی تجلیاں اچانک پھوٹ پڑیں اور اس مومنہ کے چراغِ حیات کو گل کرگئیں۔ ایسے ہی کتنے لوگ تھے جو دلوں میں محبت اہلِ بیت کے خزانے کو چھپائے ہوئے تھے اور دشمنانِ دین کو اس کا علم نہ تھا۔

بات صرف مردوں ہی کی نہیں ہے۔ عورتیں بھی اس مشقِ ستم سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ انھیں بھی خبر ملنے پر پکڑ بلایا جاتا، سرزنش کی جاتی اور سزائیں دی جاتیں لیکن اس آزمائش میں بڑی لذت تھی۔ خواتین بھی ہنستی مسکراتی اس کو جھیل جاتیں۔ زرقا بنت عدی، اُم البراء بنتِ رضوان، دارمیہ حجونیہ کے نام تاریخ نے محفوظ کرلئے ہیں۔ انھوں نے موت سے بے نیاز ہوکر امیر شام کو دنداں شکن جوابات دیئے کہ حمیت نام کی کوئی چیز اس میں ہوتی تو پھر کسی عورت کو کبھی نہ بلاتا لیکن ایسا ہی ہوتا تو معاویہ رسولؐ کی قدسی صفت بیٹی کے خلاف زہر کیوں اُگلتا۔

رواجِ تبرّا

صلحِ حسنؑ کے بعد شیعوں کے خون کی اچانک ارزانی توقع کے بالکل خلاف تھی کیونکہ عہد نامے کی بنیادی شرط یہی تھی مگر معاویہؓ نے کوئی وعدہ پورا کرنے

کے لئے تو کیا نہیں تھا۔ یہی صورت حضرت علیؑ پر سب و شتم کی بھی ہوئی۔ امیر شامؔ نے اس کو بند کرنے کے بجائے کھلے عام بُرا کہنے کے احکام جاری کر دیئے۔ اب عراق و شام کی ہر مسجد اور ہر منبر پر حمد باری کے بعد علیؑ کی منقصت کی جاتی اور ایک اندازے کے مطابق بہتر ہزار منبروں کے خطبات میں علیؑ پر سب و شتم کو داخل عبادت کر لیا گیا تھا۔ زیاد بن ابیہ اور مغیرہ بن شعبہ کے سے گرگ باراں دیدہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر گالیوں پر اُتر آتے۔

ایک طرف یہ عمل ثواب میں شمار ہوتا، دوسری طرف اگر کسی کی زبان سے مدح علیؑ میں ایک لفظ بھی نکل جاتا تو وہ مستوجب عذاب ٹھہرایا جاتا۔ اس کی زبان گدّی سے کھینچ لی جاتی اور کبھی کبھی تختہ دار پر اس کے تڑپنے کا منظر بھی دکھایا جاتا۔ یہ دونوں عمل حکومت کے ضابطے میں داخل تھے چنانچہ

"جب معاویہ نے کوفہ کے لوگوں سے بیعت لینا شروع کی تو حضرت علیؑ سے برأت اور بیزاری پر بیعت لی۔ یہی اس کا معمول تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر بنی تمیم کے ایک شخص نے کہا: امیرالمؤمنین! ہم زندوں کی اطاعت کریں گے مگر مُردوں سے برأت نہیں کریں گے اس پر معاویہ زیاد کی طرف متوجہ ہوا، اور بولا۔ اس شخص کو اچھائی کی وصیّت کر۔" (۸۳)

زیاد نے اس کو بیک ضرب شمشیر قتل کر دیا۔ ایسے بہت سے واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آتے اور جانوں کے خوف سے لوگوں نے اپنی زبانوں پر تالے ڈال لئے۔

اس تشدّد کے دوش بدوش ایک زبردست پابندی یہ لگا دی گئی کہ کوئی اپنے بچوں کے نام اولاد رسُولؐ کے ناموں پر نہ رکھے۔ علیؑ کے چاہنے والوں کا یہ کڑا امتحان تھا۔ یا دل نخواستہ انہوں نے اس میں بھی تقیّہ شروع کر دیا۔ بعض عقیدت مندوں نے گھر کا نام کچھ اور باہر کا کچھ اور نام رکھا مگر اس میں بھی پکڑے

گئے۔ آخر زندگیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ بھی کرنا پڑا ــــــ شیعوں کی گواہی اب بھی ناقابلِ اعتبار تھی لہٰذا وہ عدالت میں پیش ہونے کے خطرے سے بچے ہوئے تھے۔

اب ہر طرف بنی امیہ کا دور دورہ تھا، کوفہ، بصرہ اور تمام وہ جگہیں جو کبھی شیعان علیؑ سے بھری ہوئی تھیں وہ سب خالی ہو چکی تھیں۔ اِکا دُکا لوگ کونے کھدروں میں پڑے ہوئے تھے جو کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتے۔ مدینے میں امام حسن علیہ السلام نے تقریباً گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی مگر رُشد و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگ اب بھی فیضانِ علم سے بہرہ ور ہوتے تاہم خانوادۂ رسالت کو حکومت سے کوئی سروکار نہ تھا

حضرت معاویہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ انہوں نے آپ کو کئی بار بلوایا تاکہ بھرے دربار میں ذلیل کریں مگر پیغمبرؐ کے نواسے اور علیؑ کے بیٹے سے کون بازی لے جاسکتا تھا جس نے جو کچھ کہا، اس کا جواب پایا۔

رہ گیا قتل ہونے کا اندیشہ تو امامؑ کو اس کی فکر کیوں ہوتی، وہ اپنے لئے تو زندہ نہیں تھے۔ آپ کی ہر سانس خدا اور اس کے دین کے لئے تھی۔ اس کے باقی رہنے یا ختم ہو جانے سے امامؑ کا کوئی تعلق نہ تھا لہٰذا آپ بے فکر جاتے اور بے خطر چلے آتے

اس طرح نو دس سال میں آپ نے دمشق کے کئی سفر کئے اور ہر سفر میں رموزِ دین کو منکشف کرتے رہے۔ لوگوں کو پاکبازی کی زندگیاں بسر کرنے کی تلقین فرماتے رہے۔ آخر وہ وقت آگیا کہ حیاتِ مستعار اپنے انجام کو پہنچی۔ معاویہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کے راستے کا کانٹا صاف ہو گیا تھا۔ رہ گئے تھے حسینؑ تو ان کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ امیر شام نے کر لیا تھا۔ البتہ ایک ہستی باقی تھی جو کسی وقت بھی ان کے مقابلے میں آسکتی تھی اور وہ ہستی تھی اُم المومنین حضرت عائشہؓ کی، جن سے وہ ڈرتے بھی تھے اور چوکنا بھی رہتے تھے۔

استقرارِ سلطنت کے لئے قتل و خونریزی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ جابر و ظالم حکمراں اس سے پہلے اور بعد ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ سکندر و دارا، چنگیز و تیمور جیسے کتنے ہی فرمانروا تاریخ کے شعور اور شعور سے پہلے ملتے ہیں مگر وہ پیغمبرؐ

برحق وعادل کے سجادہ زہد پر بیٹھنے کے دعویدار نہیں تھے۔ معاویہؓ پر نکتہ چینی تو اس لئے کی جاتی ہے کہ ان کا ہر سوءِ عمل اسلام سے منسوب تھا اور اسلام ان کے کرتوت سے بدنام ہو رہا تھا۔

یوں تو وہ ایک باصلاحیت حکمران تھے۔ انھوں نے ایران اور دوسرے علاقوں کی بغاوتوں کو بڑی حکمتِ عملی سے فرد کیا۔ سندھ، بلوچستان، مکران اور ترکستان کے بعض علاقوں میں حضرت علی علیہ السلام نے اسلام پھیلایا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے ۴۴ھ میں مہلب بن ابی سفرہ کو متعین کیا پھر عبداللہ ابن عامر کو بھیجا۔ اس کے بعد عباد ابن زیاد کو۔ ان لوگوں نے کافی مقامات کو مسخر کیا اور جو علاقے باغی ہو رہے تھے، انہیں از سرِ نو قبضے میں کیا اور ایک دانشمندی یہ بھی کی کہ یہاں ابوسفیان کے بجائے محمدؐ الرسول اللہ کا نام روشن کیا۔

شمالی افریقہ میں کئی نئے علاقے مفتوح کئے۔ رومیوں کا معرکہ حضرت معاویہؓ کا کارنامہ ہے۔ یزید بن معاویہ بھی اس جنگ میں شریک تھا۔ اسی جنگ میں حضرت ابوایوبؓ انصاری نے داعی اجل کو لبیک کہا اور قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے دفن کئے گئے جہاں ان کا نام پیغمبرؐ عرب کے دین کو متعارف کراتا ہے۔

تیسرے امام

(امیرالمومنین) حضرت امام حسین ابن علی علیہ السلام

ربیع الاول سنہ ۵ھ تا ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ

سبطِ اصغر

سرورِ کائنات کے چھوٹے نواسے کا نام "حسین" تھا۔ وصی موسیٰ جناب ہارون کے چھوٹے بیٹے شبیر کی رعایت سے آپ کو شبیرؑ بھی کہا جاتا۔ آپ کی ولادت ۳ شعبان سنہ ۴ھ کو مدینے میں ہوئی حضورؐ نے آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا۔ کان میں اذان کہی اور "حسین" نام رکھ دیا جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا تھا۔

پیدائش سے قبل اور پیدائش کے بعد بہت سے معجزات آپ کی ذاتِ گرامی سے منسوب ہیں جن میں جبرئیلؑ کا خاکِ کربلا لاکر دینا متفق علیہ ہے۔ آپ نے وہ مٹی ایک شیشی میں بھر کر اُم سلمہؓ کو دے دی کہ جب یہ سُرخ ہو جائے تو سمجھ لینا کہ میرا بیٹا قتل ہو گیا ——— کہا جاتا ہے کہ دونوں بھائیوں کے چہروں سے ایسی روشنی ساطع ہوتی تھی کہ جدھر جاتے، رات کا اندھیرا کٹتا جاتا تھا۔

حالتِ نماز میں نواسوں کا پشت پر چڑھنا اور حضورؐ کا سجدے کو طول دینا مشہور واقعہ ہے۔ کاندھے پر چڑھانا اور طرح طرح سے ناز برداری کرنا مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ نواسوں سے متعلق حضورؐ کی کتنی ہی حدیثیں ہیں۔ معراج میں حضورؐ نے بابِ جنت پر ایک طلائی نوشتہ ملاحظہ فرمایا تھا۔

"اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں ہے، محمدؐ اللہ کے حبیب ہیں، علیؑ اللہ کے ولی فاطمہؑ اللہ کی کنیز ہیں حسنؑ اور حسینؑ اللہ کے برگزیدہ ہیں جس نے ان سے بغض کیا، اُس پر خدا کی لعنت ۔"

روایت ہے کہ جنابِ آدمؑ کی توبہ جن اسماء کے توسّط سے قبول ہوئی تھی آدمؑ نے اُن کے بارے میں باری تعالیٰ سے پوچھا تھا تو اُنہیں جواب ملا تھا۔

"یہ سب افضل ترین مخلوق ہیں : یہ محمدؐ، میں محمود، میرے نام سے مشتق ہیں محمدؐ۔ یہ علیؑ، میں علی عظیم، مجھ سے نکلا ہے نام علیؑ کا۔ یہ فاطمہؑ، میں فاطر ارض و سماء، میں نے ان کو اپنے نام کے حروف سے منتخب کیا۔ یہ حسنؑ و حسینؑ، میں محسن، دونوں مشتق ہیں میرے نام سے اور دونوں بہترین کائنات ہیں۔ عذاب و ثواب ان کی رضا اور ناراضگی پر منحصر ہے۔" (۸۴)

مختصر یہ کہ آپ نانا کی آنکھ کا تارا، ماں کے دل کا چین، باپ کے جگر کا ٹکڑا تھے اور پورے خاندان میں ہر دلعزیز تھے مگر آپ کو چھوٹی سی عمر میں سب کچھ دیکھنا پڑا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی گزر نہ سکتا تھا۔

نیرنگئ زمانہ

آپ کا سن بمشکل پانچ چھ سال کا ہوگا کہ اپنی آنکھوں سے نانا کو دفن ہوتے دیکھا۔ پھر آپؐ کی قبر پر کھڑے ہو کر آخری سلام کیا۔ اس کے بعد وہ مناظر بھی سامنے آئے کہ اپنوں کے بجائے غیر، نانا کے منبر پر قدم کش ہوئے۔ ماں نے دن رات گریہ و زاری کی۔ باپ نے وقت کے شدائد برداشت کئے مگر مُنہ سے اُف نہیں کی حسینؑ بھی بڑے بھائی کی طرح خاموش رہے۔ پابند شریعت تھے بلکہ عین شریعت تھے اس لئے وقتی اقتدار کے بعد جب عظیم المرتبت باپ کو ضربت لگی، تب بھی دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹا لیکن پائے استقامت میں فرق نہ آیا، پھر بھائی کے جگر کے لوتھڑے طشت میں گرتے دیکھے۔ ان سب مشاہدات نے صورتِ حال آئینہ کر دی تھی۔

۴۶ سال کی عمر میں آپ پر اتنی ذمہ داریاں آپڑی تھیں جن کو کوئی پیغمبر ہی اٹھا سکتا تھا۔ آپ فخرِ انبیاء کے بیٹے تھے۔ بڑی متانت کے ساتھ آپ نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی اور دل ہی دل میں کہا۔

"پروردگار! تو مجھے ہر حال میں ثابت قدم پائے گا ـــــ تو سہی جو اپنے صبر و تحمل سے تیرے عرش کو ہلا کر نہ رکھ دوں!"

وقت کا دھارا

چہار جانب ظلم و ستم کی گرم بازاری تھی۔ شیعانِ علی کا خون اتنا ارزاں تھا کہ معاویہ کے چند سکّوں میں بک جاتا تھا۔ وضعی روایتوں سے نہ صرف نبیؐ اور آلِ نبیؐ کی سیرت ہی بگاڑ دی گئی تھی بلکہ اسلام کی صورت میں بھی اتنا ردّ و بدل ہو گیا تھا کہ اس میں شرک و الحاد کے داغ پیدا ہو گئے تھے جن کا پرتو آج بھی پایا جاتا ہے امام حسینؑ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ماضی پر بھی آپ کی نگاہ تھی۔ علیؑ نے مفادِ خلائق میں پہلے خلافت ظاہری سے قطع نظر کی پھر عوام الناس کے اصرار پر اُسے قبول کیا اور نیابتِ پیغمبرؐ کا حق ادا کرتے رہے۔ امام حسنؑ فلاح انسانیت کی خاطر اس سے دست بردار ہو گئے پھر بھی انہیں زہر پینا پڑا! حسینؑ جانتے تھے کہ ان کا وجود غاصبوں کی آنکھ کا کانٹا بنا ہوا ہے انہیں پدر ذی وقار اور برادرِ عالی مقام سے ہٹ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا مگر منصبِ امامت یہ تھا کہ جب تک ضبط و سکون کے ساتھ اُسے پورا کر سکیں، پورا کرتے رہیں۔ آپ امام حسنؑ کی روش پر جاہ و اقتدار سے بے نیاز اُمّتِ مسلمہ کی ہدایت کر رہے تھے اور جہاں تک ان کی آواز جاتی صحیح اسلام کی تلقین کرتے رہتے۔

حضرت معاویہ بھی اپنے کردار میں پختہ کار تھے۔ انہیں اب ایک ہی فکر تھی کہ خلافت کو اپنی نسل میں موروثی بنا دیں ـــــ شاید وہ رسولؐ کی براہِ راست اولاد میں تھے، حق تھا ان کا اسلام پر ـــــ!

انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے یزید کو سریر آرائے خلافت کر دینے

کا عزم کر لیا تھا جس کے لئے مغیرہ بن شعبہ اور زیاد بن ابیہ بڑا کام کر چکے تھے۔ کوفہ اور بصرہ کی زمین ہموار تھی لیکن بیعت کے مرکزی مقامات مدینہ اور مکہ تھے لہذا معاویہ نے اپنے سارے عمال کو ایک فرمان جاری کیا کہ ہر جگہ یزید کی بیعت لے لی جائے احنف بن قیس اور بعض دور اندیش لوگوں نے مخالفت بھی کی مگر امیر شام نے اسی دن کے لئے تو سب کچھ کیا تھا، وہ باز کیونکر آتے ــــــ مروان نے جب مدینے سے لوگوں کے انحراف کی اطلاع دی تو وہ خود مدینے جانے کے لئے تیار ہو گئے مگر ۵۸ھ میں انھیں مایوس واپس ہونا پڑا۔ لہذا ۵۶ھ میں انہوں نے پھر مدینے کا سفر کیا۔ اب کی وہ تمام آزمودہ حربوں سے لیس ہو کر مدینے پہنچے مگر وہاں اب حربوں کا استعمال خطرے سے خالی نہ تھا لہذا انہوں نے اپنے کیسہ طلب سے صرف رشوت کے پیکان باہر نکالے کیونکہ ان کی کامگاری پر انہیں پورا یقین تھا۔ مقتدر لوگوں میں عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر، حسینؑ ابن علیؑ اور جناب عائشہ رضہ تھیں۔ ان سب نے شدید مخالفت کی۔ حضرت معاویہ نے ڈرایا دھمکایا اور آخر میں سب کو علیحدہ علیحدہ رشوتیں پیش کیں۔

عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے ایک لاکھ درہم تو نہیں لئے مگر خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔
عبداللہ ابن عمر نے پہلے تو ایک لاکھ درہم واپس کئے لیکن بعض شواہد کے مطابق بعد میں قبول کر لئے۔

عبداللہ ابن زبیر خود خلافت کے امیدوار تھے۔ وہ ایسی کسی پیش کش کو قبول کیوں کرتے۔

حسینؑ ابن علیؑ خود معاویہ کو غاصب قرار دیتے تھے تو یزید جیسے بدکردار کو ماں لینے کا سوال ہی کیا تھا۔

رہ گئیں اُم المومنین تو وہ معاویہ پر برس پڑیں۔ انھوں نے معاویہ سے محمد بن ابی بکر، حجرؓ بن عدی اور دیگر صحابیوں کے قتل کا محاسبہ کیا اور کہا :-

"جانشینوں میں سے کسی نے اپنے لائق بیٹوں کو خلافت نہیں دی۔ تم اپنے نالائق اور بدترین بیٹے کو ولی عہد بنا رہے ہو۔ شرم کرنا چاہیئے تمہیں"!

سیاسی ذہن کا معاویہ ایسی جھڑکیوں کا اثر کیا لیتا، وہ اس سے کہیں زیادہ تلخ گھونٹ پی چکا تھا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ ایسے شاطرانہ سکوت کو حلم سے تعبیر کیا جاتا ہے!

لیکن اس سے حضرت معاویہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مخالفین میں حسینؑ ابن علیؑ سے اگر تعرض نہ کیا جائے تو وہ رشد و ہدایت میں لگے رہیں گے مگر اُم المومنین یزید کی راہ میں سد سکندری بھی بن سکتی ہیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ کے لئے ایک منصوبہ بنا لیا اور اگلے دن رات کے کھانے کی دعوت دے دی۔ حضرت معاویہؓ کا دسترخوان پہلے ہی سے مشہور تھا۔ اس لئے کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا۔

وفات اُم المومنین عائشہؓ

اموی مورخین نے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ام المومنین کی وفات کیونکر واقع ہوئی؟ تاہم کئی مورخوں کے قلم رُک نہ سکے۔ انہوں نے لکھ دیا کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے خیمے کی گزرگاہ پر ایک کنواں کھدوا کر اس میں چونا بھروا دیا تھا اور کنویں کو خار و خس سے اس طرح چھپا دیا تھا کہ آنے والا اُسے راستہ ہی سمجھے۔ یہی ہوا کہ جناب عائشہ نے چلتے چلتے اس پر قدم رکھ دیا، یا اس کرسی پر آکر بیٹھ گئیں جو اوپر بچھائی گئی تھی اور کنویں کے اندر جا رہیں، جس کے بعد جسم کا گل جانا ایک لحظے کی بات تھی۔ (۸۵)

ساتھ والیوں کا منہ بند کر دینا امیر شام کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ زبانیں کاٹ دی گئی ہوں یا سونے کی مہروں سے منہ سی دیا گیا ہو۔ پھر بھی کسی نہ کسی کو بھنک مل ہی گئی ــــــــ لیکن حضرت معاویہؓ سے پوچھتا کون؟ وہ تو رات ہی میں کوچ کر گئے تھے۔

حضرت معاویہؓ کا انتقال

دمشق واپس آتے ہوئے وقت راہ میں حضرت معاویہ نے "ابوا" میں قیام کیا۔ رات میں باہر نکلے تو اتفاقاً قریب کی باؤلی میں جھانکنے لگے جس سے ایسی گیس نکلی کہ منہ ٹیڑھا ہو گیا، تمام اعضاء میں لرزہ پڑ گیا۔ تیزی کے ساتھ وہ دمشق کو روانہ ہوئے مگر مرض شدت اختیار کرتا رہا۔ سوتے سوتے اُچھل پڑتے اور مُنہ سے نکلتا: ــــ علیؑ ــــ حجرؓ ــــ عمرو بن حمق ــــ میں نے کیوں قتل کیا!

معاویہ کو جب مرنے کا یقین ہو گیا تو یزید کو بہت سی وصیتیں کیں۔ عبداللہ ابن زبیر سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی اور ہدایت کی کہ خبردار حسینؑ ابن علیؑ سے کوئی تعرض نہ کرنا۔ وہ تیری بیعت نہیں کریں گے۔ پھر ایک وصیت نامہ تحریر کرایا جو یزید کی خلافت کے لئے تھا۔ اس میں لکھوایا کہ یزید عدل و انصاف کرے، اولادِ عثمان کو مقرب بنائے اور جو مخالفت پر کمر بستہ ہو، اس کا قلع قمع کر دے۔

۱۵ رجب یا ۲۲ رجب ۶۰ھ ۸۵ سال کی عمر میں شام کا وہ حکمران اپنے انجام کو پہنچا جس کا جاہ و حشم قیصر و کسریٰ کو مات کر گیا تھا۔

یزید شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں باپ کی تدفین ہوئی جب وہ پلٹ کر آیا تو باپ کی قبر پر جا کر بہت رویا پھر اپنے دنوں کو عید اور راتوں کو شب برات بنانے میں لگ گیا۔

یزید ابن معاویہ

شام کا یہ "تیرہ" رجب ۶۰ھ میں اس تختِ خلافت پر متمکن ہوا جو رحمۃ للعالمین سے منسوب تھا۔ اس کا تقدس ہر طرح پامال ہو چکا تھا پھر بھی اسلام کی روایات اب بھی اس سے وابستہ سمجھی جاتی تھیں ــــ مگر بھلا ہو حضرت معاویہؓ کا کہ انہوں نے اُس تختِ خلافت پر جانتے بوجھتے ہوئے اس بیٹے کو بٹھا دیا تھا جو ایامِ جاہلیت کے ابو سفیان کا پوتا تھا۔

خونریزی کی جن داستانوں کو شام کے تخت و تاج نے جنم دیا تھا، وہ تو یزید

کانسلی ورثہ تھیں۔ اولادِ رسولؐ سے عداوت آبائی طریقت تھی، زہد و تقویٰ سے دشمنی سرشت میں شامل تھی، قساوت و سنگدلی اموی جبلت تھی، شراب کی بدمستی ذاتی خباثت تھی۔ ان حقائق کے باوجود ماننا پڑے گا کہ اس میں لباس و طعام کا ذوق سلیم باپ سے زیادہ تھا اور اس کے دربار کا شاہانہ طمطراق قسطنطنیہ اور مدائن کی شوکت و سطوت کو شرمندہ کر دیتا تھا۔

یزید اگر تخت خلافت پر بیٹھا نہ ہوتا تو عیش پسندی میں سلاطینِ عالم کے لئے آپ اپنی نظیر تھا۔ ادب کا دلدادہ اور حسن و شباب کا گرویدہ تھا۔ ذوق جمال اس بلا کا تھا کہ کسی حسینہ پر ایک نظر ڈال کر ناک نقشے کا تناسب اور اعضائے جسمانی کا آہنگ تاڑ لیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ نفس پروری میں اس کو یہ امتیاز نہ رہتا کہ یہ شعلہ جوالہ اس کی بہن ہے یا ایسی کنیز جو اس کے باپ کی زینت بستر رہی ہے۔

بلاشبہ ایام جاہلیت میں محرمات ہوس کا نشانہ بن جاتی تھیں اور کوئی معترض نہ ہوتا کیونکہ اس حمام میں سب ننگے تھے مگر اب تو اسلام کا پیغام عرب و ایران، مصر و روم ہر جگہ پہنچ چکا تھا اور یزید بن معاویہ بلا دِ اسلام کا نام نہاد جانشین تھا مگر ایسے موقعوں پر وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیتا اور جو پھول اس کو پسند آتا اُسے مسل ڈالتا تھا۔ کون اس کا روکنے والا تھا اور کون اس کو ٹوکنے کی جسارت کر سکتا تھا۔ (۸۶)

تاریخ لاکھ کوشش کرے مگر یزید کی بداعمالیوں کو چھپا نہیں سکتی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہے گی کہ "بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہو کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اسلام کی روح حریت و جمہوریت کو غارت کیا اور مشورہ اجماع امت کی جگہ محض غلبۂ جابرانہ اور مکر و خدع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا نظام حکومت شریعت الٰہیہ نہ

تھا بلکہ محض اغراض نفسانیہ و مقاصد سیاسیہ۔ ایسی حالت میں ضرور تھا کہ ظلم و جبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی اور حق و حریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔" (۸۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ سے اس خیال کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ جو علماء حکومتِ شام سے وابستہ تھے، ان کا سکوت شرعی طور پر مجرمانہ تھا۔ کوئی ایک آواز تو اُٹھتی مگر نا انصافی ہوگی، اگر یہ نہ کہا جائے کہ آواز اُٹھتی تو زبان برشِ شمشیر سے قطع کر دی جاتی اور کشتگانِ اسلام میں ایک یا چند کا اضافہ ہو جاتا۔

تشدّد کے اس طوفان میں محبّانِ علیؑ کا جو عالم تھا، وہ تو تھا ہی لیکن وہ لوگ بھی محفوظ نہ تھے جو جذبۂ دینی کی جرأت رندانہ میں مخالف بن کر زبان بھی ہلا دیتے لہٰذا وقتی طور پر تائید کے سوا تردید کا لفظ ہی لغت سے نکل گیا تھا۔ اس لئے شاہانہ نظام اور رئیسانہ مزاج کی مطلق العنانی بڑھتی رہی اور یزید نے حکم دے دیا کہ مدینے کے ایک ایک آدمی سے بیعت لی جائے اور جو سرتابی کرے، اس کا سر اڑا دیا جائے یا اس کو گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔

ولید بن عقبہ والی مدینہ کو جب یزید کا فرمان ملا تو اس نے عبداللہ ابن زبیر اور امام حسینؑ کو بلا بھیجا۔ ابنِ زبیر تو مکے چلے گئے۔ امام حسینؑ تیس بنی ہاشم کو لے کر ملاقات کے لئے روانہ ہوئے۔ بنی ہاشم باہر ٹھہر گئے۔ امام اندر داخل ہوئے تو ولید نے عزّت کے ساتھ بٹھایا۔ معاویہ کی خبر مرگ سُنائی اور بیعت یزید کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: میں اپنے خیال کا اظہار مجمع عام میں کرنا چاہتا ہوں۔ ولید کل آنے کا وعدہ لے کر آپ کو رخصت کرنے ہی والا تھا کہ مروان بول اُٹھا:

"حسینؑ اس وقت قبضے سے نکل گئے تو پھر ہاتھ نہ آئیں گے ——"

امام حسینؑ کو سنتے ہی جلال آگیا۔ آپ نے بلند آواز میں فرمایا۔

"کس میں دم ہے کہ حسینؑ کو ہاتھ لگا سکے!"

بہادرانِ بنی ہاشم اس آواز پر اندر داخل ہو گئے مگر امام نے سمجھا بجھا کر خاموش

کردیا اور اپنے جاں نثاروں کے ساتھ واپس ہو گئے۔

یزید کا دوسرا حکم جب صادر ہوا کہ حسینؑ کا سر اُتار کر بھیج دے تو عقبہ کا بیٹا بڑے مخمصہ میں پڑ گیا، کیونکہ مدینے میں حسینؑ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا اور تعمیل نہ کرنے میں معزولی یقینی تھی۔ اس لئے اس نے حکمتِ عملی سے کام لے کر امام حسینؑ کو کسی ذریعہ سے اس کی اطلاع کرادی اور امام حسینؑ نے سمجھ لیا کہ مدینہ چھوڑنے کا وقت آگیا۔

کوفہ شیعانِ علیؑ کا گڑھ رہا تھا۔ ظلم سہتے سہتے بچے کھچے مُٹھی بھر لوگ مر مٹنے پر تیار تھے اور امام حسینؑ کے پاس خطوط کے انبار لگ گئے تھے کہ آپ کوفہ آئیں اور ہماری ہدایت فرمائیں۔ امامِ وقت کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری تھی کہ ان کی شرعی تسکین کریں لیکن بڑے بھائی نے جو صراطِ عمل چھوڑا تھا اس کو بھی آپ نظر انداز نہ کر سکتے۔ آپ کا ارادہ کیا تھا؟ یہ تو آپ نے ظاہر نہیں فرمایا، مگر یہ بات مسلّم ہے کہ آپ کا ارادہ جنگ کا نہیں تھا، ورنہ اہلِ بیت کو لے کر وطن سے نہ نکلتے، صرف جوانانِ بنی ہاشم کو ساتھ لے جاتے اور ان حق پسندوں کو بھی جو آپ پر جان دینا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

روانگی کا اعلان کرنے کے بعد آپ کئی مرتبہ نانا کے روضے پر گئے۔ یقیناً فریاد کی ہو گی کہ اُمت چین لینے نہیں دیتی پھر ماں کے مزارِ مقدس پر حاضری دی۔ اس سلسلے میں بہت سی روایتیں ہیں جو موعودہ شہادت کا اشارہ کرتی ہیں۔

عبداللہ ابنِ عباس، محمد حنفیہ اور عبداللہ ابن جعفر اور دیگر بزرگوں نے آپ کو روکا حتیٰ کہ پورے مدینے نے حفاظت کا وعدہ کیا مگر آپ جانتے تھے کہ بنی اُمیہ آپ کا پیچھا نہ چھوڑیں گے۔ وہی ہوا کہ ۲۸ رجب ۶۰ھ کو مدینے سے روانہ ہو کر ۳ شعبان کو مکے پہنچے تو تھوڑے ہی دنوں بعد شام کے جاسوس حاجیوں کے لباس میں اس سرزمین پر وارد ہونے لگے کیونکہ والیٔ مکہ سعید ابن عاص نے مدینہ پہنچ کر آپ کے عزم سے یزید کو مطلع کر دیا تھا اور یزید نے مکے ہی میں آپ کو قتل کرا دینے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

مدینے کا مسافر

امام حسینؑ چار ماہ مکے میں مقیم رہے مگر جب آپ کو یقین ہو گیا کہ حج کے دوران آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے گا تو آپ نے عزم حج کو عمرے میں بدل دیا اور طوافِ کعبہ کر کے ۲ ذی الحج ۶۰ھ کو مکے سے عراق کی طرف روانہ ہو گئے۔

سات آٹھ سال کی ایک بیمار بیٹی فاطمہ صغریٰ کے علاوہ تمام اہل و عیال اور متعلقین آپ کے ساتھ تھے۔ فاطمہؑ کو آپ نے نانی اُمِ سلمہ کے حوالے کیا تھا۔ امیرالمومنینؑ نے اپنے آخر وقت میں سارے پس ماندگان کے ہاتھ امام حسنؑ کے ہاتھ میں دیئے تھے مگر اُم البنین کے بڑے بیٹے حضرت عباس کا ہاتھ امام حسینؑ کے ہاتھ میں۔ عباسؑ امام حسینؑ کے دم کے ساتھ تھے اور تین چھوٹے بھائی عباسؑ کے تابع۔ سارے بیٹے بھانجے، بھتیجے ہم سفر تھے۔ اہلِ مدینہ نے مشورہ دیا کہ جانا ہے تو کہیں اور چلے جائیں عراق نہ جائیں مگر امام حسینؑ شرعی مصلحتوں کو جانتے تھے، پھر آپ حضرت مسلمؑ بن عقیلؑ کو بھی اپنے سفر کی حیثیت سے کوفے بھیج چکے تھے جن کے جواب کا انتظار تھا اور اسی پر منزلِ سفر کا تعین ہو سکتا تھا۔

کوفے کا سفیر

کوفہ کبھی امیرالمومنین حضرت علیؑ کا دارالخلافہ رہا تھا اور اہلبیتؑ کے فدائیوں سے بھرا پڑا تھا مگر جمادی الثانی ۴۱ھ کو صلح حسنؑ کے بعد سے حضرت معاویہ کے قبضے میں آگیا تھا اور اس پر زیاد بن ابیہ کی قاہرانہ حکومت تھی۔ زیاد نے چن چن کر بچوں بوڑھوں سب کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ بچے صرف وہ تھے جن کے ساتھ کسی قبیلے کی طاقت تھی یا جو تقیہ کر کے چھپ گئے تھے۔ ایسے لوگوں کے علاوہ حبِ علیؑ نام کی کوئی شئے کوفہ کیا، اطراف و جوانب میں بھی پائی نہ جاتی لیکن شیعوں کے علاوہ غیر جانبدار لوگ بھی زیاد کا نشانہ ستم بنے تھے۔ اس لئے معاویہ کی خبرِ مرگ گرم ہوتے ہی شیعوں اور ظالمانہ حکومت سے بیزار حلقے نے اطمینان کا سانس لیا۔

اور جب یزید کی بیعت لی جانے لگی تو وہ لوگ، جن کے دل میں ذرا بھی حمیت

اسلام باقی تھی، وہ ذہنی طور پر بغاوت کے لئے آمادہ ہو گئے۔ یہی وہ وقت تھا جب انھیں امیرالمومنین کی صداقت یاد آئی اور دلوں میں احساس پیدا ہوا کہ انھوں نے نبیؐ کی آلؑ سے اچھا سلوک نہیں کیا مگر یہ دودھ کا اُبال تھا اور بہت جلد ٹھنڈا ہو جانے والا تھا۔ پھر بھی ایک وقتی جذبے میں مختلف گروہوں نے حضرت امام حسینؑ کو خطوط لکھنے شروع کر دیئے اور یہ خط تین تین چار چار آدمیوں کے وفد کے ساتھ حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے لگے۔ آہستہ آہستہ خطوط کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔

رسولؐ کا نواسہ پیدا ہی انسانوں کی رہبری کے لئے ہوا تھا۔ اس کی نظر میں معاویہ کا وجود بھی دینی حکومت پر بوجھ تھا، نہ کہ یزید بن معاویہ جو شرافتِ انسانی کی سطح سے بھی گرا ہوا تھا۔ ایسے میں فرض تھا امامؑ کا کہ عوام کی اکثریت انہیں آواز دے تو وہ بڑھ کر دستگیری کریں، تاہم احتیاط کے طور پر امام حسینؑ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو ۱۵ رمضان ۶۰ھ کو کوفہ روانہ کر دیا جو دو بچوں کو ساتھ لے کر عازم سفر ہو گئے۔ مسلم کی بیوی اور باقی بچے امام حسینؑ کے ساتھ رہ گئے۔

۵ شوال کو جناب مسلمؑ وارد کوفہ ہوئے اور جناب مختارؒ بن ابو عبیدہ ثقفی کے مکان پر قیام فرمایا۔ چند روز کے اندر اٹھارہ ہزار آدمیوں نے جناب مسلمؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان میں شیعہ بہت تھوڑے تھے۔ اکثریت ان لوگوں کی تھی جو یزید سے متنفر تھے یا جن کو معاویہ کا ساتھ دے کر پچھتاوا ہوا تھا۔ چنانچہ وسط ذی قعدہ ۶۰ھ میں جناب مسلمؒ نے عابس ابن ابی شبیب شاکری کے ہاتھ ایک خط خدمت امامؑ میں بھیج دیا۔

نعمان بن بشیر حاکم کوفہ نے اس سیلاب کو روکنا خلاف مصلحت سمجھا مگر بعض ہوا خواہوں نے خفیہ خفیہ یزید کو اطلاع کر دی اور یزید نے نعمان کو معزول کر کے عامل بصرہ عبیداللہ ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم بنا دیا ـــــ اسی دوران امام حسینؑ کے بعض خطوط ابن زیاد نے پکڑ لئے جو امامؑ نے بصرہ کے بعض قبائل کو لکھے تھے۔

حضرت علیؑ کے بعد اٹھارہ انیس سال تک معاویہ نے حکومت کی تھی اور لاکھوں

کر گر گئے۔ پھر آپ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور زمین پر آتے ہی گرفتار کر لئے گئے۔

زخمی شیر ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہونے کے باوجود شیر تھا۔ تیور سے علیؑ کا جلال اور بشرے سے اسلام کا کمال برس رہا تھا۔ ابن زیاد سفاکی اور قساوت کے ساتھ پیش آیا مگر آپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ نے اس کے ہر سوال کا جواب ایمان افروز لب و لہجہ میں دیا اور اموی دریدہ دہنی کو لاجواب کر دیا۔ سعد ابن ابی وقاص کا بیٹا عمر بھی دربار میں موجود تھا۔ جناب مسلمؑ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تو ایک طرح سے ہمارا رشتہ دار ہوتا ہے۔ تجھ کو وصیت کرتا ہوں کہ امام حسینؑ کو ادھر آنے سے روک دے۔ میری زرہ اور تلوار بیچ کر فلاں کو سات سو درہم ادا کر دے اور باقی سے میری میت کسی مقام پر دفن کر دے۔"

ابن زیاد معاویہ و یزید کی تعریفیں کر رہا تھا اور حضرت علیؑ، امام حسینؑ اور حضرت عقیلؑ کو گالیاں دے رہا تھا۔ حضرت مسلمؑ نے چیخ کر کہا :۔

"خبیث! یہ تیرے لئے نئی بات نہیں ہے۔ تیرا باپ تجھ سے زیادہ بدباطن تھا۔ جھوٹ تیری میراث ہے ــــــــ"

ابن زیاد نے اس سے زائد موقع نہ دیا، حکم دے دیا۔

"اوپر لے جا کر گردن کاٹ دی جائے ــــ"

لوگ کشاں کشاں جناب مسلمؑ کو بالاخانے پر لے گئے اور بکیر بن حمران کی تلوار فضا میں بلند ہو گئی۔ مسلم کا رخ کعبہ کی طرف تھا اور آپ فرما رہے تھے۔

"آپ پر آخری سلام ہو، یا اباعبداللہ الحسینؑ!"

دوسرے ہی لمحے آپ کا سر کٹ کر نیچے آ گرا۔ اس کے بعد پھڑکتا ہوا جسم بھی بالاخانے سے نیچے پھینک دیا گیا۔

اٹھارہ ہزار بیعت کرنے والے دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ان میں کوئی شیعۂ علیؑ نہ تھا، سب شیعانِ معاویہ تھے جو خود معاویہ کی طرح اپنی اصل کی طرف پلٹ گئے تھے

ہانیؒ اور مسلمؑ کے جسدِ مردہ رسی میں باندھ کر سر بازار کھینچے گئے پھر ہانی کے قبیلے والوں نے لڑ کر دونوں لاشیں لے لیں اور انہیں دفن کر دیا۔ اس طرح ۹ ذی الحج ۶۰ھ ہجری کو کوفے میں حسینؑ کی سفارت اختتام کو پہنچی۔

یتیمانِ مسلم

جنابِ مسلمؑ کے دو بچے محمد اور ابراہیم قاضی شریح کی پناہ میں تھے۔ یہ حالات دیکھ کر قاضی نے اپنے بیٹے اسد کے ساتھ دونوں کو کوفے کے باہر بھیج دیا کہ مدینہ جانے والے قافلے کے ہمراہ چلے جائیں مگر قافلہ روانہ ہو چکا تھا اور سامنے جاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسد نے بچوں کو راستہ دکھا دیا کہ دوڑ کر قافلے سے جا ملیں۔

بچے تیزی سے چلے مگر قافلے کو نہ پا سکے بلکہ اموی سپاہیوں کے ہاتھوں پڑ گئے۔ ابن زیاد نے انہیں زندان میں ڈلوا دیا ـــــ ایک قیاس کے مطابق کربلا کے اسیروں کا قافلہ جب کوفے پہنچا تو یہ بچے قید خانے میں تھے۔ صرف وہی نہیں پورا قید خانہ محبانِ علیؑ سے بھرا ہوا تھا۔

بچے دن بھر روزہ رکھتے۔ شام کو جَو کی روٹی اور گرم پانی سے افطار کر لیتے ان کا بیشتر وقت عبادت ہی میں گزرتا تھا۔ اس معمول کو دیکھ کر ایک دن داروغہ زندان مشکور نے ان کے حالات پوچھے اور خاندانِ رسالتؐ سے ان کی وابستگی کے سبب بڑی محبت سے پیش آیا اور رات کی تاریکی میں بچوں کو شہر کے باہر چھوڑ آیا ـــــ مشکور اس جرم میں پکڑا گیا اور اس کی جان حُبِّ علیؑ کی بھینٹ چڑھ گئی

انجانا دیس، دشمنوں کا شہر، بچے راہ سے بھٹک گئے اور تھک کر ایک چشمے کے کنارے سو گئے۔ صبح کو ایک جھاڑی میں چھپ رہے۔ اتفاق سے سہ پہر کو ایک کنیز پانی بھرنے کے لئے آئی۔ اس کی نظر بچوں پر پڑ گئی۔ انہوں نے اس کی آنکھوں میں شفقت کی چمک دیکھ کر اپنے متعلق سب بتا دیا۔ کنیز نے گھر واپس آ کر اپنی مالکہ سے سارا حال کہہ سنایا اور مالکہ خود آ کر بڑے پیار سے بچوں کو لے گئی۔

مومنہ کو معلوم تھا کہ اس کا شوہر سخت دشمنِ اہلبیتؑ ہے لہذا اس نے بچوں

کو کھلا پلا کر تہہ خانے میں سُلا دیا۔

ابن زیاد عناد آلِ رسولؐ میں اتنا کٹر تھا کہ کوئی جانور بھی علیؑ کے نام پر سر ہلاتا تو اس کو ذبح کر ڈالتا۔ بچوں کی اس کو اتنی فکر پڑ گئی کہ اس نے چہار جانب آدمی دوڑوائے ــــــ حارث بن عروہ دن بھر دوڑ دھوپ کر کے شب میں پلٹا اور کھانا کھا کر بستر پر دراز ہوا تو اس کو ایک طرف سے سانسوں کی آواز محسوس ہوئی وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دبے پاؤں اسی طرف کو چل پڑا۔

حضرت مسلمؑ کے بچوں نے رسالتمآبؐ، امیرالمومنینؑ، فاطمہؑ زہرا، امام حسنؑ اور حضرت مسلمؑ کو خواب میں دیکھا تھا اور چونک کر آپس میں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے کہ حارث اندر داخل ہوا۔ اس نے دونوں کو بال پکڑ کر کھینچا اور دریافت کیا۔

"تم کون ہو ــــ ؟"

بچوں نے سہم کر بتا دیا، پھر کیا تھا۔ دونوں یتیموں کے رُخسار طمانچوں سے لال ہو گئے۔ اس نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیئے۔ بیوی منت سماجت کرتی رہی مگر جلاد نے ایک نہ سُنی ــــــ صبح کو انہیں لے کر چلا تو بیوی نے راستہ روکا۔ ظالم نے مومنہ کو تلوار مار دی۔ بیٹا اور غلام مزاحم ہوا تو دونوں کو قتل کر دیا اور بچوں کو دریا کے کنارے تک کھینچ لے گیا۔

انھوں نے ہاتھ جوڑ کر خوشامد کی کہ بازار میں بیچ ڈال یا ابنِ زیاد کے پاس لے چل مگر وہ نہ مانا۔ آخر بچوں نے کہا۔

"اچھا ہمیں دو رکعت نماز پڑھ لینے دے ــــــ"

"نماز کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے تو پڑھ لو۔" اس نے کہا اور بچے وضو کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن انھوں نے نماز ادا کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے کہ بڑے بھائی کی گردن پر تلوار پڑی۔ ملعون نے اس کی لاش اُٹھا کر دریا میں پھینک دی مگر وہ پانی پر تیرتی رہی، جب چھوٹے بھائی کی لاش بھی دریا میں گری تو دونوں لاشیں بہتی ہوئی ایک دوسرے سے آ کر مل گئیں اور پانی کی تہہ میں غرق ہو گئیں۔

یہ ہوا انجام کوفے کے سفیرِ الی الحق کے بچوں کا ـــــ جن کا خون اوراقِ تاریخ میں مسلمانوں سے اپنی بے گناہی کا محاسبہ کر رہا ہے!

حیرت ہوتی ہے اس فلسفۂ عقائد پر جب زیاد اور ابن زیاد جیسے لوگوں کو رضی اللہ یا رحمۃ اللہ لکھا جاتا ہے، جن کا اسلام ثابت کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلام انسانیت کے لئے آیا تھا اور جو لوگ انسان اور انسانیت دونوں کے قاتل ہوں، ان کے حق میں فتویٰ دینے والے نہ جانے کون سے عالم ہوں گے ـــــ اور جو رسول کے چہیتوں اور ان سے محبت کرنے والوں کا بلا سبب خون بہائیں، انھیں دائرۂ اسلام میں کوئی مقام دلانے والے فقیہہ کس اسلام کے فقیہہ کہلائیں گے ـــــ عبیداللہ ابن زیاد کا تو یہ عالم تھا کہ کسی گھر میں اگر فاطمہؑ یا اولادِ فاطمہؑ کا نام بھی لیا جاتا تو وہ گھر منہدم کر دیتا۔ کوفہ اور نواحِ کوفہ میں علی کے ماننے والوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ اِکاّ دُکاّ کسی گوشے میں کوئی بوڑھا پڑا ہوگا تو اس پر بھی اس کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ ان ہی میں ایک برگزیدہ شخصیت حضرت میثم تمار کی بھی تھی جو کھجوریں فروخت کر کے گزر بسر کرتے۔ ایک دن ابنِ زیاد نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ حضرت میثم حج کرنے گئے ہوئے تھے۔ ابن زیاد نے عمر بن حریث کو تاکید کی کہ آتے ہی انہیں پیش کیا جائے عمر مکے سے واپسی پر آپ کو قادسیہ سے جا کر پکڑ لایا اور ابن زیاد کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے میثم بن یحییٰ سے کہا۔

"علی ابن ابی طالب پر تبرا کرو۔"

"میں ـــــ اور علیؑ پر تبرا!" میثم نے جواب دیا اور ابن زیاد قدرے بلند آواز میں بولا میثم کی تیوریوں پر بل پڑ گئے مگر انھوں نے ضبط سے کام لیا۔

"میرے مولیٰ مجھے اس کی خبر دے چکے ہیں،" میثم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا پھر اسی سلسلے میں وضاحت کی: "مجھے عمر بن حریث کے دروازے پر سولی دی جائے گی، زبان کاٹی جائے گی ـــــ چوتھے دن میرے دونوں نتھنوں سے خون جاری ہوگا"

"اچھا تو میں زبان چھوڑ دوں گا تاکہ تمہارے مولا کا کہنا جھوٹ ہو جائے۔"

ابن زیاد نے جواب دیا اور جلاد کو اشارہ کیا جو ہر وقت دربار میں موجود رہتا تھا۔

چنانچہ میثم تمار کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اب اس کو ایمان کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ میثم نہ چیخے نہ چلائے۔ خون بہتا رہا اور آپ امیرالمومنین کی حدیثیں بیان کرتے رہے ـــــ عمرو بن حریث کے دروازے پر سولی پر چڑھائے گئے تھے ایک انبوہ کثیر جمع تھا اور آپ کی زبان بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

"سن لے، جس کو سننا ہے۔ میں قیامت تک پیش آنے والے واقعات بیان کرتا رہوں گا ـــــ پھر آپ نے کہنا شروع کر دیا۔ فلاں وقت یہ ہوگا، فلاں وقت یہ ہوگا ـــــ!"

روانی کا یہ عالم تھا کہ جیسے آپ کو سب کچھ ازبر ہو ـــــ لوگ ایک سکتے کے عالم میں تھے، جیسے کھڑے کھڑے سو رہے ہوں۔

ابنِ زیاد کو فوراً اس کی اطلاع دی گئی۔ اس کو ڈر ہوا کہ علی کے اس معجزے سے کہیں لوگوں کے دل ان کی طرف پھر نہ جائیں۔ اس نے زبان کاٹ دینے کا حکم دیا۔ جلاد جب ان کی طرف بڑھا تو میثم چیخ اٹھے۔

"ملعون میرے مولا کو جھٹلانا چاہتا تھا ـــــ ان کا قول بھلا جھوٹا ہو سکتا ہے!"

زبان کٹ گئی ـــــ خون اس کثرت سے بہا تھا کہ میثم اسی عالم میں جاں بحق ہو گئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ رشید ہجری کا بھی ہے۔ ان کی گرفتاری کے لئے بھی ابن زیاد نے آدمی مقرر کئے تھے۔ ۲۲ ذی الحجہ ۶۰ھ کو وہ پکڑ کر ابنِ زیاد کے دربار میں لائے گئے۔ اس نے پوچھا۔

"تمہارے دوست نے تمہیں بھی کوئی خبر ضرور دی ہوگی؟"

"ہاں، فرمایا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں اور زبان کاٹ کر سولی پر چڑھایا جائے گا"

آپ نے بتایا اور ابنِ زیاد نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اشارہ کیا اور سپاہیوں نے آپ کی رسیاں کھول دیں لیکن رشید ہجری جب جانے لگے تو چیخ کر بولا۔

"واپس لاؤ، اسے ـــــ!"

سپاہیوں نے پھر پکڑ لیا تو ابن زیاد نے کہا۔

"واقعی تمہارے لئے اس سے بہتر سزا نہیں ہوسکتی ورنہ تم جب تک زندہ رہو گے، ہماری جڑیں کھودتے رہو گے۔"

ایک لحظے تک وہ خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔

"اچھا، میں تمہیں قتل بھی کرتا ہوں اور تمہارے آقا کے کذب کو بھی ثابت کروں گا ـــــ"

پھر اس نے جلاّد کو حکم دیا۔

"اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر چھوڑ دو۔"

جلاد نے حکم کی تعمیل کی اور رشید ہجری کو دارالامارہ کے باہر لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ رشید کی بیٹی ساتھ تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے بلک کر پوچھا

"بابا کیا تکلیف ہو رہی ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں"۔ رشید نے شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔ "بس اتنی تکلیف ہے جیسے کوئی معمولی خراش آگئی ہو۔"

تماشا دیکھنے والوں کا مجمع لگ گیا تھا۔ رشید ہجری نے بھی وہی کیا جس کا مظاہرہ میثم تمار نے کیا تھا ـــــ ان کی زبان سے مدح امیر المومنین کے دریا اُبل رہے تھے اور سننے والے ایک کیف میں سُنے جا رہے تھے۔ آخر وہی ہوا، ابن زیاد کو زبان کاٹ ڈالنے کا حکم دینا پڑا اور اہلِ کوفہ نے دیکھ لیا کہ علیؑ تو علیؑ ان کے شیدائی بھی کتنے معجز بیان ہوتے ہیں ـــــ مگر خدا نے ان کے قلوب پر مہریں لگا دی تھیں یا وہ طمع دنیا میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ حق کی روشنی دیکھ ہی نہ سکے۔

کوفے کے ان حالات میں قتلِ امام کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں اور نخیلہ میں فوجوں پر فوجیں جمع ہوتی جا رہی تھیں جس کے احکام روز دمشق سے صادر ہو رہے تھے۔

مدینے سے کربلا کی طرف

امام کو روکنے والوں میں دوسرے بزرگوں کے ساتھ عبداللہ ابنِ عمر بھی تھے۔ انھوں نے بھی کہا۔

"کوفے والے اعتبار کے قابل نہیں ہیں ——"

محمد حنفیہ اور عبداللہ ابنِ جعفر نے رائے دی

"اچھا آپ نہیں رُکتے تو عورتوں اور بچوں کو نہ لے جائیے"

مشورہ بڑا معقول تھا لیکن امام حسینؑ لڑنے کو تو جا نہیں رہے تھے، انہیں تو ہدایت کرنا تھی اہلِ کوفہ کی بھی، یزید اور اس کے عمال کی بھی۔ اس لئے عورتوں اور بچوں کی موجودگی آپ کے منصب میں حائل نہ ہو سکتی۔ خود آنحضرتؐ امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ کی سیرتیں مشعلِ راہ تھیں۔ آپ کی زندگی اسلام اور صرف اسلام کے لئے تھی اس کے لئے کوئی تشویش ہو نہ سکتی اور گئے گذرے حالات میں بھی آپ کے بھائی عورتیں اور بچے مسلمانوں کے لئے ان کے پیغمبرؐ کی امانت تھیں لہذا وہ کسی بد تمابات کا تصور بھی نہ کر سکتے اور اگر کچھ خطرہ ممکن تھا تو ان کی عدم موجودگی میں زیادہ ہو سکتا مروان کی روش آپ دیکھ چکے تھے۔ اس لئے سب کو ساتھ لے جانا ہی مناسب تھا۔ اہلِ بیتِ رسولؐ کی ذمہ داری آپ پر تھی۔ جس کو کسی دوسرے کے سپرد بھی نہ کیا جا سکتا۔

اس کے ماسوا خود جناب زینبؑ اور اُم کلثومؑ بھی بھائی کے چھوڑنے پر تیار نہ تھیں۔ مدینے میں جب عبداللہ ابنِ عباس نے یہی بات کہی تھی تو جناب زینبؑ نے پسِ پردہ سے انہیں ٹوکا تھا۔

"آپ حسینؑ کو مجھ سے جُدا کرنا چاہتے ہیں، ہم تو نہ چھوڑیں گے اپنے بھائی کو ——"

حالات پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی جائے تو امام حسینؑ کے برمحل اقدام کی ضرورت سمجھ میں آجاتی ہے —— یقیناً ادوارِ خلافت میں بعض ناروا باتیں وقوع میں آئیں اور بہت کچھ ایسا ہوا جو نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے جب پورے اصولِ دین کے نفاذ کی کوشش کی تو لوگ اسلام میں لچک کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے

پابندیوں کی سختی انھیں ناگوار گزری۔ ایسے میں حضرت معاویہ کی ریشہ دوانیاں اپنا کام کر گئیں اور حضرت علی کا عہد ناکامیوں کا شکار ہو گیا۔ پھر معاویہ کا زمانہ ستم رانی شروع ہو گیا۔ سابقہ دورِ خلافت میں اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ روحِ اسلام کسی نہ کسی حد تک باقی تھی تسخیری مہمات میں اکثر مقامات پر چنگیزیت کے مظاہرے ضرور ہوئے لیکن ان کی ذمہ داری خلیفۂ وقت پر ڈالی نہیں جا سکتی۔ مرکز مدینہ سے جو ہدایات جاری ہوتیں ان میں مفتوحین سے انسانیت کا سلوک کرنے کی ہدایت کی جاتی۔ بعض جرنیلوں نے ایامِ جاہلیت کا کردار ادا کیا تو قصوروار وہ ہیں۔

لیکن حضرت معاویہ نے خلافت کو پوری طرح ملوکیت میں بدل دیا اور فتح ممالک میں ایک خونخوار جرنیل کی سیرت کا مظاہرہ کیا۔ اندرونی نظم و نسق اور استقرار حکومت کے لیے اس مقدس خون کے دریا بہا دیئے جو پوری قوم کے لئے ان کے رسُول کی امانت تھا پھر بھی کہیں کہیں پر اسلام کی جھلکیاں نظر آجاتیں اور حکومت کو اسلامی تو نہ کہا جا سکتا تو اس پر اسلامی حکومت کا شبہ ضرور ہو سکتا تھا۔

یزید بن معاویہ نے یہ شبہ بھی دُور کر دیا تھا۔ شراب عام تھی، فرمانروا محرمات سے ہم بستری کرتا تو دوسروں کے لئے بھی اس کا جواز تھا۔ نماز عالم سکر و جنابت میں بھی ادا کر لی جاتی۔ اظہارِ رائے کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو، گردن زدنی تھا۔ سادات اور محبانِ علیؑ کا خون مباح تھا اور بعثتِ رسُول کا مذاق اڑانا ان سب پر مستزاد تھا مفتیانِ دین اور علمائے کرام کے مُنہ سی دیئے گئے تھے کسی کی زبان حرکت کرتی تو کاٹ دی جاتی۔

اس نظام کا نام اسلام رکھا گیا تھا جس کی توثیق امامؑ وقت سے کرائی جا رہی تھی۔ امامؑ کا منصبی فرض تھا کہ وہ اس کی حقیقت واضح کر دیں اور دُنیا کے سامنے صحیح اسلام کی تصویر پیش کر دیں۔ خود یزید کو سمجھانا بھی آپ کے فرائض میں شامل تھا۔ اسی لئے آپ نے کربلا میں عمر سعد سے کہا تھا کہ انہیں یزید کے پاس بھیج دیا جائے اور شاید یزید بھی سمجھا تھا کہ امامؑ آگئے تو اس کو اپنے اعمال کی تاویل بن نہ پڑے گی

لہٰذا اس نے ایسی ہدایات دی تھیں کہ بیعت یا سر ــــــ!

دوسرے لوگ ان حقائق کو نہ سمجھتے لہٰذا ہر ایک خلوصِ نیت سے اپنا مشورہ دے رہا تھا۔ امامؑ نے بڑے ملائم الفاظ میں مجبوری کا اظہار فرمایا اور خلیل کے کعبے سے رخصت ہو کر اسمٰعیل ذبیح اللہ کی مہم پر روانہ ہو گئے۔

عباسؑ ابن علیؑ منتظمِ قافلہ تھے۔ عرصہ صفین نے امام حسینؑ کے ساتھ ایک چھوٹے سے شمشیر زن کو دیکھا تھا، وہ اب ایک پیکرِ جمال وجلال بن چکا تھا۔ گھوڑا اڑا اڑا کر قافلے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا اور واپس آ کر امام کی سواری کے برابر چلنے لگتا ــــــ اس کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ جیسے علیؑ کاروانِ رسولؐ کا طواف کر رہے ہیں۔

امام علیہ السلام کے قاصد

جناب مسلمؑ کا خط امام حسینؑ کو مل چکا تھا مگر آپ نے ابھی اس کا جواب نہ دیا تھا۔ قافلہ تھوڑی دور گیا ہو گا کہ عرب کے مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ فرزدق نے بھی حالات کے نامساعد ہونے کی خبر سنائی۔ اہلِ بیتؑ کی محبت میں سرشار شاعر نے بعض فی البدیہہ شعر بھی پڑھے۔ لوگوں کے دل آپ کی طرف ہیں، تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں مگر حضرت نے ارادہ ملتوی نہ کیا۔ تین میل پہنچے تھے کہ منزل تنعیم پر عبداللہ ابن جعفر اپنی قائمقامی کے لئے زینبؑ کے دونوں بچوں عون و محمد کو لے کر پہنچے، وہ خود بیماری کی وجہ سے ساتھ نہ جا سکتے۔ بڑی رقت انگیز ملاقات تھی۔ عبداللہ اور امام حسینؑ کی۔ عبداللہ بھی محسوس کرتے کہ امام حسینؑ علیؑ اور حسنؑ کے بعد تبلیغ کا تیسرا رُخ پیش کرنے جا رہے ہیں۔ دونوں کئی بار بغل گیر ہوئے پھر عبداللہ مدینے کی طرف واپس ہو گئے۔

منزلِ عاجز میں عبداللہ ابن مطیع نے بھی ایسا ہی کچھ کہا لیکن آپ آگے بڑھتے رہے۔ منزل ذات العرق میں بشیر بن غالب نے کوفیوں کی غداری کا تذکرہ کیا مگر آپ کا انداز بتا رہا تھا گویا آپ یہ سب کچھ جانتے ہوں۔

پیغمبرؐ اسلام نے جب دین کا آغاز کیا تھا تو انہیں آسانی سے عربوں کے راہِ راست پر آجانے کی امید تو نہ تھی۔ آج پیغمبر کا نواسہ تجدید اسلام کے لئے جا رہا تھا تو وہ کیوں توقع کرتا کہ بھٹکے ہوئے کوئی ایک دم آپ کا پیغام سن لیں گے اور جابر حکومت کی طرف سے ان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا —— آپ منزلوں پر منزلیں کرتے رہے اور ایک روایت کے مطابق بطن رمہ پر اہل کوفہ کے خطوط کا جواب لکھا، جس میں اپنے پہنچنے کی اطلاع دی —— اس خط کو آپ نے قیس بن مسہر صیداوی اور عبدالرحمن بن یقطر کے ہاتھ کوفہ روانہ کیا۔

وہاں کوفے کی مکمل ناکہ بندی تھی۔ ہر طرف ایک جنگی ماحول تھا۔ فوجوں کی مسلسل نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ حسینؑ کے قاصد قادسیہ میں حصین ابن نمیر کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور ابن زیاد کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ قیس نے ان کے سامنے پہنچتے ہی امام کا خط پرزے پرزے کر ڈالا اور ابن زیاد کے پوچھنے پر بتا دیا۔

"یہ خط جن کو لکھا گیا تھا، ان کے نام تو کبھی معلوم نہ کر سکے گا۔"

ابنِ زیاد کو علیؑ کے سرفروشوں کا کردار معلوم تھا تاہم اس نے دھمکیوں سے کام لیا اور جب کوئی امید افزا جواب نہ ملا تو کہا۔

"مکتوب الیہم کے نام بتا دو یا منبر پر جا کر حسینؑ اور ان کے باپؑ پر لعنت کرو۔"

"پہلی خواہش پوری ہونا تو ناممکن ہے۔ ہاں دوسری ہو سکتی ہے ——"

یہ کہتے ہی قیس منبر پر پہنچ گئے اور حمد الٰہی و نعت رسالت پناہیؐ کے بعد زیاد بن سمیہ، یزید بن معاویہ اور دوسرے بنی اُمیّہ پر تبرا کرنا شروع کر دیا۔ قیسؓ کی زبان بڑی روانی سے چل رہی تھی، انہوں نے کوفہ والوں کو بتایا۔

"امامؑ تمہارے بلانے پر فلاں منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ تمہاری شرافت کا تقاضا ہے کہ ان کی نصرت کرو۔"

وہ اور کچھ کہتے کہ ابن زیاد کے آدمیوں نے پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا۔ قیسؓ اپنے آقا کے نام پر قربان ہو گئے۔ عبدالملک بن عمیر لخمی نے ان کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اب عبداللہ بن یقطر کی باری تھی۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ پیش آیا۔ انھوں نے

بھی قیسؓ کے سے جوابات دیئے اور انھیں بھی بالا خانے سے پھینک کر شہید کر دیا گیا

سفر: ایک مسلک ہدایت

امام حسینؑ ان واقعات سے بے خبر اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے کہ منزل خزیمیہ پر زہیر ابن قین کا خیمہ نصب دیکھا جو قبیلہ بجلہ کے رئیس اور کوفہ کے بزرگ گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ امام حسینؑ نے انھیں بلا بھیجا۔ زہیر حاضر خدمت ہو گئے اور خیمے سے باہر آئے تو آپ کی دُنیا بدل چکی تھی۔ آپ نے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ بلند مرتبہ زوجہ ساتھ دینے پر مصر ہو گئی اور امامؑ کے قافلے میں ایک سرفروش کا اضافہ ہو گیا جس نے تاریخ کربلا میں اپنے خون سے ایک نمایاں عنوان لکھا ہے۔

زہیر کا تعلق یمن کے قبیلہ بجلّہ سے تھا مگر پیدائش مکّہ کی ہے۔ امام حسینؑ سے بچپن کا ربط تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ امامؑ کی خاکِ پا آنکھوں سے لگاتے تھے۔ آپ کے باپ قین نے رسُولؐ کا زمانہ دیکھا تھا۔ آپ نسلوں سے محبِّ اہلبیتؑ تھے۔

منقول ہے کہ امام ۹ ذی الحج کو کسی منزل پر فروکش تھے کہ اچانک اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بآواز بلند فرمایا:۔

"علیکم السلام یا مسلمؑ!"

جناب زینبؑ نے جو کچھ پوچھا اور آپ نے جو جوابات دیئے وہ روایت کا حصّہ ہیں منزل زبالہ پر محمد بن کثیر، عبداللہ بن یقطر سے ہانی بن عروہ اور جناب مسلمؑ کی شہادتوں کی تصدیق ہوئی ــــ امام حسینؑ جب مکّے سے نکلے تھے تو ۸۲ آدمی آپ کے ہمراہ تھے۔ راستے میں بہت سے لوگ مالِ غنیمت کی طمع میں ہمرکاب ہو گئے تھے لیکن جب آپ نے خطبہ دیا کہ آپ جنگ کے لئے نہیں جا رہے ہیں بلکہ آپ کا قتل یقینی ہے تو مجمع آہستہ آہستہ چھٹنے لگا اور صرف حق کے ماننے باقی رہ گئے۔

قصرِ بنی مقاتل میں عبداللہ بن حر جعفی آکر ملے۔ منزلِ ثعلبیہ میں حضورؑ کو خواب میں دیکھا اور آپ کو اپنی شہادت کا یقین ہو گیا۔ حضرت علی اکبرؑ نے کہا

"بابا۔ ہم حق پر ہیں تو موت سے ڈرنا کیا ــــ!"

آپ نے بڑے پیار سے بیٹے کو دیکھا اور بڑے صبر و شکر کے ساتھ خدا کو یاد کیا۔ شراف یا عذیب الہجانات کی منزل میں حُر بن یزید الریاحی کا لشکر سدِ راہ ہوا، اور آپ نے اس کے پورے لشکر کو سیراب کیا جو مارے پیاس کے جاں بلب ہو رہا تھا ۔ اس کے بعد ہی آپ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا جو حالات پر پوری روشنی ڈالتا ہے۔

"لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے ظالم، محرمات الٰہی کو حلال کرنے والے، خدا کے عہد کو توڑنے والے، خدا اور رسولؐ کے مخالف، اور خدا کے بندوں پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ حکومت کرنے والے بادشاہ کو دیکھا اور قولاً و عملاً اس میں غیرت نہ آئی، تو خدا کو حق ہے کہ اس کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کر دے

لوگو۔ خبردار ہو جاؤ۔ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی ہے، ملک میں فساد پھیلایا ہے حدود الٰہی کو معطل کر دیا ہے، مالِ غنیمت میں اپنا حصہ زیادہ لیتے ہیں، خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کر دیا ہے، اس لئے مجھ کو غیرت آنے کا زیادہ حق ہے" (۸۸)

شاہ معین الدین ندوی نے ان عوامل کے ایک رُخ کو واضح کر دیا ہے جنھوں نے امام حسینؑ کو اس اقدام پر مجبور کر دیا تھا۔

آپ کا ارادہ کوفے کی طرف جانے کا تھا لیکن حر کو گرفتاری کا حکم ملا تھا۔ اس کے گستاخانہ انداز پر حضرت عباسؑ کا ہاتھ قبضۂ شمشیر پر پڑ گیا مگر امام نے روک دیا یہاں سے علی کے شیر کا امتحان ضبط شروع ہوا۔ آخر بحث و تمحیث کے بعد آپ نے راستہ بدلا اور اس سرزمین پر وارد ہوئے جو ازل سے آپ کے نام لکھی ہوئی تھی۔

جنگی نقطۂ نظر سے زہیر بن قین کی رائے تھی کہ حُر کا دو ہزار کا لشکر کسی گنتی میں نہیں ہے۔ اس کے بعد فوجوں کی تعداد بڑھتی جائے گی مگر امام حسنؑ کا چھوٹا بھائی لڑنے کے لئے تو آیا نہیں تھا۔ اس نے پہل کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا، اس راستے پر چل پڑا جو نہ آپ کا مجوزہ تھا اور نہ حُر کا۔

۲ محرم کو آپ وارد کربلا ہوئے، آسمان پر چمکتے ہوئے چاند پر آپ کی نظر پڑی پھر آپ نے زمین کی طرف دیکھا جس سے ایک زرد غبار بلند ہو رہا تھا۔ ایک انجانا ہولناک منظر جس سے عورتوں کو دہشت اور بچوں کو وحشت ہو رہی تھی مگر آپ نے سامنے بہتی ہوئی نہر فرات کے کنارے خیمے لگانے کا حکم دے دیا۔

راستے میں امام حسینؑ نے کئی خطبے دیئے تھے جن کو حر اور اس کے لشکریوں نے بھی سُنا تھا اور ان سے کافی متاثر تھے۔ اس لئے کربلا پہنچنے تک حُر کا رویہ بہت نرم رہا اور وہاں پہنچنے پر بھی اس کی طرف سے خلاف ادب کوئی مظاہرہ نہیں ہوا لیکن جب ابن زیاد کا تاکیدی حکم پہنچا تو حُر مجبور ہو گیا اور اس نے ساحلِ نہر پر خیموں کی تنصیب روک دی۔

حضرت عباسؑ کے تحمل کی یہ دوسری آزمائش تھی۔ آپ کے تیوروں پر بل پڑ گئے مگر رسولؐ کے جانشین نے پھر نرمی سے سمجھا دیا اور خیمے وہاں سے ہٹا کر تپتی ہوئی ریت پر لگا دیئے گئے۔ عباس کسی چاکر کمترین کی طرح سر جھکائے تھے مگر چہرہ فرط غیظ سے تمتما رہا تھا۔ اصحاب کا بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ زہیرؓ سے پھر رہا نہ گیا۔ ادب کے ساتھ عرض پیرا ہو گئے۔

"مولا۔ ابھی وقت ہے۔ انہیں سزا دی جا سکتی ہے ——!"

"نہیں زہیر، میرے صبر کے سامنے اس عمل کی کوئی حقیقت نہیں ——" امامؑ نے اپنی منصبی بلندی پر کھڑے ہو کر کہا اور زہیر کے ساتھ دوسرے اصحاب بھی مجبور ہو گئے۔

—— امام حسینؑ کی یہ روش فہم انسانی سے بالاتر ہے۔ دشمن کی بڑھنے والی قوت کو اسی منزل پر کچل سکتے تھے اور اس کے بعد جو فوجیں آتیں ایک ایک کر کے وہ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن ان کا مقصود کشت و خون نہ تھا۔ وہ سروں کو کاٹ دینے کے قائل نہ تھے بلکہ دلوں کو جھکانے کے لئے آئے تھے۔ جس کے بعد بند آنکھوں کو کھول دینا آپ کا نصب العین تھا اور ظلم کے سامنے عدل کی شمع روشن کر کے شامیوں اور کوفیوں کو اس منزل پر لے آنا تھا جہاں وہ عہد رسالت میں کھڑے ہوئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کی صراحت فرماتے ہیں۔

"فی الحقیقت یہ حق و صداقت، آزادی و حریّت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان قربانی تھی جو صرف اس لئے ہوئی تاکہ پیروانِ اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح حق جہاد و عدالت اور ثبات و استقامت کی ہمیشہ کے لئے ایک کامل ترین مثال پیش کر دے۔ پس جو بے خبر ہیں، اُن کو رونا چاہیئے۔

اور جو روتے ہیں، ان کو رونے ہی پر اکتفانہ کرنا چاہیئے۔ ان کے سامنے سیدالشہداؑ نے اپنی قربانی کا اسوۂ حسنہ پیش کر دیا ہے اور کسی روح کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسینؑ کی مدعی ہو، جب تک کہ اسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے۔

دُنیا کی ہر چیز مر جاتی ہے کہ فانی ہے مگر خونِ شہادت کے ان قطروں کے لئے، جو اپنے اندر حیاتِ الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں کبھی بھی فنا نہیں۔

حضرت سیدالشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے مظالم بنی اُمیّہ کے خلاف جہادِ حق کی بنیاد رکھی اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو، جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریّت و حقوق کی غارتگر ہو۔" (۸۹)

یہ فتویٰ اُس ایوان اہلِ سُنت والجماعت کے لئے ہے جس کو حضرت معاویہؓ نے تشکیل دیا تھا مگر یہ نام قبول عام حاصل نہ کر سکا اور معاویہ کے پیرو شیعانِ معاویہ ہی کہے جاتے رہے۔ مامون رشید کی مساعی سے امام ابو یوسف کی قیادت میں جب اس نام کا پرچم بلند کیا گیا تو اس نے اتنی شہرت حاصل کی کہ آج تک مسلمانوں کی اکثریت اہلسنت والجماعت کے عنوان سے موسوم ہے لیکن فی زمانہ تو اس کی اتنی شاخیں ہو گئی ہیں کہ ان کی تعداد درجنوں سے زائد ہے۔ بریلوی گروہ جس کی تعداد سب سے زائد ہے، دیوبندی وہابی، اہل حدیث وغیرہ وغیرہ۔ ان کے عقائد میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ اگر ان

کا تجزیہ کیا جائے تو رسولؐ کی حیثیت اتنی مختلف نظر آتی ہے کہ اس کے خد و خال پہچانے نہیں جا سکتے۔ نظریاتِ توحید میں بھی کہیں کہیں ٹکراؤ اور قرآن کی معنی آفرینی میں تو انفرادی افکار کی کارفرمائی ہے ـــــ ان سب کے مقابل شیعوں کا ایک موقف جو کبھی تھا، وہ آج بھی ہے کیونکہ ہمارا مسلک رسولؐ اور ان کے گھر تک محدود ہے۔ کوئی ناراض ہو یا آمادۂ قتل ہو جائے، ہم کسی کی اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کرتے جس کی تصدیق ہمارے آئمہ کے اقوال سے نہ ہوتی ہو۔

اس مقام پر ایک بات توضیح طلب ہے کہ کسی کو ہم سے برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا ایک راستہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے، ہم اس پر قائم ہیں، کسی کے نظریئے سے وہ غلط ہے تو ہم اس کی تصدیق نہیں کراتے اور نہ کسی سے کہتے ہیں کہ آپ غلط ہیں پھر ہمیں کیوں چھیڑا جاتا ہے۔ بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں!

بات تھی مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں امیرِ کربلا کے اقدام کی تو مولانا بحوالہ بالا فتوے کے بعد تصریح فرماتے ہیں۔

"مقابلے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے پاس قوّت و شوکت مادّی کا وہ تمام ساز و سامان بھی موجود ہو، جو ظالموں کے پاس ہے کیونکہ حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ ضعفاء و مساکین کی جمعیت قلیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ نتائج کی فکر سے بے پرواہ ہوتی ہے، نتائج کا مرتب کرنا تمہارا کام نہیں۔ یہ اس قوّت قاہر عادلۂ الٰہیہ کا کام ہے جو حق کو باوجود ضعف و فقدانِ انصار کے کامیاب و فتح مند کرتی اور ظلم کو باوجود جمعیت و عظمت دنیوی کے نامراد و نگوں سار کرتی ہے۔"

خیمہ گاہ کربلا

یزید کو خود اپنے ظلم و ستم اور افعال شنیعہ کا احساس تھا مگر وہ ان کو ترک نہ کر سکتا لہٰذا ان کا جواز ڈھونڈھنے میں کوشاں تھا۔ سامنے کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی توثیق چند مقدس لوگوں سے کرا لیتا جس کے بعد کوئی اس پر انگلی اٹھانے کے قابل نہ رہتا۔ ایسے لوگوں میں سرِ فہرست حسینؑ ابن علیؑ تھے، جن کی طرف سے سردست کسی جنگی مخالفت کا خدشہ

نہ تھا مگر نہ جانے کیوں راہ کے اس کانٹے کو صاف کر لینے کی بڑی الجھن تھی۔

حسینؑ کے مدینے سے بچ نکلنے پر اس نے کوتاہی کی پاداش میں عاملِ مدینہ کو معزول کر دیا اور مکے میں تین سو شامی حاجیوں کے لباس میں بھیج دیئے کہ حج کرتے وقت رسولؐ کے نواسے کو قتل کر دیں مگر حسینؑ نے اس کی نوبت نہ آنے دی اور ۲ ذی الحج ۶۰ھ کو مکہ چھوڑ دیا ــــ یزید اس خبر پر اچھل پڑا اور عبیداللہ ابنِ زیاد کو اس نے حکم دے دیا کہ اب حسینؑ بچنے نہ پائیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے نواحِ کوفہ میں میدان نخیلہ فوجوں سے بھر گیا۔ حُر ابن یزید الریاحی دو ہزار کے لشکر کے ساتھ رسولؐ کے نواسے کو گھیر کر میدانِ کربلا میں لے آیا۔ سعد ابن ابی وقاص کے بیٹے عمر کو ابنِ زیاد نے رے کی جاگیر دینے کا وعدہ کر کے امیرِ لشکر بنا دیا اور افسر پر افسر اور لشکر پر لشکر کربلا کی طرف بھیجنا شروع کر دیئے۔

اِدھر قیامِ کربلا میں امامؑ نے بنی اسد سے کربلا کی زمین خرید کر ان کو ہبہ کر دی، حالات مستقبل کا اشارہ تھے۔ اپنی یقینی شہادت کے پیشِ نظر آپ نے بنی اسد سے لاشوں کی تدفین کا وعدہ لیا اور رشد و ہدایت کے آخری فرائض کی انجام دہی میں لگ گئے۔

امامؑ جانتے تھے کہ حُر الریاحی نے عمالِ یزید کو آپ کے پہنچنے کی اطلاع ضرور دی ہوگی اور جلد ہی لشکر آنا شروع ہو جائیں گے لیکن آپ ذہنوں کو بدلنے کے لئے آئے تھے لہٰذا آپ بے خوف و خطر روز کے خطبات میں آنے والے خطرات کو بیان کرتے رہے تاکہ جس کو جانا ہے، وہ اب بھی چلا جائے اور وہ رہ جائیں جو صداقت کے لئے موت کو گلے لگانے پر تیار ہوں۔ جانے والوں کے لئے آپ نے اپنی بیعت اُٹھا لی تھی اور کہہ دیا تھا۔

وہ اپنی جان بچا لینے پر کسی سے باز پرس نہ کریں گے۔ اس کے بعد آپ نے جتنی بھی تقریریں فرمائیں، وہ فوج یزید کے سامنے اور حقیقت یہ ہے کہ جن کے پاس ضمیر مُردہ بھی تھا، اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بے ضمیروں پر اس وقت تو کوئی اثر نہ ہوا، لبعد میں انہیں پچھتانا پڑا۔

اہلِ حرم میں ۲۰ بچے، بنی ہاشم کے اٹھارہ یا انیس مرد، اسی قدر عورتیں اور اصحاب میں ستر اسّی مرد تھے، جن میں اسّی پچاسی سال کے بوڑھے بھی شامل تھے۔ عزیز واقارب اور اصحاب کا تو یہ حال تھا کہ امام حسینؑ کی ہر تقریر کے بعد اپنی وفاداری کا یقین دلاتے اور تھے بھی وہ ایسے وفادار، انسانی تاریخ میں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ خواتین میں زینب کبریٰ ام کلثوم عظمیٰ، جناب شہربانو، جناب ام لیلیٰ، جناب فضہؑ، جناب اُمّ فروہؑ اور دیگر مخدرات شامل تھیں، جن کے ثباتِ عزم میں لغزش آنے کا امکان ہی نہ تھا۔ تاہم قلوب میں ایک دہشت پیدا ہو رہی تھی۔ اسی لئے جناب زینبؑ نے امامؑ سے فرمایا۔

"بھائی آپ بھی اپنے دوستوں کو خط لکھیں ــــــــ"

امام نے یکے بعد دیگرے کئی خط لکھے۔ ان میں سے ایک خط بچپن کے دوست حبیبؒ ابن مظاہر کے نام، دوسرا مسیبؒ بن نجبہ کے نام تھا۔

حبیبؒ خط ملتے ہی اپنے غلام کو لے کر بچتے بچاتے کوفے سے نکل آئے اور سات یا آٹھ محرم کو وارد کربلا ہوئے۔

مسیبؒ گھر میں صرف تہہ بند باندھے بیٹھے تھے۔ امامؑ کا خط ملتے ہی اسی عالم میں نکل پڑے اور اپنے قبیلے میں پہنچ کر اعلان کرنے لگے "بھائیو چلو، فاطمہؑ کا لال دشمنوں میں گھر گیا ہے، اس کی نصرت کرو۔" مسیبؒ نے بہت جلدی کی مگر لوگوں کو جمع کرنے میں وقت لگ گیا اور جب وہ کربلا کے قریب پہنچے تو روزِ عاشور گزر چکا تھا۔ مسیبؒ اسی مقام سے پلٹ پڑے اور اب ان کی زندگی کا مقصد قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینا رہ گیا تھا۔

دوسرے خطوط جو امام حسینؑ نے تحریر فرمائے تھے، وہ بھی مکتوب الیہم کو پہنچے لوگ جانوں کو قربان کرنے کے لئے روانہ ہوئے مگر کچھ تو گرفتار ہو کر قید خانوں میں ڈال دیئے گئے، کچھ قتل ہو گئے، کوئی پہنچ گیا اور بعض وہ سرفروش بھی آ گئے جنہیں بلایا نہیں گیا تھا۔ انہوں نے سنا تھا کہ فوجیں سبطِ پیغمبرؐ کے قتل کے لئے جمع ہو رہی ہیں۔ توفیقاتِ الٰہی نے انہیں دشمنوں کی نگاہوں سے بچ کر نکل جانے کا موقع دیا اور کربلا

پہنچ کر انہوں نے دادِ شجاعت دی۔

دورانِ سفر ایک انبوہِ کثیر امام حسینؑ کے ساتھ ہو گیا تھا مگر راستے میں امامؑ کی تقریروں نے انہیں مایوس کر دیا اور سب آہستہ آہستہ ساتھ چھوڑتے رہے کربلا پہنچنے والوں میں بہت تھوڑے لوگ تھے۔ پھر ان میں ایک ایک دو دو کا اضافہ ہوتا رہا اور گنتی کچھ بڑھ گئی مگر کسی روایت کی رُو سے وہ نو دس دہائیوں سے زائد نہ تھی۔

لشکر پر لشکر

حرؒ بن یزید الریاحی کے ساتھ دو تین ہزار فوج تھی جس کے مقابلے کے لئے اسّی نوے نفوس کافی تھے بلکہ ان میں سے کوئی ایک یا دو چار ان کو بھگا سکتے تھے مگر ۳ محرم کے بعد فوجوں کا تانتا بندھ گیا۔ شیثؔ ابن ربعی، حصینؔ ابن نمیر، شمرؔ ذی الجوشن، عامرؔ بن خزیمہ۔ خولیؔ اصبحی، سنانؔ بن انس، عروہؔ بن قیس، ابو قدارؔ باہلی بکرؔ بن کعب، کتنے ہی سردار اپنے اپنے لشکر لے کر پہنچتے رہے۔ ۳ محرم کو عمرؔ بن سعد نو ہزار فوج لے کر پہنچا۔ جو کربلا کے پورے یزیدی لشکر کا سپہ سالار تھا۔

فوجوں کی تعداد جتنی بڑھ رہی تھی، مخدراتِ عصمت کو اتنی ہی ہول ہو رہی تھی اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ جب کوئی نیا لشکر آتا تو خیامِ آلِ رسولؐ کے قریب پہنچتے ہی گھوڑوں کو اتنی تیزی سے دوڑاتا کہ بچے دہل دہل کر ماؤں کی گودیں جا چھپتے۔ اب حالات اور اس کے نتائج بالکل روشنی میں آچکے تھے مگر مردوں اور عورتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ کسی نے امامؑ کو چھوڑ دینے کا خیال تک کیا ہو۔

روایات کی کثرت نے جس طرح اسلام کے ہر کردار میں غیر یقینی پہلو پیدا کر دیئے ہیں۔ ویسا ہی کچھ کربلا میں بھی ملتا ہے کیونکہ اس عظیم سانحہ کے بارے میں ہر بیان دشمنوں ہی کا ہے۔ سچے لوگوں میں جنہوں نے دیکھا تھا وہ موت کی آغوش میں سو چکے تھے۔ امام زین العابدینؑ بیماری کے بستر پہ بیہوش تھے اور خواتین پردے کے اندر تھیں لہذا مورخین کو جو کچھ معلوم ہو سکا، وہ قاتلانِ حسینؑ کی زبان سے فوجوں کی تعداد چالیس ہزار سے ۹ لاکھ تک بتائی گئی ہے۔ یہ نو لاکھ تو قابلِ فہم نہیں ہیں

مگر چالیس ہزار یزیدی کربلا میں ضرور موجود تھے کیونکہ حدِ نظر تک فوجیں پھیلی ہوئی تھیں جن کے مقابلے میں ایک طرف چند خیمے لگے ہوئے تھے۔

کوفہ کربلا سے اڑتالیس میل پر واقع ہے۔ فوجوں کی تعداد کا تعین چالیس ہزار سے زائد اس تقویت پر کیا جا سکتا ہے کہ بعض بہادروں کے حملوں میں دشمن کی فوجیں بھاگتی ہوئی کوفے کی سرحدوں تک پہنچ گئیں۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ مقاتل اور تذکروں میں اس کو تواتر اور صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے عابس ابن ابی شبیب شاکری، زہیرؓ ابنِ قین اور بریرؓ ہمدانی کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ شروع میں صرف حُرؓ سے نپٹ لیا جاتا پھر جو فوج آتی جاتی اُس کو باری باری کاٹ کر رکھ دیا جاتا مگر یہ جنگی نقطۂ نظر تھا اور فتح کا یقینی راستہ، امام حسینؑ تو پیغمبرِ اسلام کی سطحِ ہدایت سے دیکھ رہے تھے، آپ کو تسخیرِ قلوب کرنا تھی۔ اس لئے فوج کی تعداد بڑھتے ہی آپ نے وہ روش اختیار کی جو ایک مُرسل کی ہو سکتی۔

عمرؔ سعد کا درشت اور تند مزاج فرستادہ، کثیر ابنِ عبداللہ جب ملنے آیا تو ابو ثمامہؓ صائدی سے تلخ کلامی کے بعد واپس چلا گیا۔ وہ امامؑ کے رُوبرُو پہنچ جاتا تو آپ کی نرمی سے متاثر ضرور ہوتا۔ دوبارہ قرۃ بن قیس حنظلی باریاب ہوا تو آپ نے فرمایا:۔ ”میں عوام کی دعوت پر رہِ ہدایت دکھانے کے لئے آیا ہوں، تمہیں گوارا نہیں تو واپس چلا جاؤں گا۔“ بات اتنی واضح تھی کہ اس کے بعد جنگ کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ حجت تمام ہو گئی تھی۔ ایک فریق لڑنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ دشمن کے لئے خاموشی کے سوا چارہ ہی کیا تھا لیکن ابن زیاد کو شام سے کھلے ہوئے احکام مل چکے تھے۔ بیعت یا قتل؟ لہٰذا ابنؔ زیاد نے عمرؔ سعد کو یزید الریاحی کی طرح، سرزنش کی مگر اس سے قبل امامؑ حسینؑ نے خود عمر سعد کو بلوا لیا۔ ایک علیحدہ خیمے میں گفتگو ہوئی اور طے ہو گیا کہ حضرت عرب چھوڑ کر کسی دُور دراز مقام پر چلے جائیں گے۔

امید پیدا ہوئی تھی کہ خونی واقعہ عمل میں نہ آئے گا مگر خولیؔ اصبحی اور شمرؔ ذی الجوشن

نے ابن زیاد کو عمر سعد کی نرمی سے آگاہ کر دیا، وہاں سے تاکیدی فرمان جاری ہو گیا جس میں بندشِ آب کا حکم بھی تھا۔ چنانچہ عمر سعد نے عمر ابن حجاج کو پانچ سو سواروں کے ساتھ فرات پر تعینات کر دیا۔

یہ عمل مستقبل کے عزائم کا آئینہ دار تھا جس کو آلِ محمدؑ سے عناد پر تعبیر کیا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ امام حسینؑ کے ساتھ جو گنتی کے سرفروش تھے، تاریخ عرب کی شجاعت میں ہر ایک کا ایک مقام تھا اور عرب و عراق کے ذرّے ذرّے ان کی تلواروں سے ٹپکتے ہوئے لہو کو چاٹ چکے تھے۔ عابسؒ شاکری، سیدؒ القرار، بُریرؒ ابن خضیر ہمدانی، زہیرؒ ابن قین مرد فقیہہ حبیبؒ ابن مظاہر اسدی کے سے مردانِ جنگ آزما کے تصوّر سے یزیدی سورماؤں کے جسموں میں کپکپی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کا علم ابنؒ زیاد کو بھی تھا۔ شجاعتِ علی کے وارثوں سے خواب میں بھی اس کو دہشت ہونے لگتی تھی۔ خود مسلمؑ بن عقیل کی جنگ وہ دیکھ چکا تھا۔ آج بھی دارالامارہ کوفہ کے در و دیوار میں مسلمؑ کے نعروں کی آواز بازگشت سُنائی دیتی، اس لئے حکم دے دیا کہ ساقیٔ کوثر کے بچوں پر پانی بند کر دیا جائے تاکہ مانے ہوئے بہادر پیاس کی شدّت سے اتنے کمزور پڑ جائیں کہ کل جب لڑائی ہو تو وہ اس طرح نہ لڑ سکیں جس کی روایت ان سے وابستہ ہے خونخوار مگر بزدل بھیڑیئے کو معلوم نہ تھا کہ شیر بھوکا اور پیاسا ہو تو زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے!

اہلِ کوفہ کی طبیعتوں کی طرح کربلا کے حالات بھی ہر لمحہ بدل رہے تھے۔ ایک طرف ستم رانی کے جواز کے لئے بے قصوروں میں قصور ڈھونڈے جا رہے تھے، دوسری طرف اتمامِ حجت سے ظلم کا ہر دروازہ بند کیا جا رہا تھا۔ امامؑ نے یہاں تک کہہ دیا۔ "اور کوئی صورت ممکن نہیں تو مجھے شام لے چلو" آپ یوں بھی ایک بار یزید کو سمجھانا چاہتے تھے کہ سچا مسلمان نہیں بن سکتا تو اسلام کی لاج رکھنے کی کوشش ہی کرے، اس لئے آپ نے عمر سعد سے کہہ دیا کہ انہیں یزید کے پاس لے چلے یا پھر ہندوستان کی طرف چلا جانے دے مگر ہٹ دھرم یزیدیوں نے ہر پیش کش مسترد کر دی۔

ہندوستان کا نام آپ نے یقیناً تبلیغ اسلام کے لئے لیا تھا اور مستقبل کے کسی

معین الدین اجمیری اور لعل شہباز قلندر کی رہنمائی کی تھی لیکن آپ کا ایک تعلق بھی ہندوستان سے تھا۔ مکران و سندھ کے بعض علاقے حضرت علیؑ کے دورِ خلافت میں اسلام اور آلِ محمدؐ سے آشنا ہو چکے تھے۔ ایک تعلق جناب شہر بانو سے بھی ہندوستان کا تھا ــــــ مورخین نے اس سلسلے میں بھی تاریخ کا خون کیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ حضرت عمر کے دور میں فتح ایران کے بعد اس کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ ان میں ایک شہر بانو، دوسری کیہان بانو تھیں جو غلط ہے۔ یزدجرد چار ہزار سپاہ کے ساتھ معہ اہل و عیال بھاگ نکلا تھا اور مرو میں اقامت پذیر ہو گیا تھا۔

"۳۱ھ دورِ عثمانی میں یزدجرد مارا جا چکا تھا۔ اس کے عیال مرو میں موجود رہے۔ حضرت علیؑ کے عہد میں خلید بن قرہ یربوعی نے ایک مختصر سی جنگ کے بعد ان کو برآمد کیا اور دیگر اسیروں کے ساتھ دونوں شہزادیوں کو بھی خدمتِ امامؑ میں ارسال کیا جو ۳۶ھ میں جنگِ جمل کے بعد مدینہ پہنچیں۔ حضرت علیؑ نے جناب شہر بانو امام حسینؑ کو اور کیہان بانو حضرت محمد بن ابی بکر کو عطا کر دیں۔ حضرت امام زین العابدینؑ یکشنبہ ۳۸ھ میں جناب شہر بانو کے بطن سے پیدا ہوئے اور قاسم بن محمد جناب کیہان بانو کے بطن سے۔" (۹۰)

ان دونوں بہنوں کی ایک تیسری بڑی بہن بھی تھیں جو اودے پور میں مہارانا پرتاپ کی اولاد میں بیاہی تھیں جن کا پتہ اودے پور کی روایتی تاریخ سے چلتا ہے۔

ایک اور رشتہ بھی امامؑ کا ہندوستان سے تھا وہ یہ کہ امام زین العابدینؑ کی ایک بیوی سندھی تھیں جن سے جناب زید شہید پیدا ہوئے۔ (۹۱)

ایک ضعیف سی روایت یہ بھی ہے کہ جونا گڑھ کے موجودہ حسینی برہمنوں کے اجدادِ اعلیٰ میں سے کوئی فرد جس کے نام کے آگے "دت" لگا تھا وہ بھی کربلا کے شہیدوں

میں شامل ہے، ممکن ہے کہ اس نے امام علیہ السلام کو ہندوستان چلنے کی دعوت دی ہو جس طرح طرماح بن عدی نے اپنے آبائی وطن یمن کی استدعا کی تھی جہاں آج بھی ان کے دادا حاتم کا نام در و دیوار میں گونجتا تھا۔

تشنگانِ فرات

یزیدیوں کا پہلا حربہ بندشِ آب تھا جو بہت کارگر ہوا، خیام حسینی میں تہلکہ پڑ گیا اور بچے بلکنے لگے۔

۷ محرم تک پانی کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ صفین میں حضرت علیؑ ایک نظیر پیش کر چکے تھے کہ پانی دشمنوں پر بھی بند نہیں کیا جاتا۔ اس لئے عام خیال یہ ہو سکتا کہ اب شاید پیروانِ معاویہؓ ایسا نہ کریں لیکن جب عمرؓ بن حجاج نے دریا کو اپنے قبضے میں لے لیا تو امام حسینؑ کو زیادہ استعجاب نہیں ہوا۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ خیام اہلبیت میں پانی موجود ہی نہ تھا لیکن قبضہ، چونکہ اچانک کیا گیا تھا۔ اس لئے پہلے سے کسی ذخیرۂ آب کا التزام نہ تھا، جو پانی موجود ہوگا وہ ۸ محرم تک ختم ہو گیا ہوگا اس کی تقسیم میں بھی بچے مقدم رہے ہوں گے اور اس کا امکان ہے کہ بڑوں کا دورانِ تشنگی شب ہشتم ہی سے شروع ہو گیا ہو۔

دشمنانِ اسلام نے کربلا سے متعلق بھی ان گنت جھوٹی روایتوں کے انبار لگائے ہیں مگر کسی ناصبی نے بھی یہ نہیں کہا کہ مردوں یا عورتوں میں سے کسی نے پانی کی شکایت کی ہو، البتہ ناسمجھ بچوں نے اکبرؑ و عباسؑ سے بار بار فریاد کی۔ العطش، العطش اور اسی کو دیکھ کر امامؑ نے عباسؑ سے فرمایا:

"بھائی! پانی کی کچھ سبیل کرو ——— "

کئی مورخین نے لکھا ہے کہ اکبرؑ و عباسؑ، نافع بن ہلال اور بعض دوسرے اصحاب کو لے کر نہر پر حملہ آور ہوئے تھے اور کئی مشک پانی لائے تھے مگر ان مشکوں سے کتنے بچے اور کتنے بڑے اپنے حلق تر کر سکے ہوں گے! اسی رعایت سے ۸ محرم سقائے حرم سے منسوب ہے اور آپ کے نام پر جس جگہ پانی یا شربت پلایا جاتا ہے

اس کو سبیل کہتے ہیں۔

یہ چند مشکیں جلتے توے پر چھینٹوں کا کام کو گئی ہوں گی اور پھر وہی طفلانِ کم سِن کی العطش العطش کی آوازیں خیمہ گاہ سے بلند ہونے لگیں۔ کہا جاتا ہے کہ علیؑ کے پسر نے یکے بعد دیگرے کئی کنویں کھودے مگر ان سے پانی برآمد نہیں ہوا اور بعض میں پانی نکلنے کے آثار پائے گئے تو دشمنوں نے ان کو حملے کر کے بند کر دیا۔

شبِ عاشور حصولِ آب کے لئے بریر ہمدانی کا نام تاریخ کے افق پر درخشاں ہے۔ آپ امامؑ کی اجازت سے اصحاب کی ایک جماعت لے کر دریا پر پہنچے۔ عمر بن حجاج نے پانی پینے کی اجازت دی۔ بریرؓ دریا میں اترے۔ ساتھی قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھے کنارے کھڑے رہے۔ بریرؓ نے مشک بھر لی۔ اس کے دہانے کو باندھ لیا۔ دور تک بہتے ہوئے پانی کو دیکھا مگر امیرالمومنینؑ کا بوڑھا صحابی پیاسا ہی گیا تھا، پیاسا ہی نکل آیا۔ عمر بن حجاج نے ٹوکا۔

" تم خود جتنا چاہے پی لو، مگر پانی لے کر نہیں جا سکتے ——— "

بریرؓ نے نعرہ بلند کیا۔

" صفین کا مجاہد ہوں۔ روک سکتا ہے تو مجھے ——— "

صرف چند ہمراہیوں کے ساتھ بڑی احتیاط سے بریرؓ آئے تھے مگر تھے سب یگانۂ روزگار۔ ایک بار جتنی تلواریں چمکیں، اتنے ہی سر زمین پر آگرے۔ چند لمحوں میں کچھ زخمی، کچھ صحیح و سالم بھاگنے لگے۔ بریرؓ مشک لے کر بتعجیل خیمہ گاہ میں پہنچ گئے اور آواز دی۔

"بچو! تمہارا بوڑھا غلام پانی لے آیا ——— "

حسینؑ کی چہیتی بیٹی سکینہ دوسرے بچوں کو لے کر دوڑ پڑی۔ پیاسے بچے پانی تو پانی، پانی کی تری کو بھی ترسے ہوئے تھے۔ انہوں نے منہ مشک پر رکھ دیئے اور اس افراتفری میں مشک کا دہانہ کھل گیا۔

مشیت کی طرف سے اس اتفاقی آزمائش کو تسلیم نہ کیا جائے تو بھی اس پانی نے لمحات کے لئے تشنگی کو بجھا دیا ہوگا اور پھر وہی قحطِ آب اور پیاس۔

عیسوی حساب سے اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ ریگزار عرب کی گرمی۔ پھر پشت خیام پر خندق کھود کر اس میں آگ روشن کر دی گئی تھی تاکہ دشمن اس طرف سے حملہ نہ کر سکیں۔ اس آگ نے پیاس کی شدت کو اور بڑھا دیا تھا۔ پانی لانے کے یہ دونوں مواقع مسلّم لیکن ان سے دو مرتبہ بچوں کو سکون میسر آیا تھا۔ عورتیں اور مرد تو ۸ محرم سے پیاسے ہی تھے ـــــ اس پیاس میں ظالم یزیدیوں کی دھمکیاں اضافہ کر رہی تھیں۔ اصحاب ان کے طعن و طنز پر غصّے میں بے قابو ہو جاتے مگر امامؑ کا منشاء دیکھ کر غصّے کو پینا پڑتا جس سے تشنگی بڑھ رہی تھی۔

۷ محرم کو پانی پر پہرے بیٹھ جانے کے بعد امام حسینؑ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں حضورِ اکرمؐ سے اپنے رشتے کو واضح فرمایا اور پانی کو مشیت باری کے فیض عام سے تعبیر کیا مگر سیاہ قلوب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

۸ محرم کو لشکرِ اسلام میں پانی پہنچ جانے کی اطلاع پر عمر سعد نے نہر پر چند ہزار سواروں کا مزید لشکر متعین کر دیا۔ شب میں عمر سعد اور امامؑ کی ملاقات ہوئی حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ بھی موجود تھے۔ امامؑ نے پھر ہر طرح سمجھایا اور کسی ایک شرط کو مان لینے پر زور دیا مگر ابن سعد جاہ و منصب کی طمع میں مبتلا تھا۔ اس نے ابن زیاد کو لکھا۔ اس اثناء میں شمر ذی الجوشن بھی کوفہ پہنچ گیا۔ اس نے ابن زیاد کو عمر سعد کی طرف سے بھڑکایا اور ابن زیاد کا حکم عمر سعد کو پہنچ گیا کہ اگر تو حملہ نہیں کرتا تو لشکروں کا چارج شمر کے حوالے کر دے۔ مجبوراً عمر سعد نے لشکر کو تیار ہونے کا حکم دے دیا۔

کربلا کا خانوادۂ رسالت

امام حسینؑ پنجتن کی آخری فرد تھے اور پیغمبرِ اسلامؐ شریک کارِ رسالت فاطمہؑ زہرا، نائب برحق حضرت علیؑ اور رسولؐ کے سبطِ اکبر امام حسنؑ کے جانشین تھے۔ جنگ صفین میں بھرپور حصّہ تو نہیں لیا تھا مگر موجودگی مسلّم ہے۔

آپ کی پہلی شادی شہربانو بنت یزدجرد سے ہوئی تھی جن کی یادگار علی بن الحسین یعنی زین العابدینؑ تھے۔ یہ خاتون بچے کی ولادت کے بعد ہی انتقال فرما گئی تھیں۔

دوسری شادی لیلیٰ بنت ابی مرہ سے ہوئی۔ جس کو علمائے انساب نے یزید کی پھوپھی زاد بہن بتایا ہے۔ حضرت علی اکبر آپ ہی کے بیٹے تھے۔

تیسری بیوی رباب بنت امر القیس تھیں جو شیر خوار شہید شہزادہ علی اصغر کی ماں تھیں

چوتھی اُم اسحٰق بنت طلحہ تیمی تھیں۔ فاطمہ کبریٰ بنت الحسین اور جعفر بن الحسین آپ ہی کے بطن سے تھے۔

پانچویں بیوی کا بھی تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ ممکن ہے، فاطمہ بنت الحسین انہیں کے بطن سے ہوں۔

کنیزیں ان کے علاوہ تھیں۔ اریبنب نام کی ایک خاتون کا ذکر بھی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے کہ انھوں نے خود امام حسینؑ کو پسند فرمایا تھا۔ یہی صورت ہند زوجہ یزید کی بھی ہے کہ اس کا عقد پہلے امام حسینؑ کے ساتھ ہوا تھا۔

ان واقعات سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ صورت وسیرت اور رسول اسلام کا نسلی رابطہ اتنا وقیع تھا کہ تخت حکومت بھی اس کے سامنے ہیچ سمجھا جاتا تھا اور بلا شبہ جاہ و ثروت نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کو ایک قابل رشک امتیاز حاصل تھا۔

پیغمبرؐ سے نسبت، علی کا عدل و شجاعت، زہد و سخا، حسن کا حلم و صلح پسندی اور ماں کی عصمت و طہارت حسینؑ کو ورثے میں ملی تھی۔ کئی آیات آپ کی شان میں اُتریں اور رسولؐ کی بہت سی احادیث آپ سے متعلق ہیں۔ انبیاء آپ کی حرمت کے معترف اور ملائکہ آپ کی فضیلت و شرف کے قائل۔ اَن گنت معجزات آپ سے ظاہر ہوئے اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ آپ تھے بھی تو بیٹے جناب پیغمبرؐ خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے۔ اس دعوے کی دو دلیلیں ہیں۔ اوّل یہ کہ نواسہ بجائے بیٹے کے ہوتا ہے۔ اسی جہت سے عیسیٰ بنی اسرائیل کہلائے۔ دوسری دلیل یہ کہ حضرت نے دونوں کو متبنیٰ کیا تھا۔

حضرت رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ حسنؑ اور حسینؑ سردار ہیں بہشتی جوانوں کے ــــــ اس آئینہ محمدی ہونے کا اثر یہ ہے کہ

محبت حسینؑ محبت رسولِ خدا ہے اور عداوت ان کی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عداوت"۔ (۹۲)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ان تمام احادیث کو نقل کیا ہے جو عام طور سے مشہور رہیں اور ان پر مہر توثیق ثبت کی ہے مگر نہ جانے کیسے عالم تھے کہ کربلا میں لشکر یزید کے ساتھ کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انہوں نے قتل حسینؑ کے فتوے دے دیئے تھے۔

تحیّر میں پڑ جاتی ہے عقلِ انسانی، جب انس بن مالک جیسے بزرگ صحابی ایک روایت کے مطابق لشکر یزید کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ امامؑ نے انھیں مخاطب کر کے کہا تھا۔

"تم تو جانتے ہو، نانا نے میرے لئے کیا فرمایا تھا ـــــــ"

"بوڑھا ہو گیا ہوں، حافظہ کچھ کام نہیں کرتا ـــــــ!" انسؓ نے جواب تو دے دیا مگر فوراً ہی لوگوں کی آڑ میں ہو گئے تاکہ رسولؐ کا نواسہ پھر ان سے کوئی سوال نہ کر سکے، اس کے بعد ہی وہ کربلا سے چلے گئے۔ تحیّر خیز ہے انسؓ جیسے بزرگ صحابی کی کربلا میں موجودگی، پھر یہ خیال آتا ہے کہ جس طرح انہوں نے قتلِ حسینؑ کا فتویٰ یزید کی مروّت یا دباؤ میں دے دیا تھا، ویسے ہی شاید ہمت بڑھانے کے لئے چلے بھی آئے ہوں، خدا کرے یہ روایت غلط ہو!

امامؑ کے بعد دوسری معظمہ جناب زینبؑ تھیں جو ۵ جمادی الاوّل ۶ھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ علیہ منزلت ماں کی عظیم بیٹی کربلا سے قبل چادر اور چہار دیواری کی وارث تھیں۔ آپ عمر میں دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھیں مگر بھائی آپ کو ماں کا قائمقام قرار دیتے۔ خود باپ کی نظر میں بھی آپ کا بڑا درجہ تھا۔ مرنے سے قبل کئی وصیتیں کی تھیں اور آپ کے بازو بھی چومے تھے۔

آپ کی شادی عبداللہ بن جعفر طیار سے ہوئی تھی۔ شوہر کی اجازت سے آپ امام علیہ السلام کے ساتھ آئی تھیں اور عبداللہ خود دونوں بیٹوں عون و محمد کو ماموں کی فداکاری کے لئے دورانِ سفر آکر پہنچا گئے تھے۔

آپ کی چھوٹی بہن جناب ام کلثوم تھیں جو ۸ھ میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا عقد عبداللہ

کے چھوٹے بھائی محمد ابن جعفر کے ساتھ ہوا تھا۔ محمد کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپ لا ولد تھیں بڑی بہن کی طرح آپ بھی بھائی کو بہت چاہتی تھیں اور اس سفر میں ساتھ آئی تھیں حفظِ مراتب میں آپ کے بعد حضرت عباس تھے۔ علیؑ کے بہادر بیٹے۔ آپ کا شمار شجاعانِ عصر میں ہوتا تھا۔

۴ شعبان ۲۶ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ روایاتِ معتبرہ کی رو سے حضرت امیرالمومنینؑ نے خاندان کی شجاعت دیکھ کر آپ کی والدہ گرامی فاطمہ بنت خزام کلابیہ سے شادی کی تھی کہ بہادر بیٹے پیدا ہوں، چنانچہ حضرت عباس، جناب عبداللہ، جناب عثمان، جناب جعفر، چار بیٹوں کی ماں کی حیثیت سے آپ کی کنیت اُم البنین پڑ گئی۔

چاروں بیٹے اس لحاظ سے نجیب الطرفین تھے۔ شجاعت کا خون ان کی رگوں میں تھا اور بہادری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ والدین کے مطیع، خانوادۂ رسالت میں ہوتے ہوئے بھی اولادِ فاطمہؑ کے فرماں بردار تھے۔ خدا اور رسولؐ کی معرفت اس درجہ تھی کہ عبدالصالح کہے جاتے ہیں۔ عبداللہ ابن عباس کی بیٹی ذکیہ عرف لبابہ آپ کی شریکِ حیات تھیں۔ جن سے دو بیٹے پیدا ہوئے فضل اور عبیداللہ۔ یہ اُم البنین کا کلیجہ تھا کہ اپنی ساری کائنات امام حسینؑ کے ساتھ کر دی تھی اور اس کو حضرت اُم البنین کی پرورش کا اثر ہی کہنا چاہیئے کہ شمر ذی الجوشن نے جب شبِ عاشور آپ کو امان نامہ پیش کیا تو آپ نے اس کو نہایت حقارت کے ساتھ پھینک دیا۔

آپ شکل و صورت میں علیؑ سے بہت مشابہ تھے مگر پستہ قد نہ تھے بلکہ لانبے تڑنگے، پاؤں رکاب سے باہر نکل جاتے اور ہاتھ اتنے لمبے کہ ہاتھ سمیٹ کر گھوڑے کی لگام پکڑتے۔ عرب و عراق کے شجاعانِ روزگار میں شمار ہوتا۔ خوبصورتی کا یہ عالم کہ قمر بنی ہاشم کہے جاتے اور دل درد مند ایسا رکھتے کہ بچے بوڑھے سب آپ کے گرویدہ تھے اور شجاعت ایسی کہ ہر ایک کی امیدوں کا مرکز تھے۔ صحیح معنیٰ میں مشکل کشا کے بیٹے حضرت امام حسینؑ کو بھی عباسؑ پر اتنا اعتماد تھا جتنا پیغمبرِ اسلامؐ علیؑ پر کیا کرتے تھے۔

حضرت عباسؑ کے بعد حضرت علی اکبرؑ کا نام آتا ہے جو حضرت اُم لیلیٰ کے بطن سے

۸ محرم ۳۳ھ کو مدینے میں پیدا ہوئے۔ شکل و صورت اور رفتار و گفتار میں آنحضرتؐ سے بہت مشابہ تھے۔ اس لئے شبیہہ رسولؐ کہے جاتے۔ آپ کو جناب زینبؑ نے پالا تھا مگر اپنے حسن اخلاق میں ہر دلعزیز تھے اور بہادر ایسے کہ میدان جنگ کی ہر امید آپ سے وابستہ کی جا سکتی تھی ـــــ عمر سعد نے ماں کے رشتے سے آپ کو امان کی پیش کش کی تھی مگر آپ نے چچا عباس کی طرح اس کو ٹھکرا دیا۔

امام حسین کے سب سے بڑے بیٹے کا نام بھی علی تھا مگر آپ سید سجاد کے نام سے پکارے جاتے۔ زہد و عبادت میں اتنے مشغول رہتے کہ زین العابدین بھی کہے جاتے۔ یزدجرد کے نواسے تھے مگر شان فقیرانہ رکھتے۔ کربلا پہنچنے تک اچھے خاصے تھے جنگی ماحول کو دیکھ کر ہتھیار منگوائے کہ اپنے کو میدان کے لئے تیار کریں کیونکہ ایک عرصے سے زرہ لگانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ سب سے پہلے زرہ پہنی جو تنگ ہو گئی تھی۔ آپ نے اتارنے کی کوشش کی تو اتر نہ سکی۔ آپ نے جوش شجاعت میں اس کو پھاڑ ڈالا۔ زرہ تو پھٹ گئی مگر آپ پر اس کا اتنا اثر پڑا کہ اسی وقت تپ چڑھ آئی اور یہ تپ عصر عاشور تک بڑھتی ہی رہی۔

آپ کی ولادت جمادی الاوّل ۳۸ھ میں جناب شہر بانو کے بطن سے مدینے میں ہوئی۔ ولادت کے بعد ہی والدۂ گرامی چل بسیں۔

شکل و صورت میں آپ علی بن ابی طالب سے اور کردار و گفتار میں آنحضرتؐ سے ملتے جلتے تھے۔ بشاش چہرہ، بلند بینی، سفید گردن، فراخ سینہ، پنڈلیاں پتلی تھیں مگر ہاتھ مضبوط تھے۔ جوہر شجاعت میں نسلی وراثت کے حامل لیکن اس کے مظاہرے کا موقع ہی نہیں آیا۔

ان شخصیتوں کے ساتھ امام حسینؑ کے کئی بھائی، امام حسنؑ اور حضرت مسلمؑ کے بچے اور دیگر بنی ہاشم تھے۔ ان میں ایک معظمہ جناب فضہؒ بھی تھیں۔

جناب فضہ ایک حبشی خاتون تھیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب شاہان حبش سے ملتا ہے نام نامی میمونہ تھا مگر امیرالمومنین نے فضہ کہہ کر پکارا کیونکہ فن کیمیا کی ماہر تھیں فاطمہ زہراؑ

کے گھر میں آپ کا درجہ کنیز کا تھا لیکن حقیقتاً برابری کی حیثیت حاصل تھی۔ گھر کا کام ایک دن جناب فاطمہؑ کرتیں، دوسرے دن جناب فضہؒ۔ حسنینؑ آپ کو ماں سے کم نہ سمجھتے۔

جناب فاطمہؑ کی زندگی تک آپ نے شادی نہیں کی۔ پھر امیرالمومنین نے آپ کو ابو ثعلبہ حبشی کے عقد میں دے دیا۔ ابو ثعلبہ کے انتقال پر ابو سلیک غطفانی سے آپ کا نکاح ہوا۔ عملی طور پر آپ اہلِ بیت میں شامل تھیں جس کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا اور کربلا میں تو آپ نے وہ کردار ادا کیا کہ سر آپ کی عظمت کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ کربلا کے بعد آپ نے زیادہ گفتگو کرنا بند کر دیا تھا۔ جب بات کرتیں تو آیاتِ قرآنی میں، جس سے قرآن پر آپ کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

علیؑ کے گھر کی کنیز دن کا جب یہ عالم تھا تو گھر والوں سے قرآن کا کیا ربط رہا ہوگا اب اس کو امت کی بدنصیبی ہی کہنا چاہیئے کہ وہ اس گھر کو چھوڑ کر تفسیرِ قرآن کے لئے پاس بیٹھنے والوں کے دروں کی خاک چھانتی رہی اور ہر در سے ایک نیا مفہوم پا کر آج تک بھٹک رہی ہے۔ اسی سے ہم کو اختلات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم نے رسول و قرآن دونوں کو غلط سمجھا ہے۔ ان سے منسّنہ مطالب کے سوا کوئی کچھ اور کہتا ہے تو ہم اس کو صحیح نہیں مانتے۔

آغازِ جنگ

امام حسینؑ اور آپ کے انصار سب سمجھ چکے تھے کہ ہٹ دھرم بنی امیہ اپنے ارادوں سے باز نہ آئیں گے۔ حالانکہ امام نے اپنی طرف سے صلح و آشتی کا ہر دروازہ کھول دیا تھا۔ نسلی سیادت اور ذاتی شرافت کا ہر مظاہرہ آپ کی طرف سے ہوا تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف حُر ابن یزید الریاحی بلکہ بہت سے دوسرے لوگوں کے قلوب میں ایک ہلچل مچ گئی تھی، ذہنوں میں ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ انہوں نے سُنا کچھ اور تھا، اور دیکھا کچھ اور۔ رسولؐ کا نواسہ جس منزل پر کھڑا تھا، وہاں ان کو انبیاء کے پیر ڈگمگاتے دکھائی دے رہے تھے۔ محسوسات کی شدت میں اندر سے ایک آواز آ رہی تھی۔ جان بوجھ کر بھی حق کا ساتھ نہ دینا بزدلی ہے مگر یقینی موت کے منہ میں پھاند پڑنا بھی کچھ آسان نہ تھا پھر عواقب بھی پیشِ نظر تھے۔ یہ ظالم متعلقین کو تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔

بے شمار لوگ ایک ذہنی کرب اور شعوری کش مکش میں مبتلا تھے کہ ابنِ زیاد کا خط آتے ہی اور شمر ذی الجوشن کے کوفہ سے کربلا پہنچتے ہی عمر سعد نے وقتِ عصر حملے کا حکم دے دیا ـــــ اکثریت کا زعم باطل بھیڑیوں کو بھی شیر بنائے ہوئے تھا۔ یزیدی سپاہ ایک طوفان کی طرح اُمنڈی، اور کالی گھٹا کی طرح خیام عترت اطہار کی طرف بڑھنے لگی۔

امامؑ حالات سے بے نیاز اپنے خیمے میں فرد کش تھے مگر شہزادی زینبؑ ہر وقت چوکنا رہتیں۔ شاید آپ وقتاً فوقتاً پردے کے پیچھے سے جھانکتی رہتیں کہ دشمن کے ارادوں کا اندازہ ہو سکے۔ آپ فوراً بھائی کے خیمے کی طرف دوڑ پڑیں اور کہنے لگیں

"بھیا فوجیں حملے کے لئے بڑھ رہی ہیں ـــــ"

اتنے میں حضرت عباسؑ بھی یہی خبر لے کر آ گئے ـــــ امامؑ جیسے اس خبر کے متوقع ہی تھے۔ آپ نے بغیر توقف کئے حضرت عباسؑ سے کہہ دیا۔

"بھیا! ان سے ایک شب کی مہلت لے لو ـــــ"

حضرت عباسؑ نے عمر سعد کو پیغام پہنچایا۔ عمر سعد خاموش تھا مگر شمر نے مخالفت کی۔ حضرت عباسؑ کا جلال ایک بار پھر ضبط کی زنجیروں سے جکڑ دیا گیا۔ عمر سعد نے عمرو بن حجاج سے مشورہ کیا۔ اس نے مُہلت کے حق میں رائے دی اور عمر سعد نے جنگ کو اگلے دن پر ملتوی کر دیا۔

بنی اُمیہ کے کینہ جُو افسر یہ سمجھ رہے تھے کہ حسینؑ نے مزید غور و فکر کے لئے ایک رات کی مُہلت لی ہے مگر امامؑ نے خود انہیں سوچنے کا موقع دیا تھا اور تلاطم زدہ قلوب کی یکسوئی کے لئے بارہ چودہ ساعتیں فراہم کی تھیں۔ انہیں حُر الریاحی اور دوسرے لوگوں کی ذہنی کش مکش کا بظاہر کوئی علم نہ تھا مگر اتنا جانتے تھے کہ ہزاروں کے اِس مجمع میں سب بھیڑیئے تو نہیں ہو سکتے، کچھ انسان تو ضرور ہوں گے اور صداقت پذیری انسان کے خمیر میں داخل ہے ہو سکتا ہے کہ کسی دل میں ایمان کا کوئی شعلہ چھُپا ہو اور وہ عین وقت پر پھُوٹ پڑے۔

شبِ عاشور

انسانیت کی ضمیر شناسی کا یہ ملکہ امامؑ کا حصہ تھی۔ آپ عفو و درگزر کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے کہ کوئی آنے والا مایوس ہو کر پلٹ نہ جائے ــــــ وہی ہوا کہ حُرؑ سے پہلے اور حُرؑ کے بعد حق شناس آتے رہے اور سرزمین کربلا پر حریّت کے پرچم لہراتے رہے۔

امام کا ایک زاویۂ نگاہ یہ بھی تھا کہ انصار میں اگر کوئی بادلِ نخواستہ محض شرما حضوری میں رُک گیا ہو تو اسے نکل جانے کا موقع دیں، چنانچہ آپ نے شب میں سب کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا۔

"یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں کسی جانے والے کا راستہ نہ روکیں گے جنگ کا انجام ڈھکا چھپا نہیں۔ میں اپنی بیعت اُٹھائے لیتا ہوں، ہر ایک کو آزاد کرتا ہوں، جو اپنی جان بچانا چاہے، وہ چلا جائے۔"

آپ نے چراغ گُل کر دیا تاکہ آنکھ کی مروّت جانے میں مانع نہ ہو ــــ لیکن جب روشنی ہوئی تو سب موجود تھے۔ کسی کا چہرہ تمتما رہا تھا کسی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اصحاب نے باتفاق کہا۔

"مولا! آپ کو اب تک ہماری وفا کا اعتبار نہیں ــــــ آپ فرمائیں تو اپنی گردنوں کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ لیں۔"

بعض نے تلواریں میانوں سے نکال لیں۔ امام نے ان کے لئے کلماتِ خیر استعمال کئے۔ آپ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ آنسو پیتے ہوئے آپ حضرت ابوالفضل العباسؑ اور دوسرے بنی ہاشم سے مخاطب ہو گئے۔

"تم لوگ میرے پارہ ہائے جگر ہو۔ یہ عورتیں میرے پاس رسُولؐ کی امانت ہیں تم ایک ایک کر کے کسی عورت اور بچوں کو نکال لے جاؤ تاکہ وہ ان موذیوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں ــــــ"

حضرت عباسؑ جیسا جری ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ آپ کی آواز امامؑ کے کان میں پڑی۔

"آقا! کیا آپ نے ہمیں اِسی دن کے لئے پالا تھا کہ آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں ــــــ"

امامؑ کے آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے، آپ نے ان کو پونچھ ڈالا اور سر جھکا لیا عورتوں کو لے جانے کی بات آپ نے صرف اتمام حجت کے لئے کہی تھی ورنہ شریک کار امامت کے کربلا سے ہٹ جانے کا سوال ہی کیا تھا۔ بغیر جناب زینبؑ شہادت عظمیٰ مکمل ہی نہ ہو سکتی ـــــ پھر تمام اصحاب اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ بعض ہتھیاروں پر صیقل کرنے لگے، بعض سجادہ عبادت پر جا بیٹھے۔

اسی رات بریر ابن خضیر ہمدانی فرات سے لڑکر پانی لائے۔ اسی رات ہلال ابن نافع نے امام علیہ السلام کے پیچھے پیچھے جاکر وہ مقام دیکھا جہاں امام حسینؑ کی قبر پہلے سے کھدی کھدائی تیار تھی اور جس پر بیٹھی ہوئی جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا بیٹے کی زندگی میں اس کا ماتم کر رہی تھیں ـــــ ہمارا نوحہ و شیون اسی کی تاسی ہے۔ مزار نہیں ملتا تو ہم نقلِ مزار کے قریب بیٹھ کر رو لیتے ہیں۔

تمام رات ہر خیمے میں شمعیں جلتی رہیں کیونکہ اس کے بعد تو رسول کی عترت کو اندھیرے ہی میں بیٹھنا تھا۔ امام ایک خیمے سے دوسرے میں جاکر صبر و شکر کی تلقین فرماتے رہے لیکن جہاں گئے وہاں ایک ہی منظر دیکھا کہ ہر عورت اپنے بچوں کو سرفروشی پر اُکسا رہی تھی۔ جناب زینبؑ عون و محمد سے کہہ رہی تھیں۔

"جعفر کے پوتے اور علی کے نواسے ہو، دادا اور نانا کی لاج رکھ لینا۔ ماں کو رسوا نہ کرنا۔"

اُم فروہ کے خیمے میں پہنچے تو آپ قاسمؑ کو شجاعت دلا رہی تھیں۔

"علی کا خون تمہاری رگوں میں ہے۔ علی اکبر پر سبقت کرنا۔"

اُم لیلیٰ، علی اکبر کے سرہانے بیٹھی ہوئی جوان بیٹے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں اور سمجھاتی جاتی تھیں۔

"رسولؐ کی شبیہہ ہو، دین کی حرمت رکھنے کے لئے جان کو عزیز نہ کرنا اور

پھوپھی کی نظر میں ماں کو سُرخرو رکھنا۔"

اُمِ کلثومؑ اپنے خیمے میں رو رہی تھیں کہ کوئی اولاد ہوتی تو نصرت امام کرتی حضرت عباسؑ نے پہنچ کر تسکین دی۔

"بنتِ رسولؐ! غم نہ کریں۔ غلام آپ کی طرف سے نصرت کرے گا۔"

امام ہر خیمے میں جاتے رہے اور بی بیوں کو تسکین دیتے رہے۔ ربابؑ کے خیمے میں جاکر چہیتی سکینہؑ کو سینے سے لگایا اور تسلی دیتے رہے۔

"میں نہ ہوں تو پھوپھی کے سینے پر سر رکھ کر سو جانا۔"

تین چار سال کی بچی کیا سمجھتی کہ بابا کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے کہا

"مجھے بھی لیتے چلیں ——— !"

امام چیخ کر رو پڑے مگر ضبط کیا اور بولے۔

"پھر بلوا لوں گا ———"

سکینہؑ کی دلدہی تو ہو گئی مگر سمجھی کچھ نہیں۔ پھر آپ زین العابدین کے خیمے میں گئے جہاں زینبؑ تیمارداری میں مصروف تھیں۔ آپ دیر تک جناب زینبؑ سے باتیں کرتے رہے۔ کیا کہا اور جناب زینبؑ نے کیا جواب دیا؟ اس کا پتہ تو نہ چل سکا۔ البتہ دیکھا یہ گیا کہ جناب زینبؑ رو پڑتی تھیں پھر آنسو خشک کر لیتیں۔ اس طرح کافی وقت گزار کر آپ نے اصحاب و انصار کے خیموں کا دورہ کیا۔ بعض کو دُنیا کی بے ثباتی کی تلقین کی، بعض کو رموزِ شہادت سمجھائے اور اپنے خیمے میں آ گئے۔

یہ رات انصار و اصحابِ حسینؑ کی آخری رات تھی۔ اس کا ایک ایک لمحہ ہر ایک نے عبادت میں گزارا۔ اِسی عالم میں نمازِ فجر ادا کی۔ اُدھر یزید کی فوج میں کچھ لوگ بڑے کرب و اضطراب میں جاگ رہے تھے۔ امام حسینؑ نے پہلے خطبے سے جو بے ضمیروں کو جھنجھوڑنا شروع کیا تھا تو اپنے ہر عمل سے چوٹ لگاتے ہی رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ تو صداقت کی ضرب سے تلملا کر ۷ محرم کو امام کی پناہ میں آ گئے۔ کچھ اس کے بعد اور بیچے کھچے آج کی رات ایک بے چینی میں کاٹ رہے تھے۔ آئے تو وہ یزید کے لشکر کے ساتھ تھے۔ قتلِ حسین

ان کا نصب العین تھا لیکن حسینؑ کی مظلومیت اور حق پسندی نے بند آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان میں حر الریاحی سب سے زیادہ بے چین تھا۔ وہ سوچتا:۔

"ہم تشنگی سے جاں بلب تھے، ساقی کوثر کے بیٹے نے اس ریگزار میں ہمیں سیراب کیا جہاں پانی ممکن ہی نہ تھا —— کوئی دشمن کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے —— پھر میں نے انہیں یہ بدلا دیا کہ صحرائی بھیڑیوں کے سامنے لاکر چھوڑ دیا!"

حُر نے دیکھا تھا کہ امامؑ نے جنگ نہ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا مگر یزید کے نمائندوں نے بڑے جارحانہ طور پر ہر شرط ٹھکرا دی۔ حُر نے اپنے کو ٹٹولا تو اندر سے آواز آئی۔

"تو نے جیتے جی جہنم خرید لیا ہے ——"

ایک فیصلہ ہو جانے پر حُر عمر سعد کے خیمے میں آیا اور اس سے سوال کیا

"کیا اب صلح کی کوئی صورت نہیں رہی؟"

"نہیں، قطعاً نہیں —— جنگ ہو گی اور سروں پر سر گریں گے"۔ عمر سعد نے جواب دیا۔ حُر پلٹ پڑا۔ اس کا ضمیر چہرے پر چمک رہا تھا۔ جس سے عمر سعد کچھ سمجھا مگر خاموش ہو گیا اور اپنی جگہ پر پہنچ کر حُر نے اپنے ارادے کا اظہار بھائی بیٹے اور غلام سب سے کر دیا۔

صبح کو جب لشکروں کی صف بندی ہو رہی تھی تو چار گھوڑے عمر سعد کی فوج سے نکلے جو لشکر امامؑ کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔ امامؑ نے مہمانوں کے استقبال کے لئے عباسؑ اور علی اکبرؑ کو بھیجا جو سب کو امامؑ کے حضور میں لائے۔ حُر کے دونوں ہاتھ خود اس کے رومال سے بندھے ہوئے تھے۔ امام نے ان کو کھولا اور سینے سے لگا لیا —— امامؑ کے الفاظ میں کتنا صحیح نام رکھا تھا اس کا، اس کی ماں نے حُر، وہ دنیا میں بھی حُر تھا اور عاقبت میں بھی حُر ہی رہا —— کہا جاتا ہے کہ گھوڑے سے گرنے پر امامؑ نے جناب فاطمہؑ زہرا کا رومال اس کی پیشانی پر باندھ دیا تھا۔ ایک دور میں حُر کی قبر کھولی گئی اور لاش دیکھی گئی تو رومال اسی طرح بندھا ہوا تھا۔ اس کو ہٹایا

گیا تو تازہ خون جاری ہو گیا لہذا رومال کو اسی طرح باندھ کر لاش دفن کر دی گئی۔

تازہ واردانِ بساطِ شہادت میں حُرؔ بن یزید الریاحی کا نام ہمیشہ درخشاں رہے گا اس کے ساتھ عمر سعد کی فوج سے آنے والوں میں اس کا بیٹا علی بن حُرؔ، بھائی مصعب ابن یزید، غلام عروہ بن کبوش اور دوسرے سرفروشانِ مسلکِ حُرّیت بھی ہیں جن میں جوین بن مالک تیمی۔ حارث بن امراء القیس کندی۔ ظہیر بن حسان اسدی، حلاس بن عمر راسبی، زہیر بن سلیم ازدی، جابر بن حجاج تیمی، عبدالرحمٰن بن مسعود تیمی، عبداللہ بن بشر خثعمی، عمرو بن صبیعہ تیمی، قاسم بن حبیب ازدی اور مسعود بن حجاج تیمی شامل ہیں جو کربلا میں یزیدی بن کر آئے تھے لیکن جنّت کی طرف حسینی بن کر سدھار گئے۔

روزِ عاشور

اس دن کے سورج نے طلوع ہو کر جنگ و جدل کا جو منظر دیکھا، ویسے کتنے ہی مناظر وہ دیکھ چکا تھا۔ کفر و توحید کی لڑائیاں، حق و باطل کے معرکے، انبیاء و ملحدین کے محاربے اس کی نظروں سے گذرتے ہی رہے تھے لیکن غروب ہونے سے پہلے کچھ ایسا دیکھا کہ خلّاقِ عالم سے فریادی ہو گیا:۔ " پیدا کرنے والے! تساوت و شقاوت کا یہ نظارا اب کبھی نہ کرانا ورنہ اپنا وجود خود مجھ پر بوجھ بن جائے گا۔" مشیت کا جواب خود وہی جانتی ہے لیکن اس کے بعد سے آج تک نہ کبھی ایسے بے رحم پیدا ہوئے اور نہ اتنے صابر و جری کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کے لشکر کے سامنے مٹھی بھر نفوس اپنی فوج کی صف بندی کریں۔

امام حسینؑ نے جمل و صفین کے معرکے دیکھے ضرور تھے، تلوار کے جوہر بھی دکھائے تھے مگر کمانداری کا یہ پہلا موقع تھا ــــــ صاحبِ ذوالفقار نے جتنی لڑائیاں بھی لڑیں ان میں فوجوں کا یہ تناسب نہ تھا کہ ایک اور کم سے کم پانچ سو ورنہ کم سے کم دو ہزار!

داد دینا پڑتی ہے ان شجاعانِ روزگار کو، جن کی ہمتوں نے اس موقع پر بھی

ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ ہر ایک کا حوصلہ یہ تھا کہ ان سب کو کاٹتے ہوئے کوفے تک پہنچ جائے اور تختِ کوفہ کو اُلٹ دے۔

تعدادِ لشکر کی یوں تو بہت سی روایتیں ہیں۔ دو لاکھ ممکن ہے لیکن مبالغے سے خالی نہیں۔ البتہ چالیس ہزار اور اکہتر ہزار اس دور کی آبادی کو دیکھتے ہوئے قرینِ عقل ہے۔

اس لشکر کی ترتیب میں میمنہ پر عمرو بن حجاج، میسرہ کے سواروں پر شمر ذی الجوشن اور عروہ ابن قیس، پیدلوں پر شیث ربعی افسر تھے۔ قلب میں خود سردارِ افواج عمر ابن سعد تھا اور فوج کا علم اس کے غلام درید کے ہاتھ میں تھا۔

اس کے مقابلے پر امام حسینؑ کے پاس بتیس سوار اور چالیس تربیت یافتہ پیادے تھے۔ باقی عام شہری جو جذبۂ جہاد یا شوقِ شہادت میں آگئے تھے مگر تھے سب تیغ زن اور فنِ حرب میں مہارت رکھنے والے —— امام حسین علیہ السلام نے قلیل فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ دیکھنے میں تعداد زیادہ معلوم ہو اور بڑی سے بڑی یلغار کو بھی روک سکے۔

میمنہ آپ نے زہیرؓ ابنِ قین کو دیا۔ میسرے پر حبیبؓ ابنِ مظاہر کو متعین کیا قلب میں قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباسؑ کو ایستادہ کیا۔ جن کے دوش پر سرورِ کائنات کا وہ علم لہرا رہا تھا جو کبھی حمزہؓ و جعفرؓ اور کبھی علیؑ کے ہاتھ میں رہا تھا۔ عباسؑ کے بعد اسلام کا یہ علم کسی دوش پر نہیں ملا اسی لئے آج تک عباسؑ سے منسوب ہے۔

اسی اثناء میں عمر سعد نے اپنی کمان سے پہلا تیر چھوڑا۔ اس کے ساتھ ہی تیس ہزار کمانیں کڑکیں اور تیس ہزار تیروں کو حسینی سرفروشوں نے ڈھالوں پر روک لیا۔ امامؑ آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ سید القراء بریر ابن خضیر ہمدانی امام کی اجازت سے آگے بڑھے۔ کوفہ کا بچہ بچہ اسّی برس کے اس مجاہد کو جانتا تھا۔ جس نے لٹکتی ہوئی بھوؤں کو پٹی سے باندھ لیا تھا اور خمیدہ کمر کو اس طرح کس لیا تھا

کر سیدھا کھڑا ہو سکے ——— بریرؓ نے خطاب کرنا شروع کیا مگر انہیں ہر بات کا جواب تلخ کلامی سے ملا۔ آخر امام حسینؑ نے انہیں واپس بُلا لیا اور خود ایک ناقہ پر آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے اور ابتدائی تمہید کے بعد فرمایا۔

"میرے قتل میں عجلت نہ کرو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں، سُن لو۔"

آپ نے رسولؐ و قرآن کے احکام پر توجہ دلائی۔ اپنا حسب و نسب بتایا اور پوچھا۔

"میرا جرم کیا ہے ——— ؟"

آپ کی آواز اتنی بلند تھی کہ کوئی نہ سننے کا عذر نہ کر سکے۔ ہر طرف ایک سناٹا طاری تھا۔ آپ نے اپنے شرف کی تائید کے لئے بعض صحابہ کے نام لئے، اس پر شمر نے جواب دیا۔

"خدا مجھے بت پرستوں اور کافروں میں محشور کرے اگر میں نے آپ کا ایک لفظ بھی سمجھا ہو۔"

حبیبؓ ابنِ مظاہر نے کہا

"سیاہ کار! تو نے خدا کی خالص عبادت ہی کب کی۔ بت پرستی اور کفر تیرے بزرگوں کا شعار رہا ہے۔ تیرا حشر بھی ان ہی کا سا ہو گا!"

حضرتؑ نے اپنا خطبہ جاری رکھا

"تم میری فضیلت نہیں مانتے تو اتنا ہی بتا دو کہ میں نے کسی کا قتل کیا ہے جو مجھ سے قصاص لینا چاہتے ہو۔"

اس سلسلے میں آپ نے شیثؒ، حجاجؒ، قیسؒ اور یزیدؒ ابن حارث کے نام لے کر کہا۔

"کیا تم نے مجھے خطوط لکھ کر نہیں بُلایا اور مجھ پر شرعی ذمہ داریاں نہیں ڈالیں؟"

"کلام کو طول نہ دیں۔ ہم نے کچھ نہیں لکھا ——— آپ کو یزید کی بیعت کرنا پڑے گی" شیث ابن ربعی نے جواب دے دیا اور آپ نے ناقہ کو اپنے لشکر کی سمت

واپس پھیر لیا اور اس سے اتر کر ذوالجناح پر سوار ہو گئے ـــــــ اس کے بعد بریرؓ نے مخصوصین کوفہ کو مخاطب کرکے ایک تقریر اور کی۔ جس کا جواب نوک پیکاں سے دیا گیا اور امام نے بریرؓ کو واپس بلا لیا ـــــــ پھر آپ نے دوسرا خطبہ دیا اور بہت سی باتیں کہنے کے بعد فرمایا۔

"میرے سر پر جو عمامہ ہے، وہ رسولؐ کا ہے یا نہیں، جس گھوڑے پر میں سوار ہوں، وہ رسولؐ کا ہے یا نہیں؟"

"کسی بات سے انکار نہیں مگر ہم آپ کو قتل ضرور کریں گے۔" بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں اور زہیر ابن قین اپنی سی کرنے کے لئے بڑھ کر آگے۔

"اگر تم ان کی بات نہیں مانتے تو انہیں قتل تو نہ کرو، اور ان کا مسئلہ براہ راست یزید پر چھوڑ دو ـــــــ"

"ہم تمہارے بہکانے میں آنے والے نہیں۔ تمہارا اور تمہارے سردار کا سر کاٹ کر انعام حاصل کریں گے۔" شمر چلا کر بولا اور ایک تیر زہیر پر مارا۔ جس کو زہیر نے خالی دیا اور ڈانٹ کر بولے۔

"ملعون تو سمجھتا ہے کہ اس طرح ہم رسول کے بیٹے کو چھوڑ دیں گے۔ بخدا ہم نے ایک ساتھ مرنے کا عزم کر رکھا ہے۔"

امام نے زہیر کی آواز سن کر انہیں واپس بلا لیا ـــــــ پھر امامؑ نے تیسرا خطبہ ارشاد فرمایا۔

"تم وہ قوم ہو جو ایمان لا کر کافر ہو گئی ہے۔ افسوس ہے تمہاری جفا اور ستم پرستی پر۔" پوری فوج سر جھکائے کھڑی تھی۔ امام کے شخصی تقدس اور معجز بیانی نے ذہن کے بند دریچوں کو کھول دیا تھا۔ عمر سعد کو بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کی آواز نے طلسمی سکوت کو توڑ دیا۔

"لوگو! یہ حسین ہیں ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ ان کے پاس زبان ہی زبان رہ گئی ہے ـــــــ بڑھو اور اپنا وعدہ پورا کرکے انعام لو۔"

یزید کے نمک خوار آگے بڑھے اور امامؑ کو ایک بڑے گھیرے میں لے لیا۔ امامؑ فرماتے رہے۔

"اہلِ کوفہ و شام! نبیؐ کا نواسہ اتمام حجت کر رہا ہے اور تم سرکشی پر آمادہ ہو ـــــ مالِ حرام کے شعلے تمہارے شکم کے دوزخ میں بھڑک رہے ہیں۔ جہالت و ضلالت کی مہریں تمہارے قلوب پر ثبت ہیں۔"

امامؑ کی آواز پر جو جہاں تھا وہیں رُک گیا ـــــ جنگ سے قبل آپ نے آخری اور یادگار خطبہ دیا۔ جس سے لوگوں کے دل ہل گئے۔ اس خطبے کے آخر میں آپ نے عمر سعد کو انتباہ دیا کہ وہ جس لالچ میں سب کچھ کر رہا ہے، اس کو وہ شئے میسر آئے گی، کوفے میں اس کا سر ایک نیزے پر نصب ہوگا اور لڑکے اس پر پتھر ماریں گے۔

عمر سعد غصّے میں ہونٹ چباتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور اس نے جنگ شروع کرنے کا حکم دے دیا۔

فوجیں ہنگامہ خیز شور و غل کے ساتھ آگے بڑھی ہی تھیں کہ آپ نے ہاتھ بلند کر کے انہیں روکا ـــــ امامؑ کا جاہ و جلال عطیۂ خداوندی تھا۔ کوفہ و شام کے صحرائی بھیڑیئے رعب میں آکر رک گئے اور امام نے ایک بار پھر انہیں دوزخ کی آگ سے بچانے کی کوشش کی مگر عمر سعد کو جلدی تھی۔ اس نے للکار کر آگے بڑھایا اور پنجتنؑ پاک کی آخری شمع بجھانے کے لئے خود بھی سبقت کی۔

بات یہ تھی کہ امام حسینؑ پر فوج کشی کا آوازہ عراق و شام سے نکل کر مکہ و مدینہ تک گونج رہا تھا۔ عمر سعد جانتا تھا کہ حسینؑ کتنے ہی ناطاقت ہوں لیکن پیغمبرؐ اسلام کی شخصیت و حیثیت ان کے ساتھ ہے اس کو خطرہ تھا کہ کسی طرف سے کمک پہنچ گئی تو جنگ کربلا میں ختم نہ ہوگی۔ بنی اُمیّہ کے مظالم کا ردِعمل آتنا طول پکڑے گا کہ کوفہ و دمشق اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔ ابھی تو صرف چند نفوس ہیں جو شیر ہیں مگر انہیں گھیرے میں لیا جا سکتا ہے اور جال پھینک کر گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے لیکن وقت گزر گیا تو یہ ممکن نہ ہوگا، اس لئے اس نے ممکن تعجیل کی اور تیزی کے ساتھ جنگ شروع کر دی

صحرائی بھیڑیئے اور مدینے کے شیر

یہی وہ لمحات ہیں جب حُرّ الریاحی خدمتِ امامؑ میں حاضر ہوئے اور معافی مِل جانے پر سب سے پہلے میدان میں جانے کی اجازت چاہی۔

مہمان کو اس طرح موت کے مُنہ میں جانے کی اجازت دینا خاندانِ رسالتؐ کے شایانِ شان نہ تھا مگر حُرّ بضد ہو گئے۔ آخر امام کو اجازت دینا پڑی۔ حُرّ نے میدان میں پہنچ کر ایک ایمان افروز تقریر کی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اِسی لشکر میں تھے لوگ توجہ سے سننے لگے مگر عمر سعد نے تیروں کی بارش کرا دی۔ باپ کو تنہا دیکھ کر علی بن حر جاپہنچا اور تیر اندازوں پر حملہ آور ہو گیا۔ اس نے چوبیس بھیڑیوں کو تلوار سے کاٹ ڈالا اور تیروں سے چھلنی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ یہ بارگاہِ امامت میں حُرؒ غازی کی پہلی قربانی تھی۔

بیٹے کے بعد بھائی نے حُر کا ساتھ دیا مصعبؒ ابن یزید نے بھی حُر کی طرح شیرانہ حملہ کیا اور ایک سلسلے سے یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں کو خاک و خون میں لتھاڑ ڈالا پھر خود بھی درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

اب غلام کی باری تھی عروہؒ شروع ہی سے قتال کرتا ہوا چلا اور کئی آدمیوں کو جہنم واصل کر کے جنّت کو سدھار گیا۔

حر جنگ آزمودہ سپاہی اور لشکر یزید کے مانے ہوئے تیغ زن تھے۔ درجنوں آدمی زمین پر گرے جن میں زخمی بھی ہوں گے اور مُردہ بھی۔ انجام کار حُرؒ بھی گر گئے۔ دُور سے امام کی زیارت کی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے بعد عمر سعد نے ازدی پہلوان سالم آہن پوش کو میدان میں بھیجا جس کے مقابلے کے لئے لشکر امامؑ سے ظہیر بن حسان اسدی نکلے۔

ظہیرؒ لشکر عمر سعد کے ساتھ کوفہ آئے تھے امام کے خطبات نے انہیں راہِ حق دکھائی اور وہ اس طرف سے نِکل کر چھوٹی سی سپاہِ اسلام سے آملے۔ سالم ظہیرؒ کی

شجاعت سے واقف تھا۔ وہ دیکھتے ہی پریشان ہوگیا اور ظہیرؓ نے نیزے کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

سالم کی جگہ نصر بن کعب نے لی جو سو پہلوانوں پر بھاری سمجھا جاتا تھا اس نے بھی ظہیرؓ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اِدھر آکر کیوں اپنے کو خطرے میں ڈالا۔ ظہیرؓ نے زیادہ بات کرنے کی مُہلت نہ دی اور ایک ہی نیزے میں اس کو بھی ٹھکانے لگا دیا پھر اس کے بیٹے کو مارا۔ اس طرح ۲۷ کوفیوں کو جہنم رسید کیا۔

اب ان کے مقابلے کے لئے حجر الاحجار کو بھیجا گیا جو تین سو آدمیوں کو ایک کمین گاہ میں چھپا آیا تھا۔ اس نے بھاگنے کا فریب کیا اور جب ظہیرؓ تعاقب میں کمین گاہ کے قریب پہنچے تو چھُپے آدمیوں نے تیروں اور نیزوں سے ظہیرؓ کا جسم چھلنی کر دیا۔

اس دوران زیاد و ابن زیاد کے غلام یسار و سالم میدان میں آکر مبارز طلب ہوئے۔ حبیبؓ و بریرؓ شکر امامؑ سے نکلنا چاہتے تھے مگر عبداللہؓ ابن عمیر کلبی دست بستہ خدمت امامؑ میں حاضر ہو گئے۔

عبداللہؓ ابن عمیر محرم کی ابتدائی تاریخوں میں نخیلہ کے قریب معہ اپنی بیوی کے مقیم تھے کہ لشکروں کا اجتماع دیکھا اور دریافت کرنے پر انہیں معلوم ہوا کہ یہ تیاریاں قتلِ حسینؑ کے لئے کی جا رہی ہیں۔ محبت اہلِ بیت نے انھیں نصرت پر آمادہ کیا۔ مومنہ رفیقۂ حیات نے اس موقع پر ساتھ نہ چھوڑا اور آپ نظروں سے بچ کر خدمتِ امامؑ میں حاضر ہو گئے۔ گٹھا ہوا جسم، کشادہ سینہ، چوڑی پیشانی، ہلکا سیاہ رنگ، بلند قامت مولا نے ایک نظر دیکھ کر فرمایا:۔

"مرد جنگ آزما معلوم ہوتا ہے ــــــ"

اجازت پاکر آپ میدان میں آئے۔ یسار و سالم دونوں ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔ آپ نے ایک طرف ہٹ کر پہلے یسار پر نیزے کا وار کیا۔ وہ زمین پر گر گیا اتنے میں سالم اپنی تلوار بلند کر چکا تھا۔ آپ نے اس کی ضرب کو خالی دیا اور تلوار کا بھرپور وار کیا تو سالم بھی اپنے بھائی کے پاس پہنچ گیا۔

عبداللہؒ کے رجز کی آواز خیمے میں پہنچی تو اس کی زوجہ عمود خیمہ ہاتھ میں لے کر باہر نکل آئی۔

"لڑے جا عبداللہ نصرت امام میں ۔۔۔ خاک و خون میں لتھاڑ دے دشمنوں کو!"

امامؑ اس کی آواز سن کر بڑھ آئے اور فرمایا۔

"جہاد عورتوں پر ساقط ہے، مومنہ۔"

اُم وہب خیمے میں واپس چلی گئی۔ اس اثنار میں عمرو بن حجاج نے میمنہ کی پوری طاقت سے حملہ کر دیا۔ دفاع کرنے والوں میں عبداللہ ابن عمیر بھی تھے۔ آپ نے کئی اشقیار کو داخل دار البوار کیا اور زخمی ہو کر اپنی صف میں واپس آئے۔

روایت ہے کہ جنگ مغلوبہ میں مسلم ابن عوسجہ کے بعد عبداللہ ابن عمیر کی شہادت ہوئی تو اُم وہب شوہر کی لاش پر پہنچی۔ چہرے سے خون پونچھتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی

"مجھے فخر ہے کہ تم نے نصرت امامؑ کا حق ادا کر دیا مگر جنت میں داخل ہوتے وقت مجھے بھول نہ جانا۔"

شمر اپنے غلام رستم کو لے کر آگیا اور رستم نے اس زور کا گرز اس کے سر پر مارا کہ اُم وہب شوہر کی لاش پر گر پڑی اور روح پرواز کر گئی۔

اُم وہب کی داخل جنت ہونے کی آرزو منہ سے نکلتے ہی پوری ہوگئی۔ سیّدہ کونین نے یقیناً آگے بڑھ کر اس کو سینے سے لگایا ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ عمارؒ یاسر کی والدہ سمیہؒ، شہادتِ اوّل کا تاج پہنے، عرش کی بلندیوں سے پکار اٹھی ہوں:۔

"حوروں کا تقدس قربان تجھ پر، اے نوعروس شہادت، آ میرے قریب آ، میں تیری بلائیں لے لوں، تو نے مومنات عالم کی لاج رکھ لی۔"

وہ شاید کچھ اور کہتیں لیکن وقت اس سے زائد کا نہ تھا۔ کربلا کی تپتی ہوئی ریت کے ذرّے شہیدوں کے تازے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔

عمرو بن حجاج کا حملہ جاری تھا۔ دین کے سرفروش نابیوں کو منہ توڑ جواب دے

رہے تھے۔ انہوں نے سیکڑوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا مگر خود ان کے بھی کئی ساتھی کم ہو گئے تھے۔ جن کے نام محضرِ شہادت میں ہمیشہ روشن رہیں گے۔

یزید بن زیاد کندی، ۲۸ محرم ۱۳ھ کو کوفے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا قبیلہ عرب کے معزز و معروف قبائل میں تھا۔ نام آپ کا یزید تھا مگر محبِ اہلِ بیت تھے۔ عمر سعد کی افواج میں کوفے سے شامل ہوئے تھے۔ صبح عاشور حُر سے پہلے خدمت میں باریاب ہوئے۔ عرب کے مشہور تیر انداز تھے، بہادر اور جنگ آزما۔ صرف ۸ تیر آپ کے ترکش میں تھے۔ جن میں تین تیروں نے خطا کی۔ پانچ تیروں سے پانچ موذیوں کو ہلاک کیا۔ امام نے آپ کو دُعا دی تھی۔ تیر ختم ہونے پر دست بدست جنگ کی اور شہادت کا شرف حاصل کیا۔ بعض روایات کی رو سے آپ نے بعد نماز انفرادی جنگ کی۔

منجح بن سہم، امام حسنؑ کے غلام تھے آپ نے ایک کنیز سے ان کی شادی کردی تھی۔ حسان بن بکر حنظلی کے ہاتھوں پہلے حملے میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔

عمرو بن خالد ازدی اشرافِ کوفہ میں سے تھے، روپوش ہو کر غیر معروف راستے سے عذیب کے قیام میں امامؑ سے آکر ملے۔ کربلا میں ایمان افروز اور عقیدت آفریں رجز پڑھتے ہوئے کئی دوزخیوں کو قتل کیا، پھر شہادت کے درجے پر فائز ہوئے آپ کے غلام سعد نے بھی آپ کے ہمراہ جہاد و شہادت کا شرف حاصل کیا۔

مجمع بن عبداللہ صحابی امیرالمومنین تھے۔ عبداللہ کو رسولؐ کی صحابیت کا شرف حاصل تھا۔ جنگ صفین کے تیغ آزما اور منزلتِ اہلبیتؑ کے عارف تھے۔ عذیب الہجانات میں امام کی خدمت میں بیٹے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ پہلے حملے میں مجمع اور عائذ بن مجمع دونوں نے شجاعت آفریں جنگ کرکے اپنی جانیں امامؑ پر نچھاور کیں۔

جنادہ بن حارث سلمانی، کوفے کے باشندے اور صفین کے مجاہد تھے آپ بھی مقام عذیب سے امامؑ کے ہمرکاب ہوئے۔ ۱۶ روباہوں کو قتل کرکے شہید ہوئے۔

جندب بن حجیر کندی، کوفے کے شریف زادے اور صفین کے افسر فوج تھے، حُر کے آنے سے قبل امامؑ کے محافظوں میں شامل ہوئے۔ شایانِ شان جنگ کی اور

شہادت پائی ـــــ ایک روایت کی رو سے آپ کا بیٹا حجیر بن جندب بھی آپ کے ساتھ شہید ہوا۔

بریر ان شہیدوں کا کارنامہ ہے کہ یزیدی لشکر ہزاروں زخمی چھوڑ کر بھاگا۔ بریر ہمدانی ان کا پیچھا کر رہے تھے اور رجز پڑھتے جا رہے تھے۔

"میں خضیر کا بیٹا ہوں۔ میری تلوار خون بہاتی بھی ہے اور پیتی بھی ہے۔ یہ قہر خداوندی کا ایک نمونہ ہے۔ اس کا خراج تمہاری گردنیں ہیں!"

بریرؒ المحرم نو سال قبل ہجرت بمقام جدّہ پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی قبیلہ ہمدان ہے۔ کوفہ کے متوطن تھے۔ پیغمبر اسلام کو دیکھ چکے تھے مگر آپ کا شمار امیر المومنین کے اکابر اصحاب میں ہوتا ہے، عالم و فاضل، زاہد و عابد، امر بالمعروف نہی عن المنکر کے عامل تھے۔ حافظِ قرآن تھے اور کوفے کی مسجد میں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عرف عام میں سید القراء کہے جاتے تھے، کئی دینی معرکے آپ سے منسوب ہیں، ایک معتبر روایت کے مطابق کوفے سے چل کر راستے میں امام حسینؑ سے ملحق ہوئے اور ۶۹ سال کے مجاہد کی حیثیت سے جنگ کربلا میں شرکت کی۔

امامؑ کی اجازت سے میدان میں ٹھہر کر اشقیاء کو للکارا۔

"مقابلہ پر ایک ایک آدمی نہ آیا تو ایک ہی حملے میں اس دل بادل کو پارہ پارہ کر دوں گا!"

صف مخالف سے یزید بن معقل نکلا۔ دونوں کے درمیان تلوار چلنے لگی۔ یزید نے موقع پا کر ضرب لگائی، بریرؒ نے ایک طرف جھک کر وار خالی دیا، پھر اتنی بھرپور ضرب لگائی کہ یزید کے دماغ میں در آئی اور وہ جہنم واصل ہو گیا۔

بریرؒ اس نابکار کو ٹھکانے لگا کر سیدھے ہوئے تھے کہ یحییٰ بن اوس نے کمین گاہ سے نکل کر تلوار کا وار کر دیا اور بریرؒ گھوڑے سے گر کر راہیٔ جناں ہو گئے۔

عمرو بن حجاج کا پہلا حملہ ناکام ہو چکا تھا اور انفرادی لڑائی شروع ہو رہی تھی اس پر اس نے کہا:۔

"بیوقوفو! جان توڑ کر کن سے لڑ رہے ہو۔ یہ لوگ جان پر کھیلے ہوئے ہیں۔ تم اس طرح ایک ایک کر کے قتل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہ کرو۔ یہ مٹھی بھر ہیں۔ پتھروں سے انھیں مار سکتے ہو"۔

عمر سعد نے یہ رائے پسند کی اور حکم دیا کہ بھرپور حملہ کیا جائے"

(۹۳)

اب کی دشمن کا میمنہ، میسرہ اور قلب ایک ساتھ حملہ آور ہوا گنتی کے لوگ جن کے مقابل تھے ان میں بھی کئی لوڑھے اور کئی زخمی۔ درندوں کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے بتیس شہسواروں نے نیزوں کو تان کر ان سے ٹکرلی اور پروں میں رخنے ڈال دیئے۔ ان کے پیچھے فوجِ حسینی کے پیدل مجاہد ایک گھٹنا زمین پر خم کر کے بیٹھ گئے۔ تنے ہوئے نیزوں کی نوکوں پر انھوں نے دشمنوں کو دھر لیا۔ سواروں نے نے فوج میں تہلکہ ڈال دیا۔ سیکڑوں زمین پر لنڈ ڈھکنے لگے۔ سیکڑوں زخمی گھوڑوں سے گر گر کر چیخنے لگے۔ فوجیں مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار پر مجبور ہو گئیں۔ عین اسی وقت دشمنانِ دین نے تیروں کی بارش کر دی۔ جس سے سواروں اور پیدلوں نے تیر خالی دے کر یا ڈھالوں کو استعمال کر کے اپنے کو بچا لیا مگر گھوڑے سب کے سب زخمی ہو گئے اور دوبارہ جنگ میں جانے کے قابل نہ رہے۔

اس شدید یلغار میں بھی یزیدی فوج کو منہ کی کھانا پڑی۔ ان کے کشتوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ وہ ہتھیار پھینک پھینک کر جانیں بچا لے گئے مگر حسینی فوج کی اکثریت بھی قتل ہو گئی۔ جن میں امیر المومنین کے سن رسیدہ صحابی مسلم بن عوسجہ بھی تھے ـــــ بعض روایات کے مطابق مسلم بن عوسجہ نے پہلے حملے میں شہادت پائی

مسلم بن عوسجہ اشرافِ کوفہ میں منفرد، عابد و زاہد، صحابی رسولؐ اور مقربِ جناب امیر المومنین تھے۔ جنابِ مسلم کی حمایت میں آپ نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا مگر ہانی و مسلم کی شہادت کے بعد اپنے کو کربلا کے لئے محفوظ کر لیا اور بچ بچا کر بال بچوں سمیت خدمتِ امام میں حاضر ہو گئے۔ آپ کا شمار ان افراد میں تھا جو امامؑ کا محورِ اعتماد تھے

بڑھاپے کی جنگ میں آپ نے جوانی کی یاد تازہ کر دی اور پچاس اشقیا کو داصلِ جہنم کیا۔ مسلم بن عبداللہ اور عبداللہ بن خشکارہ نے دو طرف سے وار کر کے شہید کیا۔

یوں تو امام حسینؑ ہر شہید کے پاس پہنچتے رہے مگر مسلم بن عوسجہ کی لاش پر حبیبؒ ابن مظاہر کو لے کر گئے۔ بازارِ کوفہ میں مسلمؒ و حبیبؒ نے اپنی ڈاڑھیاں خون سے خضاب کرنے کا عہد کیا تھا۔ مسلمؒ نے پہل کی، اور اپنے عزم میں کامیاب ہوئے

حبیبؒ نے کہا:۔

"بھائی مسلم! زندہ رہنے کا حوصلہ ہوتا تو کوئی وصیت کرنے کو کہتا ـــــ"

مسلم بن عوسجہ نے ایک تفاخر سے حبیب کی طرف دیکھا اور پھر امام کے چہرے پر نظر ڈالی اور آہستہ سے کہا:۔

"هٰذا الرَّجُل ـــــ!"

مطلب یہ تھا کہ اس شخص کا ساتھ نہ چھوڑنا ـــــ یہ بات حبیبؒ سے کہنے کی نہ تھی مگر کربلا کے شہیدِ اوّل کے ان جذبات کی ترجمان ہے کہ خود اپنی جان تو قربان ہی کر دی تھی، اب چلتے چلتے دوست کو بھی وصیت کر رہے تھے کہ حق رفاقت میں کوتاہی نہ کرنا۔

کاہے کو دیکھے ہوں گے دُنیا نے ایسے وفادار جو نبیؐ کے نواسے کو ملے تھے۔

جنگِ مغلوبہ کے شہید

جنگِ مغلوبہ کے شہدار کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کچھ مورخین نے پچاس لکھی ہے، کچھ نے اِس سے کم مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد گنے چنے، جاں نثار امام حسینؑ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ جانے والوں میں کوئی نامور ہو یا گمنام مگر کربلا کی تاریخ سب نے اپنے مشترک خون سے لکھی ہے۔

ادہم بن امیہ عبدی بصرے کے ساکن تھے۔ آپ وجد کا مسلک حبِّ اہلبیتؑ تھا۔ امامؑ کی روانگی کی خبر سُن کر چھ آدمیوں کے ساتھ مقام ابطح پر جا کر ملے کربلا تک ساتھ ساتھ رہے اور دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئے۔

امیہ بن سعد طائی، ساکن کوفہ، بہادر، جنگ آزما، مجاہد صفین تھے۔ ۸ محرم کو کربلا پہنچے۔ کئی دشمنوں کو تلوار کا لوہا چٹا کر شہید ہوئے۔

جابر بن حجاج تیمی کوفے کے باشندے تھے، خدمتِ امام میں پہنچنا تھا لہٰذا یزیدی فوج میں شامل ہوئے اور موقع تلاش کر کے امام کی پناہ میں آ گئے، بے جگری سے لڑے اور شہادت کا درجہ حاصل کیا۔

جبلہ بن علی شیبانی، ساکنِ کوفہ، شجاع اور جنگ صفین کے سورما تھے۔ چھپ چھپا کر کربلا پہنچے اور نصرت امام کر کے شہادت پائی۔

جنادہ بن کعب انصاری کا وطنی تعلق یمن کے قبیلہ اوس سے تھا۔ مکّے سے امام کے ہمرکاب رہے۔ جنگ کر کے شہید ہوئے۔

جوین بن مالک تیمی کوفے کی فوج میں شامل تھے۔ صلح کا امکان ختم ہو جانے پر نصرت امام پر آمادہ ہوئے اور مظلوم کی حمایت میں جنگ کر کے شہادت پائی

حارث بن امراءالقیس کندی، عابد و زاہد شجاع تھے۔ امامؑ کے خطبات سے متاثر ہو کر جابروں کی صف سے نکل کر مجبور سے آملے اور جوہر شمشیر دکھا کر شہید ہوئے

حارث بن نبہان حضرت حمزہ کے غلام تھے۔ بڑے بہادر اور شہسوار حضرت علی اور امام حسن دونوں کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔ مدینے سے امام کے ساتھ آئے تھے۔ حق رفاقت ادا کر کے شہید ہوئے۔

حباب بن حارث ثعلبی کی تفصیل کسی تذکرے میں نہیں ملتی۔ آپ نے جنگ مغلوبہ میں شہادت کی فضیلت حاصل کی۔ ممکن ہے کہ فوج یزید کی طرف سے آئے ہوں۔

حباب بن عامر تیمی کوفے کے شیعان علی کی نمایاں فرد تھے۔ ابن زیاد کے ظلم و ستم کے باعث قبیلے میں روپوش رہے پھر کسی طرح خدمتِ امام میں آ گئے اور شہید ہونے کی سعادت حاصل کی۔

جبشر بن قیس نہمی راوی حدیث اور علم دوست بزرگ تھے۔ جنگ مغلوبہ کے شہیدوں میں آپ کا نام ملتا ہے۔

حجاج بن زید بصرہ والوں کے نامہ بر بن کر خدمتِ امام میں بھیجے گئے تھے۔ زمانہ بدل گیا تب بھی ساتھ نہیں چھوڑا اور لڑ کر شہید ہوئے۔

حلاس بن عمر راسبی، امیر المومنین کے دور میں پولیس افسر تھے۔ یزیدی فوج میں شامل ہو کر کربلا آئے تھے مگر حسینی فوج سے آملے اور حق جہاد ادا کر کے شہادت پائے ہوئے۔ آپ کے بھائی نعمان بھی ساتھ ساتھ رہے اور دونوں یکے بعد دیگرے جنت کو سدھار گئے۔

حنظلہ بن عمر شیبانی جنگ مغلوبہ میں شہید ہوئے۔

زاہر بن عمر کندی صحابی رسولؐ تھے۔ آپ کو بیعتِ رضوان کا شرف حاصل تھا جنگ خیبر میں علی کے ساتھ تھے۔ زیاد نے انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی مگر آپ مکہ پہنچ گئے۔ امام کے ساتھ کربلا آئے اور فدا کاری کر کے شہید ہوئے۔

زہیر بن بشر خثعمی نے رفاقتِ امام میں شہادت کا مرتبہ حاصل کیا۔

زہیر بن سلیم ازدی آئے تھے یزیدی فوج کے ساتھ مگر شبِ عاشور اہلِ حق کی فوج میں آکر شامل ہو گئے اور درجۂ شہادت حاصل کیا۔

سلیم غلام تھے امام حسینؑ کے۔ حق وفا ادا کر کے شہید ہوئے۔

سوار ابن ابی عمیر نہمی امام کا حقِ رفاقت ادا کرتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے قبیلے کے لوگ اٹھا لے گئے تھے مگر جانبر نہ ہو سکے۔

سیف بن مالک عبدی بصرے کے باشندے تھے۔ مقام ابطح پہ امام سے آکر ملے۔ کربلا کی جنگِ مغلوبہ میں فوجوں کی یلغار روکنے میں شہید ہوئے۔

شبیب بن عبداللہ، حارث بن سریع ہمدانی کے غلام اور صحابی رسولؐ تھے جنگ جمل، صفین اور نہروان کے مجاہد اور حضرت علی کے فدائی تھے۔ جنگ آزمودہ اور بلا کے تیغ زن تھے، اپنا جوہر انفرادی جنگ میں دکھا نہ سکے پھر بھی نیزہ بازی کا حق ادا کیا اور شہادت کا شرف حاصل کیا۔

شبیب بن عبداللہ نہشلی محبت اہلِ بیت میں امتیاز رکھتے۔ مدینے سے امام

کے ساتھ آئے تھے۔ امیرالمومنین کی تینوں جنگوں کا تجربہ رکھتے تھے۔ لڑے اور خوب لڑے مگر آدمیوں کے طوفان نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہوئے۔

ضرغامہ بن مالک ثعلبی کوفے کے ساکن تھے، راستے بند ہونے کے سبب فوج یزید میں بھرتی ہوئے اور کربلا پہنچ کر امامؑ سے جا ملے اور دوسرے حملے میں شہادت پائی۔

عامر بن مسلم عبدی بصرے کے محبّانِ آلِ رسولؐ میں سے تھے۔ مقام البطح پہ آ کر امامؑ کی حضوری کا شرف حاصل کیا اور کربلا میں بہادری کے جوہر دکھا کر شہادت پائی آپ کے ساتھ آپ کے غلام سالم بھی تھے وہ بھی شہید ہوئے۔

عباد بن مہاجر جہنی اہلِ بیتؑ کے دیرینہ خادم تھے۔ امامؑ کے ساتھ کربلا آئے مرتبۂ شہادت کا امتیاز حاصل کیا۔

عبدالرحمٰن بن عبدالرب انصاری صحابی رسولؐ تھے، اعلانِ غدیر کے شاہد اور راوی تھے۔ کوفے سے آ کر امامؑ کی نصرت کی اور شہید ہوئے۔

عبدالرحمٰن بن عبداللہ ارجی بڑے بہادر اور جنگ آزما تھے، کسی طرح کوفے سے نکل کر کربلا پہنچے، جنگ کی اور شہید ہوئے۔

عبدالرحمٰن بن مسعود تیمی اپنے پدر محترم کے ساتھ یزیدی لشکر میں شامل تھے۔ باپ بیٹے دونوں بہت بہادر تھے۔ ساتویں محرم کو عمر سعد کا ساتھ چھوڑ کر امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عبدالرحمٰن و مسعود دونوں نصرت امامؑ کرتے کرتے شہید ہوئے۔

عبداللہ بن بشر خثعمی مشاہیر کوفہ میں تھے۔ یزید کے لشکر میں شامل ہو کر امام حسینؑ سے لڑنے آئے تھے لیکن توفیق الٰہی دستگیر ہوئی۔ امامؑ کی طرف آ گئے اور شہادت پا کر راہی جناں ہوئے۔

عبداللہ بن یزید قیسی اور عبیداللہ بن یزید قیسی بصرے سے اپنے پدر عالیمقام کے ہمراہ نصرت امام کے لئے آئے تھے اور البطح سے کربلا تک ہمرکاب رہے۔ کربلا میں اپنے باپ یزید بن ثبیط کے ساتھ تلوار کے جوہر دکھائے اور دونوں بھائی جنگ مغلوبہ میں شہید ہوئے۔

عقبہ بن صلت جہنی صحابیِ رسولؐ اور علمِ قیافہ کے ماہر تھے۔ امامؑ کی نصرت میں شہید ہوئے۔

عمار بن سلامہ والانی، جنگ جمل اور صفین و نہروان کے معرکے جھیلے ہوئے بزرگ، رسولؐ کا دور بھی دیکھے ہوئے تھے۔ لڑنے کی عمر گزر چکی تھی مگر نصرت امامؑ اس طرح کی کہ چھکے چھڑا دیئے۔ آخر شرف شہادت حاصل کیا۔

عمار بن حسان طائی شجاع وصف شکن تھے۔ مکے سے امام حسینؑ کے ہمراہ کربلا آئے تھے۔ کئی دشمنوں کو فی النار کیا اور شہادت پائی۔

عمرو بن ضبیعہ تیمی بہادرانِ عرب میں شمار کئے جاتے تھے۔ فہم و فراست سے کام لے کر آپ دشمنوں کی فوج میں بھرتی ہوئے اور کربلا آ کر امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ جہاد کا حق ادا کیا اور شہادت کا مرتبہ پایا۔

عمران بن کعب اشجعی کا نام جنگ مغلوبہ کے شہیدوں میں ملتا ہے۔

قارب بن عبداللہ جناب رباب کی کنیز کے بیٹے تھے۔ مدینے سے امامؑ کے ہمراہ آئے تھے نام جنگ مغلوبہ کے شہیدوں میں ملتا ہے۔

قاسط بن زہیر تغلبی، مقسط بن زہیر، کردوس بن زہیر، امیرالمومنینؑ کے اصحاب میں تھے۔ بالخصوص کردوس لمبے تڑنگے اور تنومند تھے۔ امامؑ حسن کی خدمت میں بھی حاضر رہے۔ جہاد میں شریک رہے اور کوفے میں قیام پذیر ہو گئے۔ امام حسینؑ کے وارد کربلا ہونے پر دشمنوں سے بچ بچا کر کربلا پہنچے۔ جنگ آزمودہ اور تجربہ کار تھے تینوں نے تلواروں کے جوہر دکھائے۔ دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا پھر شہید ہوئے۔

قاسم بن حبیب ازدی کوفے کے محبانِ علیؑ میں سے تھے، بہادر اور شہسوار تھے۔ کربلا پہنچنے کے لئے عمر سعد کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ موقع پاتے ہی سپاہِ اسلام میں آ کر شامل ہو گئے تھے۔ شمشیر زنی کا حق ادا کیا اور شہید ہو کر زندۂ جاوید ہو گئے۔

کنانہ بن عتیق تغلبی زہد و تقویٰ اور عبادت میں منفرد تھے۔ حافظِ قرآن بھی تھے۔

شجاع ایسے کہ اعدار کی یلغار میں سامنے کی دیوار بن گئے اور آپ وجد کے نام کو روشن کیا۔ آپ کے شیرانہ حملوں میں دشمنوں کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔ آخر آپ بھی زخموں کی شدت سے جاں بحق ہو گئے۔

مسلم بن کثیر ازدی کی ایک ٹانگ جنگ جمل میں تیر لگنے سے بیکار ہوگئی تھی مگر امامؑ پر اعدار کی یلغار دیکھ کر بے چین ہو گئے اور کوفے سے کربلا پہنچ گئے۔ نصرت امامؑ کا جذبہ لے کر آئے تھے۔ مرتبہ شہادت پاکر جنت کی طرف چلے گئے۔

منیح بن یزید کے بارے میں پتہ نہ چل سکا کہ کون تھے مگر امام کی طرف سے لڑے اور شہید ہوئے۔

نصر بن ابی نیزر نجاشی شاہ حبش یا شاہ عجم کی اولاد میں تھے۔ ابونیزر صحابیٔ مولاؑ بھی تھے اور صحابیٔ امیرؑ المومنین بھی۔ نصر نے بچپن اور جوانی امیرؑ المومنین اور امام حسن کی خدمت میں گزاری تھی۔ امام حسینؑ نے جب عزم سفر کیا تو نصر آپ کے ساتھ روانہ ہوئے، کربلا میں حق جہاد ادا کیا اور لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

نعیم بن عجلان انصاری صحابی امیر المومنین تھے۔ آپ نے جنگ صفین میں کارگزاری دکھائی تھی۔ کوفے میں یزید گردی ہونے پر چھپ گئے، پھر کسی طرح کربلا جا پہنچے اور دشمنوں کو مار کر شہید ہوئے۔

یہ ہیں امام مظلوم کے وہ سرفروش جنھوں نے جنگ مغلوبہ میں دشمنوں کی لاشوں کے انبار لگا دیئے اور تاریخ عالم میں اکثریت اور غیر متناسب اقلیت کے مقابلے کی ایک نظیر قائم کر دی ـــــ ایسے وفاداروں کی مثال آجتک اقوام عالم کے لئے ایک للکار ہے کہ انہوں نے تیر، نیزہ و تلوار کا ہر حربہ اپنے سینوں پر لیا مگر خانوادہ رسالتؐ کے کسی بچے کو خراش تک لگنے نہ دی لیکن اب بہت تھوڑے سے لوگ بچے تھے، باقی بنی ہاشم تھے ـــــ بچے ہوئے لوگوں کا فیصلہ اب بھی یہی تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں اُس وقت تک آلِ رسولؐ پر آنچ نہیں آسکتی۔

بعض مورخین نے اس حملے کو حملۂ اولیٰ لکھا ہے۔ یہ حملۂ اولیٰ اجتماعی یلغار کے

کے لحاظ سے حملۂ آخری تھا کیونکہ اس کے بعد انفرادی لڑائیاں ہی ہوتی رہیں۔

عراق و شام کے بھیڑیوں نے اس یلغار کے پسپا ہوتے ہی خیامِ اہلِ بیت کو گھیر لیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی نقشہ کشی کی ہے۔

"لڑائی اپنی پوری ہولناکی سے جاری تھی۔ اب بعد دوپہر ہوگئی مگر کوئی فوج غلبہ حاصل نہ کرسکی۔ وجہ یہ تھی کہ حسینی فوج نے تمام خیمے ایک جگہ کر دیئے تھے اور دشمن صرف ایک ہی رُخ سے حملہ کرسکتا تھا۔ عمر سعد نے یہ دیکھا تو خیمے اکھاڑ ڈالنے کے لئے آدمی بھیجے۔ حسینی فوج کے صرف چار یا پانچ آدمی یہاں مقابلے کے لئے کافی ثابت ہوئے۔ خیموں کی آڑ سے دشمن کے آدمی نکلتے ہی قتل ہوگئے۔ جب یہ صورت بھی ناکام رہی تو عمر سعد نے خیمے جلا ڈالنے کا حکم دیا۔ سپاہی آگ لے کر دوڑے۔ حسینی فوج نے یہ دیکھا تو مضطرب ہوگئی مگر حسین نے فرمایا۔ "کچھ پرواہ نہیں جلانے دو۔ یہ ہمارے لئے اور بھی زیادہ بہتر ہے۔ اب وہ پیچھے سے حملہ نہیں کرسکیں گے اور ہوا بھی یہی ـــــــ" (۹۴)

ایسے میں نماز ظہر کا وقت آ گیا۔ ابوثمامہ صائدی نے عرض کیا۔

"تمنا ہے کہ آخری نماز آپ کے پیچھے ادا کرلیں"۔

"خدا تمہیں نماز گزاروں میں محشور کرے"۔ امامؑ نے دعا دی اور کہا۔ "ان ملعونوں سے کہو کہ جنگ روک دیں، ہم بھی نماز ادا کرلیں اور وہ بھی پڑھ لیں"۔

امامؑ کا یہ پیغام پہنچایا گیا۔ اس کا جواب حصین ابن نمیر نے دیا۔

"کتنی ہی نمازیں پڑھ لو، قبول نہ ہوں گی ـــــــ"

سبط رسولؐ کی نماز کو اس طرح کہنے والا بھی مسلمان اور اس کا ولی نعمت بھی رحمتہ اللہ علیہ! اگر یہی اسلام ہے تو یقیناً یہ ابوسفیان اور اس کی اولاد کا اسلام ہوگا۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسلام تو نہیں ہوسکتا۔

اسّی سال کے بوڑھے صحابی حبیبؓ ابنِ مظاہر اس جواب کو برداشت نہ کرسکے آپ نے عرض کیا :-

"مولیٰ۔ اب یہ بوڑھا غلام آپ کے نانا کے پیچھے نماز ادا کرے گا ــــــ"

حبیبؓ ابن مظاہر کی اہلِؑ بیت سے عقیدت مورخین کے رشحات قلم کا موضوع رہی ہے۔ بچپن ہی سے آپ امام حسینؑ کے گرد پروانے کی طرح چکر لگاتے رہتے۔ امامؑ کی خاکِ پا کو آنکھوں سے لگاتے اور اہلِؑ بیت کو بھی آپ سے اتنا لگاؤ تھا کہ جب آپ کربلا پہنچے تو زینبؑ کبریٰ نے در خیمے کے پیچھے کھڑے ہو کر حبیبؓ کو سلام کہلوایا تھا۔ حبیبؓ نے اپنا منہ پیٹ لیا تھا کہ اب یہ وقت آگیا ہے کہ شہزادیاں غلاموں کو سلام کہلواتی ہیں !

حبیبؓ کی یاد آجانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انصارِ امامؑ میں کتنے قلیل جاں نثار باقی تھے ــــــ غرض حبیبؓ نے لٹکتے ہوئے ابرو ماتھے پر کھینچ کر باندھے، کمر کو دوہرے پٹکے سے محفوظ کیا، امامؑ سے اجازت لے کر گھوڑے کو ایڑ دی اور فاسقوں کی آہنی دیوار کے سامنے پہنچ کر للکارے۔

"میدان شجاعت کا شہسوار حبیبؓ آیا ہے"

آپ کی نگاہیں حصین ابن نمیر پر جمی ہوئی تھیں۔ آپ نے بڑھ کر کہا۔

"فاسق و فاجر کے بیٹے! تیری نماز قبول اور فرزندِ رسولؐ کی نماز قبول نہیں ــــ!"

اس کے ساتھ ہی آپ نے حصین پر تلوار کا وار کیا حصین پیچھے ہٹ گیا اور اس کے بجائے بنی اُمیہ کی بھیڑیں کٹنے لگیں۔

حبیبؓ کی تلوار بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ تین روز کے پیاسے تھے مگر غصے میں منہ سے کف جاری ہونے کی کیفیت تھی۔ گھوڑے کو جس صف پر ڈال دیتے۔ دشمن اس طرح بھاگنے لگتے، جیسے شیر کے سامنے سے جنگل کے جانور بھاگتے ہیں

پیرانہ سالی اور شدتِ عطش میں زیادہ دیر لڑنے کی سکت نہ تھی مگر آپ کے جسم میں نہ جانے کہاں کی پھرتی آگئی تھی کہ آج جنگ صفین سے زیادہ سُرعت کے ساتھ آپ

کا ہاتھ چل رہا تھا۔ ساٹھ نابکاروں کو آپ نے قیدِ ہستی سے آزاد کیا اور جو زخمی ہو کر بھاگ گئے ان کی گنتی نہیں۔ یہ جنگ جاری رہتی کہ ایک بزدل نے پیچھے سے نیزے کا وار کر دیا اور رسولؐ کا صحابی، امیرالمومنینؑ کا سرفروش گھوڑے سے گر کر جنت کو سدھار گیا۔

امامؑ نماز سے فارغ ہو کر تشریف لائے تو آپ خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔

عاشور کی نماز

حبیبؓ کا عزم بظاہر برائے جنگ تھا لیکن حقیقتاً وہ تھوڑی دیر کے لئے پوری فوج کا بار اٹھانے کے لئے میدان میں آئے تھے۔ ان کا یہ مقصد پورا ہوا۔ سعید ابن عبداللہ حنیفی اور زہیر ابنِ قین ڈھالوں کو لے کر کھڑے ہو گئے۔ مجاہدوں نے امامؑ کے پیچھے صفیں باندھ لیں۔ ادھر دشمنوں نے تیر برسانا شروع کر دیئے۔ دونوں سرفروش تیروں کو ڈھالوں پر یا اپنے جسموں پر لیتے رہے یا تلوار سے کاٹتے رہے۔ نماز ختم ہوئی تو سعید کا جسم تیروں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ ایک سہ پہلو تیر سینے کو توڑ گیا تھا اور تیرہ ۱۳ تیر مختلف جگہوں پر پیوست تھے۔

امامؑ میدان سے حبیبؓ ابن مظاہر اسدی کی لاش لے کر پلٹے تو سعید کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

ابو ثمامہ عمرو بن عبداللہ صائدی عرب کے نامور شہسوار، جنگ جمل، صفین و نہروان کے مجاہد تھے۔ کوفے سے خفیہ طور پر نکل کر نافع بن ہلال کے ساتھ کربلا آئے تھے آپ بھی اسی ظہر کے ہنگامے میں شہادت یاب ہوئے۔

نماز ظہر کے بعد

امامؑ کا میمنہ اور میسرہ سب خالی ہو چکا تھا۔ آپ نے بڑی حسرت کے ساتھ داہنے اور بائیں دیکھا اور ایک عبرت انگیز اور ایمان افروز خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں شہداً کے درجاتِ عالیہ پانے کی توثیق تھی۔ ہر ایک نے جواباً عرض کیا۔

"ہمارا یقین اس منزل پر ہے کہ پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں تب بھی ان میں کوئی اضافہ نہ ہو گا!"

اس کے بعد ہر فرد ش آگے جانے میں پیش قدمی کرنے لگا۔ سب سے پہلے زہیرؒ ابن قین بجلی نے اجازت لی۔

آپ بڑے زاہد و دیندار، عبادت گزار و بہادر تھے۔ ایمان کی روشنی دیکھ کر راستے سے امامؑ کے ساتھ ہو لئے تھے۔ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں آئے اور مقابل طلب کیا تو اس قدر ضعیف آدمی کا سامنا کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ ایک سبب زہیر کی سماجی منزلت بھی ہو سکتی ہے۔ ایک عجیب بات تھی ناصرانِ حسینؑ میں کہ دیکھنے میں کتنے ہی کمزور و ناتواں ہوں مگر رزمگاہ میں آتے ہی شیر نیستاں بن جاتے تھے ــــــ زہیرؒ سے لڑنے کے لئے جب کوئی نہیں آیا تو زہیر نے خود گھوڑے کو اشارہ کیا اور میمنے پر حملہ آور ہو گئے۔ پھر میسرے پر یلغار کی۔ تلوار اس سرعت کے ساتھ گردش میں تھی کہ سامنے والے کو نگاہ جمانے کا یارا نہ ہوتا اور چشم زدن میں اس کا سر اڑتا نظر آتا۔ یا گھوڑے سے گر کر زمین پر لوٹنے لگتا۔ آپ خود بھی زخم کھانے سے بچ نہ سکے۔ مگر ذرا سی دیر میں ایک سو بیس آدمی خاک و خون میں غلطاں کر دیئے۔ پھر آپ بھی گھوڑے سے گر کر کوثر کے راہی ہوئے۔

امام حسین آپ کی آواز پر دوڑ پڑے۔ سرہانے بیٹھ کر مُنہ پر مُنہ رکھ دیا۔ جنت کی بشارت دی اور لاش اٹھوا کر خیمہ گاہ میں لے آئے۔

اب غلام ابوذرؒ غفاری جون بن حوی اجازت طلب ہوئے۔ امام حسینؑ نے فرمایا۔

"خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہو گئے ہو۔ تم کو مبتلائے مصیبت نہیں کر سکتا۔"

"شاید اس لئے کہ میرا حسب و نسب پست ہے ــــــ میرا خون آپ کے خون میں مل جائے گا۔" قدموں پر سر رکھ کر جونؒ ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگے امامؑ نے اُٹھا کر گلے لگایا اور میدان کی اجازت دی۔

بوڑھے جونؒ نے بھی ایک یادگار جنگ لڑی۔ پروں کے پرے اُلٹ دیئے آخر گھوڑے سے گر کر امامؑ کو آواز دی۔

"مولا۔ میں آپ پر قربان ہو گیا!"

امام علیہ السلام پہنچے۔ جونؓ کا سر اُٹھا کر زانو پر رکھا اور دُعا دی۔

روایت ہے کہ جب بنی اسد نے شہدار کو دفن کرنے کے لئے لاشیں یکجا کیں تو جونؓ کے چہرے پر ایسا نور تھا جو اس سے قبل دیکھا نہیں گیا اور آپ کی لاش سے مشک و عنبر کی خوشبو آرہی تھی۔

حنظلہ بن اسعد شامی اس کے بعد لڑنے آئے۔ حافظ قرآن اور زاہد شب زندہ دار تھے، ہر وقت امامؑ کے آگے آگے رہتے تھے۔ پہلے سے کافی زخمی تھے، پھر بھی کئی آدمیوں کو جہنم واصل کیا اور لڑتے ہوئے مارے گئے۔

حجاج بن مسروق کوفی بلال کے جانشین تھے۔ ظہر کی اذان آپ ہی نے دی تھی۔ میدان میں آکر آپ نے رجز پڑھا۔

"پنجتن کی محبت میں نامردوں سے لڑنے آیا ہوں ــــــ!"

آتے ہی آپ لشکر یزید میں در آئے۔ جس طرف رُخ کیا، لاشیں ہی لاشیں گرا دیں۔ ایک سو سے زائد کافروں کو قتل کیا، پھر درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

عابسؓ قبیلہ ہمدان کی ایک شاخ بنی شاکر کی بزرگ ترین فرد تھے۔ ۲۱ شوال ۹ھ کو مکہ میں پیدا ہوئے مگر کوفہ کے متوطن ہو گئے تھے۔ ابو شبیبؓ صحابی امیرؑ المومنین میں سے تھے۔ ممکن ہے امیرؑ المومنین ہی کے ساتھ کوفہ آئے ہوں۔ عابسؓ جنابِ مسلمؑ کے پرجوش حامیوں میں تھے مگر خط لے کر امام حسینؑ کی خدمت میں جانا پڑا اور پھر قدم قدم پہ امامؑ کے ہمرکاب رہے۔ عاشور کو بہت دیر تک امام کی حفاظت کی۔ وقت آیا تو اپنے غلام شوذبؓ بن عبداللہ کے ساتھ میدان میں آگئے۔ عابد و زاہد، جنگ صفین کے سورما، اتنے معتمد اور ذی عزت کہ مسلمؓ بن عوسجہ، زہیرؓ قین اور حبیبؓ ابن مظاہر کے ساتھ آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ امیرؑ المومنین نے فرمایا تھا کہ بنو شاکر کے ایک ہزار آدمی ہوں تو دنیا میں اسلام کے سوا کوئی مذہب نہ رہے!

میدان میں آکر آپ نے رجز پڑھا۔

حضرت کے قدموں پر مرنے کی قسم کھا کر آیا ہوں مگر مروں گا اُسی وقت جب تمہاری

سیکڑوں عورتیں بیوہ اور صدہا بچے یتیم ہو جائیں۔"

ایسا ہی نعرہ شوذب بن عبداللہ نے بھی مارا۔ لوگ شمشیر عابس کی شعلہ فشانی دیکھ چکے تھے۔ جانتے تھے کہ جو بھی جائے گا، جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ کسی کی ہمت نہ پڑی دور سے پتھر مارنے لگے۔ شوقِ شہادت میں عابس نے زرہ اُتار کر پھینک دی اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ کیا۔ شوذب ساتھ ساتھ تھے۔ دونوں نے ایسی تلوار چلائی کہ دو سو سے زائد کوفیوں کی لاشیں گرا دیں، پھر دونوں نے یکے بعد دیگرے جامِ شہادت نوش کیا۔

عروہ بن حراق انصاری کے چودہ پندرہ سالہ بچے نصرت امامؑ کے لئے کربلا آئے تھے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ امامؑ نے اُن کو دہشتِ جنگ پر محمول کیا اور ان سے کہا کہ وہ بچ کر نکل جائیں۔ اس پر وہ رونے لگے اور بولے "ہمیں آپ کی بےکسی پر رونا آ رہا ہے" پھر دونوں نے ہاتھ جوڑ کر اجازت لی۔ میدان میں جا کر تلواروں کے جوہر دکھائے اور موت کی آغوش میں سو گئے۔

حضرت زین العابدینؑ کے ترکی غلام نے بھی میدان میں جا کر جہاد کیا، کئی ناری دوزخ کے حوالے کئے اور خود جنت کی راہ لی۔

جنادہؒ ابن حارث اصحاب امیرالمومنینؑ میں سے تھے۔ کوفے سے چل کر عذیب الہجانات میں آکر امامؑ سے ملے تھے۔ میدان میں آکر آپ نے رجز پڑھا۔

"دشمن کے سامنے کمزور پڑنے والا نہیں ہوں"۔

آپ نے بھی بہت سے دشمنوں کو تلوار کا لوہا چٹایا اور موت کو لبیک کہا۔

معلیٰ بن معلیٰ اتنے شجاع تھے کہ آپ کی تیغ زنی پر دشمن بھی دنگ رہ گئے ۴۰ نابکار آپ کی تلوار سے قتل ہوئے پھر آپ گرفتار ہو گئے۔ عمر سعد نے شرطِ اطاعت پر علاج معالجے کا لالچ دیا مگر آپ نے جواباً تلوار کھینچ لینے کی کوشش کی آخر قتل کر دیئے گئے۔

طرماح بن عدی بن حاتم طائی دو نسلوں سے محبِّ اہلِ بیتؑ تھے۔ امامؑ کو

قبیلہ طے میں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ نہیں گئے تو ہمرکاب رہے اور دشمنوں سے جنگ کی ستر کوفیوں کو موت کے منہ میں پہنچایا اور زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گر گئے بعض روایات کے مطابق عصر کے وقت تک زندہ تھے پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے

سلمان بن مضارب زہیر ابن قین کے چچیرے بھائی تھے۔ بعد ظہر جنگ کی کئی کوفیوں کو موت کا مزہ چکھایا اور شہید ہو گئے۔

عمرو بن قرظہ انصاری کے والد امیر المومنین کے عہد میں حاکم کوفہ تھے۔ عمرو امام حسینؑ کی نصرت کے لئے کربلا پہنچ گئے مگر ان کا بھائی علی لشکر یزید میں رہا جو نافع بن ہلال کے ہاتھوں مارا گیا۔ عمرو نے شجاع باپ کی لاج رکھی، شایان شان جنگ کی اور شہادت پائی۔

نافع بن ہلال جملی، شریف النفس، سردار قوم، شجاع، قاری قرآن، راوی حدیث اور صحابی امیر المومنین تھے۔ آپ کوفے سے آکر لشکر امام میں شامل ہوئے۔ اپنے وقت کے بے خطا تیر انداز تھے۔ میدان میں آکر اپنے فن کے جوہر دکھائے اور بارہ موذیوں کو جہنم رسید کیا۔ تیر ختم ہو گئے تو تلوار نکال لی۔ جفا کاروں نے ان کی لڑائی کے مناظر دیکھے تھے کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی، دور سے ان کو تیروں کی زد پہ لیا۔ اور ان کے بازو شکستہ کر دیئے۔ پھر گرفتار کر کے عمر و سعد کے سامنے لے گئے۔ شمر نے انہیں قتل کر دیا۔

سیف بن حارث اور مالک بن عبداللہ آپس میں چچیرے بھائی تھے۔ امامؑ کی بے چارگی پر روتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اجازت لے کر میدان میں گئے اور مبارز طلب ہوئے مگر کوئی مقابلے پر نہ آیا بلکہ پوری فوج نے گھیر لیا۔ دونوں نے غضب کی شمشیر زنی کی۔ کتنے ہی کافروں کو قتل کر ڈالا اور زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔

ہلال بن نافع کی پرورش امیر المومنین نے کی تھی۔ ہانی و مسلم کی شہادت کے بعد آپ کوفے سے آکر راہ میں امام حسینؑ سے ملحق ہوئے تھے۔ آپ کی عمر پچیس سال تھی بیوی کو لے کر نصرت کے لئے آئے تھے۔ ہلال تیر انداز اور تیغ زن تھے۔ امام کے ساتھ

ساتھ رہنے کی کوشش کرتے۔ فوجِ حسینی میں ایک نمایاں عہدے پر فائز کئے گئے تھے میدان میں آکر آپ نے رجز پڑھا۔

"یمن کے قبیلہ بجلی کا جوان ہوں حسینؑ ابن علیؑ کی تعلیم میرا مذہب ہے ـــــ تم پر حملے سے باز نہ رہوں گا جب تک مجھے موت نہ آجائے!"

فولاد کا خود سر پر، گول ڈھال پشت پر، تیروں سے بھرا ہوا ترکش کمر میں جن کے پر زمردی تھے اور سوفاروں پر عنبر پڑے ہوئے تھے۔ یمنی تلوار حمائل کئے تیز تیز دوڑتے ہوئے سر میدان پہنچے اور تاک تاک کر تیر مارنے لگے۔ ہر تیر پر ایک آواز بلند ہوتی تھی۔ پتہ نہ چل سکا کہ کتنے مرے، کتنے زخمی ہوئے۔ ترکش خالی ہو جانے پر تلوار بے نیام کی اور سر گرانا شروع کر دیئے، مگر خود ان کا جسم بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ آخر زمین پر گر کر موت کی آغوش میں آنکھیں بند کر لیں۔

انس بن حارث اسدی نے آنحضرتؐ سے شہادت حسینؑ کی خبر سنی تھی اور نصرت کے لئے جی رہے تھے۔ کتنے بوڑھے ہوں گے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مگر امام کے ساتھ آئے تھے۔ ناتوانی میں موت سے بے نیاز ہو کر لڑے۔ مارے تو کم زخمی زیادہ کئے اور شہادت کی آرزو پوری کر کے موت کی آغوش میں سو گئے۔

زیاد بن عمر ہمدانی، عابد و زاہد، شجاع اور تہجد گزار تھے۔ آپ نے بہت سخت جنگ کی پھر مرادِ شہادت حاصل کی۔

اسلم بن عمرو امام حسینؑ کے ترکی النسل غلام تھے۔ میدان میں بڑی سرفروشی دکھائی۔ کئی کوفیوں کو مارا اور شہید ہوئے۔

سالم بن عمرو کوفہ کے قبیلہ بنی المدینہ کے غلام تھے۔ رفاقتِ مسلمؑ میں گرفتار ہو گئے مگر موقع پا کر بھاگ نکلے اور روزِ عاشور ایک ہولناک جنگ کر کے مارے گئے۔

سعد بن حارث امیرؑ المومنین کے غلام تھے۔ مدینے سے امام حسینؑ کے ساتھ آئے تھے۔ میدان میں دادِ شجاعت دی اور شہید ہوئے۔

عمرو بن جندب حضرمی جنگ صفین و جمل کے سورما اور رجعت امیرؑ المومنین میں

سرشار تھے۔ شہادت مسلم کے بعد کسی طرح امام کی خدمت میں پہنچے اور جہاد و شہادت کا شرف حاصل کیا۔

قعنب بن عمرو نمری بصرے سے آئے تھے، مقصد نصرت امام تھا جو میدان میں پورا کیا، کئی آدمیوں کو دوزخ دکھا کر شہید ہوئے۔

یزید بن ثبیط عبدی بصرے سے اپنے دو بیٹوں عبداللہ اور عبیداللہ کو لے کر آئے تھے، صرف نصرت امام کے لئے۔ کس طرح لڑے ہوں گے؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تینوں نے مل کر ایک یادگار جنگ کی اور شہادت پائی۔

یزید بن مغفل جعفی جنگ صفین کے بہادر تھے۔ باپ کے وقت سے آل رسولؐ کے شیدا تھے، بڑی فداکاری دکھائی اور شہید ہوئے۔

رافع بن عبداللہ مسلم بن کثیر اعراج کے غلام تھے۔ بعد ظہر جنگ کر کے شہید ہوئے۔

سوید بن عمرو کندی، حضرموت کے متوطن، کوفہ میں بنی کندہ کے مقیم تھے چھپ چھپا کر کربلا پہنچے۔ نصرت امامؑ کا حق ادا کیا اور شہید ہوئے۔

سوید بن عمرو خثعمی بڑے عابد و زاہد تھے، اتنے ضعیف کہ تلوار اٹھانا مشکل تھا میدان میں آ کر بے دینوں کو بہت سمجھایا کہ مجھے قتل کر دو مگر نبیؐ کے نواسے کو چھوڑ دو جواب وہی ملا جو دوسروں کو ملتا رہا تھا۔ شیر بوڑھا ہو گیا تھا مگر تھا شیر ہی، ایک غضبناک حملہ کیا اور جو سامنے پڑا اس کو گرا دیا۔ آخر میں خود بھی گر گئے۔ دشمنوں نے اسی وقت آپ کا سر کاٹ لیا۔

بائیس چوبیس نام اور ملتے ہیں جن کے بارے میں جہاد و شہادت کی روایات پائی جاتی ہیں مگر انہیں معتبر نہیں کہا جا سکتا۔ بعض آدمی وہ بھی ہیں جو سخت زخمی ہوئے تھے، لوگ اٹھا لے گئے، کچھ بچ گئے اور کچھ جنت کو سدھار گئے۔

بنی ہاشم رزم گاہ شہادت میں

اب صرف حسینؑ رہ گئے تھے اور رسولؐ کی اولاد۔ دوپہر ڈھل رہی تھی جناب فضہ سیدانیوں کو لمحے لمحے کی خبر پہنچا رہی تھیں اور عترتؐ اطہار کے خیموں میں ایک

قیامت برپا تھی۔ مایوسیوں کے اس اندھیرے میں جناب زینبؑ بھی پریشان ہو رہی تھیں بھائی نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر بھی عورت ذات کے کمزور پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ بالآخر ان کی سخت آزمائش کا وقت آ ہی گیا اور علی اکبرؑ ہاتھ جوڑ کر سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

"پھوپھی جان، جانے کی اجازت چاہتا ہوں؟"

اکثر مورخین اور علماء نے حضرت علی اکبرؑ کو آخری شہید لکھا ہے مگر بعض اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان میں سید العلماء سید علی نقی اور علامہ رشید تُرابی اعلی اللہ مقامہما سر فہرست ہیں اور اس خیال کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ امام علیہ السلام نے بارگاہِ احدیت میں پہلی قربانی اپنے چہیتے بیٹے کی دی ہو گی۔ جس طرح اصحاب میں حضرت مسلمؒ بن عوسجہ کو مقدمہ شہدا ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کی ایک توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شبیہہ رسولؐ کو بھیج کر ایک بار پھر بانیٔ دین کی یاد تازہ کرا دیں کہ شاید ان میں کوئی صاحب ایمان رہ گیا ہو جو اس منزل پر بھی سنبھل جائے اور آپ کسی اور کو قصر مذلت سے نکال لائیں۔

اوّل وقت ظہر سے آخرِ عصر تک کا دورانیہ ایک قیاس کے مطابق پانچ گھنٹے کا ہو سکتا ہے اس میں بارہ چودہ بنی ہاشم کی انفرادی جنگ کو دیکھتے ہوئے وقت کی تقسیم قدرے مشکل نظر آتی ہے کیونکہ اس میں امام حسینؑ کے خطبات بھی شامل ہیں لیکن شہداء کی لڑائی کی تفاصیل کا زیادہ اختلاف بھی نہیں ہے۔ لہذا یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ اشقیا کی یلغار کو روکنے کے لئے ایک سرفروش کی شہادت کے فوراً بعد دوسرا میدان میں پہنچ گیا اور اس نے اپنی تلوار پر پورے لشکر کو روک لیا جس میں پہل شبیہہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ نے کی۔

پھوپھی کے دل کو پہلے سے دھڑکا لگا ہوا تھا مگر بے کس عورت کرتی بھی تو کیا کرتی، خود اس کی مہم کا وقت سر پر آ رہا تھا۔ حسینؑ کی ماں جائی نے درد آمیز مکالمہ کے بعد علی اکبرؑ کو اجازت دے دی۔ پھر علی اکبرؑ نے ماں کا مرحلہ سر کیا۔ امامؑ کی رفیقۂ حیات

قیاساً سب کچھ سمجھ چکی تھیں۔ سیدہ زہرا کی بہو تھیں۔ دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے بھی بیٹے کی بلائیں لیں اور رخصت کر دیا۔ پورے خاندان کا ہر دلعزیز نوجوان میدان کو جا رہا تھا اور جانے والوں کا انجام ہر ایک دیکھ چکا تھا۔ علی اکبرؑ عورتوں اور بچوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے تھے۔ ایک ایک سے گلے ملے۔ سب کے آخر میں دادی فضہؑ کو سلام کیا۔ سکینہؑ کو گود میں لے کر پیار کیا اور پردہ اُٹھا کر باہر جانے کا عزم کیا مگر کسی نہ کسی نے روک لیا۔ آخر کئی بار ٹھہرنے کے بعد وہ باہر آسکے۔

امام حسینؑ نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا۔ علیؑ کی تلوار حمائل کی، زرہ پہنائی رسولؐ کے گھوڑے عقاب پر سوار کیا اور ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔

"بارالٰہا! اب میں نانا کی زیارت سے محروم ہو جاؤں گا۔ تو اس کی حفاظت کرنا۔"

علی اکبرؑ کا جانا عورتوں ہی کے لئے نہیں، مردوں کیلئے بھی حشر انگیز تھا۔ ہر ایک نے ان کو روک کر پہل کرنے کی کوشش کی۔ بالخصوص حضرت عباسؑ تو اپنے ہوتے کسی کے بھی جانے کے قائل نہ تھے اور اکبرؑ تو ان کی آنکھوں کی روشنی تھے مگر حکم امامؑ سے مجبور ہو گئے۔ اکبرؑ سب سے باری باری گلے مل چکے تھے۔ چلتے وقت پھر سب کو سلام کیا اور گھوم گھوم کر دیکھتے ہوئے میدان میں جا پہنچے۔

"علیؑ کا پوتا اور حسینؑ کا بیٹا ہوں ـــــ وہ تیغ زنی کروں گا کہ دادا کی یاد تازہ ہو جائے!"

بار بار مبارزت پر بھی کوئی مقابلے پر آنے کی ہمت نہ کر سکا تو علی اکبرؑ نے خود قلب پر حملہ کر دیا۔ صفیں کے بھاگے ہوئے لوگ پھر بھاگنے لگے۔

دادا کے بعد پوتے کو پیٹھ دکھاتے کسی کو شرم نہ آئی۔ تین دن کے بھوکے اور پیاسے نے ایک سو بیس آدمیوں کو تہہ تیغ کیا اور امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپ نے پیاس کم کرنے کے لئے منہ میں ایک انگوٹھی دے دی اور علی اکبرؑ پھر رزم گاہ میں پلٹ گئے۔

ابن سعد نے لالچ دے کر بمشکل ایک نامور پہلوان طارق بن شیث کو مقابلے کے لئے بھیجا مگر یہ ایک لمحے کی بات تھی۔ نیزے کا پہلا ہی وار طارق کی پشت توڑ کر

نکل گیا۔ اس کے بعد اس کے دو بیٹے عمر طارق اور طلحہ طارق آکر مقابل ہوئے۔ اکبرؑ نے عمر کو قتل کر دیا اور طلحہ کا گریبان پکڑ کر پچھاڑ دیا۔ یہ دیکھ کر عمر سعد نے مصراح بن غالب کو حکم دیا، وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔

لشکرِ یزید میں ہلچل پڑ گئی۔ اب محکم بن طفیل اور ابن نوفل دو ہزار کے لشکر سے حملہ آور ہوئے۔ اکبرؑ نے اس لشکر کو بھی اُلٹ دیا اور پیاس کی تاب نہ لاکر پھر باپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ امام نے فرمایا۔

"جاؤ، ساقیٔ کوثر تمہیں سیراب کریں گے ــــــ!"

امامؑ کا جواب ہر دریدہ دہن مورّخ کا مُنہ بند کر دیتا ہے اور پانی کے ہر امکان کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ ایک قطرہ بھی ہو سکتا تو نورِ نظر سے عزیز کرتے اور صرف انہیں پر موقوف نہیں، کسی کا امکان بھی ہوتا تو علی اکبرؑ کے لئے کچھ اُٹھا نہ رکھتا۔

علی اکبرؑ پھر واپس ہوئے اور کسی ضیغم گرسنہ کی طرح حملہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ۸۰ بے دینوں کو راہی جہنم کیا۔ اس اثنا میں منقذ بن مرہ اور ابن نمیر نے ایک طرف چھُپ کر نیزے مارے اور ایک نیزے کی اَنی سینے کو توڑ کر پار نکل گئی۔ عنانِ فرس آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ آپ نے گھوڑے کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے اور آواز دی۔

"بابا میری خبر لیجئے ــــــ"

دُنیا امامؑ کی آنکھ میں اندھیر ہو چکی تھی۔ آپ ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلے۔ قریب پہنچ کر گر پڑے اور گھٹنوں کے بل چل کر بیٹے کی لاش پر پہنچے۔ ۱۸ سالہ جوان کا لاشہ خیمے میں لایا گیا تو محسوس ہو رہا تھا کہ گویا پیغمبرِ اسلام سینے پر نیزے کا زخم کھائے پڑے ہوئے تھے۔

امامؑ کی پہلی قربانی بارگاہِ احدیت میں قبول ہو چکی تو عبداللہ بن مسلم، جو امام کی بہن رقیہؑ کے بیٹے تھے، آگے بڑھے۔ ۱۴ سالہ بچے کا پہلا محاربہ تھا مگر عقیل کا پوتا علی کا نواسہ بے خطر ہو کر فوجوں پر ٹوٹ پڑا اور آنکھ جھپکتے ہی لاشیں گرا دیں۔ کوفی سپاہ

شغالان عرب کی طرح بھاگنے لگی۔

مقابلے پر ٹھہرنے کی ہمت کسی میں نہ رہی تھی۔ دُور سے تیر برسنے لگے۔ دفعتاً ابوجرہم اور یقیط بن ایاس نے پہلو میں آ کر سر پر مسلسل تلواریں ماریں اور شہزادہ گھوڑے سے گر گیا۔

جعفرؓ بن عقیل فوراً بھتیجے کی مدد کے لئے پہنچے مگر اس کا رشتۂ حیات منقطع ہو چکا تھا۔ جعفرؓ رجز پڑھ رہے تھے۔

"تم میں کچھ بھی ہمت اور بہادری کا دعویٰ ہو تو امامؑ کی طرف رخ کر کے دیکھو ــــــ"

بزدل ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے لگے۔ شمر سامنے پڑ گیا۔ جعفرؓ نے اس پر حملہ کیا۔ وہ سپاہیوں کی آڑ لے کر خیمے میں جا چھپا۔ جعفرؓ نے میسرے پر ہلہ بول دیا۔ جو سامنے پڑا، اس کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ ڈالا۔ میسرے میں کمی محسوس کر کے عمر سعد نے میمنے کو بڑھایا۔ جعفرؓ کی تلوار چمک رہی تھی کہ بشیر نامی ملعون نے پہلو سے وار کر دیا۔ جعفرؓ زمین پر آ رہے۔ امامؑ جب تک پہنچیں اشقیا انہیں قتل کر چکے تھے۔

عبدالرحمٰن بن عقیل نے امام کی اجازت سے بھائی کی جگہ لی۔ آپ کے حملے نے جنگ مسلم کی یاد تازہ کر دی۔ چند حملوں میں سترہ سوار اور کئی پیادوں کو مار گرایا اور فوج بھاگنے لگی مگر عثمان بن خالد نے پیچھے سے نیزہ مار دیا جو دل میں اتر گیا اور عبدالرحمٰن گھوڑے ہی پر شہید ہو گئے۔

اب حضرت عقیلؓ کے بیٹے موسیٰ بھائی کے جہاد کو مکمل کرنے کے لئے میدان میں آئے تو لشکری ان کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹنے لگے تاہم تیروں کی باڑھ سے آپ کا استقبال کیا گیا مگر آپ رُکنے والے نہ تھے۔ اتفاق سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ پھر تلواروں کی پے در پے ضربوں سے آپ بے جان ہو گئے۔

عبداللہؓ بن جعفر نے دونوں بیٹوں کو اسی دن کے لئے بھیجا تھا۔ بچے احساسِ ذمہ داری میں بڑوں سے کم نہ تھے۔ ماں کی اجازت سے ماموں کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ امامؑ نے تامل کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے گھوڑوں پر بٹھایا اور شہزادے میدان میں

پہنچ کر رجز خواں ہو گئے۔

"عمر و شمر میمنہ اور میسرہ سنبھال لیں۔ جس کو شجاعت پر ناز ہو، وہ سامنے آجائے!"

ابن سعد نے خیمے سے نکل کر دیکھا تو فوجی جوان خیموں کی آڑ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے للکارا۔

"دو کم سن بچوں سے بھاگ رہے ہو، شرم نہیں آتی تمہیں ——"

ابن سعد کے غیرت دلانے پر وہ پلٹے مگر مقابلے پر آنے کے بجائے تیر برسانے لگے عون و محمد تیروں کو خاطر میں نہیں لائے اور نیمچوں کو بلند کر کے ٹوٹ پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے نیمچے، ایسے دشمنوں سے لڑنے کے لئے چھوٹے پڑتے تھے لہٰذا بچے خم ہو کر وار کرتے تھے۔ لڑتے لڑتے عمر سعد کے خیمے تک پہنچ گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس ستم شعار کو قتل کر دیں مگر یہ آرزو پوری نہ ہو سکی —— مجموعی طور پر انہوں نے چوبیس سواروں اور بارہ پیادوں کو قتل کیا پھر عامر بن نہشل نے محمدؑ پر پہلو سے وار کیا۔ انہوں نے گرتے ہوئے بھائی کو آواز دی۔ عون پہنچنے کی سعی میں تھے کہ نیزوں کی انیوں سے گرا دیئے گئے۔

حضرت سیدالشہداء آوازیں سن کر دوڑ پڑے۔ حضرت عباسؑ نے حملہ کر کے بزدلوں کو بھگا دیا مگر زینبؑ کے لال ماموں کا حق ادا کر کے خاموش ہو چکے تھے۔

عبداللہ بن امام حسنؑ بہت حسین و جمیل تھے۔ جنگ کا پہلا اتفاق تھا مگر شیر کے بچے چھوٹی عمر سے شکار کرنے لگتے ہیں۔ شہزادہ چچا سے اجازت یاب ہو کر میدان میں آیا تو علیؑ کا پوتا ہی معلوم ہوتا تھا۔ رجز پڑھ کر بجلی کی طرح قلب لشکر پر کوندنے لگا اور سروں کو کاٹ کاٹ کر پھینکنے لگا۔

شمر سامنے نظر پڑا تو شہزادے نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ وہ بے تحاشا بھاگا تو طناب خیمہ سے اُلجھ کر گر گیا۔ اس کو بچانے کے لئے لشکری بیچ میں آگئے اور شہزادے نے اکیس جوانوں کو خون میں نہلا دیا۔ عمر سعد نے یوسف بن الاحبار کو غیرت دلا کر بھیجا جو سامنے آتے ہی واصل جہنم ہوا۔ باپ کے بعد اس کے بیٹے طارق

نے مقابلہ کیا۔ عبداللہ نے پہلی ہی ضرب شمشیر میں اس کو قتل کر دیا۔ طارق کی جگہ اس کے چچیرے بھائی مدرک بن سہیل نے لی۔ اس کا حشر بھی پہلوں جیسا ہوا۔ اس کے بعد کسی کو سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔

مجبور ہو کر خود عبداللہ نے لشکر کے میمنے پر حملہ کر دیا۔ نتیجے میں فوج کے گھیرے میں آ گئے۔ چہار جانب سے تیروں اور نیزوں کے وار ہونے لگے۔ ہانی ابن ثبیت نے ایک ایسا تیر مارا جو پشت سے سینے پر در آیا۔ اس کے ساتھ ہی عبداللہ بن عقبہ نے پیشانی پر گرز لگایا اور عبداللہ زمین پر گر گئے۔

قاسم بن حسنؑ، تیرہ سال کے بچے اور ام فروہ کی یادگار تھے۔ امامؑ ایسے کسی بچے کو اذن جہاد دینا نہ چاہتے تھے مگر روز قربانی معین ہو چکا تھا۔ پھر حضرت قاسمؑ کو بیوہ حسنؑ حضرت اُم فروہ خود لے کر آئی تھیں اور بڑے بھائی کی وصیت بھی موجود تھی۔ امامؑ مجبور ہو گئے۔

فاطمہ کبریٰ سے حضرت قاسمؑ کا عقد کتنا ہی اختلافی کیوں نہ ہو لیکن قرین عقل ہے آلِ رسولؐ سے امت کا عناد یقیناً امام حسینؑ کے پیش نظر ہوگا لہذا آپ نے کسی بچی کو ناکتخدا نہیں چھوڑا۔ قاسم کو دُولہا بنا کر فاطمہ سے منسلک کر دیا، پھر ایک رات کے بیاہے کو میدان میں بھیج دیا۔

امامؑ کی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ کسی دوشیزہ کو وہ اس طرح چھوڑ گئے تو رسولؐ کے دشمن نہ جانے کس کس طرح مطعون کریں ——— وہی ہوا کہ کچھ اور نہیں ملا تو سکینہؑ بنت الحسینؑ کا افسانہ گھڑ لیا گیا اور نام کی مماثلت کا فائدہ اُٹھا کر تین چار سال کی بچی کو افسانوں کی لپیٹ میں لے لیا گیا۔

قاسم قد و قامت کے لحاظ سے بھی چھوٹے تھے۔ امامؑ نے امام حسنؑ کا عمامہ سر پر باندھا۔ فاطمہؑ زہرا کے رومال کا بازو بند بنایا اور گود میں اُٹھا کر خود گھوڑے پر بٹھایا ——— یہ ایک طنز تھا شجاعان روزگار پر کہ وقت پڑنے پر پیغمبرؐ اسلام کی اولاد اس طرح بھی رزم گاہ میں جاتی ہے اور میدان میں پہنچ کر بساطِ شجاعت پر

جھنڈے گاڑ دیتی ہے ـــــ قاسم کے رجز میں ایک انفرادیت ہے۔

"وہ آئے مقابلے پر جس کو اپنی بہادری کا زعم ہو ـــــ آج کی فتح و شکست حق و باطل کی میزان ہے!"

کمسن بچے نے خود لڑنا تو در کنار، دور سے کسی جنگ کا منظر بھی نہ دیکھا تھا ـــــ مگر بھیڑیوں کے اس جنگل میں اس کے تیور بتا رہے ہے کہ وہ اسد اللہ کا پوتا ہے

ارزق شامی مقابلے پر آیا، اس اعلان کے ساتھ کہ بازو پکڑ کر گھوڑے سے اُتار لے گا لیکن خیبر شکن کی روایات قاسم کے ساتھ تھیں۔ ایک ہزار سواروں پر بھاری شہسوار مقابلے کو عار سمجھتا تھا، اس نے اپنے بیٹے کو آگے بڑھا دیا۔ نیزہ بازی کے ردوبدل میں اس کا خود سر سے گر گیا۔ قاسم نے سر کے بال پکڑ کر اس کو گھوڑے سے کھینچ لیا اور زمین پر پٹک دیا۔

ارزق نے دعویٰ کیا، قاسم نے کر دکھایا اور ارزق کے دوسرے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئے جو بھائی کا بدلہ لینے کے لئے آگیا تھا۔ قاسم نے نیزے کے پہلے ہی وار میں اس کو بھی فی النار کیا۔ تیسرا بھائی مقابل ہوا تو قاسم نے اس کے پیٹ میں نیزہ گھونپ دیا۔ اسی طرح چوتھے کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور ارزق کی طرف دیکھ کر اس کو سامنے آنے کی دعوت دی۔

چار بیٹوں کی موت نے دنیا ارزق کی نگاہوں میں تیرہ و تار کر دی تھی وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ گینڈے کی طرح دوڑ کر قاسمؑ پر حملہ آور ہوا۔ تین روز کا بھوکا پیاسا بچہ، ابھی چار آدمیوں سے لڑ چکا تھا، کچھ پیچھے ہٹا مگر ارزق کا نیزہ گھوڑے کے پیٹ میں گھس گیا۔ قاسم بڑی تیزی سے زمین پر کود پڑے۔

حضرت عباسؑ ابنِ علیؑ دور سے دیکھ رہے تھے آپ بسرعت دوسرا گھوڑا لے کر پہنچ گئے اور مقابلہ پھر شروع ہو گیا۔ جہاندیدہ اور جنگ آزمودہ ارزق یا تو مقابلے کو اپنے لئے ننگ سمجھتا تھا یا اس کو جان بچانا مشکل ہو گیا اور آخر تلوار کے ایک آڑے وار سے اس کا سر گردن سے کٹ کر دور جا گرا۔ قاسم اس سر کو لے کر فاتحانہ

واپس ہوئے اور ماں اور پھوپھیوں سے مل کر پھر میدان میں آ گئے۔

اب کی وہی ہوا جو دوسروں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ کوئی مقابلے کے لئے نہیں نکلا شہزادے کو خود حملہ کرنا پڑا اور آپ کی تیغ برق رفتار نے ستر بہتر لاشیں گرا دیں مگر خود بھی جسم پر ستائیس زخم کھائے۔ آپ فوج میں گھستے چلے جا رہے تھے کہ شیث بن سعد نے پشت سے نیزہ مارا، آپ منہ کے بل زمین پر آ رہے اور آواز دی۔

"چچا ــــ خبر لیجئے!"

امام حسینؑ حضرت عباسؑ کو لے کر جھپٹے۔ سوار بھاگے اور قاسمؑ کی لاش گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو گئی۔ امامؑ نے جسم کے ٹکڑوں کو ایک چادر میں سمیٹا اور ایک چھوٹا سا گٹھڑ لے کر چلے۔ اُم فروہ نے دیکھا تو چیخ مار کر گر پڑیں۔

"میرا قاسمؑ اتنا چھوٹا تو نہ تھا ــــ!"

احمد بن حسنؑ باپ کی شبیہ تھے۔ آپ نے میدان میں پہنچ کر رجز پڑھا اور پڑھتے پڑھتے حملہ کر دیا۔ کبھی میمنے پر کبھی میسرے پر حملہ آور ہوئے۔ اسی بہادروں کو موت کے گھاٹ اتار کر لشکر کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے اور پکار کر پھر رجز پڑھا۔

"جس کے دل میں حوصلہ ہو وہ آ جائے، ورنہ میرے بعد لاف زنی گیدڑ کی آواز ہو گی ــــ!"

لیکن کون مقابلے پر آتا۔ اب تک جو بھی آیا تھا۔ زندہ سلامت واپس نہیں گیا تھا جواب میں ہمیشہ بھیڑیوں کی یلغار ہوئی تھی۔ شہزادے پر دو ہزار سواروں نے حملہ کر دیا۔ آپ نے مزید ساٹھ سواروں کو جہنم کا راستہ دکھا دیا اور خود زخموں سے چور چور ہو گئے۔ تیروں کی بوچھار اس پر مستزاد تھی۔ انجام کار گھوڑے سے گر گئے۔ امامؑ آواز سن کر آئے اور لاش اٹھا لے گئے۔

ابوبکر بن حسنؑ کی والدہ گرامی کا نام اُم اسحٰق تھا۔ آپ کو شاید لڑنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ عبداللہ بن عقبہ نے دُور ہی سے زہر آلود تیر کا نشانہ بنایا اور آپ شہید ہو گئے ــــ ایک اور نام بشیر بن حسنؑ کا بھی مقاتل میں ملتا ہے۔

حسن مثنیٰ ابن حسن نے بھی رزم گاہ میں پہنچتے ہی شیرانہ حملہ کیا۔ ستر کوفیوں کو قتل کیا اٹھارہ زخم کھائے مگر خون زیادہ نکل جانے کے سبب گر کر بیہوش ہو گئے۔ امام حسینؑ آپ کو مردہ سمجھ کر اُٹھا لے گئے اور شہداء میں لٹا دیا۔ اس دن اتنی مہلت نہ تھی کہ کوئی کسی پر توجہ کر سکتا۔ دوسرے دن جب شہیدوں کے سر کاٹے جانے لگے تو آپ کو زندہ پایا گیا اور آپ کے ماموں اسماء بن خارجہ نے عمر سعد سے کہہ کر آپ کو بچا لیا۔

کہا جاتا ہے کہ امام حسنؑ کے سات بیٹے کربلا میں موجود تھے۔ ساتویں کا نام عمر بن حسنؑ تھا جو اسیروں میں شامل ہوئے ——— شہیدوں کی تفصیل میں ایک ترتیب سے مسلمؑ، عقیل، عبداللہؓ بن جعفر اور حسنؑ کی اولاد ملتی ہے محسوس ہوتا ہے کہ نسلوں کے اعتبار سے یہ افراد لڑنے گئے ——— عقیدے کی آنکھ سے دیکھا جائے تو کوئی استعجاب باقی نہیں رہتا۔ قربانی آلِ رسولؐ کا دن تھا۔ بارگاہِ احدیت میں جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہی تھا اور کسی کو بچ کر جانا نہیں تھا تو آپ وجد کے آہنگ کو ملحوظ رکھ کر میدان داری کی گئی اور شہادت کے درجات پیش کئے گئے۔ امام حسنؑ کی اولاد کے بعد علیؑ کے بیٹوں کی باری آئی اور بچوں کو بھیج کر بڑے اپنی جانوں کی پیش کش کے لئے آگے بڑھے۔ تقدیم ابوبکرؓ بن علی نے کی۔

ابوبکرؓ بن علی کا حملہ بھی یادگارِ عصر ہے۔ آپ جس طرف جاتے سپاہ شام بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بھاگنے لگتی وہ لاشوں پر لاشیں گراتے ہوئے بڑھتے رہے۔ عبداللہ بن عقبہ اور زجر بن بدر لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے موقع پاکر نیزے کھینچ مارے اور آپ شہادت پر فائز ہو گئے۔

عبداللہؓ بن علیؑ، اُم البنینؑ کے ۲۵ سالہ بیٹے تھے۔ آپ نے رزم گاہ میں جاکر صفوف اشقیاء کے سامنے نیزہ گاڑ دیا اور رجز پڑھا۔

"ماں اور باپ دونوں طرف سے شجاعت کا وارث ہوں ——— کوئی ہے جس کو اپنی شجاعت پر ناز ہو؟"

لیکن جان کس کو عزیز نہیں تھی جو مقابلے پر آتا۔ عبداللہ نے گھوڑا دوڑایا اور

آواز دی۔

"عمر سعد، ہوشیار ــــ عمرو ابن عبدود کے قاتل کا بیٹا آرہا ہے!"

لشکر میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ عبداللہ نے حملہ کیا اور اس میدان تک پہنچ گئے جہاں عمرو بن سعد کا خیمہ نصب تھا۔ یزیدی لشکر سدراہ ہوگیا کہ آپ کو عمر سعد تک پہنچنے نہ دے۔ عبداللہ کی خارا شگاف شمشیر بجلی کی طرح کڑک کڑک کر گرتی رہی اور سر ہوا میں اُڑ اُڑ کر زمین پر آتے رہے۔ ایک سو چالیس لاشیں چہار جانب بکھر گئیں عمر سعد پشتِ خیمہ چاک کر کے نکلا کہ راہِ فرار اختیار کرے۔ اس اثناء میں ہانیؑ بن شبیت نے آپ پر نیزے کا وار کر دیا۔ ان گنت زخم پہلے ہی کھا چکے تھے۔ گھوڑے سے گر گئے اور شہدائے حق میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگیا۔

عثمانؓ بن علی، حضرت عباسؑ کے ۲۳ سالہ بھائی تھے۔ آپ کے مقابلے پر کسی کو آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آپ نے دشمن کے میمنے پر حملہ کر دیا۔ علیؑ کے بیٹے تھے تلوار آپ سے مانوس تھی۔ اشارے پر کام کر رہی تھی۔ دشمن بھاگ رہے تھے اور کٹ کٹ کر گرتے جا رہے تھے۔ حضرت عباسؑ آپ کو پکار کر کہہ رہے تھے۔

"فوجوں میں گھستے چلے جاؤ ــــ"

مقصد شاید فتح نہیں تھا بلکہ صرف شامیوں کا خون بہانا تھا۔ آپ بڑے بھائی کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے، جدھر بڑھتے تھے، دونوں جانب لاشیں بکھراتے چلے جا رہے تھے۔ جسم تیروں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ ہانیؑ کا ایک تیر پیشانی پر آکر لگا اور آپ سے سنبھلا نہ گیا۔ گھوڑے سے گرے اور لاش امام اُٹھا کر لے گئے۔

جعفر بن علی کی عمر ۲۱ سال تھی۔ حضرت عباسؑ کے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ آپ نے میدان میں آتے ہی عثمانؓ کے قاتل کو للکارا۔

"کہاں ہے ہانی، دھوکے سے میرے بھائی کو مارا ــــ خضرمی کے صحیح نطفے سے ہے تو آکر مقابلہ کر ــــ"

فوج دہشت میں کانپ رہی تھی۔ ہانی چھپتا پھر رہا تھا۔ لوگوں نے اس کو دھکیل

کو مقابلے پر بھیج دیا مگر وہ سانس بھی نہ لے سکا؟ ایک ہی وار میں جہنم واصل ہو گیا۔ اس سے فراغت پا کر عباسؑ کے بھائی نے قلب پر یلغار کی۔ ایک آدمی سیکڑوں پر موت کے طوفان کی طرح چھا گیا۔ خولی کے تیر نے آپ کے لئے ملک الموت کا کام کیا اور آپ زمین پر گر گئے۔

عون بن علی، اسماء بنت عمیس کے بطن سے تھے۔ آپ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔
"صبح سے اب تک جو تم نے نہیں دیکھا ہو گا، وہ دکھانے آیا ہوں ـــــــ"
آتے ہی آپ گھوڑا اُڑا کر قلب لشکر میں دھنس گئے پھر میمنے اور میسرے دونوں کو درہم برہم کر دیا۔ اس اثنا میں دو ہزار آہن پوشوں کی دیوار آپ کے چاروں طرف کھڑی ہو گئی، مگر علیؑ کا بیٹا تو ایک دفعہ موت کے گھیرے کو بھی توڑ سکتا تھا۔ آپ نے اس دیوار سیاہ کے پرخچے اڑا دیئے۔ زخمی دُور دُور تک پڑے ہوئے تھے۔ بعض خاموش تھے۔ بعض کراہ رہے تھے۔

عون سلام آخر کے لئے خدمت امامؑ میں حاضر ہوئے۔ شاید پوچھنے آئے ہوں "مولیٰ کیسی جنگ کی میں نے ـــــ"، مولیٰ کا جواب یہی ہو سکتا۔ "بیٹے کس کے ہو۔ تم سے اسی کی توقع تھی!" قدم بوسی کر کے آپ پھر پلٹے۔

ابن زیاد نے یزید کے حکم پر بڑا التزام کیا تھا۔ بصرہ، عراق و شام ہر جگہ سے مشہور پہلوان اور تیغ زن اکٹھا کر کے کربلا بھیجے تھے۔ ان میں صالح بن سیّار اور بدر بن سیّار بھی تھے۔ عمر سعد نے پہلے بڑے بھائی صالح کو بھیجا جو سامنے پہنچتے ہی موت کا نوالہ بن گیا، پھر بدر مقابلے پر آیا۔ فاتح بدر و حنین کے بیٹے کے لئے یہ سب نرم چارہ تھے کٹ کر رہ گئے اور عون کی تلوار پھر فوجوں کے پرّوں کو پراگندہ کرنے لگی مگر تابہ کے؟ آخر وہی شاطرانہ بساط بچھ گئی۔ کمیں گاہوں سے تیر، نیزہ اور تلوار کے وار، خون کے فوارے عون کے جسم سے نکل رہے تھے اور سر کٹ کٹ کر گر رہے تھے شامیوں کے۔

ایسے میں خالد بن طلحی نے پہلو سے وار کیا اور عون کاری ضرب کی تاب نہ لا سکے۔ گھوڑے سے گرے اور سید الشہدا لاش اُٹھا کر لے گئے۔

عمرؑ بن علی بڑے شجاع عابد و زاہد تھے۔ میدان میں آئے تو انفرادی مقابلہ کسی نے نہیں کیا۔ آپ خود فوج پر حملہ آور ہوئے۔ دیکھنے والوں کو شبہ ہو رہا تھا کہ علیؑ صفین میں لڑ رہے ہیں۔ فوج بھاگی تو اکثر سورماؤں کی جنگ میں تھی مگر عمرؑ کی جنگ میں بھاگی چلی گئی اور آپ نے تعاقب نہ چھوڑا کسی مقام پر شاید گھوڑے سے گر گئے۔ سیدالشہداءؑ آپ کی لاش اُٹھا نہ سکے۔

حضرت ابوالفضل العباسؑ کا نام ہی اپنا تعارف ہے۔ آپ کی ذاتِ گرامی زہد و تقویٰ وفا و شجاعت کا علامیہ ہے، عبدالصالح، سقائے حرم اور فاتح فرات کے القاب کے ساتھ پرچم اسلام کی دوامی نسبت آپ کا طرۂ امتیاز ہے ــــ یوں تو تاریخ کربلا میں سپاہِ اسلام کا ہر نام حشر تک درخشاں و تابندہ رہے گا لیکن رسولؐ کے نواسے کے بعد جس سورما کے کردار پر ہمیشہ کی مہر لگی ہے وہ ابوالفضل العباسؑ ابن امیرالمومنینؑ ہیں

قافلۂ اہلِ بیتؑ کے مدینے سے کربلا پہنچنے تک ہر قدم پر عباسؑ، نشیب و فراز کے مراحل میں ہر موڑ پر عباسؑ، صلح و جنگ کی ہر مشورت میں عباسؑ، خلوت کے اسرار اور جلوت کے افکار میں عباسؑ، رسولؐ کی زندگی میں جو حیثیت علیؑ کی تھی، کربلا میں عباسؑ اسی منصب پر فائز تھے۔

بس چلتا تو عباسؑ جنگ کربلا کا افتتاح اپنی تیغ آبدار سے کرتے مگر امام حسینؑ نے علمداری کی زنجیر ڈال دی تھی۔ آپ ایسے ہر موقع پر ہمک ہمک کر رہتے اور مرضیٔ امامؑ دیکھ کر سسک سسک کر خاموش ہو جاتے لیکن شہادت انصار کا خونی باب بند ہو جانے کے بعد، جب اقدام بنی ہاشم کا آغاز ہوا اور اولادِ رسولؐ کی قربانی شروع ہونے کا وقت آیا تو امامؑ نے حضرت علی اکبرؑ سے فرمایا۔

"تقدم ولدی" ــــ "بڑھو میرے لال اور میدان میں سبقت کرو"

اس موقع پر عباسؑ اپنے کو روک نہ سکے ــــ اب تک تو اصحاب موجود تھے مسلمؒ ابن عوسجہ، بریرؒ ابن خضیر، عابسؒ ابن ابی شبیب شاکری اور حبیبؒ ابن مظاہر جن کی عمریں سو سال کو چھو رہی تھیں اور جنھوں نے رسولؐ اکرم، امیرالمومنینؑ اور امام حسنؑ

سب کے درباروں میں عزت پائی تھی۔ عباس ان کے سامنے کھڑے بھی ہوتے تو نہایت ادب سے، بات کرتے تو نگاہیں جھکا کر مگر اب امام عالی مقام کے علاوہ سب ہی تو چھوٹے تھے، عباس کی گودوں کے کھلائے ہوئے۔ فنِ حرب سکھائے ہوئے اور ان میں بھی امامؑ اس سے جانے کو کہہ رہے تھے جو عباس کی آنکھوں کا نور اور دل کی روشنی تھا۔

گستاخی کا سوال تو عباس کے لئے پیدا ہی نہیں ہوتا، وہ تو جسارت بھی نہ کرسکتے البتہ آپ نے آبدیدہ ہوکر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"غلام موجود ہے ——— اور شہزادہ رزم گاہ میں جائے!"

"نہیں، عباسؑ ——— اکبر کو نانا کی نمائندگی کرنے دو۔" امام چند لفظوں میں سب کچھ کہہ گئے۔ عباسؑ امام تو نہ تھے مگر نبض شناس امامت ضرور تھے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ سجادہ نشین رسالتؐ کیا کہہ رہا ہے۔ محسوسات میں ایک تلاطم تھا۔ جذبات میں مدوجزر کی کیفیت تھی مگر شعور عباسؑ نے ہر اندرونی طوفان کو دبالیا اور بے چارگی میں سر جھکا کر رہ گئے۔

اب صرف حسینؑ رہ گئے تھے اور عباسؑ ——— اور کہا جاسکتا ہے کہ خیمہ گاہ میں کل کا امام اور شریک کارِ امامت جناب زینبؑ!

خیمے کے باہر تنہا حسینؑ تھے جو صبح سے اب تک بار شہادت اٹھائے اٹھائے تھک چکے تھے۔ عباس کا زور چلتا تو پہلے ہی سارے بنی ہاشم کو لے کر بھیڑوں کے گلے پر ہلہ بول دیتے۔ کیا طاقت تھی بزدل اکثریت کی جو ان شجاعانِ روزگار کا متحدہ بار برداشت کرسکتی لیکن امامؑ کی مرضی اور مصلحت ابتدا ہی سے یہی تھی کہ لڑائی کو طویل سے طویل تر بنایا جائے۔ شاید کسی لمحہ کوئی حُر دوزخ کی آنچ سے بچ کر ادھر آجائے یا شاید اللہ ان ظالموں کو یہ توفیق ودیعت کردے کہ نبیؐ کے نواسے کا خون کرنے سے باز آجائیں۔ اسی لئے آپ ایک ایک کو بھیجتے رہے۔ جنگی زاویۂ نگاہ سے یہ طریقہ صحیح نہ تھا لیکن آپ منصب امامت پر کھڑے ہوکر سوچ رہے تھے اور عباسؑ ایک فنکارِ حرب کی حیثیت سے۔

عباسؑ کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ امامؑ کے پشتِ پناہ بن کر لڑتے اور امام کو تنہا چھوڑ کر نہ جاتے مگر ہادیانہ لائحہ عمل کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس لئے آپ نے اس وقت اور تو کچھ نہیں کہا البتہ دست بستہ اجازت خواہ ہو گئے۔

"مولیٰ، اب مجھے اجازت ہو ــــــ"

"تم تو لشکر کے سپہ سالار ہو ــــــ" امامؑ کے پاس کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں پھر بھی کہا۔

"مگر ــــــ اب وہ لشکر کہاں ہے مولیٰ؟"

امامؑ کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آپ نے قدرے توقف سے رفیقِ بارِ شہادت کو رزم گاہ کی اجازت دے دی اور کہا۔

"ہو سکے تو بچوں کے لئے پانی کی کوئی سبیل کرنا ــــــ"

یہ اشارہ تھا سکینہ کو راضی کرنے کا ــــــ بہت مانوس تھی حسینؑ کی بیٹی اپنے چچا سے۔ امامؑ جانتے تھے کہ عباسؑ اس کو روتا چھوڑ کر نہیں جائیں گے ــــــ عباس سے بھی یہ حقیقت چھپی نہ تھی۔ خیموں میں جا کر آپ ایک ایک سے ملے۔ بیوی کو پہلے ہی سمجھا چکے تھے۔ اس وقت پھر الوداعی ملاقات کی۔ سب کے آخر میں جناب اُمِ کلثومؑ اور جنابِ زینبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

بہنوں کو بڑا ناز تھا اس بھائی پر۔ وہ کسی طرح عباسؑ کے جانے پر راضی نہ ہوتیں لیکن صبح سے اب تک جو کچھ دیکھا تھا اس سے تقدیر کا نوشتہ سمجھ میں آ گیا تھا، پھر عباسؑ کے بازوں کی طاقت سے مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن پھوٹی کہ شاید عباسؑ کے جانے سے حسینؑ بچ جائیں۔

یزید کا لشکر آدھا نہیں تو ایک تہائی ضرور کٹ چکا تھا۔ ایک تنِ تنہا سے باقی لشکر کو شکست کھا جانے کا یقین تو نہیں کیا جا سکتا لیکن خیبر شکن کے بیٹے سے کچھ بعید بھی نہ تھا لہٰذا ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ملا اور زینبؑ نے گرفتہ آواز میں کہا۔

"جاؤ بھیا، تم بھی جاؤ ــــــ بہن اپنے مقدّر پہ شاکر ہے۔"

سکینہ قریب کھڑی ہوئی تھی۔ عباسؑ نے اس کو گود میں اٹھایا اور پیار کرتے ہوئے کہا
"جاؤ اپنی مشک لے آؤ ــــ پانی لانے کی کوشش کروں گا!"

سکینہ کو تکلف تھا مگر پیاس کی شدت نے سہارا دلایا کہ شاید چچا پانی لے ہی آئیں
دُنیا کا کوئی آدمی جو کام نہ کر سکتا، سکینہؑ کے نزدیک چچا عباس وہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ
۸ محرم کو تھوڑا پانی لے ہی آئے تھے ــــ سکینہؑ نے مشک لا کر دے دی اور عباس
اس کو گود میں لئے ہوئے باہر آ گئے۔

عقیدے کی روشنی میں یہ بات صرف نظر نہیں کی جا سکتی کہ عباسؑ کو لڑنے کے بجائے
صرف پانی لانے کے لئے بھیجا گیا تھا کیونکہ عباسؑ کی شجاعت پورے لشکر کو شکست دینے
کی ضمانت بن سکتی۔ امامؑ کا یہ اندازِ فکر اپنی جگہ پر ہے کیونکہ آپ نے انصار و بنی ہاشم کو
لے کر ایک ساتھ حملہ نہیں کیا کہ اُمت کٹ نہ جائے۔ یہ مصلحت بھی قرین قیاس ہے کہ
عباس پانی لانے میں کامیاب ہو جائیں تو کچھ وقت ان ملاعین کو سوچنے کا اور مل
جائے۔ امام دراصل ان بھٹکے ہوئے لوگوں کے ذہنوں اور ضمیروں سے جنگ کر رہے
تھے۔ وہ ایک ایسی لڑائی لڑ رہے تھے جو دلوں کو مسخر کر لیتی ہے۔ تلوار تو ضرورت کے
تحت بیچ میں آ گئی تھی۔

عون بن علی کی شہادت کے بعد کوئی لڑنے کے لئے نہیں کیا گیا تو عمر سعد اور
اس کے بدباطن ساتھیوں نے اس کو کمزوری پر محمول کیا اور خیمہ گاہ حسینی کی طرف بڑھنے لگے
ابوالفضل العباسؑ نے سکینہؑ کو گود سے اتار کر خیمے میں بھیجا اور بتعجیل گھوڑے
پر سوار ہو کر ایک نعرۂ شیرانہ کیا۔

"بے دینو! میری زندگی میں اتنی جسارت ــــ!"

آپ نے گھوڑے کو اتنا تیز دوڑایا کہ بزدلوں کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ گئیں
وہ بے تحاشا بھاگنے لگے۔ عباس ان کے تعاقب میں دور تک چلے گئے۔ عمر سعدؑ نے
ایک نامی پہلوان مارد بن صدیف کو آگے بڑھایا۔ اس نے غرور میں لشکریوں کو پیچھے
ہٹا دیا۔ عباسؑ کے مقابل آ گیا اور بولا۔

"میں مارد ابن صدیف ہوں ـــــ"

"میں علی ابن ابی طالب کا بیٹا ہوں ـــــ" عباسؑ نے پورے جاہ و جلال کے ساتھ جواب دیا۔ تلوار آپ کے ہاتھ میں تھی۔ مارد بولا "اصولِ حرب کے لحاظ سے پہلے نیزہ بازی کروں گا۔"

آپ نے تلوار نیام میں رکھ لی اور خالی ہاتھ کھڑے ہو گئے۔ مارد نے نیزہ مارا آپ نے ایک طرف ہٹ کر نیزے کو خالی دیا۔ پھر بڑی سُرعت سے پہلو میں آ کے نیزہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور گھوڑے پر وار کیا۔ وہ اچھلا اور مارد زمین پر گر گیا۔ اس کا حبشی غلام شمر کے اشارے پر دوسرا گھوڑا لے کر آ گیا۔ حضرت عباسؑ نے نیزے سے غلام کو ہلاک کر کے خود اس کے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور فوراً نیزے کا وار کر کے مارد کو جہنم پہنچا دیا۔

مارد کے پانچ سو آدمی حضرت عباس پر ٹوٹ پڑے۔ آپ نے ۱۲۴ کو قتل کر دیا، ۸۰ بھاگ گئے پھر آپ اسی گھوڑے کو لے کر امام کی خدمت میں حاضر ہوئے ـــــ یہ وہی گھوڑا تھا جس کو بدبختوں نے مدائن میں امام حسنؑ سے چھینا تھا۔

ابوالفضل العباسؑ ایک بار پھر رخصت کے لئے خیمے تشریف لے گئے۔ اس وقفے میں ناری امامؑ کو تنہا پا کر حملہ آور ہو گئے۔ حضرت عباسؑ آواز سن کر باہر آ گئے اور تلوار کھینچ کر پل پڑے۔ اس مرتبہ بھی آپ نے ۳۸۰ آدمی مارے، باقی فرار ہو گئے۔

اب حضرت عباسؑ اپنی آخری مہم پر روانہ ہوئے ـــــ صبح سے اب تک ہر قدم پر امام کے ساتھ رہے تھے لیکن احساسِ فرض کی شدت کے باعث چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہ تھے۔ آپ ویسے ہی مردانہ تیوروں سے بڑھ رہے تھے جو فرزند علیؑ کے شایانِ شان تھے۔ آپ کا رُخ نہر کی طرف تھا۔ فوجیں راستے میں حائل ہوئیں مگر کس میں دم تھا جو راستہ روکتا۔ دو چار جگہ کچھ رُکاوٹ ہوئی تو شمشیر خارا شگاف نے دور کر دی اور آپ نہر پر پہنچ گئے۔ عمرو بن حجاج محافظِ فرات سے آپ کا سخت مکالمہ ہوا اور آپ گھوڑے کو اڑا کر لشکر پر گرے گویا ان پر قہرِ الٰہی ٹوٹ پڑا ہو۔ ساحل فرات

پر عباس غازی کی جنگ ہر دور کے بہادروں کے لئے ایک للکار رہے گی کہ اکیلا مرد ایسی بھی جنگ کرتا ہے کہ دریا کنارے خون کی ندیاں بہادے اور سروں کو گیندوں کی طرح اُڑا اُڑا کر زمین پر بکھرا دے۔ تین سو سوار موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ باقی اس طرح بھاگے کہ دریا پر پہرہ داروں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

اب موجیں مارتا ہوا دریائے فرات تھا اور عباس غازی۔ آپ نے چلّو میں پانی لے کر اُچھالا۔ پیاسے شہید ضرور یاد آئے ہوں گے اور شاید انہیں کے ناموں کا پانی عباسؑ نے دریا سے لے کر دریا ہی میں پھینک دیا، پھر سکینہؑ کی مشک بھری اور پیاسے ہی دریا سے نکل آئے۔

اس دوران عمر سعدؑ نے فوجوں کو سمیٹ کر راستہ بند کر دیا۔ آپ کے دوش پر پانی سے بھری ہوئی مشک، بائیں ہاتھ میں علم، داہنے ہاتھ میں اُپی ہوئی تلوار تھی اور مرکب صبار فتار تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ شام کے ٹڈی دل روباہ دیوار بنے کھڑے تھے مگر ان میں شگاف پڑ گیا۔ گھوڑا آگے بڑھتا، علیؑ کا شیر اس وقت سخت آزمائش میں تھا۔ نیزوں اور تلواروں کا جواب دے یا ان تیروں کو تلوار سے کاٹے جو چاروں طرف سے لگاتار برس رہے تھے۔ ایسے میں زرارہ نامی ملعون نے ایک طرف سے وار کیا اور آپ کا داہنا ہاتھ کٹ کر گر گیا۔ آپ نے مشک دوسرے کاندھے پر لے لی اور علم کو قائم رکھا لیکن نوفل ابن ارزق نے دوسرا ہاتھ قطع کر دیا، اب غازی نے مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا اور جھک کر اس کی حفاظت کرتا رہا کہ ایک گرز آہنی سر پر پڑا۔ اسی اثنا میں ایک تیر مشک پر آ کر لگا اور سقائے سکینہؑ گھوڑے سے زمین پر آ رہا۔

اس جنگ سے یہ حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ امام نے اپنے شیر کو پانی میں اس لئے الجھا دیا تھا کہ وہ آزاد ہو کر جنگ نہ کر سکے۔

ایک نکتہ اور بھی ارباب دانش کو دعوتِ فکر دیتا ہے کہ اگر کربلا کی جنگ کا انجام حسینؑ کے حق میں ہوتا تو اس کا نتیجہ اتنا ہی نکل سکتا تھا کہ فاتحینِ عالم میں ایک جلی نام

کا اضافہ ہوجاتا لیکن حسینؑ کی خدا شناس امامت کی دھجیاں بکھر جاتیں۔ ظالم اگر مظلوم نہ بن سکتا تو اس کے ظلم پر پردے ضرور پڑ جاتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یزداں اور اہرمن ایک سطح پر آجاتے مگر حسینؑ کی عظمت کو ہزاروں سلام۔ آپ نے حفاظت جان و آبرو کا شرعی فریضہ تو انجام دیا لیکن مادیت اور روحانیت کی جنگ کا امتیاز قیامت تک کے لئے باقی رکھا۔

عباسؑ کی شہادت دوسرے بہادروں کی شہادت نہ تھی بلکہ اتنی اہم تھی کہ اس کے بعد فاطمہؑ کا لال بالکل اکیلا رہ گیا ــــــ امام حسینؑ عباسؑ کی لاش پر پہنچے ضرور مگر اب ان میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ ۳۵ سالہ بھائی کی میت تنہا اُٹھا سکتے۔ آپ تھوڑی دیر تک تو عباسؑ کے سرہانے بیٹھے روتے رہے پھر مشک و علم لے کر خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

چہیتی بھتیجی چچا کو نہ پا کر بلک بلک کر رو دی لیکن امامؑ نے اس کو سینے سے لگا کر اور تسلیاں دے کر وقتی طور پر چُپ کرا دیا کیونکہ اس کے بعد تو رونا ہی رونا تھا۔

مظلوم کربلا

اب اکیلے امام تھے اور چوطرفہ مصیبتوں کی یلغار، پھر بھی آپ نے فرائضِ امامت انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ ایک بلند ناقے پر سوار ہو کر لشکر کے سامنے آئے اور آوازِ استغاثہ بلند کی۔

"ہے کوئی تم میں سے جو میری نصرت کرے ــــ ہے کوئی جو حرمِ رسولؐ کی حفاظت کرے!"

کوئی جواب نہ پا کر آپ خیمے میں واپس آئے۔ حضرت زین العابدینؑ آپ کے استغاثے پر اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور تلوار ٹیک کر باہر جانے کو تیار تھے۔ آپ نے اُنہیں روک کر لٹا دیا اور بہت دیر تک دھیرے دھیرے کچھ کہتے رہے۔ پھر آپ نے جناب زینبؑ سے وہ کرتا طلب کیا جو غم رسیدہ ماں نے آج کے لئے سی کر رکھا تھا۔ آپ نے اُسے زیب تن کیا اور اوپر سے زرہ پہن لی، پھر تمام بیبیوں کو درِ خیمہ تک دو رویہ کھڑا کیا اور آپ ایک ایک سے ملتے ہوئے باہر تک آگئے ــــ جناب فضہؑ نے اس موقع پر گزارش گزار کیا۔

"اصغرؑ نے آپ کی آواز پر اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے ــــــ"

امام نے چھ ماہ کے بچے کو منگوایا اور ایک بلندی پر پہنچ کر فوجِ اشقیا کو مخاطب کیا۔

"بچے کی ماں کا دودھ پیاس میں خشک ہو گیا ہے۔ تم بھی صاحب اولاد ہو اس کو ایک گھونٹ پانی پلا دو!"

آپ نے بچے کا مُنہ ظالموں کی طرف کر دیا تاکہ وہ بھی اس کی حالت کو دیکھ لیں امامؑ کے معصوم بچے نے زبان خشک ہونٹوں پر پھرائی اور اپنی پیاس کا یقین دلایا۔ اس پر بے رحم سے بے رحم آدمی آنکھوں میں آنسو بھر لایا مگر نہ جانے کس قدر سنگ دل تھا عمر ابن سعد، اس نے حرملہؑ کو اشارہ کیا کہ حسینؑ کی بات کو کاٹ دے۔

یزید کے تیرانداز نے جلدی میں ایک تیر نکالا جو بڑے پھل کا تھا۔ ظالم حرملہؑ نے بچے کی عمر کا لحاظ کئے بغیر تیر کمان میں جوڑ کر چھوڑ دیا جو بچے کے گلو کو توڑتا ہوا سبطِ رسولؐ کے بازو میں پیوست ہو گیا اور بچہ آپ کے ہاتھوں میں اُلٹ گیا۔

امام حسینؑ کی یہ آخری قربانی تھی۔ آپ نے تیر بچے کے گلے سے نکال لیا۔ خون کا ایک فوارہ جاری ہوا۔ امامؑ نے اس کو چلو میں لے کر مُنہ پر مل لیا۔ بچے کی لاش کو خیمہ گاہ کے قریب ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

اب امامؑ ایک بار پھر سب سے ملے اور گھوڑے پر بیٹھنے کے لئے باہر نکلے تو ماں کی قائمقام جناب فضہؑ گھوڑے کی لگام تھامے تھیں اور سکینہؑ گھوڑے کے اگلے پاؤں سے لپٹی کہہ رہی تھی۔

"گھوڑے، میرے بابا کو میدان میں نہ لے جا ــــــ"

آپ نے بڑے پیار سے سکینہؑ کو الگ کیا تو سکینہؑ نے دامن تھام لیا۔

"جو بھی گیا، پلٹ کر نہیں آیا، میں آپ کو جانے نہ دوں گی ــــــ"

امامؑ نے بہت سمجھایا، مگر سکینہؑ نے دامن نہ چھوڑا۔ ہائے رے ایک باپ کی بیچارگی فرض اپنی طرف بُلا رہا تھا اور بیٹی دامن چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ علیؑ نے ایک ہاتھ سے خیبر اکھاڑ لیا تھا مگر بیٹی کے ہاتھ سے دامن چھڑانا صرف حسینؑ کا کام تھا۔ اس

کے لئے حسینؑ کی ہمت اور حسینؑ کا کلیجہ درکار تھا۔ آپ نے بچی کو گود میں اُٹھالیا دیر تک پیار کرتے رہے۔ بچی نے کہا۔

"آپ جاتے ہیں تو مجھے بھی لے چلیں ـــــ"

"پہنچتے ہی بلوا لوں گا تمہیں ـــــ" امامؑ نے وعدہ کرلیا۔ بچی کو تسکین ہو گئی اور وہ پھوپھی کی گود میں چلی گئی۔

امام علیہ السلام نے ایک آخری بار اہل بیت اطہار اور اماں فضہؓ کو سلام کیا اور گھوڑے کو میدان کی طرف بڑھا دیا۔

"میں رسولؐ کا نواسہ ہوں، علیؑ کا بیٹا ہوں اور وقت کا امام ہوں ـــــ"

رجز پڑھتے ہوئے آپ صفوف اعداء کے مقابل پہنچے اور ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس کے آخر میں کہا

"میرا راستہ چھوڑ دو، میں ناموس رسولؐ، بیواؤں اور یتیموں کو لے کر نانا کے مزار پر چلا جاؤں ـــــ"

جواب طعن و طنز سے ملا اور امامؑ نے فرمایا۔

"اچھا ایک ایک آدمی مجھ سے آکر مقابلہ کرے ـــــ"

پھر وہی مہلت دینے کی بات تھی ورنہ ایسے انصار اور اکبرؑ و عباسؑ کے بعد کس کے دل میں جینے کی تمنا ہوگی ـــــ عمر سعد نے اس کو منظور کرلیا اور شام کے مشہور جنگ آزما تمیم بن قحطبہ کو مقابلے کے لئے بھیج دیا۔ امامؑ نے سامنے پہنچتے ہی تلوار کا وار کیا اور اس کا سر دُور جا گرا۔

جابر بن قاہر قمی اس کی جگہ لینے کو تیار تھا۔ وہ لاف و گزاف کرتا ہوا مقابلے پر آگیا اور آپ نے اس کو نیزے کی نوک پر دھر لیا۔ پیغمبرؐ اسلام کا جانشین اور علیؑ کی شجاعت کا مورو ثی حقدار ان گیدڑوں کو کب خاطر میں لانے والا تھا، اس نے تلوار کی ایک ضرب جو لگائی تو ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا۔ دوسرے وار نے اس کا کام تمام کر دیا۔

عمر سعد نے کئی پہلوانوں کو اسی وقت کے لئے محفوظ رکھا تھا۔ ان میں بدر نامی فنونِ حرب کا ماہر تھا۔ بدر نے اپنے ایک بیٹے کو اشارہ کیا۔ امامؑ نے اس کے آتے ہی نیزے سے گرا دیا۔ بیٹے کے قتل ہونے پر بدر خود بل کھاتا ہوا چلا۔ امام علیہ السلام نے اس کو موقع دیا اور وہ پے در پے نیزے کے وار کرتا رہا۔ امامؑ نے ایک وار کو ڈھال پر روکتے ہوئے ڈھال کو جھٹکا دیا تو نیزے کی اَنی ٹوٹ گئی۔ بدر نے تلوار ماری امامؑ نے ڈھال کی حرکت سے تلوار کی دھار توڑ ڈالی۔ آخر اس بے حیا نے ترکش سنبھالا، مگر امام کی تلوار سے سر سے زین فرس تک دو ٹکڑے ہو گیا۔

فوج پر ایک دہشت طاری تھی۔ اب ایک کے بجائے دو دو مل کر مقابلے پر آئے مگر ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ اس کے بعد دس دس کی ٹولیاں سامنے آئیں لیکن وہ بھی بے سر ہو گئیں۔ مجموعی طور پر ۹۵۰ آدمی علی کے بیٹے نے جہنم واصل کئے۔ شمر چلّا اٹھا۔

"عمر سعد کیا مصر و شام، عراق و عرب کے سب بہادروں کو کٹوا دے گا ــــــ؟"

آخر عمر سعد نے بدعہدی کر کے پورے لشکر کو ٹوٹ پڑنے کا اشارہ کیا۔ امامؑ نے ہاتھ سے سب کو روک کر عاشور کا دوسرا خطبہ دینا شروع کر دیا۔

"ایہا الناس! میں نے ایک ایک سے لڑنے کی پیش کش صرف اس لئے کی تھی کہ تمہیں اپنے سردار کی بدعہدی دکھا سکوں۔"

تقریر کے تسلسل میں آپ نے پھر اپنے تعارفی الفاظ استعمال کئے اور کہا۔

"اب تک تم نے میری مظلومیت دیکھی ہے، آؤ میری شجاعت بھی دیکھ لو!"

کہاں ہیں روایتی اور افسانوی تاریخ کے ہیرو ــــ کہاں ہیں ہندوستان کے ارجن، کہاں ہیں یورپ کے ہرکولیس، کہاں ہیں ایران کے رستم ــــ آئیں اور دیکھیں کہ پیغمبرؐ عرب کا نواسہ، تین روز کا بھوکا اور پیاسا، فرزندان شمشیر کے داغ اٹھائے دل پر بہتر زخم کھائے ــــ ۵۶ سال کی عمر میں تنِ تنہا عراق و شام کی چالیس ہزار منتخب سپاہ کو للکار رہا ہے۔

کہاں ہیں قبلِ تاریخ کے شہرۂ آفاق ہادی، بندرابن کے کرشن کنھیا، اجودھیا کے

رام چندر، گیا کے مہاتما گوتم، چین کے کنفیوشس، ایران کے سائرس، یونان کے سقراط ـــــ آئیں اور دیکھیں کہ اسمٰعیل ذبیح اللہ کا پوتا، شجاعان عصر انصار کا خون کرنے والوں ـــــ باوفا عباسؑ اور کڑیل جوان بیٹے کے قاتلوں کو بھی معاف کرنے پر آمادہ ہے اور اس انسان نما درندے سے بھی درگزر کرنے پر تیار ہے جس نے چھ ماہ کے بچے پر تہری دھار کا تیر چلایا تھا!

شرط صرف اتنی ہے کہ وہ انسانیت کا صحیح راستہ اختیار کرلیں ـــــ ہدایت کا یہ معیار ہادیانِ عالم کو سکتے میں ڈال دے گا اور وہ حیرت میں رہ جائیں گے کہ صبر و رضا کی کوئی منزل ایسی بھی ہوتی ہے!

یقیناً یہ رہنما رسولؐ اسلام کے نائب برحق پر عقیدے کے پھول نچھاور کریں گے لیکن یزید کے لشکری شاید درندگی کی سطح سے بھی گر گئے تھے کہ ایک کمزور و ناتواں پر چالیس ہزار فوج نے دھاوا بول دیا۔ امامؑ مظلوم نے آسمان کی طرف دیکھا پھر دائیں بائیں نظر ڈالی اور آواز دی۔

"کہاں ہیں حبیبؒ ابن مظاہر، کہاں ہیں بریرؒ ہمدانی، کہاں ہیں زہیرؒ قین آئیں اور ایک پیاسے کی لڑائی دیکھیں!"

آپ نے ایک ایک کا نام لے کر پکارا، پھر نہر کی طرف نگاہ اُٹھائی۔

"عباسؑ! تم نے جیتے جی مجھے تلوار اُٹھانے نہ دی ـــــ آج حیدر کی تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ آؤ، دیکھو، اس کی کاٹ میں کوئی فرق تو نہیں آیا ـــــ!"

پھر آپ بپھرے ہوئے شیر کی طرح لشکر اعدا پر ٹوٹ پڑے۔ علیؑ کے ہاتھوں میں یہ تلوار جن حالات میں چلی تھی، وہ آج سے بالکل مختلف تھے ـــــ شاید اسی لئے اس کی برق رفتاری آج کچھ زائد ہوگئی تھی۔ تب ہی تو تھوڑی دیر میں ایک ہزار سو پچاس بے دینوں کی لاشیں گرادیں۔

فوج کئی بار بھاگتے بھاگتے کوفے کی سرحدوں سے جا ٹکرائی اور پھر دائرہ بناتی ہوئی واپس آگئی ـــــ چشم فلک نے ایسا رن کبھی دیکھا نہ ہوگا کہ تین روز کا پیاسا

اتنے بڑے لشکر پر حملہ کرے اور الامان والحفیظ کی آوازیں بلند ہو جائیں ـــــ لڑتے لڑتے امامؑ دریا تک پہنچ گئے۔ شمرؒ ناہنجار کو گمانِ باطل ہوا کہ حسینؑ پانی پی لیں گے اس نے ایک مکارانہ نعرہ لگایا۔

"حسینؑ تمہارے خیمے لٹ رہے ہیں ـــــ"

آپ نے اپنا رُخ خیمہ گاہ کی طرف کر دیا۔ سپاہ آپ کو دیکھتے ہی بھاگنے لگی۔ آپ نے خیمے میں جا کر رشد و ہدایت کے آخری فرائض انجام دیئے اور باہر آکر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ ابوالفضل العباسؑ ہمیشہ لجام فرس تھام کر آپ کو گھوڑے پر بٹھاتے تھے۔ آج اماں فضّہؑ اور بہن زینبؑ نے رخصت کیا اور آپ اس عالم میں چلے جیسے ہوا کے دوش پر آپ کا جنازہ جا رہا ہو۔

زینبؑ ایک بلندی پر آکر کھڑی ہو گئیں وہ دیکھ رہی تھیں کہ آپ ایک سوار کو نیزے سے اٹھاتے اور دوسرے پر پھینک دیتے۔ تلوار داہنے ہاتھ میں آگ کے شعلے کی طرح گردش کر رہی تھی اور ناری ہر طرف جلتے جا رہے تھے۔ جانوں کی امان کے لئے اکبرؑ و عباسؑ کا واسطہ دیتے مگر دشمنی سے باز نہ آتے۔

عصرِ عاشور

آخری بار فوج کے بھاگنے میں بہت زیادہ دیر نہ تھی کہ ہاتف غیبی کی آواز کان میں پڑی۔

"اے نفسِ مطمئنہ! اپنے رب کی رضا سے رجوع کر ـــــ"

آپ نے تلوار روک کر نیام میں رکھ لی ـــــ پھر کیا تھا، تیروں کی بارش ہونے لگی، نیزہ و شمشیر کے وار پڑنے لگے۔ گھوڑا آپ کو ایک نشیب کی طرف لے آیا۔ امامؑ کے بعد گھوڑے کی جنگ بھی اوراقِ تاریخ کا ایک خونی باب ہے گھوڑے کو جیسے کسی خاص جگہ کا علم تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ رُک گیا۔ اس نے چاہا کہ امام کو آہستہ سے زمین پر اُتار دے کہ صالح ملعون نے تلوار ماری اور آپ اس طرح زمین پر گر گئے گویا حالت سجدہ میں ہوں۔

بہن عالمِ اضطراب میں عمر سعد کو آواز دے رہی تھی کہ بھائی کو قتل ہونے سے بچالے۔ اتنے میں امام حسنؑ کا ایک بچہ دوڑتا ہوا چچا کے پاس آگیا۔ بحر ابن کعب کی تلوار امامؑ کو قتل کرنے کے لئے بلند ہو چکی تھی۔ بچے نے چچا کو بچانے کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ اس کے دونوں ہاتھ کٹ کر گر گئے۔ حرملہ بن کاہل کا تیر اس بچے کو بھی لگا اور اس نے چچا سے لپٹ کر جان دے دی ـــــ اس بچے کو راویوں نے امام حسنؑ کا بچہ تحریر کیا ہے لیکن وہ درحقیقت امامؑ کا پوتا تھا۔

امامؑ سجدۂ شکر میں تھے کہ شمر ذی الجوشن پشت پر سوار ہو گیا۔ امامؑ نے اس وقت بھی اُسے راہِ ہدایت دکھائی اور جب وہ نہیں مانا تو نمازِ عصر بجالانے کی اجازت لی لیکن آپ نے پہلے سجدے سے بھی سر نہ اُٹھایا تھا کہ شمر نے پس گردن سے ذبح کر دیا۔

ظالموں نے خیموں میں آگ لگا دی۔ بیبیاں بدحواس ہو کر بھاگنے لگیں بارِ غم و اندوہ اب جناب زینبؑ کے کاندھے پر تھا۔ آپؑ نے خیمے میں جا کر امام زین العابدینؑ کو ہوشیار کیا اور ان سے اجازت لے کر تمام عورتوں اور بچوں کو ایک خیمے میں جمع کیا۔ خود امام زین العابدینؑ کو بھی اسی خیمے میں لے آئیں۔

اس وقفے میں سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ جناب زینبؑ کے سر سے چادر بھی اُتر چکی تھی سکینہؑ کے کانوں کے گوشوارے نوچے جا چکے تھے۔ شمر کے طمانچوں پر وہ چچا عباس کو بار بار پکار چکی تھی مگر اب اس کے لئے یہی قسمت کا نوشتہ تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ اس کو بُلوا لیں گے ممکن ہے، سکینہ کو اس کا انتظار ہو مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔

بنی اُمیہ کی دشمنی قتلِ حسینؑ اور عترتِ رسُول کی لُوٹ کھسوٹ پر ختم نہیں ہوئی۔ پہلے شہداء کے سروں کو تن سے جُدا کیا گیا، پھر لاشوں کو ایک سلسلے سے لٹایا گیا کہ انہیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا جائے۔ شہداء میں جو لاشیں ان قبیلوں سے متعلق تھیں جو لشکرِ یزید میں شامل تھے وہ سب علیحدہ کر لی گئیں مگر آلِ رسُول کا کوئی سفارشی نہ تھا۔ ان کو پامال کر دیا گیا اور سروں کو نیزوں پر بلند کر دیا گیا۔ (۹۵)

جناب شہر بانو کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے نہر فرات میں گر کر جان دے دی۔ یہ روایت کسی ناصبی کی ہے۔ امامؑ کی بیوی اور امامؑ کی ماں حرام موت، نہیں مر سکتی۔ دوسری روایت یہ کہ آپ اہلِ حرم میں موجود تھیں اور اسیر ہو کر شام گئیں۔ مگر زیادہ صحیح روایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ امام زین العابدینؑ کی ولادت کے بعد ہی آپ کا انتقال ہو گیا تھا لیکن تیسری روایت بھی یکسر نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ بعد قتلِ امام حسینؑ گھوڑا خیمہ گاہ میں آیا۔ ایک نقاب پوش بی بی خیمے سے نکلیں۔ گھوڑے پر سوار ہوئیں اور گھوڑا فراٹے بھرتا ہوا انہیں لے کر چلا گیا۔ دشمن کی نظر ان پر نہیں پڑی جس طرح شبِ ہجرت حضورؐ قریش کے سامنے سے گزر گئے تھے مگر کوئی انہیں دیکھ نہ سکا تھا۔ یہ بی بی شہر بانوؑ تھیں یا کوئی اور بانو مگر تھیں نقاب پوش۔ گھوڑا رے کی ایک پہاڑی کے قریب آ کر رُکا۔ آپ دامنِ کوہ میں داخل ہوئیں اور درہ بند ہو گیا۔ آپ کا آنچل مدتوں اس جگہ لہراتا رہا، جس کو دُور سے دیکھنے کی سعادت بعض راویوں کو حاصل ہوئی۔ یہ جگہ شہزادہ عبدالعظیم کے مزار کے قریب واقع ہے۔

ہندوستان کے بعض حصوں میں ناپید بی بی کی نذر کی جاتی ہے اور مومنین کی مُرادیں بر آتی ہیں —— ناپید بی بی سے مُراد جناب شہر بانوؑ ہیں۔

تاہم جناب شہر بانو کے اسیر ہونے یا نہ ہونے سے نتائج یا کوفیوں کی روش پر کوئی اثر نہیں پڑتا ——

بلاشبہ جناب شہر بانو ایران کی شہزادی تھیں لیکن اُس سے زائد عزت کی بات یہ تھی کہ آپ رسالتؐ مآب کی بہو تھیں۔ مسلمانوں نے جب رسولؐ کے بیٹے کو قتل کر دیا تو بہو کی تکریم کیا کرتے —— ان کے لشکر میں خوشیوں کے شادیانے ضرور بجتے جو اس وقت بھی بج رہے تھے اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف مسرت کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ ان کے ہزاروں آدمی کھیت رہے تھے۔ اس کا انہیں کوئی غم نہ تھا، خوشی تھی تو بس اپنی فتح کی لیکن درحقیقت یہ ان کی بھول تھی۔ جیت یزیدؔ کے بجائے حسینؑ ابنِ علیؑ کی ہوئی تھی۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔

"فتح اس کی تھی اور فیروزمندی اور کامرانی کا تاج صرف اسی کے زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹا، پر اپنے اس خون کے ایک ایک قطرے سے، جو عالم اضطراب میں اس کے زخموں سے ریگ و سنگ پر بہا تھا، انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتش پیدا کر دیئے، جن کو نہ مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی، نہ حجاج کی بے اماں خونخواری اور نہ عبدالملک کی تدبیر و سیاست۔ وہ بڑھتے اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان کے شعلوں کی پرورش کرتا رہا اور حکومت و تسلط کا غرور ہوا بن کر ان کی ایک ایک چنگاری کو آتش کدۂ سوزاں بناتا رہا۔" (۹۶)

چوتھے امام

امیر المومنین حضرت امام زین العابدین علیہ السلام

۱۱ محرم ۶۱ھ تا ۲۵ محرم ۹۵ھ

آغازِ امامت

۲۳ سال کی عمر میں غم و اندوہ کے طوفان سے آپ نے دورِ امامت کا آغاز کیا ایوبؑ و عیسیٰؑ کی سیرت آپ کا ابتدائیہ تھی اور جلے ہوئے خیموں کا خاکستر تختِ امامت زینبؑ نے بھائی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کو وہ پورا کرتی رہیں۔ بچوں کو یکجا کیا۔ عورتوں کی ڈھارس بندھائی اور بیمار بھتیجے کو سہارا دیا۔ کتنی دل شکستہ اور تھکی ماندی تھیں زینب، مگر بڑے تحمل اور استقلال کا مظاہرہ کیا آپ نے، جس کو پیغمبرانہ کردار کے سوا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

کلیجہ پھٹ جاتا کسی اور کا جب وہ یہ سوچتا کہ کل اسی وقت خیمہ گاہ میں کتنی چہل پہل تھی۔ اکبرؑ و قاسمؑ تھے اور عباسؑ، گھر سے باہر تک ہر ایک کا مرجعِ امید، آج ایک طرف پامال شدہ لاشیں پڑی تھیں، دوسری طرف زینبؑ اپنے وجود کی بساط پھیلائے سب کو تاریکی کی چھاؤں میں لئے بیٹھی تھیں اور اللہ کو یاد کر رہی تھیں۔

حُر کی بیوہ کھانا پانی لے کر آئی تو زینبؑ کا نہ رونا فطرتِ انسانی کے خلاف تھا مگر آپ نے حواس کھو کر دوسروں کو بدحواس ہونے نہیں دیا اور اسی عالم میں رات گزاری صبح کو قافلہ روانگی کے لئے ترتیب دیا گیا تو کل چوراسی ۸۴ افراد تھے۔ امام زین العابدینؑ

امام محمد باقرؑ، محمد بن امام حسینؑ، عمر بن امام حسینؑ، زید بن امام حسنؑ، عمر بن امام حسنؑ حضرت زینبؑ، حضرت ام کلثومؑ، فاطمہؑ بنت امام حسینؑ، سکینہؑ بنت حسینؑ۔ فاطمہؑ بنت علیؑ رقیہؒ زوجہ حضرت مسلمؑ، اُمّ ہانیؒ بنت ابی طالب، ربابؒ والدہ علی اصغرؑ، اُمّ لیلیٰؑ والدہ علی اکبرؑ، عاتکہؒ زوجہ امام حسینؑ، رقیہؒ بنت مسلمؑ، نضاعہ زوجہ امام حسینؑ، اُمّ اسحٰقؒ مادر فاطمہؒ اُمّ عبداللہ زوجہ امام زین العابدینؑ، جناب فضہؑ، زوجہ حضرت عباسؑ، عاتکہ بنت مسلمؑ زوجہ امام حسنؑ، زوجہؒ عثمانؒ بن علیؑ، دخترؒ عثمانؒ بن علیؑ، زوجہؒ عونؒ بن علیؑ، زوجہ جعفرؒ بن عقیلؑ، زوجہؒ موسیٰؒ بن عقیلؑ، زوجہؒ سعدؒ غلام امیرالمومنینؑ، زوجہؒ زہیرؒ ابن قین زوجہؒ مسلمؒ بن عوسجہ، زوجہؒ بریرؒ ہمدانی، زوجہؒ جنادہؒ بن کعب، مادرؒ قاربؒ بن عبداللہ رفیدؒ سلمٰیؒ بنت حجرؒ بن عدی۔

ان ناموں میں کئی نام شبہ سے خالی نہیں، باقی تعداد میں دو چار غلام اور بچے تھے جن کی تفاصیل کا ملنا ممکن ہی نہیں، کیونکہ کوفہ و شام کے جلاد جب قافلے کو لے کر چلے تو اکثر مقامات پر ناقوں کو اس تیزی سے دوڑاتے رہے کہ بچے رسن بستہ عورتوں کے ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ کر گر گئے۔ بدنصیب عورتیں چیختی رہیں مگر ظالموں نے ایک نہ سُنی۔ ان بچوں کی قبور کربلا سے کوفہ اور کوفے سے شام کے راستوں پر جا بجا پائی جاتی ہیں جنہیں ارد گرد کے باشندوں نے دفن کر دیا لیکن کوئی بتا نہیں سکتا کہ کس قبر میں کس کا بچہ دفن ہے؟

قافلے کو اس انداز پر ترتیب دیا گیا تھا کہ آگے آگے نیزوں پر سر تھے۔ پیچھے حضرت زین العابدینؑ آہنی طوق و زنجیر پہنے ایک اونٹ پر سوار، اس کے عقب میں جناب زینبؑ، جناب اُمّ کلثومؑ اور دوسری خواتین اُونٹوں کی ننگی پیٹھوں پر رسن بستہ بیٹھی ہوئیں اور سب کے پیچھے افسران فوج اپنے اپنے دستوں کے ساتھ، شمرؔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتا۔ اس کی نظر خاص طور پر امام کی چہیتی بیٹی سکینہ پر رہتی جو جناب زینبؑ کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی اور جس کو سزا دینے کے لئے وہ قصور ڈھونڈتا رہتا تھا۔

کربلا کے اسیر کوفے میں

اہلِ بیتؑ کی دشمنی کا جو چراغ سقیفہ بنی ساعدہ میں جلایا گیا تھا ـــ اس کی لَو معاویہ نے بہت تیز کر دی تھی اور یزید نے تو چراغ کی بتی کو اتنا اونچا کر دیا کہ اس کی لَو بھڑکنے لگی۔ یزید کا مقصد اوّلیں قتلِ حسینؑ تھا لیکن اس قتل کے عواقب میں بغاوت کے جو امکانات مضمر تھے وہ اس سے چھپے نہ تھے لہٰذا وہ آلِ رسولؐ کو اتنا ذلیل کرنا چاہتا تھا کہ کسی کی نظر میں ان کی کوئی وقعت باقی ہی نہ رہے، اسی لئے اس نے پورا منصوبہ پہلے ہی سے ابن زیاد کو بھیج دیا تھا کہ قتل کے بعد اسیروں کی زائد سے زائد تشہیر کی جائے اور اس راستے سے نہ لایا جائے جس پر شیعانِ علیؑ کی بستیاں پڑتی ہیں۔

یزید کے حمایتی کہتے ہیں کہ یزید اہلِ بیتؑ کو دیکھ کر رو پڑا تھا اور اس نے چند روز کے اندر سب کو رہا کر دیا۔ مگر چھ کے یہ آنسو اس نوشتے کو دھو نہیں سکتے جو اس نے ابن زیاد کو بھیجا تھا بلکہ سب سے پہلے حاکمِ مدینہ ولید کو لکھا تھا کہ بیعت یا قتل پھر یہی حکم ابن زیاد کو دیا گیا ـــ اموی سیاست داں کا مکار بیٹا بیعت یا گرفتاری بھی لکھ سکتا تھا مگر روایات گڑھنے والوں کے ذہن میں شاید یہ بات نہیں آئی ورنہ یہ کہنا سچ ہی ہو جاتا کہ جو کچھ کیا ابنِ زیاد نے کیا، ابن معاویہ کا منشا یہ ہرگز نہیں تھا۔

پھر بعد قتلِ حسینؑ وہ عزت و آبرو کے ساتھ اہلِ بیت کو بھیجنے کا حکم بھی بھیج سکتا تھا جو اہلِ بیت کے قیام کوفہ میں کبوتر کے ذریعہ با آسانی ابن زیاد تک پہنچ جاتا ـــ اور خانوادہ رسالت کی وہ رسوائی نہ ہوتی جو دربارِ شام میں ہاں تک پہنچنے میں ہوئی۔

رونا تو اسی کا ہے کہ ظلم پر پردہ ڈالنے کیلئے ظالم کی ہمنائیت میں محاسن کو نکھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کوشش میں حق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اندھی طرف داری میں باطل پرستی کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگوں سے سچا تو عمر سعد تھا۔ صاف لفظوں میں امام حسینؑ سے کہہ دیا تھا کہ وہ دین کے لئے دنیا کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اسی پر وہ عمل پیرا رہا اور حکم کے مطابق اسیرِ

کو کربلا سے کوفہ لے آیا۔

۳۸ میل کا فاصلہ اگرچہ رواروی میں طے کیا گیا تھا پھر بھی رات ہو گئی، لہٰذا قافلے کو شہر کے باہر ہی ٹھہرا دیا گیا۔ دوسرے دن صبح کو بازار آراستہ کیا گیا اور بے پردہ بیبیوں کو بھرے بازار سے گزارا گیا۔

یہی کوفہ امیر المومنین کا دارالخلافہ رہا تھا۔ زینبؑ و ام کلثومؑ یہاں بنات رسولؐ کی حرمت کے ساتھ رہی تھیں۔ آج اس حال میں گزرنا کسی پیغمبرانہ آزمائش سے کم نہ تھا مگر حسینؑ کی بہن نے پورے صبر و تحمل سے عزتِ نفس کا مظاہرہ کیا۔ تماشائی دو رویہ کھڑے ہوئے تھے۔ عورتیں بالاخانوں سے اسیروں کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ بارہ ہزار سپاہی بازار میں پھیلے ہوئے کسی ممکن بغاوت کے نگران تھے۔ شہزادی زینبؑ کا سر جھکا ہوا تھا۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہؐ کے اہلِ بیتؑ ہیں تو وہ بے اختیار رونے لگے۔

خوشی کے باجے بج رہے تھے اتنا شور و غل تھا کہ ایک دوسرے کی آواز سن نہ سکتا مگر اللہ رے زینبؑ کا رعب و جلال کہ آپ نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو ایک دم سناٹا چھا گیا اور زینبؑ کی آواز گونجنے لگی۔

"کوفے والو! تم ہماری حالت پر روتے ہو ـــــ تمہاری مثال اس ہری گھاس کی سی ہے جو کوڑے پر لہلہا رہی ہو، اس چاندی کی سی ہے جو کسی قبر پر چڑھائی گئی ہو ـــــ چند روزہ مہلت پر مغرور نہ ہو کیونکہ اللہ جلد باز نہیں۔ اس کو نہ موقع نکل جانے کا خوف ہے اور نہ جہنم کی عدول حکمی کا اندیشہ!"

قسی القلب افسرانِ فوج بھی سن رہے تھے اور سنگدل سپاہی بھی۔ زینبؑ علیؑ کے لہجے میں بولتی رہیں اور وہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ کسی عورت کی زبان سے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ امام زین العابدینؑ نے روک کر خاموش کر دیا۔

"آپ عالمہ غیر معلمہ ہیں: (وہ عالم، وہ کسی کا شاگرد نہ رہا ہو)

اس کے بعد فاطمہؑ بنت حسینؑ اور حضرت ام کلثومؑ نے خطابت کے جوہر دکھائے

پھر امام زین العابدینؑ نے حقِ امامت ادا کیا۔

"میں علیؑ ابن الحسینؑ ہوں! وہ حسین جو ساحلِ فرات پر بے جرم و خطا قتل کیا گیا کیا جواب دو گے رسولؐ اللہ کو، جب وہ پوچھیں گے ــــــ" لوگ ڈھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ قافلہ بڑھتا چلا گیا اور آراستہ و پیراستہ دربار میں ابن زیاد کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔

رسیوں سے بندھے ہوئے قیدی اعیان سلطنت کے سامنے ایستادہ کئے گئے ابن زیاد علیؑ کی کرسی پر فروکش تھا۔ امامؑ کا سر ایک طشت میں نیچے رکھا ہوا تھا اور وہ ایک چھڑی سے آپؐ کے دانتوں کو چھیڑ رہا تھا۔ زیدؓ بن ارقم صحابیٔ رسولؐ کو تاب نہ رہی انھوں نے ٹوک دیا۔

"کیا کرتا ہے، ابن مرجانہ۔ رسولؐ ان ہونٹوں کے بوسے لیتے تھے!"

"خاموش بڈھے۔ تیری عقل جاتی رہی ہے ــــــ" ابن زیاد نے ڈانٹ دیا اور زید روتے ہوئے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اب ابنِ زیاد جناب زینبؑ کی طرف متوجہ ہوا اور امام حسینؑ کی شان میں گستاخی کی۔ جنابِ زینبؑ نے منہ توڑ جوابات دیئے۔ پھر اس نے سیّد سجاد کے بارے میں پوچھا۔

"یہ کون ہے ــــــ؟"

لوگوں نے بتایا تو اس نے امام زین العابدینؑ سے بھی تلخ کلامی کی اور دندان شکن جواب پا کر قتل کا حکم دے دیا۔ امامؑ نے فرمایا۔

"موت سے کیا ڈراتا ہے۔ قتل ہونا ہماری عادت اور شہادت ہمارا شرف ہے!"

جناب زینبؑ بے چین ہو گئی تھیں مگر امامؑ وقت کے چہرے سے ایک اطمینان ٹپک رہا تھا۔ آپ کی بے خوفی نے ابنِ زیاد کے حوصلوں کو پست کر دیا۔ اس نے سوچ سمجھ کر حکم قتل واپس لے لیا اور اسیروں کو قید خانے بھیج دیا۔ پھر سر امامؑ کو نیزے پر بلند کر کے بازاروں میں تشہیر کرایا گیا۔

"یہ ابنِ فاطمہؑ کا سر ہے جو محمدؐ کی بیٹی تھی ــــــ"

اعلان کا مقصد یہ تھا کہ ہر ایک کو قتلِ حسینؑ کی اطلاع ہو جائے۔ یہ مقصد تو پورا ہوگیا اور بے ضمیر کوفہ والوں پر رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی بے حرمتی کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا، پھر بھی دین کے استہزاء اور ارکانِ دین کی تضحیک پر بعض دلوں میں ایک دبی ہوئی چنگاری سلگ اُٹھی ــــــ محبانِ اہلِ بیتؐ سب کے سب قید تھے جن میں مختار بن ابی عبیدہ ثقفی بھی تھے ــــــ ابن زیاد نے اسیروں کی موجودگی میں مختار کو قید خانے سے طلب کیا اور حسینؑ اور ان کے خاندان کی بربادی کا حال دکھایا۔ ظاہر ہے کہ مختار کا کیا حال ہوا ہوگا مگر ابن زیاد کو مختار سے وہ جوابات ملے جن کی وہ توقع بھی نہ کرسکتا۔ نتیجتہً مختارؒ کے مصائب زندان میں اضافہ ہوگیا مگر مختارؒ یا علیؑ کے کسی سرفروش کے جذبۂ ایمان میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ جوشِ انتقام کچھ زیادہ ہوگیا۔

اسی دن ابنِ زیاد نے اہلِ کوفہ کو مسجد میں جمع کیا اور اعلان کیا:-

"خدا کا شکر ہے کہ امیرالمومنین یزید اور ان کے گروہ کو فتح حاصل ہوئی اور کذّاب قتل ہوا!"

عبداللہ ابن عفیف نابینا صحابی برداشت نہ کرسکے، اُٹھ کر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے۔

"کذّاب تُو اور تیرا باپ، پسرِ مرجانہ ــــــ وہ اور اس کا باپ کذّاب، جس نے تجھ کو حاکم بنایا۔"

ابنِ زیاد نے غصّے میں انہیں قتل کرا دیا اور جسم کو دار پر لٹکوا دیا۔ جنابِ مسلمؑ کے بعد یہ دوسری لاش تھی جو لٹکوائی گئی۔

کوفے میں سرِ امامؑ نے سورہ کہف کی تلاوت فرمائی ــــــ سرِ امامؑ کے ایک قطرۂ خون سے ابن زیاد کی ران میں ناسور ہوگیا جو پھر اچھا نہ ہوسکا اور اسی طرح کے کئی اور معجزے رونما ہوئے، پھر ۱۷ محرم ۶۱ھ کو اسیرانِ بلا شام کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔

کوفے سے شام تک

کوفہ سے شام جانے کے تین راستے تھے۔ پہلا راستہ صرف ساڑھے پانچ سو میل کا تھا لیکن وہ غیر آباد اور صحرائی تھا۔ اس راستے سے اسیر جاتے تو نہ فتح کربلا کو شہرت ہوتی اور نہ خانوادہ رسالت کی ذلت اس لئے اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔

دوسرا راستہ اگرچہ سات سو میل کا تھا لیکن اس پر جو بستیاں پڑتی تھیں ان میں محبّان علی کی تعداد زیادہ پائی جاتی خطرہ تھا محافظینِ قافلہ پر حملہ ہونے کا۔ لہذا اس کو بھی ترک کر دیا گیا۔

تیسرا راستہ طویل ترین تھا بارہ تیرہ سو میل لمبا۔ جو مقصدِ تشہیر کو بھی پورا کرتا اور اس کی آبادیاں بھی علی دشمن تھیں، اس لئے اس کو ترجیح دی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ منصوبہ بھی دمشق سے آیا ہو کہ اس پر امیر شام کی سطوت و جبروت کے ڈنکے بجائے جائیں اور اعلان کیا جائے کہ جو حکومت سے بغاوت کرتا ہے اس کا یہ انجام ہوتا ہے، خواہ وہ پیغمبرؐ ہو یا پیغمبر زادہ!

سرہائے شہداء پہلے کی طرح نیزوں پر آگے آگے جو گویا فتح و ظفر کے نشان تھے ان کے پیچھے نبی زادیاں رسن بستہ، شتران بے کجاوہ پر سوار، جن کے ہراول بیمار امام طوق و زنجیر آہن میں جکڑے ہوئے، دونوں طرف نگرانی کے لئے سوار، سب کے پیچھے عمر سعد، شمر، شیث بن ربعی، عمرو بن حجاج اور بعض دوسرےؑ ایک ہزار فوج جلو میں لئے ہوئے، کوفے سے روانہ ہوئے۔

طویل راستے کی مسافت کا توڑ بدبختوں نے یہ کیا تھا کہ دو منزلہ اور سہ منزلہ کرتے ہوئے جائیں تاکہ جلد پہنچیں اور تیز رفتاری کے سبب قیدیوں کو تکلیف بھی ہو۔ بچوں سے ان بے رحموں کو خاص عداوت تھی۔ اونٹوں کو تیز دوڑاتے کیونکہ اس طرح بچوں کے ناقوں سے گر جانے کا امکان تھا ـــــ جب کوئی بچہ گر جاتا تو ملاعین کی اکثریت قہقہے لگاتی اور عورتوں کے چیخنے کے باوجود اونٹوں کو دوڑاتی رہتی تھی۔

شام کے راستے میں بھی ایسے تمام بچوں کو اہلِ تریات نے دفن کیا جن کی بے نام

نبریں اب بھی جا بجا پائی جاتی ہیں۔

کوفے سے چالیس میل پر قادسیہ کے قیام میں شب میں ایک ہاتھ برآمد ہوا جس نے دیوار پر خونِ تازہ سے دو شعر لکھے۔ ان شعروں کا مفہوم تھا۔

"وہ اُمّت، جس نے حسینؑ کو قتل کیا، قیامت میں شفاعت کی امید نہ رکھے، وہ یقیناً عذابِ جہنم سے بچ نہیں سکتی۔"

بعض ملعونوں نے ہاتھ کو پکڑنے کی کوشش کی، مگر وہ غائب ہوگیا اور انھیں دہشت میں مُبتلا کر گیا۔

دوسری منزل ۱۵ میل پر حصاصہ میں ہوئی۔ وہاں سے چل کر ۱۱۲ میل پر قافلہ تکریت پہنچا تو بازار خیر مقدم کے لئے آراستہ تھا اور مشہور کیا گیا تھا کہ ایک خارجی نے خروج کیا تھا جو قتل کر دیا گیا لیکن ایک نصرانی کوفے سے آیا تھا اس نے بتا دیا کہ سرِ حسینؑ ابنِ علیؑ کا ہے۔ اس خبر سے ہر طرف شورش پھیل گئی۔ قافلہ کو کچھ فاصلہ سے دارلوادہ میں ٹھہرایا گیا اور صبح ہوتے ہی کوچ کر دیا گیا۔

وادیٔ نخلہ کے لوگوں نے ان پر نفریں کی اور وہ شہر "لینا" پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے یزید و شمر پر لعنت بھیجی۔ شمر نے ان پر حملہ کیا اور غارتگری کرکے آگے بڑھ گیا۔ اگلی منزل کحیل تھی مگر وہاں بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے اس لئے اسیروں کا قافلہ بغیر آرام کئے آگے بڑھ گیا۔

موصل کی صورتِ حال بہت زیادہ خراب تھی۔ اوس و خزرج کے ہزاروں آدمی سروں کو چھین لینے اور اہلِ بیتؑ کو آزاد کرا لینے پر تیار تھے لیکن عمر سعد نے کچھ دُور پہلے ہی قیام کر لیا اور صبح ہوتے ہی جبلِ سنجار کی طرف چل پڑا۔

اگلی منزل نصیبین تھی۔ یہ واحد مقام تھا جہاں ملاعین حسب منشاء عترتِ پیغمبرؐ کی تذلیل کر سکے۔ جناب زینبؑ نے شہر کو بددُعا دی۔ ایک بجلی گری اور تقریباً نصف شہر جل کر خاک ہوگیا۔ پھر بدنصیبوں کا قافلہ عین الورد ہوتا ہوا دعوات پہنچا۔

یہ دوسرا شہر تھا جہاں بنی اُمیہ کی پذیرائی کی گئی۔ وسط شہر میں امامؑ کا سر نصب

کیا گیا اور محفل سرود و جام گرم ہوئی، تاہم سر کے بارے بتایا گیا کہ ایک خارجی کا ہے۔۔۔
اس کے بعد حران میں منزل کی گئی۔ عراق کا یہ قدیم ترین شہر ہے۔ سرِ حسینؑ ایک کلیسا کے نیچے سے گزرا تو اس کے لبوں سے تلاوت کلام پاک ہو رہی تھی۔ کلیسا کا پادری یحییٰ خزاعی بڑے تحیّر میں سر کو دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا کہ کس کا سر ہے؟ کسی نے اس کو بتایا اور سر کے معجزے سے صداقتِ اسلام اس کے دل پر مرتسم ہو گئی۔ اس نے فی الفور کلمہ طیبہ زبان پر جاری کیا اور مخدراتِ عصمت کو چادریں پیش کیں۔ شامیوں نے مزاحمت کی تو اہلِ کلیسا نے مقابلہ کیا۔ یحییٰ شہید ہو گیا اور قافلہ اسی وقت آگے بڑھ گیا۔

منزلِ کلیسہ پر سیدانیوں کو ایک دیر کے قریب ٹھہرایا گیا۔ جس کی دیوار پر عربی میں کسی زمانے کا ایک شعر لکھا ہوا تھا۔ اُس کے بارے میں معلوم ہوا کہ جناب شیثؑ کی اولاد نے لکھا تھا۔ شعر کا مفہوم تھا۔

"جس اُمّت نے حسینؑ کو قتل کیا، وہ قیامت میں ان کے جدّ کی شفاعت سے محروم رہے گی"!

شعر میں ۶۱ھ کی کوئی صراحت نہ تھی کیونکہ حسینؑ تو اس کے بعد بیشتر ادوار میں قتل کئے گئے اور آج بھی مسلسل ان کے گلے پر چھریاں پھیری جا رہی ہیں۔ کیا آج کے قاتل اُس تعریف میں نہیں آتے؟ ضرور آتے ہیں اور یقیناً وہ لوگ شفاعت سے مایوس ہیں تب ہی تو سرے سے شفاعت کے منکر ہو گئے ہیں۔

قنسرین اس کے بعد کی منزل تھی۔ اہلِ شہر نے قافلے کو اندر داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ قاتلوں پر لعنت کی اور پتھر مار مار کر بھگا دیا۔

معرۃ النعمان میں قافلے نے رات گزاری، پھر شیرز آیا۔ وہاں بھی قنسرین کی سی صورت پیش آئی اور قافلہ کفر تاب پہنچا۔

یہ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ قلعہ والوں نے انہیں پانی تک نہیں دیا اور قافلہ ارضِ سیبور کی طرف چل پڑا۔

اس مقام پر شامی لشکر کا اہلِ شہر سے سخت مقابلہ ہوا۔ لشکر کے چھ سو آدمی مارے

گئے اور شہر والے صرف پانچ شہید ہوئے۔ حضرت اُمِ کلثومؑ نے شہر کو دُعا دی۔

"خداوندا۔ یہاں کے چشموں کو شیریں بنا دے!"

شہزادی کی دُعا کا اثر ہے کہ آج تک ارضِ سیبور سے زائد شاداب علاقہ دُور دُور تک پایا نہیں جاتا۔

حماۃ کے باشندوں نے بھی شامیوں کو ٹھہرنے نہ دیا۔ حاکم حمص نے لشکر کا استقبال کیا مگر شہر میں داخل ہوتے ہی اس پر اتنی اینٹیں اور پتھر برسے کہ ۲۶ آدمی مر گئے۔ وہ لوگ تو امامؑ کا سر بھی چھین لیتے مگر عمر سعد نے چالاکی سے کوچ کر دیا۔

بعلبک کے آراستہ شہر میں اولادِ رسولؐ کا مضحکہ اُڑایا گیا اور حضرت ام کلثومؑ نے اس شہر کے لئے بد دُعا فرمائی۔

وہاں سے عسقلان کی طرف بڑھتے ہوئے عیسائیوں کی ایک عبادت گاہ پڑی جہاں سرِ مظلوم سے ایک معجزہ ظاہر ہوا۔ وہاں کے راہب نے دس ہزار دینار دے کر ایک رات کے لئے سر کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ سر جیسے ہی صومعہ کے اندر پہنچا، ہر طرف سے نور ہی نور ساطع ہونے لگا۔ راہب کی گرویدگی کا اثر ہو یا دعا کی قبولیت کہ سر سے آواز آئی۔

"کیا چاہتا ہے تو ——— ؟"

"اپنا پورا تعارف کرا دیں ———" راہب ملتجیانہ لہجے میں بولا اور امامؑ کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

"حسین شہیدِ کربلا ——— علیؑ کا بیٹا ——— فاطمہؑ کا پارۂ جگر ——— رسولؐ کا نواسہ!"

راہب ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور بولا

"مجھے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی۔ آپ سے شفاعت کا امیدوار ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اور تمام اہلِ کلیسا نے اسلام قبول کر لیا۔

قافلہ اگلی منزل پر ٹھہرا تو عمر سعد نے راہب کی دی ہوئی تھیلی کھولی۔ اس کی تمام اشرفیاں ٹھیکریوں میں بدل چکی تھیں۔

عسقلان کا حاکم جنگ کربلا میں شریک تھا۔ اس نے لٹ کر والوں کی بڑی خدمت کی مگر اس مقام پر زریر نامی مرد حق بیں کو جب معلوم ہوا کہ عترت پیغمبرؐ اس حال میں گرفتار ہے تو وہ امام زین العابدینؑ کے قریب آیا، دیر تک روتا رہا پھر آپ کے حسب ارشاد سواروں کو کچھ رقوم دے کر خواتین مطہر کے قریب سے ہٹایا۔ کچھ چادریں منگوا کر ان میں تقسیم کیں اور شمر کو بہت سخت دُرُست کہا۔ اس پر اُسے زد و کوب کیا گیا اور وہ قافلے کی روانگی تک بے ہوش رہا۔

اب دمشق کوئی سوا سو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس لئے قافلہ بڑے اہتمام سے چلتا ہوا شہر کے باہر پہنچ کر مقیم ہو گیا۔

کربلا سے کوفہ، کوفے سے دمشق کا طویل فاصلہ، ۱۱ محرم ۶۱ھ سے ۱۶ صفر ۶۱ھ تک چھتیس روز کا دقفہ، ذہنوں پر بھرے گھر کی تباہی اور اسیری کے احساس کا غلبہ، نہ جانے کیسے برداشت کیا ان بلانصیبوں نے۔ اس پر مستزاد دکھی گلی کوچوں اور بھرے دربار کی رسوائی۔ زین العابدینؑ تو خیر امام تھے اور زینبؑ عظمیٰ شریک کارِ امامت، مگر راستے میں جو شدائد اہلبیتؑ کو پیش آئے، ان کا نشانۂ اول وہ چھوٹی سی بچی تھی جو باپ کی پیاری اور چچا کی لاڈلی تھی۔

شمر کو جب سے معلوم ہو گیا تھا کہ حسینؑ سکینہ کو بہت چاہتے تھے، اس وقت سے وہ چار سال کی اس بچی کا اتنا دشمن ہو گیا تھا کہ موقع ملتے ہی اس کو سزا دینے کو آ جاتا۔ سکینہ ہر طمانچے پر چچا کو آواز دیتی، ہر دُرّے پر باپ کو پکارتی اور جب کوئی فریاد رس کرنہ آتا تو پھوپھی کے سینے میں سر چھپا لیتی۔ اس کے بعد سکینہؑ پر پڑنے والا ہر دُرّہ بنت علیؑ کی پشت پر پڑتا۔ مخدّرات رسّیوں میں بندھی نہ ہوتیں تو بڑھ کر ہر دُرّے کی چوٹ اپنے اوپر لے لیتیں مگر کرتیں کیا، وہ جنبش بھی تو نہ کر سکتی تھیں پھر بھی چیخ کر کہتیں۔

"ظالم! شہزادی کو نہ مار، مارنا ہے تو مجھے مار لے ________"

خود امام زین العابدینؑ بھی اس مشقِ ستم سے محفوظ نہ تھے۔ ملاعین کو جب کوئی بات جناب زینبؑ سے منوانا ہوتی تو پہلے امامؑ کے پاس آتے اور دو چار دُرّے لگا کر کہتے

"پھوپھی سے کہو، دربار میں چلیں ـــــ"

"تمہارے باپ کا سر ایک جگہ رُک گیا ہے، چلتا کیوں نہیں ہے؟"

امامؑ سر کے بتانے پر سکینہ کو ڈھونڈھواتے اور جب وہ مل جاتی تب ان کی جان اس تشدد سے چھوٹتی ـــــ اتنے مصائب پر بھی یہ سخت جان زندہ تھے۔ شاید حسینؑ کے کام کو پورا کرنے کی خاطر یا اس مہم کو سر کرنے کے لئے جو بغیر کسی تحریک کے شروع ہوگئی تھی

حسینؑ کی شہادت حقیقتاً رسولؐ کی شہادت تھی، کیونکہ اہلِ بیت کی جس قدر تشہیر ہوتی، مقصدِ شہادت اتنا ہی واضح ہوجاتا۔ بالفاظ دیگر سرِ حسینؑ جہاں جہاں جاتا، کربلا میں بنی اسد کے ہاتھوں دفن کئے ہوئے جسم سے اس کا رشتہ قائم ہوجاتا۔ یہ رشتہ غیر مرئی طور پر ایک طوفان کی لکیر ہوتا جس سے سُرخ شعلوں کی طرح وہ الفاظ روشن ہوجاتے جو امامؑ نے اپنے خطبات میں کربلا کے بے دھرم اور شقی القلب یزیدیوں کے سامنے پیش کئے تھے۔ اس طرح وہ الفاظ کربلا سے کوفہ، کوفہ سے ان مقامات تک جہاں جہاں قافلہ قیام پذیر ہوا تھا، پہنچے اور سب جگہوں سے گزر کر دمشق کی فصیلوں پر دستک دینے لگے

دمشق کا بازار

دمشق معاویہ کا دارالخلافہ رہا تھا۔ علیؑ اور اولادِ علیؑ پر لعنت کرنے کا رواج جہاں سے چل کر ستر ہزار منبروں تک پہنچا تھا۔ اجنبی سوچتے ضرور ہوں گے کہ کتنے بُرے تھے یہ لوگ جن سے برأت کا اعلان صبح و شام کیا جاتا ہے اور اکثریت ایسی تھی جو صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ عرب میں اسلام کا پیغمبرؐ گزرا تھا جس کے براہِ راست وارث بنی اُمیہ ہیں اور جس کا مذہب وہی ہے جو فرمانروایانِ شام کے زیرِ عمل رہا ہے۔ ایک تعداد البتہ ایسی تھی جو حقیقت آشنا تھی، مگر ان سب کے لب سونے کی مہروں سے سی دیئے گئے تھے۔ پرانے آدمیوں کی اکثریت مرکھپ چکی تھی۔ نام کو اگر کوئی باقی تھا تو زبان کھول کر شمشیر کی چھاؤں میں بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔

ان ہی حالات میں علماء سے قتلِ حسینؑ کا فتویٰ لیا گیا تھا اور ایسی ہی باتوں کو شہرت دے کر شام کے بازار سجائے جارہے تھے اور در و دیوار کی آئینہ بندی ہو رہی تھی

تاکہ جشن کے اس ماحول میں باغیوں کے سر اور ان کے رسن بستہ خاندان کو گزارا جائے اور یزید کی فتح پر اظہارِ مسرّت کیا جائے۔

اُمِ کلثومؑ نے شمر سے خواہش کی تھی کہ ہم کو اس راستے سے لے چل جدھر تماشائی کم سے کم ہوں۔ شمر لایا اس طرف جہاں کھوئے سے کھوا چھل رہا تھا۔

ایک انجان بوڑھے نے سرِ بازار امام زین العابدینؑ سے کہا کہ تم لوگوں کو خدا نے بغاوت کی سزا دی۔ اس پر امام نے آیاتِ قرآنی کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا اور بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ امام نے اس کو تسلی دی کہ نادانستگی میں اس نے جو کچھ کیا یا جو کہا، اس سے تائب ہو جائے، پروردگار اس کی توبہ قبول کرے گا۔

جلوس کی ترتیب میں ایک شخص سورہ کہف کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب وہ اس جگہ پہنچا۔

"اصحاب و رقیم ہماری نشانیوں میں سے تھے ــــــ"

تو امام کے سر سے آواز آئی

"میرا قتل اصحابِ کہف کے واقعے سے زیادہ ہے"

اور یہ حقیقت ہے کہ اصحاب کہف پر تو کفّار نے ظلم کیا تھا لیکن امام کو تو اُمت نے مہمان بلا کر شہید کیا تھا۔

کئی واقعات امام زین العابدینؑ، جناب زینبؑ اور جناب اُمِ کلثومؑ کو پیش آئے آپ نے اپنی اصلیت بتا کر بے خبر لوگوں کی آنکھیں کھولیں ـــ اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے دربار تک پہنچے تو ان پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔

دربارِ یزید

بات صرف بدحالی کی نہ تھی۔ اس کی تو مخدراتِ عصمت اور خود امامؑ بھی کسی حد تک عادی ہو چکے تھے، مسئلہ تھا عورتوں کے لئے غیر مردوں کے سامنے جانے کا اور امام کے لئے نائبِ رسولؐ کے وقار کا۔ عورتیں بازاروں میں ہو کر آئی تھیں۔ کوفے کے بازار اور دربارِ کوفہ میں جناب زینبؑ اور اُمِ کلثومؑ نے خطبات دیئے تھے تو نگاہوں

کو بچا کر، لیکن یزید کا دربار ایک طرح پر بین الاقوامی تھا۔ اسی لئے جب کسی نے امام زین العابدینؑ سے سوال کیا۔

"سب سے بڑی مصیبت آپ پر کہاں پڑی ——— ؟"

تو آپؑ نے فرمایا۔

"الشام ہے ——— الشام !"

چنانچہ شمرؔ جب اسیروں کو لے کر دربار میں جانے کے لئے چھ دروازوں سے گزر چکا اور جناب زینبؑ کی نظر دور سے نامحرموں کے بے پناہ ہجوم پر پڑی تو آپ کہنے لگیں۔

"کس کی مجال ہے جو مجھے لے جا سکے ——— ؟"

شمرؔ کا تازیانہ امام کا خون چاٹنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ امام کے قریب آگیا۔

"کہو اپنی پھوپھی سے کہ دربار کی طرف قدم بڑھائیں ———"

امام علیہ السلام نے پھوپھی کو بابا کے سر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کر دیا۔

جناب زینبؑ نے سر اٹھا کر دیکھا تو امام کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ منشاء یہ تھا کہ بہن چلی جاؤ، یہ بھی میرے محضرِ شہادت میں لکھا ہے اور اسی سے تکمیل شہادت ہوتی ہے۔

زینبؑ امام زین العابدینؑ کے پیچھے پیچھے سر جھکائے بڑھنے لگیں۔

یزید اپنے پورے جاہ حشم کے ساتھ تخت طلائی پر متمکن تھا۔ اس کے دوش پر پیغمبرؐ اسلام کی وہ چادر پڑی ہوئی جو فتح مکہ کے دن آنحضرتؐ نے ابو سفیان کو اڑھائی تھی۔

سید الشہداءؑ کا سر ایک سونے کے طشت میں یزید کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ باقی سر اس کے بعد قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ سروں کے اس طرح سجانے کی نظیر ماضی کی تاریخ میں بھی مشکل سے ملے گی۔ ہاں آگے چل کر چنگیز خان نے اس کی تقلید کی اور سروں کا ایک چبوترہ بنوایا۔ اس طرح یزید اور یزیدیوں کا موازنہ اگر ہو سکتا ہے تو چنگیز اور اس کے درندہ صفت ساتھیوں سے ——— مگر چنگیزی تو وضع قطع میں بھی درندے معلوم ہوتے تھے۔ بنی امیہ نے تو روم و ایران کی تہذیب اپنا لی تھی۔ دیکھنے میں متمدن اور اندر

سے خونخوار بھیڑیے جن کی مثال چنگیز خان سے بھی نہ دی جا سکتی۔ سات سو کرسی نشیں دربار کی زینت تھے۔ غلام چمکیلے لباس زیب تن کئے چاروں طرف کھڑے تھے۔ یزیدؐ ایک چوب زریں سے سرِ امامؑ کے لبوں کو چھو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"کاش بدر و احد کے بزرگ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ کیسا بدلہ لیا میں نے بنی ہاشم سے ــــ بنی ہاشم نے جاہ و مملکت کے لئے پیغمبری کا ڈھکوسلا بنایا تھا ــــ ورنہ نہ کوئی فرشتہ آیا تھا نہ وحی نازل ہوئی۔"

باقیات الصالحات میں ایک صحابیٔ رسولؐ ابو برزہ اسلمی دربار میں موجود تھے۔ اُن سے برداشت نہ ہو سکا۔

"یزیدؐ! یہ سردارِ بہشت کے ہونٹ ہیں جنھیں حضورؐ چوما کرتے تھے ــــ خدا لعنت کرے تیرے قاتلین پر۔"

ابو برزہؓ دھکے دے کر نکلوا دیئے گئے۔ دوسری آواز سمرہ بن جنادہ کی بلند ہوئی ان کا بھی وہی حشر ہوا مگر سمرہ نے جاتے جاتے لوگوں سے کہہ دیا۔

"یہ محمد مصطفےٰؐ کے نواسے کا سر ہے ــــ وہ محمدؐ جن کا تم کلمہ پڑھتے ہو!"

اہلِ دربار کی آنکھیں کھل گئیں اور سفیر روم نے یزیدؐ سے سوال کر دیا۔

"کیا حسینؑ تمہارے رسولؐ کے نواسے تھے؟"

یزیدؐ انکار نہ کر سکا اور سفیر بڑے دکھ سے بولا۔

"لعنت ہے تجھ پر اور تیرے دین پر ــــ مجھ سے جناب داؤدؑ کا کئی پشتوں کا واسطہ ہے مگر نصاریٰ میری اتنی عزت کرتے ہیں۔ تو نے اپنے پیغمبرؐ کا نواسہ مار ڈالا اور اس کی خوشیاں منا رہا ہے۔"

یزیدؐ اس گستاخی پر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے سفیر کے قتل کا حکم دے دیا۔ سفیرؓ نے سرِ حسینؑ کو اٹھا کر سینے سے لگایا پھر اس کو بوسہ دے کر کہنے لگا۔

"گواہ رہنا کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدؐ الرسول اللہ!"

جلادوں نے باہر لے جاکر اس کا سر قلم کر دیا۔ ایسا ہی واقعہ یہودی عالم راس الجالوت کا بھی ہوا۔ اس کا سر بھی اُتار لیا گیا۔

ان واقعات سے یزید کی طبیعت کچھ مکدر ہو گئی تھی مگر دو آدمیوں کا خون اس کے لئے کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتا۔ دو جام چڑھا کر شراب کی تلخی سے اس نے اس تلخی کو دور کر لیا اور اہلِ بیتؑ کی رسیاں کھلوا کر ان کو قریب آنے کا اشارہ کر دیا۔ سب سے پہلے جناب سکینہؑ آگے بڑھیں اور یزید آپ کے بھولپن سے متاثر ہو کر خوش مزاجی سے باتیں کرنے لگا۔ شمر کی سختیوں اور گھڑکیوں کی خوگر بچی یزید کو مہربان پاکر بڑے میٹھے لہجے میں جوابات دیتی رہی پھر یزید نے جناب زینبؑ کی طرف توجہ کی جو عورتوں کے جھرمٹ میں کھڑی ہوئی تھیں کسی نے بتایا کہ علیؑ کی بڑی بیٹی ہیں۔ جناب زینبؑ بھرے دربار میں بات کرنا پسند نہ کرتیں اور جناب فضہؑ بی بی کی سینہ سپر تھیں مگر بھائی جو منصب سونپ گئے تھے، بہن کو اُسے نباہنا تھا، اس لئے زینبؑ یزید سے ہم کلام ہو گئیں۔

یزید امام حسینؑ کو مطعون کر رہا تھا آپ اس کو برجستہ جواب دینے لگیں، پھر آپ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بہت بُرا ہو گا ان کا انجام، جنھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا۔ یزید! جانتا ہے تُو نے کیا کیا اور کیا کر رہا ہے ——"

فصاحت کا ایک دریا بہنے لگا اور محسوس ہونے لگا کہ علیؑ مسجد کوفہ میں دُنیا کی بے ثباتی پر تقریر کر رہے ہیں اور لوگوں کو بد کرداری اور بد اعمالی سے ڈرا رہے ہیں پورے دربار میں سناٹا تھا۔ سانس لینے کی آواز بھی مدھم پڑ گئی تھی، صرف بنتِ فاطمہؑ کی آواز دُور دُور تک سُنائی دے رہی تھی۔

"یہ صرف انقلابِ روزگار ہے کہ علیؑ کی بیٹی تجھ سے ہم کلام ہے —— یزید! ہم رسولؐ کی اولاد ہیں۔ تو نے ہم کو مالِ غنیمت سمجھ رکھا ہے مگر اس کا خمیازہ تجھ کو بھگتنا پڑے گا —— تیری رائے ناقص، تیری زندگی کے دن قلیل اور تیری جماعت پراگندہ ہونے والی ہے ——"

"تمام حمد اس کے لئے سزاوار ہے جس نے ہمارے اوّل کو سعادت دی اور آخر کو رحمت کی شہادت عطا کی۔"

تقریر ختم ہونے کے بعد دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر یزیدؒ کی آواز نے اس سکوت کو توڑا۔

"جس کا دل جلا ہو، اس سے ایسی باتیں کچھ بعید نہیں ــــ"

یزیدؒ اور کہتا بھی کیا؟ قتلِ حسینؑ کے جو نتائج نکلے تھے اور مختلف مقامات پر جو مظاہرے ہوئے تھے، وہ اس کے علم میں تھے۔ خود اس کے دربار میں رسُولؐ کے دو صحابیوں کا احتجاج، نصرانی سفیر اور یہودی عالم کے انجام اس کے پیشِ نظر تھے ایسے میں اگر وہ علیؑ کی بیٹی کو قتل کرا دیتا تو سب سے پہلے اس کو فضہؑ کی نسل کے حبشیوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑتا پھر اتنے کھلے ہوئے ظلم پر بعض دوسرے لوگوں کے اُٹھ کھڑے ہونے کا بھی اندیشہ تھا لہٰذا اس موقع پر اس نے معاویہ کی حکمتِ عملی سے کام لیا اور جناب زینبؑ کی شعلہ بیانی کو بُردباری سے برداشت کر لے گیا اور جناب زین العابدینؑ سے مخاطب ہو گیا۔

امامؑ اس کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ وہ امام حسینؑ کی توہین کرنا چاہتا تھا مگر ہر سوال پر اس کو مُنہ کی کھانا پڑی ــــ کہا جاتا ہے کہ یزیدؒ نے امامؑ کے قتل کا حکم دے دیا تھا مگر ایک غیبی ہاتھ نے خود جلاد کا قتل کر دیا۔ یزیدؒ ڈر گیا کہ کہیں یہ ہاتھ خود اس کی گردن نہ دبوچ لے۔ اس لئے اس نے قتل کے خیال کو ملتوی کر دیا۔

ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شامی نے جناب فاطمہؑ بنت الحسینؑ کو کنیزی کے لئے مانگا اور یزید (لعنت اللہ علیہ) نے اقتدار کے زعم میں فاطمہؑ زہرا کی پوتی اس کو بخش دی۔ اس نے فاطمہؑ کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو جناب ام کلثومؑ نے بددُعا کی اور اس کا ہاتھ خشک ہو گیا ــــ مسلمان اگر اپنے پیغمبرؐ کی معجز نمائی کے قائل ہیں تو ان کی نواسی کا اعجاز ماننا پڑے گا۔

اگلے دن یزیدؒ نے مسجد میں ایک اجتماع کرایا جس میں امامؑ کو بھی طلب کیا۔

خطیب مسجد منبر پر گیا۔ اس نے پہلے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے، پھر معاویہ و یزید کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے، جس سے سننے والوں میں وہی غلط فہمی پیدا ہوئی جس کی تشہیر برسوں سے کی جا رہی تھی۔ امامؑ کو اس لئے بلوایا گیا تھا کہ اُن کی خاموشی حقائق کی تصدیق قرار دی جائے۔ امامؑ نے جس کو محسوس کیا اور یزید سے کہا۔

"میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں ——"

یزیدؔ نے انکار کر دیا لیکن دوسرے ملکوں کے جو لوگ تھے اور بعض عمائدین نے کہا۔

"ایک مجبور اور قیدی کر ہی کیا سکتا ہے —— !"

یزیدؔ بنی ہاشم کی فصاحت سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ امام کیا کہیں گے لیکن اجازت نہ دیتے بھی بن نہ پڑا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے اجازت دے دی اور وہی ہوا جس کا یزیدؔ کو خدشہ تھا۔ امامؑ نے منبر پر پہنچتے ہی وہ تقریر شروع کی کہ سامعین دم بخود رہ گئے۔

خلاّق مطلق کی حمد اور ہادیٔ برحق کی ثنا کے بعد آپ نے فرمایا۔

"ایھا الناس! ہم اہلِ بیت رسالتؐ کو خدا نے چھ خصوصیات اور سات فضیلتیں عطا فرمائی ہیں جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ——"

"میں مکّہ و منیٰ کا فرزند ہوں، زمزم و صفا کا بیٹا ہوں، اس کا جانشین ہوں جس نے حجر اسود کو اپنی ردا میں اُٹھایا —— علیؑ ابن ابی طالب میرے دادا تھے، سیدۃ النساء العالمین میری دادی ——"

امامؑ اپنا تعارف کرا ہی رہے تھے کہ مجمع میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ یزید (لعنت اللہ علیہ) نے مؤذن کو اذان دینے کا اشارہ کر دیا اور امامؑ احتراماً خاموش ہو گئے۔

مؤذن نے جیسے ہی "اشھد ان محمد الرسول اللہ" کہا، امامؑ نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا اور یزیدؔ سے سوال کر دیا۔

"یہ محمدؐ جن کا نام اتنے احترام سے لیا گیا ہے، تیرے جدّ تھے یا میرے ؟ اگر تو کہتا ہے کہ تیرے جدّ تھے تو جھوٹا ہے تو اور کافر ہو جائے گا ـــــ اور اگر کہتا ہے کہ میرے جدّ تھے تو پھر تو نے اُنؐ کی عترت کو کیوں قتل کیا ـــــ ؟"

آپ نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا، عمامہ زمین پر پھینک دیا اور مقابلتہً بلند آواز میں فرمایا۔

"یزیدؔ! قیامت کے دن معلوم ہو گا، جب میرے نانا تیرے خلاف مدعی ہونگے ـــ"

مسجد میں شور گریہ و بکا بلند ہو گیا۔ یزیدؔ اس قدر حواس باختہ ہوا کہ بغیر نماز ادا کئے تیز قدموں سے چلتا ہوا محل کی طرف چلا گیا۔

امامؑ کی آواز جیسے صحن مسجد میں اب تک گونج رہی تھی۔ اَن دیکھے مظالم کے نقشے لوگوں کے ذہنوں میں اُبھرتے جا رہے تھے اور دلوں سے غیر محسوس طریقے پر کسی انقلاب کی آواز اُٹھ رہی تھی ـــــ پھر وقت نے یہ بھی دیکھا کہ حسینی خطبات کی آواز بازگشت زندانِ شام سے ٹکرا کر دمشق کے در و دیوار سے گونجنے لگی۔

زندانِ شام

دورِ حاضر کے یزیدؔ کہتے ہیں کہ "امیر یزیدؔ نے عزت اور احترام کے ساتھ آلِ رسولؐ کو رکھا اور رخصت کر دیا" ذرا ابن طاؤس کی آنکھ سے اس قید خانے کو اگر دیکھیں تو وہ ایسی بلند و بالا دیواروں سے محدود نظر آئے گا جو اتنی بوسیدہ تھیں کہ آندھی کے کسی جھکڑ سے گر سکتی تھیں۔ ستم زدوں نے دس محرّم کے ہولناک دن کے بعد جو رات گزاری تھی، زندانِ شام کی راتیں بالکل ویسی ہی تھیں اور دن میں تمازتِ آفتاب سے چہروں کو بچانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی شکل نہ تھی کہ خواتین اپنے بالوں سے مُنہ کو چھپا لیتیں

سچ تو یہ ہے کہ قتلِ حسینؑ کے بعد ان کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ ہاں قید خانے میں اتنا آرام تھا کہ بچے شمر کے جور و ظلم سے بچے ہوئے تھے لیکن اب بچے رہ ہی کتنے گئے تھے۔ سب تو اونٹوں سے گر گر کر جنت کو سدھار چکے تھے۔

سخت جان تھی سکینہ اور چند بچے جو زندہ تھے مگر انکی بھی یہ حالت تھی کہ کھڑے کھڑے لڑکھڑانے لگتے جسم سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے، چہروں کی کھال جھلس گئی تھی ـــــ کبھی کے برگ نو شگفتہ اتنے خزاں دیدہ ہو گئے تھے گویا پت جھڑ کے موسم کا انتظار کر رہے ہوں۔

خواتین کا بھی لگ بھگ یہی عالم تھا۔ پچھلے چند روز سے شام کی کوئی عورت کسی کسی وقت آجاتی تو زینبؑ و اُم کلثومؑ کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا پھر بھی وہ کچھ اور نہ کہتیں، تذکرہ کرتیں حسینؑ کا، عباسؑ کا اور علی اکبرؑ کا اور پوچھنے پر سرگزشتِ کربلا بیان کر دیتیں۔ یہی صورت حسینؑ کی لاڈلی بیٹی کی بھی تھی۔ کسی بچے کے ساتھ کھیلنے کی اُمنگ تو اس کے دِل میں رہی نہ تھی۔ بچے آتے تو اُس ناز و نعم کا تذکرہ کرتی جس میں اُس نے پرورش پائی تھی، اور اس ظلم وستم کو بیان کرتی جو شمر لعین نے اس پر ڈھائے تھے۔

یہ عورتیں اور بچے گھر واپس پہنچ کر آپس میں، پھر محلے میں تمام باتوں کو دہراتے ـــــ اس طرح دھیرے دھیرے عترتِ اطہار کی تباہی کی داستان دمشق میں عام ہو گئی۔ اس کا آوازہ یزیدؔ لعین کے کانوں میں بھی گونجنے لگا اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔

معاویہ کا زندمشرب بیٹا، ہوا وہوس کا دیوانہ حسن وشباب کا سودائی۔ جس کے لئے اس نے ماں بہن کے رشتوں کا امتیاز بھی ختم کر دیا تھا مگر اب کسی بات میں اس کا جی نہ لگتا، سوتے سوتے چونک پڑتا اور کہہ اُٹھتا۔

"کیا ہو گیا تھا مجھے، جو میں نے حسینؑ کو قتل کرا دیا!"

ہند زوجۂ یزیدؔ لعین کے قید خانے پہنچنے کی روایت بھی اسی زمانے کی ہے ـــــ اور یہ قرینِ عقل بھی ہے کہ ہند امام حسینؑ کی زوجیت میں رہی ہوں یا آزاد کردہ کنیز اسی لئے ہند کو خاندانِ رسالتؐ سے ایک ربط تھا اور قتلِ حسینؑ کی خبر نے ان کو پریشان کر دیا تھا۔ یزیدؔ لعین نے اپنی غلطی کا احساس ہونے پر ان کو اجازت دے دی ہو گی اور ہند نے زندان پہنچ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہو گا مگر روایات کے تضاد میں کوئی قطعی نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے پھر بھی یہ مسلم ہے کہ ملکہ یزیدؔ لعین کی اجازت سے قید خانے گئی

اس نے بعض سہولتیں بھی بہم پہنچائیں مگر یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اہلِ بیتؑ اپنی رہائی تک اسی قید خانے میں رہے۔

تشدد کا دَور کچھ ہلکا پڑ گیا تھا۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ یزیدؒ کے مزاج میں کوئی تبدیلی آئی تھی بلکہ سبب یہ تھا کہ قتل حسینؑ اور تشہیرِ اہلِ بیتؑ کے عواقب نے یزیدؒ کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ خود اس کے مرکزِ حکومت دمشق میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ آخر حسینؑ کا قصور کیا تھا؟ خود اسی دمشق میں معاویہ نے رسولؐ کے صحابیوں کو دار پر چڑھایا تھا مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی اور چند روز کے چرچے کے بعد فضا ساکت ہو گئی تھی۔ اسی طرح یزید اگر حسینؑ کو قتل کرا دیتا اور بنی اسد کے بجائے خود لاشوں کو دفن کرا دیتا تو محبانِ اہلِ بیتؑ کی طرف سے انتقام کا آوازہ ضرور بلند ہوتا لیکن یہ صورت پیدا نہ ہوتی کہ جدھر جدھر سے سیدانیوں کا قافلہ گزرا تھا، خاندانِ رسالت کی بے حرمتی اور مظلوموں کی بے بسی پر لوگوں کے دلوں میں شعلے اٹھنے لگے تھے اور انہیں خاندانِ معاویہ سے دشمنی ہو گئی تھی۔

یزیدؒ اگر مصلحت اور سیاست سے کام لیتا تو وہی کرتا جیسا دورِ حاضر کے یزیدی کہتے ہیں کہ یزیدؒ نے اولادِ رسولؐ کو فوراً رہا کر کے مدینے بھیج دیا تھا۔ دراصل یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ بعض مورخین کی رائے ہے کہ ایک سیاسی ذہن کو یہ کرنا چاہیئے تھا کہ قتل کا الزام دوسروں پر ڈال دیتا اور خود بری الذّمہ ہو کر دُور جا کھڑا ہوتا اور "بی جمالو" کا کردار ادا کرتا۔ اس مشورے کو کچھ لوگوں نے واقعہ بنا کر لکھ دیا، زمانۂ مابعد میں جس کی سند دی جانے لگی۔

لیکن ان حقائق و شواہد کو مٹایا نہ جا سکا جو آج بھی عترتِ پیغمبرؐ کے قید کیے جانے کا ثبوت ہیں۔ دمشق میں حسینؑ کی معصوم بچی کی قبر، جناب زینبؑ کا سفرِ شام وغیرہ وغیرہ جناب سکینہ کی قبر دمشق میں رقیہؑ کی قبر کہی جاتی ہے کیونکہ بنی اُمیّہ نے اپنے ظلم پر پردہ ڈالنے کے لیے مشہور کر دیا تھا کہ علیؑ کی بیٹی کی قبر ہے حالانکہ وہ بھول گئے کہ علیؑ کا دمشق پہنچنا کیونکر ثابت ہو گا، اگر کوئی لڑکی تھی تو نام بدل دینا لاحاصل ہے۔

اہلِ بیتؑ کے قیامِ دمشق کو تیسرا ہفتہ تھا۔ اس مدت میں حالات کچھ بدل چکے

تھے مگر جو سختیاں وہ جھیل کر آئے تھے، اُن کے نقوش ذہن تو ذہن جسموں پر بھی موجود تھے۔ عباسؑ کی بھتیجی اب چاہنے والوں کی گود میں رہتی مگر وہ اتنی خاموش ہو گئی تھی کہ جیسے تصویر اندوہ غم بن کر رہ گئی ہو، ہمہ وقت کھوئی کھوئی سی، زینبؑ و اُم کلثومؑ تسلی دینے کی کوشش کرتیں تو کبھی بابا کا نام لے کر روتی، کبھی کہتی کہ چچا نے آنے کو کہا تھا، پلٹ کر نہیں آئے

۵ ربیع الاوّل ۶۱ھ کو روتے روتے سوئی تو تھوڑی ہی دیر بعد چونک پڑی۔

"بابا —— کدھر گئے بابا؟"

پھر بچی چیخ چیخ کر رونے لگی۔ زینبؑ و اُم کلثومؑ نے بہلانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی چیخیں نہ رکیں اور آواز یزید کے محل تک پہنچ گئی۔ اس نے دریافت کرایا تو جناب زینبؑ نے کہا کہ اگر بھائی کا سر بھجوا دیا جائے تو شاید اس کی تسکین ہو جائے، سکینہ نے سر کو دیکھتے ہی گود میں اُٹھا لیا اور سینے سے لگا لیا۔

"بہت دیر کی آپ نے آنے میں بابا ——"، امامؑ نے بیٹی سے کہا تھا کہ جلد بلوالیں گے اس کو۔ سکینہؑ دل ہی دل میں انتظار کرتی رہی ہوگی اور امامؑ جب خواب میں نظر آئے تو وہ سمجھی کہ بابا اس کو لینے آئے ہیں۔

سر کو سینے سے لگا کر وہ بے ہوش ہو گئی، کچھ دیر بعد جناب زینبؑ کو اس کی سانس محسوس نہیں ہوئی تو انہوں نے چھو کر دیکھا۔ سارے گھر کی لاڈلی بیٹی بابا سے جا ملی تھی!

امام زین العابدینؑ بہن کو قبرستان میں دفن کرنا چاہتے تھے مگر یزید لعین کو خطرہ پیدا ہوا کہ لاش قید خانے سے باہر گئی تو قیامت ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے امام سے کہلا بھیجا کہ بچی کو زندان ہی میں دفن کر دیا جائے۔ صابر امامؑ نے یزید لعین کا بھیجا ہوا کفن تو نہیں لیا مگر زہراؑ کی پوتی کو تلوار سے قبر کھود کر انھیں کپڑوں میں دفن کر دیا جو وہ پہنے ہوئے تھی۔

سکینہؑ کی قبر آج بھی مرجع خلائق ہے —— مولف نہج البلاغہ سید محمد رضی کے شہرۂ آفاق بھائی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے روایت ہے کہ ایک شب آپ نے چھوٹی شہزادی کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا: "نہر کا پانی میری قبر کے اندر رنگ آ گیا ہے حاکم دمشق کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ قبر کو پھر سے بنوا دے، تم میری میت کو ہاتھوں میں لئے

رہنا اور قبر دوبارہ بن جانے پر اس میں لٹا دینا۔"

سیّد مرتضیٰ کا قیام ان دنوں دمشق ہی میں تھا۔ حاکم کا آدمی صبح ہوتے ہی سیّد مرتضیٰ کو لینے آ گیا۔ شہزادیؑ نے اس کو بھی یہی تاکید کی تھی۔ چنانچہ سیّد مرتضیٰ قبر مطہر پر حاضر ہوئے قبر کھولی گئی اور اس کی مرمت کی گئی۔ اتنی دیر سیّد مرتضیٰ لاش کو اپنے ہاتھوں پر لئے رہے سیّد مرتضیٰ نے دیکھا، شہزادیؑ کے رخساروں پر اب بھی انگلیوں کے ہلکے ہلکے نشان تھے جو شمر کے طمانچوں سے پڑے تھے، بازوؤں اور کلائیوں پر رسی کی بریں بنی ہوئی تھیں جو پھٹے ہوئے کرتے سے نمایاں ہو رہی تھیں۔ محسوس ہوتا کہ گویا، ابھی آپ کو دفن کیا گیا ہے۔

سید مرتضیٰ پچھاڑیں کھانے لگے لیکن انہوں نے فرض کی ادائیگی کے لئے اپنے کو سنبھال لیا اور شہزادیؑ کو اسی طرح دفن کر دیا۔

نہ جانے ظالموں کو کتنی دشمنی ہے حسینؑ کی بیٹی سے کہ مرنے کے بعد بھی اس کو معاف نہیں کیا اور مطعون کرنے سے باز نہیں رہے۔ اندھوں کو عداوت میں یہ بھی نظر نہیں آیا کہ جس سکینہ کا یہ ذکر کرتے ہیں، وہ سکینہ بنت حسین بن علی بن ابی طالب نہیں تھی بلکہ سکینہ بنت حسین بن علی بن عبدالرحمٰن بن عامر بن حکم بن عاص تھی ـــــ اور عبدالرحمٰن مروان بن حکم کا بھائی تھا۔ یہ سکینہ شاعرہ بھی تھی، فن موسیقی اور علم کلام کی ماہر بھی ـــ اس سکینہ کو بدباطنوں نے سکینہ بنت الحسینؑ بنا دیا۔

شام کے قیدی

یزید کا مقصد آلِ محمدؐ کو عوام کی نظروں سے گرانا تھا اور خود ان کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا تھا کہ اس کے بعد وہ کسی سے نگاہ چار نہ کر سکیں لیکن جو کچھ اس نے کیا تھا وہ خانوادۂ رسالتؐ کے لئے سنتِ پیغمبری تھا ـــــ یزید کی بساطِ سیاست کا یہ پانسہ الٹا پڑا اور اس کی شہرت کو اتنا دھچکا پہنچا کہ محتاط علماء کو اس کے اسلام پر شک ہونے لگا۔

آخر اس نے سوچا کہ عترتِ رسولؐ کو آزاد کر کے مدینے بھیج دے لیکن اقتدار کے غرور اور طاقت کے زعم نے از خود یہ قدم اٹھانے نہ دیا۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ عابدؑ بیمار خود خم ہو کر رہائی کی درخواست کریں مگر وہ اُس باپ کے بیٹے تھے جس نے سر کٹوا دیا تھا لیکن جھکایا

نہیں ظلم وستم کی حد اس سے آگے بڑھ کر ختم ہوتی تب بھی ایوبؑ و عیسٰیؑ کا قائمقام اُف نہ کرتا۔ لہذا آپؑ اسی طرح زندان کی سختیاں جھیلتے رہے۔

آخر ایک دن اس نے اپنے حاشیہ نشینوں سے کہہ دیا کہ علیؑ کے بیٹے نے خواب میں مجھ کو ڈرایا ہے کہ اہلِ بیتؑ کو چھوڑ دے۔

عقیدے کی روشنی میں یزیدؑ کے اس خواب کو صحیح قرار دیا جاتا ہے لیکن اس وقت کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو یزیدؑ کے لئے آلِ نبیؐ کی رہائی کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ رہ گیا تھا۔ مدینے میں قتلِ حسینؑ کی خبر پہنچ چکی تھی اور یزیدؑ سے نفرت کی چنگاری بڑھتے بڑھتے شعلہ بن چکی تھی جس کی اطلاع مروان نے یزیدؑ کو دی تھی۔ خود دمشق کے بزرگوں کی ایک جماعت کئی بار یزیدؑ سے کہہ چکی تھی کہ عترتِ رسولؐ کو کیوں زندان میں رکھا ہے؟ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کسی دن میدان میں نہ آجائیں تو جوان بھی ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔

مکے میں عبداللہ ابن زبیر اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے مصعب ابن زبیر اپنے بھائی کی حمایت میں ایک بڑی فوج کے ساتھ عراق آچکا تھا۔ ان حالات میں یزیدؑ اپنے لئے مزید دشواریاں پیدا کرنا نہ چاہتا تھا، لہذا ایک دن اس نے امام زین العابدینؑ کو بُلا کر کہہ دیا کہ انہیں رہا کیا جاتا ہے، خواہ وہ دمشق میں رہیں یا مدینے چلے جائیں۔ امامؑ نے پھوپھی کے مشورے سے مدینے جانے کا اظہار کر دیا۔

یزیدؑ نے جنابِ زینبؑ کی خواہش کے مطابق ایک مکان خالی کرا دیا، اور ان کے لوٹے ہوئے تبرکات بھی واپس کر دیئے۔ شہداء کے سر بھی بھیج دیئے۔ دمشق کی عورتیں تعزیت کے لئے آئیں۔ زینبؑ و اُم کلثومؑ اور دوسری خواتین کے بیانات سے شورِ ماتم بلند ہو گیا۔ در و دیوار سے ہائے حسینؑ کی صدائیں آنے لگیں —— اور اس کی آواز بازگشت دمشق کے گلی کوچوں میں سنائی دینے لگیں۔

یزیدؑ کو پھر خدشات نے گھیر لیا اور اس نے فوراً کربلا کے اسیروں کو عزت کے ساتھ روانہ کر دیا۔ بشیر بن جذلم پانچ سو سوار لے کر حفاظت کے لئے ساتھ کیا گیا اور اونٹوں کا

یہ قافلہ یزیدؑ کے حکم کے مطابق ساڑھے پانچ سو میل کے سنسان راستے سے چلا اور ۲۰ صفر ۶۲ھ کو واردِ کربلا ہوا۔

یزیدؑ کے ہوا خواہ مدتِ اسیری کو چند روز بتاتے ہیں۔ بعض عقیدت مندوں کا بھی یہی خیال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حسینؑ کی خبر شہادت جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ حسین کوئی معمولی انسان نہ تھے لیکن اس متشددانہ ماحول میں خبر سنتے ہی حسینؑ کی زیارت کے لئے چل پڑنا اتنی آسان بات تو نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر جلد سے جلد مدینہ پہنچی ہوگی تو محرّم کے آخر میں اور ہر ایک نے اِک دم اس کا یقین بھی نہ کیا ہوگا کیونکہ یہ بنی اُمیہ کی چال بھی ہوسکتی تھی۔ خبر کی تصدیق میں کچھ وقت لگا ہوگا اور اس میں ماہِ صفر گزر جانا ممکن نہیں۔

پھر جو کچھ ہوا، اس کا یزیدؑ کی نادانستگی میں ہونا، اس کے عقیدت مند تو مان لیں گے ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حسینؑ سے دشمنی یزیدؑ کو تھی۔ ابن زیاد، مروان بن حکم تو دشمن یزید کی حیثیت سے امام کے خلاف تھے۔ جیسا کہ عمر بن سعد نے کہا تھا وہ تو حسینؑ کو حکومت ریے کے لئے قتل کر رہا ہے۔ رہ گئے جابر بن عبداللہ انصاری اور ان کے ہمراہ چند بنی ہاشم کا ۲۰ صفر ۶۲ھ کو کربلا میں ہونا، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ بے خطر حالات کا اطمینان کر لینے کے بعد مدینے سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس کے سوا کربلا سے کوفے کا سفر، پانچ چھ روز کوفے میں قیام، کوفے سے ساڑھے بارہ سو میل طے کر کے دمشق پہنچنا، دمشق میں کسی مدت تک قیام اور دمشق سے کربلا تک واپسی ۳۶ روز کے اندر اونٹوں کی سواری سے تو ممکن نہیں اور اونٹوں کے علاوہ کوئی اور سواری استعمال نہیں کی گئی۔ اس لئے اسیری کی مدت کسی طرح ایک سال سے کم نہیں ہوسکتی اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر سیاسی عوامل یزید کو گھبرا نہ دیتے تو ایک سال بعد بھی اہلِ حرم کی رہائی نہ ہوتی۔

بہرطور جب شام کا قافلہ کربلا پہنچا تو جابرؓ ابن عبداللہ انصاری وہاں موجود تھے مگر کون سی قبر کس کی ہے؟ یہ جابر کو معلوم نہ تھا۔ یہی دشواری بنی اسد کو بھی پیش آئی وہ ۱۲ محرّم کو حسبِ وعدہ آ تو گئے تھے لیکن جسد ہائے بے سر کو شناخت کیونکر کرتے؟ اچانک ایک طرف سے گرد اُڑتی نظر آئی۔ بنی اسد سمجھے کہ فوجِ یزید کا کوئی سوار آ رہا ہے وہ روپوش

ہونے ہی کو تھے کہ سوار نزدیک آگیا جو امام زین العابدین تھے ـــــ آپ با اعجاز امامت کوفے کی قیام گاہ سے کربلا آ گئے تھے۔ بنی اسد نے آپ کو پہچان لیا۔

آپ نے گھوڑے سے اُتر کر پہلے بابا کا لاشہ ان کی قبل سے تیار قبر میں آتارا حضرت علی اکبر کی قبر پائیں پا بنوائی۔ حضرت عباسؑ کو اس مقام پر سپرد لحد کیا جہاں بحالت موجود آپ کا مقبرہ بنا ہوا ہے۔ حبیبؓ ابن مظاہر کو علیحدہ دفن کیا۔ اولادِ علیؑ اور جعفر و عقیل کو یکجا خاک میں چھپایا۔ باقیوں کے لئے گنجِ شہیداں تیار کرایا۔ امامؑ کے تشریف لانے کی غایت بظاہر تو یہ تھی کہ آپ نے جسموں کو پہچان کر بتایا کہ کس شہید کی لاش ہے۔ اس سے زائد ضرورت یہ تھی کہ امام کی میّت کو غیر امام دفن نہ کر سکتا تھا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر امام جس طرح آئے تھے، اُسی طرح واپس چلے گئے۔ کوفیوں کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ کب آپ تشریف لے گئے اور کب پلٹ کر آ گئے۔ یہ بھی ویسا ہی معجزہ تھا جیسا شبِ ہجرت آنحضرتؐ نے دکھایا تھا۔

اس وقت قافلے کے آجانے سے جابرؓ کی مشکل حل ہو گئی تھی۔ پیغمبرؐ کے یہ صحابی نابینا تھے۔ زینبؑ بازار کوفہ و شام میں کھلے سر گشت کر کے آئی تھیں، مگر اب وہ مجبور نہ تھیں آپ نے جابرؓ کو دُور ہٹوا دیا کیونکہ جابر انہیں دیکھ نہ سکتے مگر وہ تو جابرؓ کو دیکھ سکتی تھیں۔

بیبیاں محملوں میں بیٹھی ہوئی تھیں مگر قتل گاہ پہنچتے ہی سب نے اپنے کو اونٹوں سے گرا دیا اور وارثوں کی قبر پر وہ بیٹھ کر پچھاڑیں کھانے لگیں۔ جناب زینبؑ بھائی کی قبر پر جا بیٹھیں اور کیا کیا کہتی رہیں، یہ انھیں خود معلوم نہ تھا۔

تین روز تک کربلا میں شہیدوں کا ماتم ہوتا رہا۔ پھر قافلہ بشیر بن جذلم کی سرکردگی میں مدینے روانہ ہوا۔

دیارِ مدینہ

لُٹا ہوا قافلہ مدینے کے قریب پہنچ کر آبادی سے باہر خیمہ زن ہو گیا اور حضرت امام زین العابدینؑ نے بشیر بن جذلم سے فرمایا کہ پہلے مدینے میں جا کر اطلاع کرے۔ بشیر نے مسجد نبوی میں پہنچ کر اعلان کیا۔

"یثرب والو، حسینؑ کربلا میں قتل ہو گئے۔ مدینہ اب تمہارے رہنے کے قابل نہیں رہا"

مرد عورتیں، چھوٹے بڑے، سب خبر سنتے ہی گھروں سے نکل پڑے، سروں پر خاک اُڑا اُڑا کر رونے لگے اور چشم زدن میں پورا شہر ماتم کدہ بن گیا۔

مدینے کی عورتیں پیٹتی ہوئی چلیں اور جاتے ہی زینبؑ و ام کلثومؑ سے لپٹ گئیں، مرد امام زین العابدینؑ کے خیمے کے باہر جمع ہو گئے اور جب امامؑ باہر آئے تو اس طرح رونے لگے جیسے میت کے گرد کھڑے ہو کر روتے ہیں۔ امامؑ نے ایک بلیغ خطبہ دیا اور فرمایا۔

"ہمیں طرح طرح سے رسوا کیا گیا۔ ترک و دیلم کے غلاموں کی طرح در در پھرایا گیا"

پھر محمد حنیفہ، عبداللہ ابن جعفر، بنی ہاشم اور اکابرِ قریش ماتمی جلوس کی شکل میں عترتِ اطہار کو شہر میں لائے، روضۂ رسولؐ اور قبرِ جنابِ فاطمہؑ پر ایسے ایسے بین کئے گئے کہ فرشتوں کے بھی آنسو نکل آئے ہوں گے۔

حسینؑ اسلام کی آبرو اور مدینے کا وقار تھے۔ ان کی شہادت اتنی آسانی سے بھلائی نہ جا سکتی لہٰذا یزید سے نفرت عام ہو گئی۔ وہ لوگ بھی مشتعل ہو گئے جو خاندانِ علی سے کوئی خلوص نہ رکھتے لیکن یہ واقعہ ایسا تھا جس سے ہر ایک کو جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا اور بغاوت کا عنصر غیر محسوس طریقے پر پرورش پاتا رہا۔

فاطمہؑ کی بیٹیاں وطن واپس آ گئی تھیں اور اسی ماحول میں سانس لے رہی تھیں جس میں انھوں نے عمریں گزاری تھیں لیکن کربلا میں جو کچھ ہوا تھا اور کوفہ و شام میں جس طرح ذہنی اور جسمانی تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں، ان کو وہ فراموش نہ کر سکتیں۔ مدینے کی عورتیں روز جمع ہوتیں۔ زہراؑ کی بیٹیاں ان میں بیٹھ جاتیں، کبھی حسینؑ کے واقعات کبھی عباسؑ کی سرگزشت اور کبھی زندانِ شام کی آپ بیتی بیان کرتیں۔ عورتیں مردوں سے جا کر کہتیں اور اموی حکومت کے خلاف دلوں کی آگ بڑھتی رہتی۔

دونوں بہنوں کا اس کے سوا کوئی کام ہی نہ رہ گیا تھا کہ یا تو سوچتی رہتیں یا مظالم کی تفصیلات لوگوں کے گوش گزار کرتیں۔ دو چلتی پھرتی لاشیں تھیں، جن میں سانس باقی تھی اور ان لاشوں کے منہ سے روداد کربلا کے سوا کوئی لفظ نکلتا ہی نہ تھا۔

یہ تھا سیدالشہدار کی مجلس کا آغاز جس کا اعادہ ہم ہر سال کرتے ہیں اور ہماری عورتیں شہزادیوں کی تاسی میں پُرسوز لہجے میں منظوم مرثیے پڑھتی ہیں۔ زینبؑ و اُم کلثومؑ دونوں کا حال یکساں تھا مگر حضرت اُم کلثومؑ زیادہ دن چل نہ سکیں۔ مدینہ پہنچنے کے بعد چالیس روز کے اندر آپ کا انتقال ہوگیا۔

اب جناب زینبؑ اور بھی تنہا ہوگئیں مگر وہ حقیقتاً غم حسینؑ کے سہارے زندہ تھیں اور آخری سانس تک اِن مصیبتوں کو بیان کرتی رہیں جن کا تصور آج بھی سنگ دل سے سنگ دل انسان کی آنکھ میں آنسو لے آتا ہے۔

حضرت ام کلثومؑ کی وفات بادی النظر میں صرف رسولؐ کی چھوٹی نواسی کی وفات تھی لیکن دراصل حسینؑ کی پہلی ذاکرہ کی وفات تھی اور اُم وہبؓ زوجہ عبداللہؓ ابن عمیر کے بعد دوسری خاتون کی شہادت جس کا خون ہمیشہ بنی اُمیہ پر قرض رہے گا۔

جناب زینبؑ کی یہ زندگی دراصل زندگی کی تعریف میں نہ تھی پھر بھی آپ نے اپنے معمولات جاری رکھے لیکن بنی اُمیّہ کا عاملِ مدینہ اس کو برداشت نہ کرسکا۔ اس نے یزید لعین کے حکم پر زور ڈالا کہ ان بیانات کو بند کردیں یا مدینہ چھوڑ دیں۔ یہ بات کافی دنوں سے چل رہی تھی مگر زینبؑ کو چھوٹی بہن کا بڑا سہارا تھا۔ اب وہ سہارا بھی نہیں رہا تھا، لہٰذا آپ نے مدینہ چھوڑ دیا ـــــ اس کے بعد ہی حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت اُم البنینؓ دونوں کا انتقال ہوگیا۔

اب زینبؑ کا مقصدِ حیات صرف اُس سانحہ کی تشہیر تھا جس نے رسولؐ کے چمن کو اس طرح اُجاڑا تھا کہ وہ پھر کبھی آباد نہ ہوسکا۔ اس تشہیر کے لئے اور قبر حسینؑ کی زیارت کی خاطر یوں بھی انھیں نکلنا ہی تھا۔ اس لئے پہلے آپ عازمِ کربلا ہوئیں، پھر مصر گئیں اور کئی شہروں میں پھرتی رہیں۔ ان مقامات پر بھی آپ نے واقعاتِ شہادت اور حالاتِ اسیری بیان فرمائے۔ اسی لئے ان کی وفات بھی وہاں کسی جگہ سے منسوب کی جاتی ہے شام میں آپ کا جانا دو مرتبہ ضرور ہوا اور کربلا بھی دو ہی دفعہ تشریف لے گئیں۔ فرات کے کنارے بھی گئیں اور عباسؑ و علی اکبرؑ کے مزاروں پر بھی۔ اصحابِ حسینؑ کو بھی وفا و شجاعت

کی داد دی۔

آخری بار شام پہنچ کر طاقت بالکل جواب دے گئی۔ اس کا ایک سبب بھائی سے آپ کی محبت بھی ہو سکتی ہے چونکہ سرِ حسینؑ یزیدؔ کے خزانے میں محفوظ کر لیا گیا تھا لہٰذا چاہنے والی بہن نے بھی اسی سرزمین کو دائمی آرام گاہ بنا لیا۔ اس طرح دمشق نے حسینؑ کا پورا سرمایۂ محبت اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ لاڈلی بیٹی پہلے ہی ہمیشہ کی نیند سو چکی تھی۔ اب بہن نے بھی پچپن سال کی عمر میں بتاریخ ۱۴ رجب ۶۲ھ موت کو لبیک کہہ دیا۔ یہ کربلا کی خواتین میں تیسری عورت کی شہادت تھی جو یزیدؔ کے نامۂ اعمال میں لکھی گئی۔

یزیدؔ کے اقتدار کا یہ کھیل بظاہر اموی سیاست کا ایک رُخ تھا۔ کربلا کا واقعہ دُنیا کی بڑی جنگوں میں شامل بھی نہ ہوتا اور اہلِؑ بیت کی اسیری بھی ایک شکست خوردہ اور مفتوح خاندان کی داستان بن کر رہ جاتی لیکن صورتِ حال کچھ ایسی آپڑی تھی کہ طاقت اور ناطاقتی نے حق و باطل کے قالب اختیار کر لئے تھے گویا کربلا کی تپتی ہوئی زمین پر اہرمن نے یزداں کو پچھاڑ دیا تھا۔

یہ جنگ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کوئی دنیا کی پہلی جنگ نہیں تھی۔ صدق و کذب کے، حق و باطل کے تصادم کا آغاز ہابیل و قابیل سے ہو چکا تھا اور دنیا آئے دن اس کی نظیریں پیش کرتی آئی تھی لیکن کربلا کو دوسری لڑائیوں کے مقابلے میں جو امتیاز حاصل تھا وہ یہ کہ وہاں ایک ہی تصویر کے دو پہلو آپس میں ٹکرا رہے تھے۔

۲۸ صفر ۱۱ھ کو عرب کا شہرۂ آفاق پیغمبرؐ دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ ایک نے اس کی زندگی کو رسالتؐ قرار دیا، دوسرے نے بادشاہت۔ رسالتؐ کے جانشینوں نے اپنا عہد قبرِ رسولؐ سے شروع کیا اور بادشاہت کے تاجداروں نے اپنے دَور کا آغاز سقیفہ بنی ساعدہ سے کیا۔ ایک کا سلسلہ حسینؑ ابنِ علیؑ تک پہنچا، دوسرے کا یزید ابن معاویہ تک۔ حسینؑ کا کہنا تھا کہ میرے نانا صرف اللہ کے آخری نبیؐ تھے۔ یزیدؔ کا قول کہ نہ کوئی وحی آئی نہ فرشتہ، نبوّت صرف بنی ہاشم کا ڈھونگ تھا اور حکومت اپنے باپ اور دادا کے

الفاظ میں اس کا حق تھی جو اس نے لے لی۔

بعض حق پسند کہتے رہے ہیں کہ حسینؑ کربلا میں نہیں بلکہ سقیفہ ہی میں قتل کر دیئے گئے تھے، جنھیں کربلا میں حسینؑ نے اپنا خون دے کر زندہ کیا ——

سقیفہ سے کربلا کا رشتہ ہمارے تحت الشعور میں رہا ہے لیکن ہم نے ملت مسلمہ کے احترام میں اس کے علی الاعلان اظہار میں احتیاط کی کیونکہ مسلمان یزیدؔ کو ارباب سقیفہ سے مختلف قرار دیتے تھے مگر اب ابوسفیان اور یزید بلکہ بعد کے سارے خلفائے بنی اُمیہ راسخ العقیدہ مسلمان، عاشق رسولؐ اور نیک نفس قرار دیئے جاتے ہیں اور نقطۂ آغاز سے سیرتؐ کردار کے ایک خط مستقیم کی صورت میں آگے بڑھا دیئے جاتے ہیں، جس کے برعکس چادر تطہیر میں جڑے ہوئے ستاروں کو زنگ آلود بتایا جاتا ہے تو ایک طرح یہ خود اُس حقیقت کی تائید ہو جاتی ہے جس کی فریاد فاطمہؑ زہرا نے اپنے پدرؐ عظیم المرتبت کی روح سے کی تھی

"بابا! آپ کے بعد اُمت نے مجھ پر وہ ستم توڑے اور اتنی مصیبتیں ڈھائیں کہ وہ دنوں پر پڑتیں تو دن کالے پڑ جاتے!"

اور ان مصیبتوں کا اختتامیہ تھی اہلِ بیت رسولؐ کی اسیری جو رسولؐ کی دو نیابتوں میں سے ایک نیابت کا خون ہو جانے کا نتیجہ تھی مگر اس اسیری نے رزمگاہ سے باہر نکل کر ظالم کو مفتوح اور مظلوم کو فاتح بنا دیا —— اور پھر مظلومیت کا سلسلہ جتنا آگے بڑھا، ایوان ظلم و جور کے در و دیوار شہیدوں کے خون سے رنگین ہوتے چلے گئے۔

واقعہ حرّہ

اہلِ مدینہ پر شہادت حسینؑ اور تشہیر اہلِ بیتؑ کا بہت اثر تھا، پھر بھی مدینے کا ایک وفد یزید لعنہ کو سمجھانے کے لئے دمشق گیا مگر اس کو مایوس واپس ہونا پڑا۔ اس لئے اس وفد نے یزید لعنہ کو معطل کر دیا، اس کے عامل کو مدینے سے نکال دیا اور اس کی جگہ عبداللہ بن حنظلہ کو سردار بنالیا۔ اس تبدیلی میں عبداللہ ابن زبیر کی ریشہ دوانیوں کا بھی دخل تھا جنھوں نے مکّے میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا —— امام زین العابدینؑ اس خلفشار میں مدینے سے باہر منبع میں جا کر مقیم ہو گئے۔

یزیدؔ اس خبر سے جل بھُن کر کباب ہو گیا اور اس نے مدینے والوں کی سرکوبی کے لئے مسلم بن عقبہ کو متعین کر دیا ـــــ مسلم کے لشکر سے بمقام حرّہ اہلِ مدینہ کا مقابلہ ہوا، گھمسان کا رن پڑا مسلمانوں نے تعداد میں کم ہونے کے باوجود بڑی مردانگی دکھائی مگر وہ لڑنے والے سپاہی تو تھے نہیں۔ حافظانِ قرآن، علماء و صلحاء اور محدث، اور سامنا تھا خونخوار مسلم بن عقبہ کا، جس کا ہر فوجی اپنے سردار ہی کا سا تھا۔ اہلِ مدینہ کو شکست ہوئی اور ۲۷ر ذی الحج ۶۳ھ کو مسلم بن عقبہ نے اپنے لشکر کو شہر کی غارتگری کے لئے چھوڑ دیا۔ جس نے تین روز تک شہریوں کا قتلِ عام کیا۔ باکرہ لڑکیوں کو حاملہ بنایا، مسجد نبوی میں گھوڑے باندھے۔ پھر علیؑ بن الحسینؑ اور عبدؔ اللہ ابن عبّاس کے علاوہ بچے ہوئے لوگوں سے یزیدؔ کی بیعت لی۔

"مدینۃ الرسولؐ کی تباہی یزیدؔ کا سب سے سیاہ کارنامہ ہے لیکن اس کی ذمہ داری سے اہلِ مدینہ بھی بَری نہ تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ مخالفت کا انجام یہی ہوگا۔ اگر ابتدا ہی سے وہ بیعت کر لیتے تو اس کی نوبت نہ آتی" (۹۷)

شاہ معین الدین کے اس مشورے کا مطلب یہ ہے کہ کھنچی ہوئی شمشیر سر پر ہو تو چنگیز خان کی بھی بیعت کر لینا چاہیئے۔ بہر حال غلطی جس کسی کی ہو مگر نتیجہ یہ نکلا کہ :۔

"وہ شہر جس نے رسولؐ کو پناہ دی تھی، وہ شہر جو مصیبت کے وقت آنحضرتؐ کے ساتھ رہا تھا، اب کشت و خون اور قتلِ عام کا آماجگاہ بن رہا تھا۔ ایسی دہشت ناک مثال یا تو فرانس کے سپاہیوں کی غداری یا پیروان لوتھر کی روم پر تاخت و تاراج کی تباہی سے ملتی ہے ـــــ انتہا یہ ہے کہ جامع مسجد کو طویلہ بنا دیا گیا۔ مزارات، زر و جواہر کی خاطر زمین کے برابر کر دیئے گئے۔ ایک بار پھر ظلم کی فتح ہوئی ـــــ ایک یورپین مورّخ کے قول کے مطابق اس کا دوبارہ جنم اسلام کے لئے سخت خطرناک اور تباہی بخش ثابت ہوا۔ یہ عوض تھا بنی اُمیہ کی طرف سے اس لطف و کرم کا، جو فتح مکّہ کے وقت ان کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔" (۹۸)

مسلم بن عقبہ ایک سال تک مدینے کے نواح میں مقیم رہا اور عبداللہ ابنِ زبیر کی تیاریوں کا جائزہ لیتا رہا جو مکّے میں خلیفۂ رسولؐ بن گئے تھے اور کافی علاقے پر قابض ہو گئے تھے ــــــ ۶۴ھ کے اوائل میں وہ مکّے کا عازم ہوا۔

عبداللہ ابن زبیر کی خلافت

عبداللہ ابن زبیر نے امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی وفات کے بعد ہی سے اپنے کو مستحقِ خلافت سمجھنا شروع کر دیا تھا لیکن حضرت معاویہ کی سیاست اور طاقت سے مرعوب رہے۔ یزیدؔ نے تخت نشیں ہونے پر جب مطالبۂ بیعت کیا تو عبداللہ مکے چلے گئے اور وہاں اعلانِ خلافت کر دیا۔

کچھ عجیب مفہوم ہے اس لفظ کا بھی۔ اس کو تعبیر کیا جاتا ہے نیابتِ رسولؐ سے لیکن اس سے کام لیا جاتا ہے فرمانروائی، ملک گیری بلکہ جہانبانی کا جس کا کامیاب ترین آلہ کار تلوار ہوتی ہے ــــــ پیغمبرِ اسلام نے تلوار کا استعمال کیا تھا مگر ثانوی درجے پر، پہلے درجے پر زبان تھی اور اسی کو اساسی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کے بعد پہلے تلوار پھر زبان حضرت علیؑ نے پیغمبرؐ کی تاسی کی مگر مسلمان تلوار کے لوہے کے عادی ہو چکے تھے، زبان کی تیزی کو خاطر میں نہیں لائے اور حضرت علیؑ کے بعد صرف تلوار ہی تلوار رہ گئی عبداللہ ابن زبیر نے پہلے دن سے اس کا استعمال کیا اور اپنے اردگرد تلواروں کی جمعیت اکٹھا کرنا شروع کر دی۔

> "بشیر بن جذلم کی واپسی کے بعد حجاز میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ابن عباس اور حضرت علیؑ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ کے علاوہ کل اہل حجاز نے ابنِ زبیر کے ہاتھوں پر بیعت کر لی اور تمام اموی عمال کو مدینے سے نکال دیا"۔ (۹۹)

اسی کے نتیجے میں مسلم بن عقبہ کا حملہ ہوا، واقعہ حرّہ پیش آیا اور مسلم نے محرم ۶۴ھ میں مکّے کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران مسلم کا انتقال ہو گیا اور حصینؔ ابن نمیر نے فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی حصین نے شہر پر سنگ باری کرائی جس سے کعبے کی بےحرمتی

بھی ہوئی۔ ابن زبیر اندر سے مدافعت کر رہے تھے لیکن ان پر دباؤ بڑھتا رہا تھا۔
اسی دوران یزیدؔ مر گیا اور ابن نمیرؔ محاصرہ اُٹھا کر واپس ہو گیا۔

مرگ یزیدؔ اور بنی مروان

یزیدؔ کی موت سے متعلق کئی روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے پیٹ اور سارے جسم میں آگ سی لگی رہتی تھی پانی پیتا اور پیتا چلا جاتا مگر پیاس بجھتی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سونے کے لئے لیٹتا تو بھیانک خواب سے ڈر جاتا۔ مارے ڈر کے اس نے سونا چھوڑ دیا۔ تیسری یہ کہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ ایک طرف سے آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ وہ مع اپنے تمام ساتھیوں کے اسمیں میں جل کر خاک ہو گیا۔

معاویہ بن یزید باپ کا جانشین ہوا مگر چالیس روز حکومت کر کے اس نے تخت پر بیٹھنے سے انکار کر دیا جس پر آلِ رسولؐ کے خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مروان نے اس کو زندہ دفن کرا دیا تھا ــــــ معاویہ کا آخری خطبہ آلِ رسولؐ کے استحقاق اور بنی اُمیّہ کی بد دیانتی کی ایسی شہادت ہے جس کی تاب آج کے بنی اُمیہ بھی نہیں لا سکتے۔

معاویہ کا چھوٹا بھائی خالد بن یزید نابالغ تھا لہٰذا مروان نے ذی قعدہ ۶۴ھ میں عنانِ حکومت سنبھال لی اور اُمِ خالد یعنی یزیدؔ کی بیوہ سے عقد کر لیا تاکہ بنی اُمیّہ میں سے کوئی اس کی مخالفت نہ کرے۔

مروان نے سات آٹھ مہینے حکومت کی۔ اس عرصے میں اس نے ابن زبیر کی فوج کو شکست دے دی، مصر میں اپنی بیعت کرائی اور رمضان ۶۵ھ میں بغیر کسی بیماری کے مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُمِ خالد نے زہر دے کر یا گلا گھونٹ کر مروا دیا تھا کیونکہ وہ اپنے بعد خالد بن یزید کے بجائے اپنے بیٹے عبدالملک کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔

عبدالملک بن مروان

مروان نے اپنے حینِ حیات تمام انتظامات کر لئے تھے۔ چنانچہ عبدالملک ۳۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہو گیا۔ وہ نظم سلطنت کے لئے حضرت معاویہ اور آلِ رسولؐ کی دشمنی

میں باپ بیٹے دونوں کا بیرو ثابت ہوا مگر شروع میں اس کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف حجاز میں اور عراق کے ایک حصے میں عبداللہ ابن زبیر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے، دوسری طرف خونِ حسینؑ کے انتقام کا آوازہ عراق کے در و دیوار میں گونج رہا تھا۔

عبدالملک طبعاً بہت ظالم، بخیل اور گندہ دہن تھا۔ اس نے اپنے جو عمال مقرر کئے، وہ اُسی کے سے تھے۔ حجاج بن یوسف، مہلب بن ابی سفرہ، ہشام بن اسمٰعیل، عبداللہ بن عبدالملک، موسیٰ بن نصیر، محمد بن مروان۔ ان سب نے استقرار حکومت اور توسیع مملکت میں اس کی مدد کی۔

مختار بن ابی عبید ثقفی

حضرت مسلمؑ ابتداءً کوفے میں مختار بن ابو عبیدہ ثقفی ہی کے مہمان ہوئے تھے مگر مختار کو کسی ضرورت سے باہر جانا پڑا۔ اس لئے حضرت مسلمؑ حضرت ہانیؒ کے گھر منتقل ہو گئے پھر دونوں ابنِ زیادؑ کے ہاتھوں شہید ہو گئے ـــــ ابن زیاد نے کوفہ پہنچتے ہی تمام محبان علیؑ کو پابہ زنجیر کر دیا تھا جس میں مختار بھی تھے، وہ باہر سے واپس آتے ہی گرفتار کر لئے گئے تھے۔

ابو عبیدہؒ ثقفی حضورؐ کے معزز صحابی تھے۔ ان کی بیٹی عبداللہ ابن عمر کو بیاہی تھی مختار نے امیر المومنین کی صحبت اُٹھائی تھی اور وہ روشنی دیکھی تھی جو خانوادہ رسالتؐ سے ملتی ہے، پھر بھی بہن کے رشتے سے آپ نے عبداللہ ابن عمر کو اپنی اسیری کی اطلاع دی اور ان کے لکھنے پر یزیدؑ نے مختارؒ کو رہا کرا دیا ـــــ ابھی اہلِ بیتؐ اطہار کوفے ہی میں تھے کہ مختارؒ رہا ہو کر مسجد میں گئے تو ابنِ زیاد برسرِ منبر کہہ رہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ یزید کو عزت ملی اور حسینؑ کو ذلت!"

مختارؒ برداشت نہ کر سکے۔ آپ نے فرمایا:۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے حسینؑ کو بہشت میں خلعت پہنائی اور یزیدؑ کے گلے میں طوقِ لعنت ڈالا جائے گا۔"

ابنِ زیاد نے آگ بگولا ہو کر اپنا عصا مختارؒ کی پیشانی پر مار دیا اور آپ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ اب کی مختارؒ قید کیے گئے تو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی پہنائی گئیں اور انھیں ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔

اتفاق سے کثیر ابن عامر بھی ان ہی دنوں قید خانے لائے گئے۔ ان کا جرم بھی حبِ علی تھا۔ انھوں نے قاتلانِ امامِ مظلوم پر لعنت بھیجی تھی جس کو سنان بن انس کے بیٹے نے سن لیا اور لگائی بجھائی کر کے گرفتار کرا دیا۔ کثیر کی بھتیجی نعمان، ابنِ زیاد کے بچوں کی دایہ تھی۔ اس نے ابن زیاد کی بیوی سے کہہ کر کثیر کو چھڑوا دیا اور کثیر مختار کا خط لے کر قید خانے سے باہر آ گئے۔

وہ بذاتِ خود مدینہ گئے۔ عبداللہ ابنِ عمر سے یزید کے نام خط لیا پھر دمشق پہنچ کر وہ خط یزید کو دیا اور حکم رہائی لے کر کوفہ آ گئے۔ عبداللہ ابن عمر کی شخصیت یوں بھی موقر تھی اور رسولؐ کے صحابیوں میں صرف ابن عمر ہی نے یزید کا ساتھ دیا تھا لہٰذا یزید عبداللہ کی بات کو ٹال نہ سکتا۔

ابن زیاد کسی قیمت پر مختارؒ کو رہا کرنے پر تیار نہ تھا مگر حکم شاہی کے سامنے اس کی مجال کیا تھی۔ مجبوراً اس نے مختارؒ کو آزاد کر دیا۔ ایسے فرماں بردار ملازم کے لئے کون یقین کر سکتا ہے کہ امام حسینؑ کے سلسلے میں اس نے خود رائی سے کام لیا!

مختارؒ کے سامنے اُس وقت دو دشمن تھے۔ بنی اُمیہ اور عبداللہ ابن زبیر، بڑے دشمن سے نپٹنے کے لئے انھوں نے چھوٹے دشمن یعنی عبداللہ ابن زبیر کو ملانے کی کوشش کی مگر ان سے شرائط طے نہ ہو سکے۔

لیکن جب ابن نمیر ایک لشکر جرار لے کر دوسری بار شام سے آیا تو عبداللہ ابن زبیر بدحواس ہو گئے اور انھوں نے مختار کی شرائط قبول کر لیں۔ مختارؒ نے لشکر شام کا مقابلہ کیا، اس کو شکست دی اور نواح کے تمام علاقے ابن زبیر کے تابع آ گئے لیکن انہوں نے مختارؒ سے کیا ہوا کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ پہلی شرط اہلِ بیتؑ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تھی، دوسری خود مختارؒ کو عامل کوفہ بنانے کی۔

اس بدعہدی سے پریشان ہوکر مختار چھُپ چھُپا کر مدینے پہنچے اور حضرت محمد حنفیہ سے مل کر کوفہ آ گئے جہاں وہ عبداللہ ابن زبیر کے حکم سے گرفتار کر لئے گئے۔ عبداللہ ابن عمر کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے عبداللہ ابن زبیر پر زور ڈالا اور مختار پھر رہا کر دیئے گئے۔

یزید کی خبر مرگ جب کوفہ پہنچی تو ابن زیاد بصرہ گیا ہوا تھا۔ شیعانِ علیؑ نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور زندان توڑ کر باہر آ گئے۔ ابن زیاد کا تمام مال و اسباب لُوٹ لیا اور غلاموں کو قتل کر ڈالا۔

کُل ساڑھے چار ہزار قیدی تھے جن میں شیعہ تو کم ہی تھے جیسے سلیمان بن صرد خزاعی، ابراہیم بن مالک اشتر، عبداللہ بن سعد، عبداللہ بن دال، رفاعہ بن شداد اور مسیّب بن نجبہ وغیرہ، باقی تمام ایسے لوگ تھے جو آلِ رسولؐ کو افضل سمجھتے تھے۔ ابن زیاد نے ان سب کو گرفتار کر لیا تھا، جن پر علیؑ دوستی کا شبہ بھی تھا ــــــ مسیّب بن نجبہ کو بعد واقعہ کربلا لوگوں کو انتقام پر اُبھارنے کے الزام میں قید کیا گیا تھا۔

رہا ہوتے ہی سب سلیمان خزاعی کے مکان میں جمع ہوئے، مل جُل کر ایک منصوبہ بنایا گیا اور قتلِ حسینؑ کا انتقام لینے کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔

منتقمانِ خونِ حسینؑ

تاریخ اس جماعت کو توّابین کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے اور پرائے سب اس کو اسی نام سے پکارتے رہے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے نہ کوئی تائب اور نہ توّاب کسی نے کوئی گناہ ہی نہ کیا تھا جس سے وہ تائب ہوتا۔ امام حسینؑ سے کوئی بیوفائی نہیں کی تھی؟ جس کا ازالہ انھیں کرنا ہوتا۔ وہ تو بڑے بلند پایہ دیندار تھے جن کے ایمان کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ آلِ رسولؐ کے پروانے جو اپنے بال بچوں کو بھی خانوادۂ رسالتؐ پر قربان کر سکتے تھے۔ قصور ان کا صرف اتنا تھا کہ بنی اُمیّہ سے خونِ اہلِ بیتؑ کا حساب لینے کے لئے اُٹھے تھے لہٰذا انھیں بدنام کرنے کے لئے توّاب کہہ دیا گیا۔

حالات شاہد ہیں کہ جب امام حسینؑ پر یلغار کرنے کے لئے فوجیں جمع کی جا رہی تھیں تو وہ زندانِ کوفہ میں تڑپ رہے تھے۔ نگرانی اتنی سخت تھی کہ کوشش کے باوجود نکل نہ

سکے اور حسینؑ قتل ہو گئے مگر موقع ملتے ہی سر میدان آ گئے اور سروں سے کفن باندھ کر عہد کیا کہ قاتلان حسینؑ میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اولادِ معاویہ کے خلاف یہ جسارت بددیانت مورّخ کیونکر پسند کرتا، اس نے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے انھیں مطعون کرنے کی کوشش کی اور توّابین کہنا شروع کر دیا جس کو بغیر تحقیق کے آج تک کا مورّخ کہتا رہا ہے ـــــ حالانکہ سچ یہ ہے کہ وہ توّاب نہیں منتقم تھے۔

سلیمان بن صرد خزاعی

بے محل نہ ہو گی یہ وضاحت کہ ان میں بعض ایسے لوگ بھی شامل تھے جو حبِّ اہلبیتؑ سے کوئی واسطہ نہ رکھتے اور جنہوں نے امام حسینؑ کو بتقاضائے وقت خطوط لکھے تھے ان میں سے ایک گروہ تو فوراً رُوگرداں ہو گیا اور بنی اُمیّہ کی فوج میں شامل ہو کر قاتلان حسینؑ کی تعریف میں آگیا۔ ایک گروہ غیر جانبدار ہو کر خاموش تماشائی بن گیا۔

۱۰ محرم ۶۱ھ کے بعد جب خونِ شہیداں رنگ لایا اور عترتِ رسولؐ گرفتار ہو کر کوچہ و بازار میں پھرائی گئی تو پتھر بھی پسیجنے لگے، اور ان لوگوں کو احساس پیدا ہوا کہ اگر وہ امامؑ کو خطوط لکھ کر نہ بلاتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ اپنی غلطیوں کے احساس پر انہوں نے طے کیا کہ وہ اپنے گناہ کا کفّارہ ادا کریں گے۔ وہ تھے حقیقتاً شیعانِ معاویہ، لیکن یزیدیوں کی سفاکی اور اہلِ بیتؑ کی مظلومیت نے انہیں ایک ذہنی انقلاب سے دوچار کر دیا اور وہ سلیمان بن صرد خزاعی کے علم کے نیچے آ گئے۔

ایسے لوگ یقیناً توّاب تھے اور گروہِ منتقم میں ان کی اکثریت تھی مگر ان کے بہانے سب کو توّابین کہہ دینا تاریخی خیانت ہے۔

ایسی ستم ظریفی کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

"۶۶ھ میں ایک شخص مختار بن ابی عبید ثقفی خونِ حسینؓ کے انتقام کی دعوت لے کر اُٹھا اور عراق پر قابض ہو گیا۔ یہ ایک معمولی اور بے دین لیکن عالی دماغ اور حوصلہ مند شخص تھا۔ اس دور کی بدنظمی اور طوائف الملوکی کو دیکھ کر اسے بھی قسمت آزمائی کا حوصلہ ہوا۔" (۱۰۰)

شاہ معین الدین ندوی نے جس انداز پر لکھا ہے، اسی طرح سارے مؤرخ کردار کشی کرتے رہے ہیں۔ واقعات کے تسلسل میں بیان کیا جاتا ہے کہ امام زین العابدینؑ اور محمد حنفیہ کسی نے مختار کو منہ نہیں لگایا، حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ امامؑ کشت و خون کی کسی مہم میں اپنے کو ملوث کرنا نہ چاہتے تھے جو پورے خاندانِ رسالتؐ کی سیرت ہی تھی اور آئندہ بھی اس میں کوئی تغیر نہیں آیا ـــــ پھر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ امامؑ نے کبھی مختار کی مخالفت نہیں کی بلکہ آگے چل کر اظہارِ خوشنودی بھی کیا۔

حقائق کو مسخ کرنے کے ساتھ اسلوبِ بیان دل میں چھپے ہوئے عناد کا غماز ہے "ایک شخص مختار بن ابی عبید ـــــ ایک معمولی اور بے دین ـــــ" کسی مزید صراحت سے قبل حضرت ابوعبیدؒ ثقفی کی شخصیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے: بزرگ ترین صحابی، مقدس جہاندیدہ اور تجربہ کار جرنیل، دورِ اولین میں جن کی برتری مسلّم رہی اور جن کے نام کے ساتھ ہمیشہ حضرت اور رضؓ لگایا گیا لیکن مختار کی ضد میں باپ بھی اِس اعزاز سے محروم کر دیا گیا جب کہ عبدؓاللہ اور زبیرؓ دونوں ابوعبیدؓ کے سامنے قابلِ ذکر بھی نہیں ہو سکتے، ان کے نام بغیر رضؓ کے لکھے نہیں گئے۔

پھر اسلوبِ بیان میں "ایک شخص، ایک معمولی اور بے دین" قابلِ ملاحظہ ہیں۔ مختارؒ کو بے قیمت ظاہر کرنے کی بدیہی وجہ صرف اتنی ہے کہ وہ محمدؒ بن ابوبکر کی سطح پر آگئے تھے اور سب سے بڑا غضب انھوں نے یہ ڈھایا تھا کہ انتقام خونِ حسینؑ کا نعرہ لگا رہے تھے۔ رہ گئی بے دینی تو علیؑ کی محبت ان معنیٰ میں بے دینی ہی تھی کہ حضرت معاویہؓ انھیں قابلِ لعنت سمجھتے تھے۔

یہ تاریخی بددیانتی کسی خاص دَور سے مختص نہیں۔ شروع ہی سے اس پر عمل درآمد رہا اور آج بھی یہ سلسلہ بند نہیں ـــــ آج جو کچھ لکھا جائے گا وہ کل مستند ہو گا آج اگر شیعہ عقیدے کی ایک مسلّم شخصیت محمد علی جناح کو سُنی العقیدہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی تو آنے والے کل میں کسی کو اس میں کوئی شک ہی نہ ہو گا اور جھوٹ اتنی بار دُہرایا جائے گا کہ سچ اس کے سامنے ماند پڑ جائے گا ـــــ مسلمانوں کی پوری تاریخ

اسی لائحہ عمل سے ترتیب دی گئی ہے اور ہم آج جو بھی بدیہی حقیقت پیش کرتے ہیں، اس کو یہ کہہ کر جھٹلا دیا جاتا ہے کہ راوی ثقہ نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ثقہ کون ہے؟ وہ جو بغیر سُنے ہزاروں حدیثیں بیان کر دے یا وہ جو صرف تھوڑی سی حدیثیں پیش کرے کہ میں نے اپنے باپ سے، باپ نے میرے دادا سے اور دادا نے براہِ راست رسُول اللہ سے سُنا کیونکہ دادا رسُول اللہ کے بیٹے تھے۔

ہٹ دھرمی شروع ہی سے اپنی انتہا پر تھی۔ رسُول کی اکلوتی بیٹی جو طاہرہ بھی تھی، صدیقہ بھی، جس کی شان میں آیات بھی اتری تھیں اور احادیث بھی بیان ہوئی تھیں، جس کی منزلت یہ تھی کہ خود پیغمبر تعظیم کے لئے اُٹھتے تھے اور مباہلہ میں عیسائیوں کے مقابلے پر جو سرمایۂ واحد تھی یعنی جو بھی تھے، وہ اس کے باپ، اس کے شوہر اور اس کے بچے۔ اس نے جب دعویٰ کیا تو کہا گیا کہ ثبوت لاؤ، گویا خود حضورؐ سے ان کی صداقت کا ثبوت طلب کر لیا گیا اور آخر میں اس کو جھوٹا ٹھہرا دیا گیا ــــــ ایسے حالات میں اگر ہمارے راوی ثقہ راوی قرار نہ دیئے جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسُول کی زندگی میں اور رسُول کے بعد صرف دو گروہ تھے: علیؑ کے دوست اور علیؑ کے دشمن۔ علیؑ کے دشمن زیادہ اس لئے تھے کہ بیشتر قبائل کے سربرآوردہ مشرکین کو علیؑ نے قتل کیا تھا اور ان کی اولاد مسُلمانوں کی صفوں میں شامل تھی جو علیؑ سے کینہ رکھنے کی بنیاد پر آپس میں متحد تھی ــــــ حسینؑ علیؑ کے بیٹے تھے۔ اور آپ کے قاتل علی دشمنوں کے وارث، لہٰذا قاتلوں سے انتقام لینے والا قابلِ ستائش کیونکر ہو سکتا تھا۔ اس لئے پہلے گروہ کو منتقم کے بجائے کذاب اور دوسرے گروہ کے سردار مختارؒ ابن ابی عبیدؒ کو بہت معمولی آدمی اور بے دین مسُلمان قرار دیا گیا ــــــ حالانکہ مختارؒ کی اہمیت یہ تھی کہ قید میں نہ ڈال دیئے جاتے تو کربلا میں بہتر آدمی نہ ہوتے، نواحِ کوفہ کے کئی قبیلے یزیدی لشکر کے مقابل صف آرا نظر آتے ــــــ مختارؒ کے مقابلے میں مُنافق ابوسفیان اور اس کا منافق پوتا یزید قابلِ احترام قرار پاتا ہے کیونکہ دونوں دشمنِ اہلِ بیتؑ اور قاتلِ آلِ رسُول ہیں۔

بلا شبہ خونِ حسینؑ کا انتقام مختارؒ کا مقصدِ حیات تھا مگر ان کی سیاسی بصیرت کا تقاضا یہ تھا کہ پوری تیاری کے بعد میدان میں آئیں۔ اس کے برعکس سلیمان خزاعی اور مسیّب بن نجبہ وغیرہ کا خون کھول رہا تھا۔ ان میں تابِ ضبط باقی نہ رہی تھی لہٰذا جب مختارؒ مکّہ، مدینہ اور طائف وغیرہ کا دورہ کر کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے اور زمین اپنے لئے ہموار کر رہے تھے تو سلیمانؒ خزاعی اپنے پرچم کے نیچے ایک تعداد جمع کر چکے تھے تاہم ان کو ۶۱ھ سے جمادی الآخر ۶۵ھ تک چار سال لگ گئے۔

جنگ عین الورد

اب تقریباً دس ہزار آدمی جمع ہو چکے تھے لیکن ان میں ایک تعداد صرف شہریوں کی بھی جو تلوار چلانا تو جانتے تھے لیکن وہ میدان کے شیر نہ تھے۔ ان لوگوں نے یکم ربیع الثانی ۶۵ھ کو شام کی طرف پیش قدمی کی ـــــ اور قلعہ عین الورد کے قریب خیمہ زن ہو گئے

شام کی فوج بھی مقابلے پر آ چکی تھی۔ سرخیل ابن ذوالکلاع ان کا مقدمۃ الجیش تھا۔ سلیمان خزاعی نے اس پر شب خون مارا اور شکست فاش دے کر مار بھگایا۔

دوسرے دن ان کا مقابلہ حصین ابن نمیر سے ہوا جو بنی اُمیّہ کی پوری طاقت کے ساتھ آیا تھا۔ فریقین نے خوب خوب دادِ شجاعت دی اور طرف دارانِ آلِ محمدؐ کی بڑی تعداد ماری گئی مگر تین سو تیرہ آدمی جو سروں سے کفن باندھ کر آئے تھے ان میں سے ایک نے بھی قدم پیچھے نہ ہٹائے۔

لڑتے لڑتے رات ہو گئی۔ اس وقفے میں سلیمانؒ منزلِ شہادت پر فائز ہو گئے۔ مسیّب نے علم سنبھال لیا پھر مسیّبؒ بھی لہولہان ہو کر زمین پر گر گئے تو عبداللہ بن وال نے ان کی جگہ لی۔ منتقمانِ خونِ حسینؑ گنتی میں رہ گئے تھے اس لئے بڑی تیزی سے کٹ کٹ کر گر رہے تھے مگر کوئی پیچھے نہ ہٹتا۔ گویا شہدائے کربلا کی طرح صرف مرنے ہی کے لئے آئے تھے۔ آخر عبداللہ بن وال نے شہادت پائی تو عبداللہ بن نفیل نے علم ہاتھ میں لے لیا اس کے بعد خالد ابن سعد نے۔

شب کی تاریکی پوری طرح پھیل گئی اور خالد بھی زمین پر گر گئے تو رفاعہ بن شدادؒ

نے علم ہاتھ میں لیا اور گھوم کر دیکھا تو صرف چند نفوس باقی تھے وہ ان کو لے کر میدان سے نکل آئے اور کوفے کے عازم ہوگئے۔

انتقام کا دوسرا پرچم

مختارؒ اور ابراہیمؒ بن مالک اشتر کا منصوبہ سیاستِ وقت کا تابع تھا۔ ان دونوں کو میدانِ حرب کا تجربہ بھی تھا اور حالات کو سمجھنے کا شعور بھی۔ سلیمان خزاعی اور مسیّب وغیرہ اک جذبۂ ولا اور جوشِ عقیدت میں نکل پڑے تھے۔ ان کے ساتھیوں کی اکثریت جنگ کی ابجد سے بھی واقف نہ تھی تاہم انھوں نے شہادت کا مقصد حاصل کرلیا اور عراق والوں کو بتادیا کہ حسینؑ کے نام پر جی اُٹھنے والے اس طرح جانیں بھی دے دیتے ہیں اس سے مختارؒ کی تحریک کو بہت فائدہ ہوا اور ایک بڑی تعداد جوشِ انتقام میں مختار کے علم کے نیچے آگئی۔

مختار و ابراہیم نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی تحریک چلائی تھی۔ عبداللہ ابن مطیع عاملِ کوفہ کو اطلاع تو ہوگئی تھی مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اتنی جمعیت ان کے ساتھ ہوگئی ہے۔ ۱۴ ربیع الاول ۶۶ھ شب پنجشنبہ مختار نے کوفے کے باہر سب کو جمع کیا اور پندرہ ہزار آدمی لے کر شہر کا رُخ کیا۔

عبداللہ بن مطیع کو خبر ہوئی تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے شیث بن ربعی کو تین ہزار اور راشد بن ایاس کو چار ہزار فوج کے ساتھ روکنے کا حکم دیا مگر ایک طرف مالک اشتر کا بیٹا، دوسری طرف ابو عبید کا فرزند۔ ان کا مقابلہ کون کرتا۔ راشد مارا گیا۔

دو ہزار فوج عمر بن حجاج کے تحت اور دو ہزار شمر کی ماتحتی میں روانہ ہونے کو تیار ہی تھی کہ ابراہیم شہر میں داخل ہوگئے۔ نوفل بن مساحق نے پانچ ہزار مزید فوج سے روکنے کی کوشش کی مگر ابراہیم کسی شیرِ غضبناک کی طرح ٹوٹ پڑے۔ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ابن مطیع نے بھاگ کر دارالامارہ میں پناہ لی اور دروازے بند کرالئے۔ تین روز بعد ابن مطیع فرار ہونے کامیاب ہوگیا، محصورین نے دروازہ کھول دیا اور پناہ کے طالب ہوگئے۔ اب مختار امیر کوفہ تھے۔ آپ نے مختلف مقامات پر اپنے عامل مقرر کئے اور فوج

کو انعامات تقسیم کئے۔

عبداللہ کا بھائی مصعب ابن زبیر بصرہ کا حاکم تھا وہ اس خبر کے سنتے ہی تیس ہزار فوج لے کر چل پڑا۔ ابراہیمؒ نے کوفے سے نکل کر مقابلہ کیا۔ ابن مطیع مارا گیا اور مصعب بصرے کی طرف فرار ہو گیا۔

مصعب نے عبداللہ ابن زبیر سے مدد مانگی مگر وہ طائف و یمن کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھے۔ مجبوراً مصعب نے عبدالملک بن مروان کو لکھا ——— سمجھ میں نہیں آتا کہ مصعب کا عبدالملک سے کیا رشتہ تھا۔ وہ تو ابن زبیر کا سب سے بڑا حریف تھا لیکن مختار کے مقابلے میں شاید دونوں میں کوئی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ تب ہی عبدالملک نے اہلِ بیت کے سب سے بڑے دشمن عامر بن ربیعہ کو ستر ہزار کا لشکر دے کر مصعب کی مدد کے لئے بھیج دیا۔

اس درمیان مختار کی طرف سے یزید بن انس نے موصل میں ابن زیاد کو شکست دی مگر جنگ کے بعد یزید کا انتقال ہو گیا۔

عامر بن ربیعہ کوفے سے دس فرسخ پر آکر مقیم ہو گیا۔ بظاہر وہ مختار کا لشکر پہنچنے کا منتظر تھا مگر مکر و فریب بنی اُمیّہ کے خمیر میں پڑا تھا وہ کسی اور گھات میں تھا۔ اس نے کچھ جاسوسوں کو بھیج دیا کہ کسی طرح ابراہیمؒ اشتر کو گرفتار کرلائیں۔ جاسوسوں نے ابراہیمؒ کی فوج میں گھل مل کر رات میں ابراہیم کو پکڑ لیا اور اپنے لشکر میں پہنچا دیا ——— ابراہیمؒ نے اپنے کو اس عالم میں پاکر ہوش و حواس برقرار رکھے اور کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

عامر اور اس کے افسران بھی تعاقب میں دوڑ پڑے۔ ابراہیمؒ ایک درخت پر چڑھ گئے اور انھوں نے اپنے کو پتوں کی آڑ میں چھپا لیا۔ اتفاق سے عامر اُسی درخت کے نیچے آکر ٹھہرا تو ابراہیمؒ درخت سے کود پڑے اور نیچے آتے ہی خنجر سے کام تمام کر دیا۔ افسران فوج جب تک پہنچیں پہنچیں، ابراہیمؒ عامر کے گھوڑے پر کوفے کی طرف روانہ ہو گئے

اگلے ہی دن مختار نے اموی لشکر پر حملہ کر دیا اور ۲۶ ہزار آدمی قتل کر ڈالے۔ مفرورین کی ایک تعداد صحرا میں پیاس سے ہلاک ہو گئی۔ بمشکل دس ہزار آدمی واپس

ابو عمرہ جن قاتلوں کے مکانات سے واقف تھے، ان کو انھوں نے منہدم کر دیا اور جو دشمن ہاتھ آئے، انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

مختار نے معمول بنا لیا تھا کہ دن بھر مخبر شہر کے گلی کوچوں میں گھوم کر پتہ لگاتے، رات میں گرفتاری ہوتی اور اگلے دن وہ دربار میں پیش کئے جاتے۔ پہلے دن ابو عمرہ دو قاتلوں کو لائے:۔

ابو اشعمار بشیر بن سمیط۔ حضرت مسلمؑ کے بیٹوں کا قاتل تھا۔ مختار کے غلام نے انہیں قتل کیا۔

نافع بن ملک نے مشکِ سکینہ پر تیر چلایا تھا اور جس کے بعد حضرت عباسؑ مایوس ہو کر گر گئے تھے۔ اس نے خود بیان کیا۔ قتل کر کے اس کی لاش جلا دی گئی۔

عبداللہ بن کامل نے ایک ضعیفہ کے ذریعے تین قاتلوں کو گرفتار کیا۔

حارث بن بشیر کسی خاص شہید کا قاتل نہ تھا مگر کربلا میں موجود تھا اس لئے قتل کر دیا گیا۔

قاسم بن جارود دشمنِ اہلِ بیتؑ تھا مگر اس کے خلاف کربلا جانے کا ثبوت نہیں ملا لہذا وہ چھوڑ دیا گیا۔

حارث بن نوفل نے جناب زینبؑ کو تازیانہ لگایا تھا۔ مختار نے اس کو اتنے تازیانے لگوائے کہ وہ اسی جگہ ہلاک ہو گیا۔

اسحٰق بن اشعث بھائی تھا عبداللہ بن کامل کی بیوی کا، مگر تھا قاتلینِ کربلا میں۔ مختار نے معاف نہیں کیا، قتل کرا دیا۔

کوفے کے محبانِ اہلِ بیتؑ خود دن بھر قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے، ایک دن صاحبانِ ایمان کی سراغ دہی پر دس آدمی پکڑ کر لائے گئے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ لاشوں کی پامالی میں وہ شریک تھے۔ مختار نے ان سب کو زمین پر لٹا کر پہلے ان کے ہاتھوں اور پیروں میں لوہے کی میخیں ٹھنکوائیں پھر ان کو جیتے جی گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل ڈالا۔

مالکؒ بن بشیر جب پکڑا گیا تو سربازار قتل کیا گیا پھر اس کی لاش جلوا دی گئی۔

کوئی قاتل جب پکڑ کر لایا جاتا تھا تو حضرت مختار پہلے اس کا جُرم خود اس کی زبان سے قبولواتے تھے جس سے دربار میں ایک کہرام مچ جاتا تھا پھر قاتل کو سزا دی جاتی۔ اس طرح محبانِ حسینؑ ایک ایک دن میں کئی کئی مجلسیں سنتے اور ان کو اپنے گھروں میں بیان کرتے تو عورتیں روتے روتے بے حال ہو جاتی تھیں ـــــ مختار کو ابھی خاص خاص قاتلوں کی تلاش تھی، جن کے لئے وہ تاکید پہ تاکید کئے جا رہے تھے۔ آخر ایک دن خولیؒ اصبحی پکڑ ہی لیا گیا۔

ابو عمرہؒ نے پتہ لگا کر اس کے گھر کو گھیر لیا تو وہ پاخانے گھس گیا۔ اس کی ایک بیوی شامی تھی۔ عبداللہ بن کامل نے مکان میں داخل ہو کر اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ دو ماہ سے گھر نہیں آیا۔ دوسری بیوی مومنہ تھی۔ اس نے دریافت کرنے پر زبان سے انکار کیا مگر سر ہلا کر بیت الخلا کی طرف اشارہ کر دیا۔ عبداللہ نے جا کر دیکھا تو وہ اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ وہ مشکیں باندھ کر لایا گیا تو مختار نے اس کی شامی بیوی کو گرفتار کر لیا۔

اس نے بتایا کہ جب خولیؒ سرِ امامؑ لے کر آیا تھا تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ مختار نے اسی وقت اس کو قتل کر دیا پھر مختار نے خولیؒ سے پوچھا۔

"بتا تو نے کیا کیا ـــــ ؟"

خولیؒ بتانا نہ چاہتا تھا مگر کوفے میں اس کی بے رحمی کے گواہ موجود تھے لہٰذا اس کو بیان کرنا پڑا۔

"امامؑ کا سر نیزے پر لے کر نکلا تھا ـــــ"

مختار کی تاب ضبط جواب دے چکی تھی مگر وہ اپنے کو روکے رہے اور نوکِ شمشیر اس کے سینے پر رکھ کر پوچھا۔

"اور کیا کیا ـــــ ؟"

"زینبؑ کی چادر چھینی تھی ـــــ سکینہؑ کے گوشوارے نوچے تھے ـــــ زین العابدینؑ کے نیچے سے بستر کھینچا تھا ـــــ!"

مختار ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگے۔ اہلِ دربار نے پچھاڑیں کھائیں ـــ پھر مختار نے اشارہ کیا۔

پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر چھوڑ دیا گیا۔ وہ تڑپتا رہا پھر اس کو اسی حالت میں جلوا دیا گیا۔

ایک روز ایک بچے کے ذریعہ سُراغ لگا کر عبداللہ کامل چار اشقیا کو پکڑ کر لائے۔

یزید بن ضمیر نے بتایا کہ اس نے حضرت حمزہ کے غلام کو قتل کیا تھا۔

زیاد بن مالک نے اعتراف کیا کہ عابس ابن ابی شبیب شاکری کو شہید کیا تھا۔

بکر بن احمد نے بیان کیا کہ اس نے ایک ضرب حبیب ابن مظاہر پر لگائی تھی۔

عبید نے کہا کہ خیمے لوٹنے میں شریک تھا۔

مختار نے ان سب کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے سات آٹھ آدمی لائے گئے جو کربلا میں شامی فوج کے شریک تھے اور جنھوں نے شہدا کو گھیرنے اور قتل کرنے میں مدد کی تھی۔ مختار نے ان سب کی گردنیں اُڑوا دیں ـــ عمر بن خالد، عبدالرحمن بن خشارہ، عبداللہ بن قیس، عبداللہ بن صلخت، عبدالرحمن بن صلخت، عبداللہ بن وہب عمر صیدادی (لعنت اللہ)

ابو عمرہ کیسائی اور عبداللہ بن کامل ہمہ تن قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں تھے ان کے آدمی بھی ہر وقت گھات میں لگے ہوئے تھے۔ ان کوششوں میں مسلسل کامیابی ہوتی رہی اور قاتل یکے بعد دیگرے لائے جاتے رہے۔

بجدل بن سلیم وہ ملعون تھا جس نے امام کی انگلی کاٹ کر انگشتری نکالی تھی۔ بعض راویوں نے اس کا نام جمّال لکھا ہے۔ مختار نے اس کی انگلیوں کا ایک ایک پور جُدا کرایا پھر اس کو قتل کرا دیا۔

حکیم بن طفیل ایک سرائے میں جا کر چھپ گیا تھا۔ ابو عمرہ اس کو گرفتار کر کے لائے تو اس نے بتایا کہ۔

"میں نے عباسؑ کا ایک بازو قطع کیا تھا پھر آپ کے سینے پر تیر مارا تھا"

مختارؒ نے اس کو کمر تک گڑوا دیا اور اتنے تیر برسوائے کہ اس نے دم توڑ دیا۔
زیدؒ بن ورقہ گرفتار کر کے لایا گیا تو اس نے کہا۔

"میں خطاوار ہوں امیر، میں نے عبداللہ بن مسلم کو تیر مارا تھا۔ اس نے گھبرا کر پیشانی پر ہاتھ رکھا تو دوسرا تیر چلایا اور بچے کا ہاتھ پیشانی میں چھد گیا پھر میں نے ایک تیر اس کے پیٹ پر چلایا جو اس کے شکم کے پار نکل گیا۔"

مختار چیخ کر رو پڑے اور اس کو ویسی ہی سزا دلوائی۔ پہلے اس کو سنگسار کیا گیا پھر تیر برسائے گئے اور آخر میں لاش جلائی گئی۔

سنانؒ بن انس بھاگ کر بصرہ چلا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد قادسیہ آیا تو مختارؒ کے جاسوسوں نے گرفتار کر لیا۔ خنجر گلے پر رکھ کر اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا۔

"میں حضرت کا کمر بند لینے کے لئے بڑھا تھا تو آپ نے ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے ہاتھ توڑ کر پھینک دیا اور کمر بند لے لیا ــــــ"

ابراہیمؒ یہ سن کر ایک دیوانگی میں چیخنے لگے۔ انہوں نے اس کو چت لٹایا اور دونوں آنکھیں نکلوالیں پھر ناخن اکھڑوائے، دونوں ہاتھ توڑوائے۔ اس کی رانوں کا گوشت نچوایا اور اس کے منہ میں دے کر کھانے پر مجبور کیا۔ پھر ایک ایک بند جدا کر کے کھولتے ہوئے روغن میں ڈلوا دیا۔

عمرؒ بن صبیح تیر انداز تھا۔ وہ لایا گیا تو تیروں سے ہلاک کیا گیا۔
عبداللہؒ بن اسید اور مالکؒ بن خشیم نے کہا کہ انہیں زبردستی بھیجا گیا تھا مگر انہوں نے لوٹ میں حصہ ضرور لیا۔ دونوں قتل کر دیئے گئے۔

قیسؒ بن حفص عورتوں کا لباس پہن کر بھاگ رہا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا اور اقبالِ جرم کے بعد دار پر چڑھا دیا گیا۔

عبداللہؒ بن سعید نے خیموں کو آگ لگانے کا اعتراف کیا مگر یہ عذر کیا کہ اس نے عمرؒ بن سعد کے کہنے سے ایسا کیا تھا۔ مختار نے اس کو قتل کرا کے جلوا دیا۔
عمارؒ بن خالد قاتل تھا عبدالرحمٰن بن عقیل کا۔ جس وقت یہ گرفتار کر کے لایا گیا

عین اسی وقت عبدالرحمٰن کا یتیم بچہ دربار میں آیا۔ جس کا گھر مسلم بن عقبہ نے مدینے میں تاراج کر دیا تھا اور وہ کسی طرح کوفے پہنچا تھا۔ مختارؒ نے عزت و احترام کے ساتھ اس کو بٹھایا، تحفے تحائف اور زرِ نقد پیش کیا اور عمارؔ کو اسی کے ہاتھ سے قتل کرایا۔

عمرؔ ابن سعد کوفے سے بھاگ گیا تھا مگر چھپ کر کئی مرتبہ آیا۔ اس دفعہ پکڑ لیا گیا مختارؒ کی ایک بہن اس کو بھی بیاہی تھی۔ اس کو امید تھی کہ مختار بہن کے رشتے سے اس کو چھوڑ دیں گے۔ مختارؒ نے اتنی رعایت ضرور کی کہ اس کو کچھ کہنے کا موقع دیا مگر اس کے پاس کہنے کے لئے تھا ہی کیا ——— مختارؒ نے رسی سے بندھوا کر پہلے اس کے دانت تڑوائے، انگلیاں پور پور سے جدا کروائیں، ناک اور کان کٹوائے پھر آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں۔ آخر وہ خود ہی ہلاک ہو گیا۔

عمرؔ بن حجاج بھاگ کر بصرہ جا رہا تھا۔ ابو عمرہؒ نے بمقام بیضہ اس کو جا کر پکڑا اس کو پیاس ہو گئی تھی۔ اس کی شدت میں وہ گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ابو عمرہ کو یاد آ گیا کہ اسی ظالم نے امام پر نہر فرات کا پانی بند کیا تھا اور ہنگامِ قتل امامؑ کے جسمِ اطہر پر تلوار ماری تھی۔ ابو عمرہؒ اپنے غصے پر قابو نہ پا سکے۔ انہوں نے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مار ڈالا۔

حفصؔ بن عمر سعد، مختار کا بھانجہ تھا اس نے باپ کو مشورہ دیا تھا کہ حکومتِ رے کا وعدہ نقد ہے اور جنت کا خیال ادھار۔ مختار نے اس کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی اور جیسے ہی وہ لایا گیا اس کو قتل کرا دیا۔

مرہؔ بن منقذ حضرت علیؑ اکبر کا قاتل تھا۔ گرفتاری سے قبل اس نے سخت مقابلہ کیا۔ آخر گرفتار ہو کر مختار کے سامنے لایا گیا۔ مختار نے اس کے دونوں ہاتھ اور زبان کٹوائی، پھر آنکھیں نکلوا لیں اور پھر دونوں ہونٹ کٹوا کر جسم کو جلوا دیا۔

قاضیؔ شریح قتل حسینؑ کا فتویٰ دینے والوں میں تھا۔ اسی نے حضرت مسلمؑ اور ہانیؒ کو شہید کروایا تھا۔ مختار نے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ زبان گدی سے کھنچوا لی اور قتل کر کے لاش نذرِ آتش کر دی۔

سامان لوٹنے والوں کا سراغ لگانا کچھ آسان نہ تھا مگر مختار کے آدمیوں نے نام معلوم کر لئے اور ان کو پکڑ کر دربار میں لے آتے۔ امیر مختارؒ نے سب کی کھال کھنچوا کر قتل کرا دیا۔

لاشوں پر گھوڑے دوڑانے والے بھی بڑی مشکل سے باری باری پکڑے گئے یہ اسحٰقؒ بن جویریہ، رضیؒ بن منقذ، سالمؒ بن خثیمہ، صالحؒ بن وہب، اخنسؒ بن مرثد، واخطؒ بن ناعم، ہانیؒ بن شبث تھے۔ مختار نے ان کو چت لٹا کر ہاتھوں اور پیروں میں لوہے کی کیلیں ٹھنکوائیں، پھر جسموں پر گھوڑے دوڑا کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا اور ٹکڑوں کو آگ میں جھونکوا دیا۔

اسطرح مختار نے ملاعین کی جستجو میں دن رات ایک کر رکھا تھا اور چن چن کر ایک ایک کو قتل کیا تھا پھر بھی ابھی جانے بوجھے کئی لوگ باقی تھے۔ جن کے لئے ابو عمرہ اور عبداللہ بن کامل چھاپے مار رہے تھے۔ چند روز کے وقفے سے اسمار بن خارجہ پکڑ کر لایا گیا جو حسن مثنیٰ کا ماموں تھا اور جس نے حسن مثنیٰ کو کربلا سے لاکر علاج کرایا تھا لیکن اس نے لاشوں کی پامالی میں بھی حصّہ لیا تھا اس لئے معاف کرنے کے بجائے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں جلوا دیا گیا۔

محمد بن اشعث نسلی طور پر دشمنِ آلِ رسولؐ تھا۔ بڑی مشکل سے دستیاب ہوا کربلا میں اس نے بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ اس کا جسم بھی چھیدا اور کاٹا گیا پھر نذرِ آتش کر دیا گیا۔

شبث بن ربعی جب گرفتار ہو کر لایا گیا تو اس نے اپنے جرائم میں امامؑ کے چہرۂ اقدس پر تلوار لگانے کا اقبال کیا۔ ابراہیمؒ کے حکم سے اس کا گوشت کاٹا گیا اور جسم آگ میں جلا دیا گیا۔

قاتلوں میں سرِ فہرست شمر ذی الجوشن تھا وہ مسلم بن عبداللہ کے ساتھ راہ بصرہ کے ایک قریے کلبانیہ میں جا کر چھپ گیا تھا۔ ابو عمرہؒ تلاش کرتے ہوئے پہنچے تو وہ نیزہ بدست مقابلے پر آ گیا۔ ابو عمرہ نے وار کیا تو وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ ابو عمرہؒ اس کو باندھ کر مختار کے پاس لائے۔ مختار نے اس کو حد سے زائد اذیت ناک سزا دی ایک

بڑے کڑھاؤ میں تیل گرم کرایا اور کھولتے ہوئے تیل میں زندہ ڈلوا دیا۔

حرملہ بن کاہل اسدی وہ ملعون تھا جس نے آلِ محمدؐ کے دلوں کو چھید کر رکھ دیا تھا۔ مختار کو اس کی بڑی فکر تھی۔ آخر وہ گرفتار ہو کر لایا گیا۔ مختارؒ، ابراہیمؒ اور اہلِ دربار سب اس کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ حرملہ نے بیان کیا۔

"میرے پہلے تیر نے گلوئے علیؑ اصغر کو چھید ڈالا۔ بچے نے کچھ اس طرح ہونٹوں پر زبان پھیری تھی کہ مجھے بھی ترس آ گیا تھا لیکن عمر سعد نے تاکید کی تو گھبراہٹ میں گھوڑے کو مارنے والا تیر ہاتھ آ گیا۔ میں نے اسی کو کمان میں جوڑ کر چھوڑ دیا اور بچہ باپ کے ہاتھوں پر منقلب ہو گیا۔"

"دوسرا تیر میں نے مشکِ سکینہ پر لگایا تھا اور تیسرا حضرتؑ کے دہن اقدس پر"

کسی میں اس کا پورا بیان سننے کی طاقت نہ تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی دربار پر ایک قیامت خیز رقت طاری ہوئی۔ مختار نے اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر جسم پر تیل چھڑکوایا اور اس میں آگ لگوا دی۔ حرملہ تڑپتا رہا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

قاتلانِ کربلا میں اب صرف ابنِ زیاد باقی تھا اور مختار کی دسترس سے دُور تھا پھر بھی مختار نے اس کی طرف سے بے توجہی نہ کی اور ابراہیمؒ کو تیس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ موصل کے قریب ابنِ زیاد ایک بہت بڑا لشکر لے کر مقابل ہوا۔ انفرادی جنگ میں ابراہیم کے بہادروں نے کئی شامیوں کو قتل کیا، پھر جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی اور صبح سے لے کر رات گئے تک جنگ ہوتی رہی۔

ابراہیم کا مقابلہ ایسے لوگوں سے تھا جو اہلِ بیتؑ کو کافر اور آلِ مروان کو آلِ رسولؐ سمجھتے تھے اور اس کی حمایت میں مرنے کو شہادت قرار دیتے تھے۔ ان میں سے بعض نماز اس لئے نہیں پڑھتے تھے کہ اس میں آلِ محمدؐ آتا تھا اور اس نام کو وہ زبان پر لانا بھی نہ چاہتے۔

فوجوں کا تناسب ایک اور چار کا تھا لہذا سترہ روز تک قیامت خیز جنگ ہوتی رہی۔ مالکِ اشتر کے بیٹے نے باپ کی بہادری کی لاج رکھی اور دلائے علیؑ کا پورا حق

ادا کیا مگر سامنے والے قتل ہونے کو نجات اُخروی کی ضمانت سمجھتے تھے۔ ایک مرتا تو دو اس کی جگہ لے لیتے۔ تاہم ابراہیمؒ کے پیشِ نظر جنگ کربلا کا نقشہ تھا۔ انہوں نے قتل کرنے میں بازدؤں کو شل نہ ہونے دیا اور قتل ہونے کو مقصدِ حیات سمجھتے رہے۔ پھر تائیدِ غیبی شاملِ حال ہوئی۔ طوفانِ برق و باراں نے شامی فوج کو نشانہ بنالیا، اتنے بڑے اولے گرے کہ ہزاروں شامیوں کے سر پھٹ گئے۔ بیس ہزار سے زائد بھاگتے ہوئے دریا میں ڈوب مرے۔

سولھویں دن عمر بن ربیعہ نے ایک باغ میں ابنِ زیاد اور اس کے ساتھیوں کو اکل و شرب کی دعوت دی۔ ابراہیمؒ کو اس کی اطلاع مل گئی۔ محفل گرم تھی، دورِ شراب چل رہا تھا کہ اچانک ابراہیم نے حملہ کر دیا اور تقریباً تمام لوگوں کو تہہ تیغ کر دیا۔

ابنِ زیاد اس رات بھی بچ نکلا مگر اس کی ہمت پست ہو چکی تھی۔ دوسرے روز وہ نہایت احتیاط کے ساتھ فرار ہوا۔ ابراہیمؒ کے ساتھی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کو بھاگتے میں قتل کر دیا اور جناب زینبؑ کی بددعا سے آخری قاتلِ حسینؑ کیفرِ کردار کو پہنچا۔

اس فتح کی خوش خبری مختار کو ملی تو آپ نے ہمیشہ کی طرح سجدۂ شکر ادا کیا۔ ۶۷ھ کی دسویں محرم تھی۔ جناب مختار نے ابنِ زیاد کا سر بعض تحائف کے ساتھ خدمتِ امام زین العابدینؑ میں روانہ کیا اور ابنِ زیاد کے جسم کو نذرِ آتش کر دیا۔

امام زین العابدینؑ، محمد حنفیہ اور تمام بنی ہاشم نے اس سر کو دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا اور امامؑ نے اس کارِ نمایاں پر دعائے خیر سے مختار کو یاد فرمایا۔

مختارِ آلِ محمدؐ کی شہادت

مختار کا اصل مقصدِ حیات اب پورا ہو چکا تھا لہٰذا آپ نے انتظامِ حکومت پر توجہ دی اور ابراہیمؒ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ نظم و نسق درست کرنے کی خاطر جزیرہ روانہ کر دیا۔

مصعب ابن زبیر بصرے میں بیٹھا ہوا مختار کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے

تھا۔ قاتلانِ حسینؑ کے انجام سے عبدالملک کو تکلیف ہوتی تھی تو بات قابلِ فہم ہے لیکن مصعب کو نہ جانے کیوں ایک انجانا دُکھ ہوتا تھا ــــــ بالکل ویسا ہی دُکھ جیسا اس وقت کے مورخین کو ہوتا اور جیسا آج کے مورخین کو ہے اور کوئی مختارِ اعظم کو معمولی آدمی اور کوئی باغی لکھ دیتا ہے حالانکہ حضرت علیؑ بن ابی طالب قاتلِ مشرکین تھے تو مختار قاتلِ قاتلانِ کربلا، جن لوگوں نے علیؑ کو نہیں بخشا، وہ مختار کو کیونکر چھوڑ دیتے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا۔

سلطنت اور امورِ سلطنت سے ہادیانِ اسلام نے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا تو ان کے پیرو کیوں رکھیں۔ ہم تو مختار کو بنگاہ استحسان اس لئے دیکھتے ہیں کہ انھوں نے آلِ محمدؐ پر ستم ڈھانے والوں کو نیست و نابود کیا۔ وہ مختار سے جلتے ہیں جنھیں قاتلانِ کربلا سے ہمدردی ہے۔ ان میں مصعب ابن زبیر بھی تھا۔

اس نے دیکھا کہ مختار نے بڑا لشکر ابراہیم کے ساتھ بھیج دیا تو وہ کوفے پر چڑھ دوڑا مگر مختار کوئی نرم نوالہ نہیں تھے جن کو اتنی آسان سے ہضم کر لیا جاتا۔

محمد بن اشعث، مصعب کی فوج کا افسر تھا۔ اس نے مختار کو دعوتِ اطاعت دی مختار کی طرف سے مُنہ توڑ جواب دیا گیا اور مقام مدار میں دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ مختار کی فوج مقابلتہً کافی کم تھی تاہم بڑی بے جگری سے لڑی۔ مصعب کے ان گنت آدمی قتل ہوئے۔ محمد بن اشعث بھی تہہ تیغ ہوا۔ شکست مصعب کے سر پہ منڈلا رہی تھی کہ کوفے کے چند افسروں نے میدان چھوڑ دیا ــــــ شاید وہ پہلے ہی دشمنوں سے مل گئے تھے۔

فتح شکست میں بدل جانے کے بعد مختار نے پسپائی اختیار کی اور قلعہ کوفہ میں آ کر محصور ہو گئے۔

ابراہیم اتنی دُور تھے کہ وقت پر پہنچ نہ سکتے۔ محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا فوج کوفہ کے افسر ہمت ہار چکے تھے اور قلعہ میں کھانے پینے کی تنگی بھی ہو رہی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکل سکتا کہ محصورین شمشیر بکف باہر نکلتے اور فیصلہ کن جنگ کرتے مگر اس کے

برعکس ہوا یہ کہ پست ہمت یا بکے ہوئے لوگ چالیسویں دن دروازہ کھول کر نکل گئے اور مختار کے ساتھ تھوڑے سے وفادار باقی رہ گئے۔

دانش مندی کا تقاضا یہ تھا کہ مختار اپنے کو مصعب کے حوالے کر دیتے لیکن آلِ محمدؐ سے جو درس شجاعت انہیں ملا تھا، وہ ذلّت کی زندگی پر عزّت کی موت کو ترجیح دیتا۔ انہوں نے عزت کی موت کا راستہ اختیار کیا۔ تلوار ہاتھ میں لی اور دشمنوں پر ٹوٹ پڑے

آج مختار اس طرح لڑ رہے تھے جیسے کربلا میں امام حسینؑ نے جنگ کی تھی کشتوں کے پشتے لگا دیئے علیؑ کے نام لیوانے اور زخموں سے چُور ہو کر گر گئے منتقم خونِ حسینؑ کا انجام اپنے مولا سے مختلف نہ ہوا مگر اپنے مقصد کو پورا کر کے اور کربلا کے ظلم کا مکمل جواب دے کر

ایک جنگ سلیمان بن صرد خزاعی اور مسیّب بن نجبہ نے کی تھی، دوسری مختار بن ابی عبید ثقفی نے۔ دونوں کا انجام یکساں ہوا۔ پھر بھی سلیمان صرف نام حسینؑ پر قربان ہوئے اور مختار نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تو ظالموں کو ایسا سبق دے کر جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔

مصعب کا شمار شجاعانِ عرب میں ہوتا تھا لیکن اس نے بڑی بزدلی کا کام کیا کہ مختار کی بیوی کو محبِ آلِ رسُولؐ ہونے کے جُرم میں قتل کرا دیا۔

بربریت کا بہت بڑا ثبوت یہ دیا کہ کوفے پر اقتدار حاصل ہوتے ہی پیروانِ علیؑ کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ پسران حجر بن عدی عبدالرحمٰن اور عبدالرب کو تہ تیغ کیا، پھر عمران بن حذیفہ یمانی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح ایک بار پھر کوفہ علیؑ کے دوستوں سے خالی ہو گیا۔

ابراہیم کو شہادت مختار کی خبر ملی تو آپ سناٹے میں رہ گئے۔ ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ طوفان کی طرح اٹھ کر مصعب کے سر پر جا پہنچیں لیکن ان کا سب سے بڑا اور طاقتور دشمن عبدالملک بن مروان تھا جس کو وہ دوبارہ شکست دے چکے تھے تاہم ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ پہلے مصعب سے ٹکرلیں پھر بنی اُمیّہ سے۔

پھر علیؑ اور اولادِ علیؑ پر ستر ہزار منبروں سے تبرّا ابراہیم فراموش نہ کر سکتے جواب بھی جاری تھا۔ ان کے مقابلے پر مصعب شیعانِ علی کا دشمن سہی مگر چھوٹا اور کمزور دشمن تھا۔ اس لئے ابراہیمؒ نے مصعب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اس سے آملے۔

مصعب ابن زبیر کا اختتام

عراق پر مصعب کا قبضہ عبدالملک کے لئے بہت مضر تھا اس لئے ـــــــ

"۷۱ھ میں اس نے پوری قوت کے ساتھ عراق پر فوج کشی کر دی مصعب ابن زبیر بھی پوری تیاری کے ساتھ مقابلے پر آئے لیکن عین موقع پر عبدالملک نے مصعب کے بہت سے آدمیوں کو رشوت کے ذریعہ ملا لیا۔ عراق کے مروانی بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ مصعب کے دستِ راست ابراہیم بن اشتر کو بھی ملانے کی کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔" (۱۰۱)

سازش اور رشوت بنی اُمیّہ کا کارگر حملہ تھا۔ کئی نسلوں سے وہ اس پر عامل رہے تھے۔ مختار کے مقابلے میں مصعب نے بھی اس کا کامیاب استعمال کیا تھا لیکن بنی اُمیّہ استاد تھے اور مصعب شاگرد، لہٰذا مصعب کی طاقت کمزور پڑ گئی پھر بھی ایک مضبوط حلیف مصعب کے ساتھ تھا یعنی ابراہیم بن مالک اشتر جو بنی اُمیّہ سے اتحاد کر ہی نہ سکتے انہیں کی تقویت پر مصعب نے پہلے معرکے میں مروانیوں کو شکست دی اور ان کی طاقت کو پارہ پارہ کر دیا مگر جلد ہی شام سے کمک آگئی اور بنی اُمیّہ پھر تازہ دم ہو گئے

دیر جاثلیق ہی میں مصعب کا دوسرا مقابلہ اموی لشکر سے ہوا مگر قبیلہ ربیعہ کو ابراہیم سے مصعب کا اتحاد پسند نہ تھا کیونکہ وہ آلِ محمدؐ کے طرف دار تھے۔ یہ قبیلہ مصعب کی فوج کا روحِ رواں تھا۔ جنگ کے دوران اس نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا مگر ابراہیمؒ اور اس کے ساتھیوں کی شجاعت نے بنی اُمیّہ کے دانت کھٹے کر دیئے۔

ابراہیم بے جگری سے لڑے مگر طاقت غیر متوازن تھی۔ شخصی بہادری کہاں تک کام دیتی۔ ابراہیمؒ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر گئے ــــ کہا جاتا ہے کہ ابراہیم کی شہادت

میں بنی ربیعہ کا بھی ہاتھ تھا۔ لڑائی جاری تھی۔ مصعب کے بیٹے عیسیٰ نے کچھ دیر سنبھالے رکھا پھر وہ بھی قتل ہو گئے۔

جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر مصعب ایک مرد میدان تھا۔ اس نے پیٹھ نہ دکھائی پیاس کی شدت میں ایک درخت کے نیچے دم لینے کو ٹھہر گیا۔ ایک غلام اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔

"ایسی جنگ کسی نے کاہے کو کی ہوگی ——"

"نہیں حسینؑ ابن علیؑ کربلا میں اس سے زیادہ بہادری سے لڑے تھے ——!"

وقت پڑنے پر دشمن کو بھی حسینؑ کی شجاعت کا اعتراف کرنا پڑا —— اس کے بعد مصعب نے زخمی شیر کی طرح حملہ کیا مگر طاقت جواب دے چکی تھی۔ ایک شامی سپاہی عبیداللہ بن ظبیان نے تلوار کا وار کیا اور مصعب زمین پر آ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔

ابراہیم کی شہادت پر انتقام خون حسینؑ کا باب بند ہو گیا۔ آپ کا مصعب سے الحاق مستقبل کی تاریخ سازی کا ایک منصوبہ تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ وہ اگر مصعب کے ہاتھوں عبدالملک کا خاتمہ کرانے میں کامیاب ہو جاتے تو بنی فاطمہؑ کی وہ تحریک جو ابو مسلم خراسانی کے ہاتھوں تکمیل پائی۔ ابراہیم بن اشتر سے شروع ہوتی اور اس کا انجام یہ نہ ہوتا کہ ایک جلاد کو ہٹا کر اس سے بڑا جلاد سر برآرائے سلطنت ہو گیا۔

زبیری خلافت کا خاتمہ

عراق پر قابض ہو کر عبدالملک نے اواخر ۷۲ھ میں حجاج بن یوسف کو عبداللہ ابن زبیر کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ مصعب کے بعد عبداللہ کی طاقت بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ حجاج کے پہنچتے ہی وہ حرم میں قلعہ بند ہو گئے۔ حجاج نے محاصرہ کر کے سنگباری شروع کر دی اور مسلم بن عقبہ کے ادھورے کام کو پورا کرنے لگا۔ سنگباری سے اہل مکہ کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ کعبے کی عمارت کو نقصان پہنچا اور پردہ تک جل گیا ——

ابن زبیر نے بڑے استقلال کا مظاہرہ کیا مگر ساتھی دغا دے گئے۔ یہاں تک کہ لڑکوں

نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ بہادر ماں حضرت اسماء کے ہمت بڑھانے پر بچے کھچے لوگوں کے ساتھ عبداللہ باہر نکلے۔ اُمویوں سے بڑا سخت مقابلہ کیا اور جمادی الثانی ۷۳ھ میں لڑتے لڑتے گھوڑے سے گر گئے۔ آپ کی عمر ۷۲ سال تھی۔

حجاج نے لاش سُولی پر لٹکا دی جو کافی دنوں بعد حضرت اسماءؓ کے کہنے سے عبدالملک کے حکم پر اتاری گئی۔

حجاج نے مکے کے بعد ایک بار پھر مدینے کی تاراجی کی۔ کئی بوڑھے صحابیوں کو اذیت پہنچائی۔

بلاذری نے انساب الاشراف اور طبری نے تاریخ الامم والملوک میں اس کی صراحت کی ہے کہ حجاج نے جابر ابنِ عبداللہ انصاری، انس بن مالک اور سہل بن سعد کی گردنوں اور ہاتھوں پر گرم سیسے سے مہریں لگوا دی تھیں جیسے غلاموں پر لگائی جاتی تھیں۔

اس کی تصدیق جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں بھی کی ہے۔

اسی زمانے میں امام زین العابدینؑ گرفتار کر کے شام بھیجے گئے۔ امام ابوبکر محمد بن مسلم المعروف بہ زہری درباری فقیہہ اور محدث تھے۔ انھوں نے عبدالملک سے کہا کہ ایک بے خطر آدمی کو کیوں گرفتار کرایا ہے۔ عبدالملک نے امامؑ کو چھوڑ دیا اور حجاج کو ہدایت کی کہ آئندہ آلِ رسُول کو ستایا نہ جائے۔

خانۂ کعبہ کو حجاج کے ہاتھوں جو نقصان پہنچا تھا، عبدالملک کے حکم پر اس نے اس کی تلافی کی اور از سرِ نو اس کی تعمیر کرائی۔ اس میں امامؑ نے اس کی مدد کی اور حجرِ اسود کو اپنے ہاتھوں سے نصب کیا ـــــ پھر حجاج مدینے کے بجائے عراق کا حاکم بنا دیا گیا۔ چلتے وقت اپنے آخری خطبے میں اس نے کہا

"محمد بن سعد نے واقدی سے اپنے اسناد کے تحت نقل کیا ہے کہ جب حجاج مدینے سے معزول ہو کر چلا تو اس نے کہا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس شہر سے نکال دیا جس کے رہنے والے بدبودار اور خبیث ترین ہیں۔ امیر المومنین کے ساتھ زیادہ

کھوٹ رکھتے ہیں اور اس کی نعمتوں پر زیادہ حسد کرنے والے ہیں۔ خدا کی قسم، اگر عبدالملک کے خطوط اہل مدینہ کے بارے میں نہ آتے رہتے تو میں ان کو گدھے کی کھال کے مانند کسی چیز میں بھر دیتا۔ یہ لوگ سوکھی لکڑی اور ایک بوسیدہ جسم کے پاس آکر پناہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا منبر ہے اور یہ رسول اللہؐ کی قبر ہے۔"

"اس کا یہ قول جب جابر بن عبداللہ کے سامنے بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا، یہ برائی اس کی نہیں ہے بلکہ اس کے امام عبدالملک کی ہے جو اس نے کہا، وہی تو فرعون نے بھی کہا تھا، پھر خداوند عالم نے اسے مہلت دے کر اپنی گرفت میں لے لیا۔" (۱۰۲)

یہ تھا بنی امیہ کا اسلام، آج کے مسلمان جس کے خال وخد درست کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ مساعی لاحاصل کے بجائے کردار کی بات تو یہ ہے کہ کھل کر ایسے ہی عقائد کا اعتراف کر لیا جائے جس طرح ہم اپنے مسلک کا اظہار کرتے ہیں، اس کے بعد کسی اختلاف کا کوئی سوال باقی ہی نہ رہ جائے گا۔

حجاج بن یوسف کوفے میں

شیعان علیؑ کے لئے ایک بار پھر کوفے میں حضرت معاویہ کا دور تازہ ہو گیا تھا خون انسانی اس حکمران کے لئے اتنا سستا تھا کہ وہ اس کو پانی کے عوض بہا دینے میں دریغ نہ کرتا۔ جاتے ہی اس نے کوفے کے ایک بزرگ عمیر بن ضابی کا قتل کرایا جن پر الزام تھا کہ وہ خون عثمان میں شریک تھے ــــــ امیرالمومنین کے غلام ہمدان کا خون بھی اس کی گردن پر ہے جن کو ایک عرصہ تک زندان میں رکھا گیا پھر قتل کر دیا گیا۔

شیعوں کے لئے اس نے خاص طور پر آدمی مقرر کر رکھے تھے کہ جو ملے اس کو پکڑ لائیں۔ ایک روز دو آدمی لائے گئے، ان سے اس نے علیؑ پر تبرا کرنے کو کہا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے انکار کیا اور دونوں قتل کر دیئے گئے۔

پھر ایک دن جعفر نامی ایک سید زادہ لایا گیا جس پر ذکر حسینؑ کرنے کا جرم

تھا۔ اس سے حجاج نے پوچھا۔

"تو حسینؑ کا نام کیوں لیتا ہے؟"

"ماں نے وصیت کی تھی کہ محرم میں ذکر حسینؑ کرتے رہنا ۔۔۔۔"، دس سال کے بچے نے جواب دیا اور حجاج بولا۔

"باز نہ آؤ گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے!"

"ہمارے لئے یہ کوئی نئی بات نہ ہو گی ۔۔۔۔!"

بچے کے دندان شکن جواب پر حجاج آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے حکم قتل صادر کر دیا سیدزادے نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت لی مگر آپ نے نماز شروع ہی کی تھی کہ پتھر برسائے جانے لگے اور اتنے پتھر مارے گئے کہ بچہ ان میں دب کر شہید ہو گیا۔

۸۲ھ میں امیرالمومنینؑ کے صحابی کمیلؓ بن زیاد کی گرفتاری کے لئے حجاج نے ان کے ایک ہم قبیلہ ہیثم بن اسود سے ان کا پتہ پوچھا۔ کمیلؓ اپنے قبیلے میں چھپے ہوئے تھے۔ ہیثم نے پتہ نہیں بتایا۔ اس پر حجاج نے ان کے پورے خاندان کے وظائف بند کر دیئے۔ کمیلؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے خود اپنے کو پیش کر دیا۔ حجاج نے انھیں دیکھتے ہی بد کلامی شروع کر دی مگر جیسا کہا ویسا ہی سنا۔ کمیلؓ نے حجاج کو نصیحت کی کہ درندگی سے باز آ جائے اور اللہ سے ڈرے مگر حجاج نے نصیحت پر غور کرنے کے بجائے کمیل کو ایذا پہنچا پہنچا کر قتل کرا دیا۔ کمیلؓ کی عمر ۹۰ سال تھی۔ آپ کو اس عمر میں شہادت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس کو بھی امیرالمومنینؑ کا فیض صحبت کہنا چاہیئے۔

حجاج کو معلوم تھا کہ شیعان علی محرم میں ذکر حسینؑ کر کے کربلا کی یاد تازہ کرتے ہیں لہٰذا اس نے طے کیا تھا کہ وہ بھی ان دنوں بنی اُمیہ کے کردار کی تصویر پیش کرے گا اس لئے محرم شروع ہوتے ہی وہ ستم رانی میں زیادہ فعال ہو جاتا اور اس کے آدمی ٹوہ لگاتے رہتے کہ کہاں مجلس حسینؑ ہو رہی ہے؟ اس سے بھی کام نہ چلا تو مملکت بنی امیہ میں یوم عاشور کو عید منانے کا اعلان کیا گیا۔ لوگ نئے نئے کپڑے پہنتے، آنکھوں میں سرمہ لگاتے اور خوشیاں مناتے تھے۔

حجاج کا عام حکم تھا کہ کوئی بچہ، بوڑھا اور جوان نام حسینؑ زبان پر لائے گا تو اس کی زبان کاٹ لی جائے گی ـــــ ایک رات قاضی شہر نے ایک خاتون کو دیکھا جو بال کھولے سیاہ کپڑے پہنے واقعہ کربلا بیان کر رہی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے سُن رہے تھے اور روتے جاتے تھے۔ قاضی ان سب کو گرفتار کر کے حجاج کے سامنے لے آیا۔ حجاج نے ایک بچے کو ڈانٹ کر کہا۔

"اب حسینؑ کا نام نہ لینا ـــــ"

"پھر کس کا نام لوں گا ـــــ حسینؑ تو میرے آقا ہیں"۔ بچے نے جواب دیا اور حجاج کے اشارے پر قتل کر دیا گیا۔

دوسرے بچے سے حجاج نے پوچھا تو اُس نے بھی ویسا ہی جواب دیا اور وہ بھی بھائی کے پاس پہنچا دیا گیا۔ پھر ماں کا حال بھی بچوں ہی کا سا کیا گیا۔

یہ دور محبّانِ علیؑ کے لئے پچھلے ادوار سے زیادہ سخت تھا اور عام طور سے شیعوں نے تقیہ اختیار کر لیا تھا پھر بھی قید خانے شیعوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی گنتی کی نہ جا سکتی کیونکہ یہ صورت صرف کوفہ ہی کی نہ تھی، جہاں جہاں کسی کے شیعہ ہونے کا راز کھُل گیا، وہ قتل کر دیا گیا یا زندان میں ڈال دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق اسّی ہزار مرد و زن قید خانے کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔

امام زین العابدینؑ کو ایک بار پھر دمشق بلایا گیا مگر آپ با اعجاز گئے اور واپس آ گئے۔ آپ سے متعلق بہت سے معجزات مشہور ہیں جو ہمارے عقیدے کا حصّہ ہیں۔

حضرت قنبرؓ

قنبرؓ امیرالمومنینؑ کے شہرۂ آفاق غلام تھے۔ معرفت آلِ رسولؐ میں سلمانؓ و بوذرؓ مقدادؓ و عمارؓ کے ساتھ آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ کے جلوت کے ساتھی اور کبھی کبھی خلوت میں احکام کی بجا آوری پر فائز کئے جاتے۔ جنگِ صفین کی روانگی کے وقت امیرالمومنینؑ نے فوج کا علم قنبرؓ ہی کے ہاتھ میں دیا تھا۔

امیرالمومنینؑ کی وفات کے بعد غالباً آپ کوفہ ہی میں رہ پڑے تھے اور معاویہ

کے عہد میں قید کر دیئے گئے کیونکہ اُس دور میں کسی مقام پر آپ کا نام نہیں آتا۔ قیدیوں کے جنگل میں شاید آپ کو کوئی شناخت نہیں کر سکا۔ حجاج جب کوفے کا عامل ہوا تو آپ آزاد ہو کر پیرانہ سالی کی زندگی گزار رہے تھے کہ حجاج کے آدمیوں نے پابہ زنجیر کر کے حاضر دربار کیا، حالانکہ آپ اتنے ضعیف تھے کہ ابرُوول اور پلکوں کے بال سفید پڑ چکے تھے، چلنا مشکل تھا۔

حجاج سے آپ کی گفتگو ایک ناصبی اور ایک عارف امیرؑ المومنین کی گفتگو کی ترجمان ہے۔ آپ نے ہر سوال کا جواب ایک غالی شیعہ کے لب ولہجہ میں دیا اور حجاج نے آپ کے قتل کا حکم دے دیا۔ شہادت سے پہلے آپ کا طویل رجز نہایت ایمان افروز ہے "میں اس کا غلام ہوں جس نے دو تلواروں سے جنگ کی، دو نیزوں سے نیزہ بازی کی، دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی ـــــ میں اس کا غلام ہوں، جو صالح المومنین، وارث انبیاء، اور بہترین اوصیا ہے ـــــ"

جور وستم کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ عبدالملک کی ہلاکت کی خبر آئی اور حجاج کی نگاہیں دمشق کے افق سلطنت پر مرکوز ہو گئیں۔

عبدالملک: ایک حکمراں

اہلِ بیت کی دشمنی کا جہاں تک تعلق ہے، عبدالملک اپنے پیش رووں کا مقلّد تھا لیکن ایک حکمراں کی حیثیت سے بنی اُمیہ کی نشاۃ الثانیہ اس کے دَور سے شروع ہوئی۔ اس کا گیارہ سالہ عہد لڑتے لڑتے ہی گزر گیا۔ پہلے اس نے عبداللہ ابنِ زبیر کا مقابلہ کیا پھر خارجیوں کا جو حقیقتاً حضرت معاویہ کے پروردہ تھے مگر اب اُموی سلطنت کے لئے عذاب بن گئے تھے ـــــ بیرونی فتوحات میں کابل کے چند اضلاع اس کے زمانے میں فتح ہوئے۔ افریقیہ کے بعض علاقوں کی تسخیر اس کا کارنمایاں ہے۔ بربروں کی طاقت در ساحرہ اس کے عہد میں ماری گئی اور کئی دیگر فتوحات ہوئیں ۸۶ھ میں وہ ۶۲ سال کی عمر پاکر انتقال کر گیا۔ اس نے کئی اصلاحات بھی کیں جن میں سکّہ کا رواج اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولید باپ کا جانشین

ہوا ـــــ ولید، بنی امیہ کے بادشاہوں میں زیادہ خوش نصیب نکلا۔ جبر وتشدد میں وہ اسلاف سے پیچھے نہ رہا مگر تسخیر ممالک میں سب سے آگے بڑھ گیا۔ قسمت سے اس کو قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، محمد بن قاسم اور مسلمہ بن عبدالملک جیسے جرنیل ہاتھ آگئے، جنہوں نے اموی حکومت کے ڈانڈے چینی ترکستان سے یورپ کی حدود تک ملا دیئے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کی وفات

امام واقعۂ کربلا کے بعد مدینہ میں تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے، عبادت سے جو وقت بچتا، وہ گریہ وشیون میں گزرتا، کھانا سامنے آتا تو رو دیتے، پانی نظر آتا تو آنسو نکل پڑتے، گھر سے نکلتے تو صرف اُس وقت جب کوئی ہدایت خواہ آتا یا بعض روایات کے مطابق کوئی مومن مجلسِ حسینؑ منعقد کرتا تو آپ ضرور جاتے۔ عقیل کے پوتوں پر زیادہ شفقت فرماتے تھے کیونکہ کربلا میں سب سے زیادہ اولادِ عقیل نے قربانیاں پیش کی تھیں۔

مصائب اپنی انتہا پر پہنچ چکے تھے جو حکومت آئی اس نے رحم نہ کیا۔ عبداللہ ابن زبیر نے پریشان کیا، حجاج نے کینہ توزی کی مگر صابر وشاکر امام اپنی روش پر قائم رہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ آپ نے مختار ابن ابی عبیدہ کی مخالفت کی تھی البتہ خروج کے لئے سرپرستی نہیں فرمائی کیونکہ اقتدار کے لئے تلوار اُٹھانا سیرتِ علیؑ کے خلاف تھا لیکن مختار کے کارہائے خیر پر خوشنودی کا اظہار فرمایا تھا۔

آپ کی محتاط زندگی کے باوجود نسلی فضیلت کا امتیاز اور زہد وتقویٰ کا اعجاز آپ کے ساتھ تھا۔ آپ جس طرف گزر جاتے، دل بچھ جاتے، آنکھیں فرش راہ ہو جاتیں ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک اپنے باپ کے عہدِ حکومت میں حج کے لئے آیا۔ حاجیوں کی اتنی کثرت تھی کہ سیکڑوں ملازمین کی کوشش کے باوجود حجر اسود تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ اتنے میں ایک منحنی سا انسان دور سے آتا نظر پڑا تو مجمع کائی کی طرح پھٹنے لگا۔ پیوند کپڑوں میں ملبوس یہ آدمی بڑھتا رہا اور لوگ اس کو راستہ دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ

نزدیک پہنچ کر تقبیل فرمانے لگے۔

ہشام آپ کو پہچانتا تھا مگر جب ایک حواری نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تو وہ انجان بن گیا۔ عرب کا مشہور شاعر فرزدق قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ کون ہیں ـــــ مجھ سے سُنو"

فرزدق نے فی البدیہہ ایک قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

"یہ وہ ہے جس کو کعبہ بھی پہچانتا ہے اور حرم بھی جانتا ہے۔ زمینِ بطحیٰ اس کے قدم کی چاپ سے مانوس ہے اور نقوشِ پا کو محسوس کر لیتی ہے۔ بہترین خلائق کا بیٹا ہے۔ زہد و نفاست اور پاکیزگی میں ممتاز مین محتشم ہے ـــــ"

ہشام نے اس جُرم میں فرزدق کا نام درباری شاعروں کی فہرست سے نکال دیا۔ ان کو قید کر دیا۔ امامؑ نے بارہ ہزار درہم بھیجے مگر انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ معاوضہ آخرت میں لے لیں گے۔ عبداللہ ابنِ جعفر کے بیٹے نے ایک پیش کش کی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ آخر امامؑ نے چالیس ہزار درہم لے لینے پر اصرار کیا تو لے لئے اور اس کے بعد وہ چالیس سال زندہ رہے۔

ذلیل و رسوا کرنے کی ہر کوشش کے باوجود جب آپ کا قبول عام ختم نہ ہوا تو ولید بن عبدالملک نے استادِ بنی امیہ حضرت معاویہ کا حربہ استعمال کیا۔ آپ کو زہر دلوا دیا جس سے ۲۵ محرم ۹۵ھ میں ستاون سال کی عمر میں آپ کی شہادت واقع ہو گئی اور تاریخ کربلا کے صبر و رضا کا آخری باب بند ہو گیا۔ آپ کی دعاؤں کا مجموعہ صحیفۂ کاملہ کے نام سے موجود ہے۔ جس کو آپ کے سجادۂ عبادت کی روشنی سے عبارت لیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ جنت البقیع میں امام حسنؑ کے پہلو میں آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ چار لڑکیاں اور گیارہ لڑکے آپ نے یادگار چھوڑے، لڑکیوں کے نام تھے، خدیجہ، فاطمہ علیہ اور ام کلثوم۔ لڑکوں میں تھے امام محمد باقرؑ، عبداللہ، حسن، زید، عمر، حسین، عبدالرحمٰن، سلیمان، علی محمد اصغر اور حسین اصغر۔ ان میں جناب زید شہید اپنے جہاد کے سبب تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

پانچویں امام

امیر المومنین حضرت محمد باقر علیہ السلام

محرّم ۹۵ھ تا ۷ ذی الحج ۱۱۴ھ

تعارف :-

آپ کا پورا نام محمد باقر اور کنیّت ابو جعفر تھی، یکم رجب ۵۷ھ کو بمقام مدینہ منوّرہ پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش سے قبل و بعد بہت سے معجزات ظہور میں آئے۔ علم و فضل آپ سے مختص تھا لہٰذا باقر العلوم بھی کہے جاتے۔ آپ نے بنی اُمیّہ کے چھ بادشاہوں کا عہد دیکھا، معاویہ بن ابی سفیان، یزید ابن معاویہ، معاویہ بن یزید، مروان بن حکم، عبد الملک بن مروان اور اب ولید بن عبدالملک کا دَور تھا، جب آپ منصب امامت پر فائز ہوئے۔

کربلا میں آپ کی عمر تقریباً چار سال تھی مگر ایک ایک واقعہ آپ کو اچھی طرح یاد تھا، ۸ ربیع الاوّل ۶۲ھ کو جب قید سے چھوٹ کر مدینہ پہنچے تو مدینے کے بچوں کو آپ نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

امام زین العابدین کی المناک زندگی سے بھی آپ بہت متاثر تھے اسی لئے چھوٹے سے سن میں تحمل و بردباری کی تصویر بن گئے تھے۔

حضور نے اپنے صحابی جابرؓ ابن عبداللہ انصاری سے کہا تھا کہ تم سیدِ سجادؑ کے بیٹے محمد باقرؑ سے ملو گے، اس کو میرا سلام کہہ دینا۔ جابرؓ نابینا تھے۔ خود امام زین العابدینؑ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکتے لہٰذا امام ایک روز خود جابر سے ملنے گئے اور کہا۔ "باقر! اپنے عم جابر کی پیشانی کا بوسہ لو" آپ نے تعمیلِ ارشاد کی۔ جابرؓ نے آپ کو سینے سے

لگالیا اور آپ کے جدّ کا سلام پہنچایا۔ آپ نے جواب سلام دیا پھر جابرؒ نے آپ سے شفاعت کا وعدہ لیا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد جابرؒ کا انتقال ہوگیا۔

حجاج کی موت

حضرت قنبرؒ حجاج کے آخری مقتول نہ تھے اس کی خونریزی ایک تسلسل سے جاری رہی اس نے شیعانِ علیؑ کی ایک فہرست بنوا رکھی تھی۔ ان میں سے عطار دبن مجاہد، طلق بن حبیبؒ اور سعید بن جبیر ہاتھ نہ آئے تھے۔ ان کے بارے میں حجاج کو پتہ چلا کہ وہ حرم میں پناہ گزیں ہیں۔ حجاج نے ولید کو لکھا اور ولید نے خالد بن عبداللہ قسری کو حکم دیا کہ ان کو گرفتار کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا جائے۔

اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ حجاج ابنِ یوسف نے سعید سے پوچھا۔

"تمہارا نام شقی بن کسیر ہے؟"

"میری ماں میرے نام کی زیادہ عارف تھیں۔ انہوں نے میرا نام سعید ابن جبیر رکھا ہے" سعید نے جواب دیا اور حجاج نے سوال کیا۔

"ابوبکر و عمر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

سعید نے اپنے عقیدے کے مطابق جواب دیا اور دونوں میں سخت کلامی ہوئی اور حجاج نے سعید کو قتل کرا دیا جس کے بعد وہ پندرہ روز یا چالیس روز زندہ رہا۔ اس کے پیٹ میں پھوڑا نکل آیا تھا۔ سوتے سوتے وہ سعید کہہ کر چیخ پڑتا اور اسی عالم میں مر گیا۔

نجف اشرف میں انہدام قبور حجاج کے سیاہ کارناموں میں ایک اضافہ ہے اس نے زندہ تو زندہ مُردوں کو بھی چین نہ لینے دیا۔ حضرت علیؑ کی قبر کی تلاش میں اس نے کتنی ہی قبریں کھدوا ڈالیں مگر مولیٰ کی قبر اس کو ڈھونڈھے نہ ملی ــــــ زیرِ بحث یہ سوال آتا ہے کہ قبروں میں تو عموماً ہڈیاں ہی رہ جاتی ہیں، وہ پہچانتا کیونکر کہ ہڈیاں علیؑ کی ہیں یا کسی اور کی؟ لیکن شاید علیؑ کے اس شرف کا حجاج کو یقین تھا کہ آپ کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا اور وہ علیؑ کی میّت کو شناخت کرلے گا۔

ولید اور بنی ہاشم

کوفہ وبصرہ کبھی شیعانِ علیؑ کے گڑھ تھے لیکن ولید کے زمانے میں شیعہ تو درکنار شیعہ نام کی نسبت سے کوئی چیز بھی پائی نہ جاتی، اولاد رسولؐ میں بھی اِکا دُکا لوگ رہ گئے تھے جو کہیں چھپے ہوئے تھے، سب تقیہ کر چکے تھے ان میں سے اکثر بچوں کو اپنی حقیقت بتائے بغیر مر گئے۔ انھیں کی اولاد سُنی سادات کی حیثیت سے پائی جاتی ہے۔

۹۱ھ میں ولید حج بیت اللہ کے لئے آیا تو جنابِ فاطمہ کے مکان میں اس نے حسن مثنیٰ کو دیکھا اور مدینے کے والی عمر بن عبدالعزیز سے کہا کہ اس مکان کو خالی کرالیا جائے مگر اولاد فاطمہؑ نے تخلیہ سے انکار کر دیا تو اس نے مکان کو منہدم کرا دیا۔ اس واقعہ سے اس کو حسن مثنیٰ سے ضد ہو گئی اور اس نے آپ کو زہر دے کر ہلاک کرا دیا۔

سادات کشی کے کئی اور واقعے ولید کے دور میں پائے جاتے ہیں۔ عام شیعوں کا کوئی وجود تھا ہی نہیں تو وہ ظلم کس پر کرتا۔ مدینے میں خاندانِ رسالت موجود تھا مگر کوئی بھی اموی حکمران ان کی طرف دیکھتا تو اس کو کربلا یاد آجاتی اور اس کے جسم میں ایک لرزہ پڑ جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ امام زین العابدینؑ کے زمانے میں رشتہ داروں کو چھوڑ کر صرف پانچ مومن خالص مدینے میں پائے جاتے تھے۔

ولید کے اعمال وعقائد

ولید نے چاہِ زمزم کے مقابلے پر ایک کنواں بنوایا تھا جس کے سلسلے میں اس کا قول تھا کہ ابراہیمؑ نے لوگوں کو سیراب کیا لیکن کھاری پانی سے، میں نے میٹھے پانی سے لوگوں کی پیاس بجھائی۔ کھاری پانی سے وہ آبِ زمزم مراد لیتا تھا۔

حیوٰۃ الحیوان از علامہ دینوری جلد ا صـ۵۶ اور تاریخ الخلفاء از جلال الدین سیوطی صـ۱۱۶ کی رو سے ولید کا کہنا تھا کہ اگر خدا نے قرآن میں لواطے کا ذکر نہ کیا ہوتا تو کوئی اس فعل قبیح کا مرتکب ہی نہ ہوتا، خدا نے خود تذکرہ کر کے اس طرف توجہ دلائی ——— وہ خود اس پر عامل تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی تک کو معاف نہیں کیا۔

کنیزوں میں باپ کی استعمال شدہ کنیزیں بھی اس کی درخورِ اعتنا رہیں ———

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن رات بھر شغل جاری رکھنے کے بعد اس نے نشے کی حالت میں اپنی کنیز کو حکم دیا کہ مسجد میں جاکر صبح کی نماز پڑھادے۔ کنیز ڈرتی تھی مگر اس نے زبردستی کی۔ اس کو اپنے کپڑے پہنائے اور مسجد میں بھیج دیا۔ کنیز نے امام کی جگہ نماز پڑھائی اور اسی طرح حالتِ جنابت میں واپس آئی۔

لوگوں نے کنیز کو پہچان کر شور وغل کیا تو ولید نے تلوار اور سونے کی مہروں سے منہ بند کرادیئے۔

یزید بن معاویہ کا کہنا تھا کہ قرآن میں خدا نے نمازیوں کے لئے ویل استعمال کیا ہے (ویل للمصلّین) لیکن شرابیوں کے لئے کہیں ویل نہیں فرمایا۔

ولید کا قول تھا کہ خدا نے جناب داؤدؑ کو نبوّت وخلافت دونوں چیزیں عطا کی تھیں اس لئے دھمکایا۔ خلفاء کے پاس تو صرف خلافت ہے وہ کچھ بھی کریں، ان سے کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔

وضع احادیث کا سلسلہ اس کے دور میں بھی جاری رہا۔ روایت ہے کہ ایک روز فجر کے وقت حضورؐ ام المومنین عائشہؓ کے حجرے سے برآمد ہوئے اور نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے تو انہیں یاد آیا کہ وہ عالمِ جنابت میں ہیں لہٰذا واپس آئے غسل فرمایا اور بھیگے بالوں سے جاکر نماز پڑھائی۔ اس روایت سے ولید نے اپنے لئے ایک جواز پیدا کیا تھا کتنا بلند کردار بنادیا نبیؐ کو، اُسے کچھ یاد ہی نہیں تھا اور اُم المومنین نے بھی یاد نہیں دلایا۔ خود آپ نے کس حالت میں نماز پڑھی اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔

علیؑ اور اولادِ علیؑ پر سب وشتم اسی طرح جاری رہا، حالانکہ اب اس کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اولادِ رسولؐ یا شیعانِ علیؑ اگر کہیں تھے بھی تو ان میں کتنا دم خم رہ گیا تھا جو انہیں رسوا کیا جاتا مگر غالباً یہ عمل داخلِ ثواب تھا اس لئے اس کا اعادہ برابر کیا جاتا رہا۔

ولید کی تسخیری مہمات

ان خرابیوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک مدبّر اور باصلاحیت حکمران تھا۔ فرمانروائی

کے طور طریقے اس کو معلوم تھے۔

قتیبہ بن مسلم کو اس نے وسط ایشیا کا حاکم بنایا تھا جس نے دس سال کی جنگ و جدل میں کاشغر تک کا علاقہ مسخر کر لیا اور چین کی سرحد تک اموی سلطنت کی حدود بڑھا دیں

مکران کے گورنر محمد بن قاسم نے موجودہ بلوچستان اور سندھ کے قبائل کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر ہندوستان پر حملہ کیا اور سندھ، ملتان اور بیاس تک اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا۔

مسلمہ بن عبدالملک اور عباس بن ولید نے ایشیائے کوچک کے بہت سے مقامات فتح کئے اور ان پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

عمر بن عبدالعزیز نے اپنی رفاہی قابلیت سے مکہ، مدینہ اور حجاز کے کئی مقامات کی ویرانی کو قدرے دور کر دیا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر امام محمد باقرؑ نے اپنے دادا کا مدرسہ پھر سے جاری کیا تھا جو برسوں سے بند پڑا ہوا تھا۔ ولید کے عہد میں وہ جاری رہا۔

موسیٰ بن نصیر مملکت کے مغربی حصوں کا حکمراں تھا۔ جنگ صفین میں اس نے علیؑ کے خلاف تلوار اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت معاویہؓ اس کو معاف نہ کرتے مگر اس کی صلاحیت کا دوسرا آدمی پوری سلطنت میں موجود نہ تھا پھر یہ بھی ڈر تھا کہ اگر یہ ٹوٹ کر اُدھر چلا گیا تو کہیں دوسرا مالک اشتر نہ بن جائے لہذا عرب کے مدبر نے درگزر سے کام لیا اور آج موسیٰ بن نصیر اموی سلطنت کی توسیع میں کام آیا۔

مراقش پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ موسیٰ کی نظر ہسپانیہ کے حالات پر پڑی اور اس نے اپنے غلام طارق بن زیاد کی ماتحتی میں ایک فوج اس ملک کی تسخیر کے لئے روانہ کر دی۔ اسپین کی فتح طارق کی بہادری کا کارنامہ ہے مگر موسیٰ کا تدبر بھی اس میں شامل تھا۔

۹۶ھ میں ۹ سال ۸ ماہ حکومت کر کے ولید کا انتقال ہو گیا اور سلیمان بن عبدالملک اس کا جانشین ہوا۔

ولید کا عہد اموی تاریخ کا ایک درخشاں عہد ہے مگر ان تمام

خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ بڑا سخت گیر تھا۔ اس سخت گیری کی وجہ سے ہزاروں آدمی قید و بند میں مبتلا ہوئے"(۱۰۳)

امام محمد باقرؑ: ایک منارۂ علم و ہدایت

امام اپنے ابتدائے سن سے معجز نما تھے ایک راوی کا بیان ہے، وہ حج کے لئے جا رہا تھا کہ ایک سنسان راستے پر اندھیرے میں ایک طرف سے شعاع پھوٹی۔ اس نے دیکھا تو ایک چھ سات سال کا لڑکا نمودار ہوا جس نے اسلامی طریقہ پر سلام کیا۔ راوی نے پوچھا کہ کون ہے اور کہاں جائے گا اور اس کے پاس زادِ راہ ہے یا نہیں؟ لڑکے نے جواب دیا۔

"خدا کی طرف سے آرہا ہوں، خدا کی طرف جاؤں گا، زادِ راہ تقویٰ ہے عربی الاصل قریشی النسل اور علوی نژاد ہوں، نام محمد بن علی بن حسین ہے"۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ میں نے ہر طرف دیکھا مگر نظر نہیں آیا۔

اس طرح کے اور بھی معجزات آپ کی ذات سے ظہور میں آئے لیکن آپ کا بڑا معجزہ علوم دین و دنیا سے آپ کی واقفیت تھی۔ آپ نے ذات باری، انسانی زندگی اور اس کی ماہیت، رموزِ حکمت اور اسرار مشیت، زہد و تقویٰ، روح کی حقیقت اور ماہیت، سب پر روشنی ڈالی۔ علم القرآن، علم الآثار، علم السنن کے آداب و نکات کو واضح کیا۔ آپ اپنی ذات سے ایک بحر العلوم تھے اور آنحضرتؐ اور امیر المومنینؑ کے جانشین نظر آتے تھے۔

خطیب منبر سلونی سے دنیا نے استفادہ نہیں کیا لیکن امام محمد باقرؑ سے پوچھنے والوں نے بہت کچھ پوچھا۔ نعمان بن ثابت المعروف بہ امام ابوحنیفہ نے تو فقہ و حدیث کی وہ معلومات حاصل کیں کہ ان کی شخصیت بن گئی، پھر دو سال آپ نے اسی درس گاہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں گزارے۔

امام ابوحنیفہ کو امام باقرؑ نے تاکید فرمائی تھی کہ قیاس سے فتاوے نہ دیا کریں اور کئی سوالات کے جوابات دے کر سمجھایا تھا کہ اس طرح فتوے غلط ہو جاتے ہیں مگر

شاید امام ابو حنیفہ نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا کیونکہ ان کی اگلی زندگی میں اس کی نظیریں ملتی ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک

سلیمان کا عہدِ حکومت ۹۶ھ سے شروع ہوا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی قید خانوں کے دروازے کھلوا دیئے اور بے گناہ قیدیوں کو رہا کر دیا جو ایک اچھا کام تھا مگر خود اپنے دشمنوں کو بے دردی سے قتل کرا دیا اور سلطنت کے معماروں کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کیا۔ جن میں قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم شامل ہیں عبدالعزیز بن موسیٰ کا قتل اسی کے ایماء پر کیا گیا تاہم اس نے کچھ کارہائے خیر بھی کئے۔

ظلم و شقاوت اس کو ورثے میں ملی تھی مگر تدبیر سے خالی تھا۔ رومیوں سے اس نے شکست کھائی۔ یزید بن مہلب نے طبرستان و کوہستان کے بعض علاقے فتح ضرور کئے مگر مجموعی طور پر اس کا عہد ناکام رہا۔ آخر ۲ صفر ۹۹ھ کو دو سال پانچ ماہ حکومت کر کے فوت ہو گیا۔

بنی فاطمہؑ کا وہ اسلاف کی طرح دشمن تھا مگر اس کو زیادہ موقع نہیں ملا۔ مسلمانوں کی حکومت میں مخنثوں کا استعمال اس کے دور کی اختراع ہے۔ حضرت محمد حنفیہ کے پوتے ابو ہاشم کا اس کے دور میں بہت عروج تھا مگر اس نے کسی بات پر ناراض ہو کر انہیں دودھ میں زہر دلوا دیا۔

عمر بن عبدالعزیز

سلیمان کے بعد عمر بن عبدالعزیز ماہ صفر ۹۹ھ میں تخت نشین ہوئے۔ ان سے امویوں میں ایک شریف النفس، مقدس اور عالی خیال خلیفہ کی نظیر قائم ہوئی۔ انہوں نے عام فریادیوں کی داد رسی کے ساتھ ساتھ باغِ فدک اولادِ رسولؐ کو واپس کر دیا۔ حضرت علیؑ پر سب و شتم بند کرایا اور خمس کا حقدار بنی ہاشم کو قرار دیا جو بنی امیہ کو ناگوار گزرا۔

بددیانت اور خائن عمال کی گرفت بھی ان کا کارنامہ ہے۔ بعض لائق لوگوں

کو بھی انہوں نے اعلیٰ عہدوں پر متعین کیا، السمح بن مالک کو اسپین بھیجا۔ جس نے وہاں خاصی اصلاحات کیں۔ اس بے غرضانہ اور منصفانہ حکومت سے جابر اموی ان کے دشمن ہو گئے انہوں نے عمر کے غلام کو ملا کر رجب ۱۰۱ھ میں انہیں زہر دے دیا۔

یزید بن عبدالملک

یزید نے ۱۰۱ھ سے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ اس کے دور میں پہلی بغاوت یزید بن مہلب نے کی جو کئی مقابلوں کے بعد قتل ہوا۔ افریقہ میں حجاج کا ایک ماتحت افسر مقرر تھا۔ وہ بھی باغی ہوگیا۔ اسپین میں بھی بدامنی ہوگئی۔ ہر طرف ایک خلفشار اور انتشار پیدا ہوگیا۔

اس نے ستم یہ ڈھایا کہ عمر بن عبدالعزیز کے سارے نظام کو اُلٹ کر رکھ دیا اور چہار جانب بدامنی کے باوجود دادِ عیش دیتا رہا۔

حبابہ نامی ایک کنیز اس کی محبوبہ تھی، وہ اس کی لاش کے قریب کئی روز تک بیٹھا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دادِ عیش بھی دی اور بڑی لعنت ملامت ہونے پر اس کو دفن کیا۔

شعبان ۱۰۵ھ میں وہ فوت ہوا، بدمزاج، ظالم اور دشمنِ اہلِ بیت تھا ہشام بن عبدالملک اس کا جانشین ہوا۔

ہشام بن عبدالملک

ہشام ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد ہی وہ حج کے لئے مکہ پہنچا۔ امام محمد باقرؑ کو لاجواب کرنے کے لئے بعض سوالات کرائے مگر اس کو منہ کی کھانا پڑی۔ دمشق سے مکہ کی راہ میں ایک منزل پر پانی نایاب تھا۔ ہشام نے وہاں کنواں کھدوانے کا بندوبست کیا مگر زمین سنگلاخ تھی۔ بڑی مشکل سے کنواں کھودا گیا تو اس میں سے گرم اور جھلسا دینے والی ہوا نکلی اور تمام مزدور مر گئے۔ دوسرے مزدور فراہم کئے گئے تو ان کا بھی یہی حال ہوا۔ ماہرینِ ارضیات سعی بسیار کے باوجود کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ہشام نے امام کو زحمت دی تو آپ موقع پر تشریف لے گئے اور فرمایا اس جگہ کو فوراً بند کرا دیا جائے۔ قومِ عاد

کے اہلِ احقاف پر یہاں عذاب نازل ہو رہا ہے پھر آپ نے ایک دوسرا مقام نشان زد کیا جہاں میٹھا پانی نکل آیا۔

ایک سال ہشام حج کے لئے گیا تو امام محمد باقرؑ اور جعفر صادقؑ بھی موجود تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا۔

"ہم زمین پر خدا کی حجت اور اس کے خلیفہ ہیں۔ ہمارا دشمن جہنم میں جائے گا اور دوست جنّت میں ——"

شام میں علیؑ پر تبرّا پھر شروع ہو چکا تھا۔ ہشام نے اس بات کو اپنے پر طنز قرار دیا مگر مصلحتاً اس وقت خاموش رہا۔ دمشق پہنچ کر دونوں باپ بیٹے کو طلب کر لیا۔ آپ پہنچے تو تین روز تک صرف شرمندہ کرنے کے لئے ملاقات نہیں کی۔ چوتھے دن دربار کو خوب آراستہ کر کے بلوایا اور محمد باقرؑ کو مقابلۂ تیر اندازی کی دعوت دی۔ آپ نے فرمایا۔

"میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھے معاف رکھ۔"

ہشام بضد ہو گیا۔ سمجھتا تھا کہ یہ علمی آدمی ہیں اور اتنے بوڑھے ہیں۔ نشانہ خطا کر جائیں گے اور وہ اپنے اہلِ دربار کے ساتھ مذاق اُڑائے گا۔

امامؑ نے مجبوراً تیر کمان اُٹھائی اور تیر چلّے پر چڑھا کر چھوڑ دیا —— تیر ٹھیک نشانے پر جا بیٹھا۔ امامؑ نے فرمایا۔

"بادشاہ، ہم معدنِ رسالتؐ ہیں۔ ہمارا مقابلہ کوئی کسی امر میں نہیں کر سکتا۔"

ہشام کو غصہ آ گیا۔ منصوبے کے مطابق درباریوں نے بھی نازیبا الفاظ استعمال کئے اور امامؑ نے فرمایا۔

"ہمیں خدا نے عزت دی ہے۔ کسی کے ذلیل کرنے سے ہم ذلیل نہیں ہو سکتے۔"

مشتعل ہو کر ہشام نے دونوں کو قید کر دیا مگر قیدیوں نے آپ کی ہم جلیسی اور گفتگو کا بہت اثر لیا اور آپ کے گُن گانے لگے جس کا اثر باہر تک پہنچنے لگا۔ آخر خائف ہو کر ہشام نے آپ کو رہا کر دیا مگر اس دن سے آپ کو راستے سے ہٹا دینے کی فکر میں لگ گیا۔

جناب زیدؒ شہید

زیدؒ، مظلوم و صابر امام زین العابدینؑ کے بیٹے تھے مگر امام نہیں تھے۔ ۸۰ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی، جب واقعۂ کربلا کو بیس سال گزر رہے تھے۔ آپ نے بچشم خود دیکھا نہ تھا مگر عالی مرتبت باپ اور دوسرے بزرگوں کی زبان سے جو واقعات سنتے رہے تھے، اس سے خون کھول کھول کر رہ جاتا پھر آپ نے ان مظالم کو بھی دیکھا جو بنی اُمیّہ نے اولادِ رسولؐ اور علیؑ کے ماننے والوں پر ڈھائے۔ انتہا ہو گئی تھی ظلم و ستم کی کہ کوئی چوری چھپے اپنے کسی بچے کا نام علی، حسن یا حسین رکھ لیتا اور اس کا پتہ عمالِ حکومت کو چل جاتا تو بچہ تہہ تیغ کر دیا جاتا تھا۔

جناب زیدؒ بڑے عبادت گزار، نہایت متقی اور حد درجہ شجاع تھے۔ شجاعت میں بہادری کے ساتھ ضبط و تدبر بھی شامل ہوتا ہے مگر حد ہوتی ہے برداشت کی۔ امام تو ساری مخلوق کے لئے ہوتا ہے اور اللہ کی نیابت میں نافرمانیوں سے درگزر کرنا اس کا منصب ہے لیکن جناب زیدؒ پر ایسی کوئی ذمہ داری نہ تھی پھر بھی آپ اپنے جوش کو دباتے رہے اور اندر کے اُبال کو آپ نے باہر نہ آنے دیا۔

آخر مدینے میں بنی اُمیہ کی زیادتیوں سے تنگ آکر آپ نے کوفے کا رُخ کیا وہاں یوسف بن عمر کے ستم دیکھے تو دمشق پہنچے اور ہشام سے شکایت کی۔

جناب زیدؒ کا انداز انصاف طلب تھا مگر اس کا جواب فرعونیت سے دیا گیا اور زیدؒ کے سخت جوابات پر ہشام نے آپ کو دربار سے نکال دیا۔

صبر کا پیمانہ چھلک چکا تھا۔ جناب زیدؒ کوفہ واپس آئے اور آپ نے طے کر لیا کہ ظالموں کو سزا دیں گے یا سلیمان خزاعی کی طرح شہید ہو جائیں گے۔

کوفے کو حضرت عمر نے آباد کیا تھا اور علیؑ نے مرکزیت کو دیکھ کر اسے اپنا مرکز حکومت بنایا تھا۔ یہ دونوں خواص اس شہر میں موجود تھے۔ یہیں سے حضرت علیؑ نے صفین کے لئے اپنا لشکر مرتب کیا تھا اور یہیں سے ابنِ زیاد نے قتلِ حسینؑ کے لئے فوجیں تیار کی تھیں۔ اسی شہر سے سلیمان بن صرد خزاعی نے دس ہزار آدمی جمع کئے

تھے اور اسی شہر سے مختار ثقفی نے اپنی طاقت میں اضافہ کیا تھا۔

رنگ بدلنا اس بستی کا مزاج اور وعدہ خلافی اس کا طرۂ امتیاز تھا — اور اب تو حالات پہلے سے زیادہ ابتر ہو گئے تھے۔ پہلے تو شیعانِ علیؑ اور شیعانِ معاویہ دونوں پائے جاتے تھے لیکن اب شیعانِ علی تو ناپید ہو گئے تھے۔ شیعانِ معاویہ رہ گئے تھے جو دونوں کا کردار ادا کرتے، کبھی شیعانِ علی بن جاتے اور کبھی اپنی اصل کی طرف پلٹ جاتے۔ انہیں میں بعض وہ لوگ بھی تھے جو اولادِ رسولؐ کو برحق سمجھتے مگر طمعِ دُنیا انہیں اپنا راستہ بدلنے نہ دیتی۔ جیسے موسیٰ بن نصیر کہ جنگِ صفین میں علیؑ کے خلاف تلوار اٹھانے سے انکار کر دیا لیکن رہے بنی اُمیہ کے ساتھ۔

جنابِ زیدؒ نے سُن تو رکھا تھا مگر جب ان کی آواز پر جوق در جوق لوگ آکر بیعت کرنے لگے اور اُنہیں کچھ مخلص لوگ بھی مل گئے تو آپ نے علم اہلِ بیتؑ بلند کر دیا — چالیس ہزار آدمی کہنے کو کم نہیں ہوتے بشرطیکہ ان میں ایک تہائی بھی وفادار ہوں لیکن وہ سب کے سب ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہشام کا لشکرِ گراں مقابلے پر آیا، بدلی چھٹنے لگی۔ تین روز کی جنگ میں مخلص اصحاب و انصار مارے گئے صرف ۸۸۔ آدمی رہ گئے۔ ۳۳ عزیز و اقارب اور ۵۵ شیعانِ اہلِ بیتؑ تھے۔

جنگ کا انجام سامنے تھا لیکن حسینؑ کا پوتا رزم گاہ کو پیٹھ کیونکر دکھاتا۔ جنابِ زیدؒ زخموں سے چُور چُور ہو چکے تھے کہ ایک تیر آپ کی پیشانی پر آکر لگا۔ آپ گھوڑے سے گر گئے۔ خادم میدان سے ہٹا لے گیا اور ایک مقام پر قبر کھود کر آپ کو دفن کر دیا — لیکن دشمنِ اہلِ بیتؑ یوسف بن عمر نے پتہ لگا کر لاش نکال لی، سر کاٹ کر ہشام کے پاس بھیج دیا اور جسم سولی پر لٹکا دیا جو ہشام کی موت تک چار سال لٹکتا رہا۔

حضرت یحییٰ ابن زیدؒ

جنابِ زیدؒ کی شہادت کے بعد یحییٰ میدانِ جنگ سے مدائن اور مدائن سے نیشاپور چلے گئے۔ بنی اُمیہ کا دستۂ فوج ٹوہ لگاتا ہوا وہاں پہنچا تو آپ سرخس آ گئے۔ اس مقام پر چھ ماہ یزید بن بکر تمیمی کے مہمان رہے پھر حریش کے مکان میں منتقل ہو گئے —

یوسف بن عمر کو معلوم ہوا تو اس نے نصر بن سیّار کو آپ کی گرفتاری کے لئے لکھا۔ نصر نے میزبان کو پکڑ کر چھ سو کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ حریش کوڑے کھاتے رہے مگر یحییٰؑ کے بارے میں کچھ نہ بتایا مگر ان کے بیٹے نے یحییٰؑ کو گرفتار کرا دیا۔

اس عرصے میں ہشام مر چکا تھا اور ولید ثانی تخت پر متمکن تھا۔ اس نے کسی سفارش پر یحییٰ کو رہا کرنے کا حکم دے دیا مگر بنی اُمیّہ نے یحییٰؑ کو سرخس میں رہنے نہ دیا اور آپ طوس چلے گئے۔ حاکمِ طوس ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا۔ یحییٰ کو جب کسی مقام پر چین سے بیٹھنے نہ دیا گیا تو تنگ آمد بجنگ آمد۔ آپ صرف ستر آدمیوں کو لے کر مقابلے پر آ گئے۔

طوس کا سپہ سالار عمر بن زرارہ دس ہزار لشکر کے ساتھ مقابل ہوا مگر ستر بنی ہاشم ننگی تلواریں لے کر بڑھے تو کاٹ کر رکھ دیا۔ اتنی بڑی فوج کو شکست ہوئی۔ عمر مارا گیا اور باقی لوگ فرار ہو گئے ــــــ یحییٰؑ یہاں سے ہرات آ گئے۔ وہاں بھی آپ پر حملہ کیا گیا اور آپ جرجان کی طرف چل پڑے۔ اس مقام پر آپ کو ایک بڑے لشکر کا سامنا کرنا پڑا اور آپ لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ابو العجارم حنیفی اور خشخاش ازدی نے بھی اس جنگ میں شرفِ شہادت حاصل کیا۔

آپ کا سر کاٹ کر ولید ثانی کے پاس بھیج دیا گیا۔ ہاتھ پاؤں کاٹ کر پہلے جسم کو سولی پر لٹکایا گیا پھر جلا کر راکھ دریائے فرات میں بہا دی گئی۔

ابوالفضلؑ بن زید کی لاش بھی لٹکا دی گئی جس کو بنو عباس کے اقتدار میں ابومسلم خراسانی نے اُتروا کر دفن کیا۔

جناب عیسیٰؑ ابن زید موتم الاشبال اتنے سجدہ گزار تھے کہ آپ کی پیشانی پر گھٹے کا نشان چمکتا تھا۔ آپ تقیہ میں چلے گئے تھے اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر چھپتے پھرتے تھے۔

کوفے میں آپ نے ایک سقّے کی ملازمت کر لی اور ایک عورت سے شادی کر لی جس سے ایک بچی پیدا ہوئی۔ جب وہ جوان ہوئی تو سقّے نے اپنے لڑکے سے اس کا رشتہ دیا۔ عیسیٰؑ شرم سے گڑ گئے کہ علیؑ کی پوتی ایک سقے کے بیٹے سے بیاہی جائے۔ اپنی حقیقت

بیوی پر بھی کھولتے تو قتل ہو جاتے۔ رات نماز تہجد میں باری تعالیٰ سے دُعا کی کہ اس لڑکی کو اُٹھا لے۔ دعا قبول ہوئی اور وہ مر گئی۔

آپ اس کی موت پر بہت روئے تو ایک دوست نے کہا کہ بہادر اس طرح تو نہیں روتے۔ آپ نے فرمایا۔

"اس لڑکی پر نہیں رو رہا ہوں، رو رہا ہوں اس پر کہ وہ مر گئی مگر اس کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ اس کا باپ کون ہے اور وہ کس خاندان سے ہے!" یہ تھی بے چارگی جس سے عاجز اور مشتعل ہو کر آلِ رسولؐ کے بعض افراد مرنے اور مارنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت

ہشام نے ہر تدبیر کر ڈالی تھی مگر نہ امام محمد باقرؑ کی شخصیت کو مجروح کر سکا اور نہ آپ کو کسی موقع پر ذلیل کر سکا تو اس نے امامؑ کو قتل کرا دینے کا منصوبہ بنا لیا اور عاملِ مدینہ کے ذریعہ آپ کو ایک زہر آلود زین تحفے میں بھیجی۔ جس پر بیٹھنے سے آپ ۵۷ سال کی عمر میں ۷ ذی الحج ۱۱۴ھ کو انتقال فرما گئے۔

آپ کی چار بیویاں تھیں۔ جن سے دو بیٹیاں اور پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔ بیٹیوں میں زینب و اُمّ سلمہ اور بیٹوں میں امام جعفر صادقؑ، عبداللہؒ، ابراہیمؒ، عبیداللہؒ اور علیؒ۔ امام جعفر صادقؑ آپ کے بعد مسند نشینِ امامت ہوئے۔

چھٹے امام

امیر المومنین حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

۷ ذی الحج ۱۱۴ھ تا ۲۵ شوال ۱۴۸ھ

ولادتِ مسعود

آپ ۱۷ ربیع الاوّل ۸۳ھ کو دوشنبے کے دن مدینے میں پیدا ہوئے۔ دوسرے آئمہ کی طرح ناف بریدہ اور ختنہ شدہ تھے۔ عالمِ شہود میں آتے ہی کلمۂ شہادتین زبان پر جاری فرمایا۔ امام محمد باقرؑ نے آپ کو دیکھ کر فرمایا۔

"میرا یہ بیٹا اُن لوگوں میں ہے جن کا وجود بندوں پر پروردگار کا احسان ہے یہی میرا جانشین ہے" چنانچہ ۷ ذی الحج ۱۱۴ھ کو پدر عالیمقام کے بعد آپ مسندِ امامت پر رونق افروز ہوئے اور رشد و ہدایت کا وہ دَور شروع ہوا جس کے کسبِ فیض سے کئی سجادے بچھا لئے گئے۔

امامؑ سے بنی اُمیہ کے مدبّر اور جابر حکمرانوں کا کئی بار سابقہ پڑا مگر کوئی کسی موقع پر آپ کی تذلیل نہ کر سکا ـــــ آپ کے بچپن میں عبدالملک بن مروان کا عہد تھا، پھر ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک سریر آرائے سلطنت ہوئے، بحالت موجودہ ہشام کا دَور تھا، اس کے بعد ولید بن یزید، یزید الناقص، ابراہیم بن ولید اور مروان الحمار بنی اُمیّہ کے تخت پر بیٹھے۔

یہ تمام بادشاہ آلِ محمدؐ کے لئے سیرتِ معاویہؓ رکھتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ بار بار درباروں میں بُلائے گئے۔ ان کی منزلت کو گھٹانے کے لئے علمار سے مناظرے

کرائے گئے مگر پیغمبرؐ کے جانشین سُرخرو رہے۔ شاہانِ وقت نے کئی مرتبہ ملحدوں اور ہر لوگ سے مباحثہ کرایا لیکن عارفِ اسرارِ احادیث کو کون نیچا دکھا سکتا تھا۔ صادق آلِ محمدؐ حق کا بول بالا کرتے رہے۔ بے شمار معجزات آپ سے ظاہر ہوئے جو عقیدے کی روشنی کو تیز سے تیز تر کرتے رہے مگر آپ کا اصل کام بھٹکے ہوئے انسانوں کی رہبری تھا جو بہر طور جاری رہا۔

ہشام کے کارنامے اور وفات

ہر اموی حکمراں کی بنیادی کارگزاری خونِ سادات تھا۔ ہشام اس میں بازی تو نہیں لے جا سکا مگر کسی سے پیچھے بھی نہیں رہا۔ محمد جواد المغینہ الشیعہ والحاکمون تحریر فرماتے ہیں۔

"ہشام نے قدیم معمولات اور فاسد رواج کی اصلاح کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا بلکہ وہ بھی اہلبیت اور محبّان اہلِ بیتؐ کی دشمنی، اموی غذا کے طور پر فراہم کرتا رہا۔ ظلم میں ظلم، تشدد میں تشدد کا اضافہ اس کا کام تھا۔ اپنے عمال کو اس نے تحریر کیا کہ شیعوں پر سختی کریں، قید کریں، ان کے آثار و نشانات مٹا دیں اور انہیں عطایا سے محروم رکھیں۔ چنانچہ اس کے حکم پر یوسف بن عمر ثقفی نے مداحِ آلِ محمدؐ شاعر کمیت کے مکان کو منہدم کر دیا اور ان کی زبان کاٹ ڈالی ــــــ"۔ جناب کمیت ۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار اصحاب امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ میں سے ہوتا ہے آپ کا مشہور قصیدہ "ہاشمیات" آپ کے عقائد کا ترجمان ہے۔

"ہشام نے اپنے عاملِ مدینہ خالد بن عبدالملک کو تحریر کیا کہ بنی ہاشم کو مدینے سے باہر جانے نہ دے، کوئی جانے کی کوشش کرے تو اُسے گرفتار کر لے۔ اس حکم کی تعمیل میں بنی ہاشم پر سختی بڑھ گئی"۔

جابر و ظالم ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں بڑی انتظامی صلاحیت بھی تھی۔ سب سے پہلے اس نے خارجیوں کا زور توڑا، پھر مختلف اوقات میں کئی اندرونی بغاوتوں کو فرو کیا۔ ختل اور فرغانہ میں خالد کے بھائی اسد نے کئی لڑائیاں لڑیں اور

ترکمانوں کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا۔ اسی دوران کاکیشیا، شمالی ایران اور آرمینیا میں فتنۂ و فساد ہونے لگے۔ جن پر مروان بن محمد نے قابو پایا۔ افریقیہ اور اسپین میں بھی کئی فتوحات ہوئیں۔ جزیرہ سسلی مسخر ہوا پھر مسلمان فرانس کی سرحدوں تک بڑھتے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ایک نیا فرقہ خوارج میں پیدا ہوا۔ جنگ اشراف واقع ہوئی اور سارے عرب لڑتے لڑتے مارے گئے، پھر اسپین میں افراتفری پھیل گئی۔ ہشام نے حنظلہ بن صفوان کو متعین کیا اور حنظلہ نے ایک سخت جنگ کے بعد عکاشہ کو شکست دی اندلس میں بدامنی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ السمح جب لولوز کی دیواروں تلے مارا گیا تو عبدالرحمٰن الغافقی نے فوجوں کی کمان سنبھال لی اور حالات پر قابو پالیا۔

عبدالرحمٰن کو مسلسل بربروں اور عیسائیوں سے جنگیں کرنا پڑیں مگر وہ ہراساں نہ ہوا اور چارلس شاہِ فرانس سے لڑتا ہوا مارا گیا ـــــ اس شکست سے مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی اور عقبہ بن حجاج اندلس کا حکمران بنایا گیا جس نے فرانس پر کئی حملے کئے اور اٹلی کا کچھ علاقہ فتح کیا مگر سابقہ رعب و دبدبہ واپس نہ لاسکا۔

حلیف القرآن ابوالحسین زید شہید کا واقعہ اسی دور کا ہے، عباسی تحریک فاطمی تحریک کے نام سے، اسی زمانے میں پھیلتی رہی۔

۶ ربیع الثانی ۱۲۵ھ کو ہشام کا انتقال ہوگیا اور اس کا بھتیجا ولید ثانی تخت نشین ہوا۔ ہشام کی مدتِ حکومت ۲۰ سال تھی۔

ولید بن یزید بن عبدالملک

ولید ربیع الاوّل ۱۲۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ فاسق و فاجر، شرابی اور بدکار تھا۔ لواطت میں بہت مشہور تھا۔ آلِ رسول کا دشمن تھا۔ حضرت یحییٰؑ اسی کے عہد میں شہید ہوئے۔ محرمات الٰہی کی ہتک کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ ایک مرتبہ اس نے قرآن سے فال نکالی۔ فال اس کے خلاف مزاج نکلی تو اس نے قرآن لٹکا کر تیروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ولید کو ایک وسیع سلطنت ملی تھی لیکن اس نے اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ

اتار نا شروع کر دیا جس سے بغاوتیں ہونے لگیں ہسپانیہ میں بھی شیرازۂ سلطنت منتشر ہونے لگا لیکن عقبہ بن نافع کی نسل میں یوسف نامی سردار نے حالات کو سنبھال لیا۔

وہ ایک ناعاقبت اندیش اور بے تدبیر بادشاہ تھا۔ خالد بن عبداللہ قسری کو قتل کر کے اس نے یمنی قبائل کو اپنا مخالف بنا لیا اور انہوں نے محل میں اسے گھیر کر قتل کر دیا۔

یزید بن ولید المعروف بہ یزید الناقص

یہ بادشاہ اوائل ۱۲۶ھ میں تخت نشین ہوا اور ذی الحج ۱۲۶ھ میں چھ ماہ حکومت کر کے مر گیا۔

اس کا مختصر دور قبائلی بغاوتوں اور بنی اُمیّہ کی آپس کی چپقلش کا شکار رہا۔

ابراہیم بن ولید

اس کا عہد حکومت دو ماہ ایک دن کا ہے اس کا اقتدار دارالخلافہ اور اس کے آس پاس تک محدود رہا۔ پھر آپس کی جنگ میں مارا گیا۔

مروان بن محمد بن مروان المعروف بہ مروان الحمار

اموی حکومت کا آخری بادشاہ صفر ۱۲۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ آلِ محمدؐ کی دشمنی اس کو بھی وراثت میں ملی تھی مگر اپنے پانچ سالہ عہد میں اس کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ تخت پر بیٹھتے ہی سلیمان بن ہشام نے چڑھائی کر دی۔ مروان نے بہادری سے مقابلہ کیا اور اس کو مار بھگایا۔

عبداللہ ابنِ معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیارؓ بھی دوسرے بنی ہاشم کی طرح ظلم و ستم سے عاجز ہو کر اُٹھے تھے اور ایک عرصے سے ساتھیوں کی تلاش میں سرگرداں تھے آہستہ آہستہ انہوں نے ایک جمعیت فراہم کر لی۔ مروان الحمار نے ان سے مقابلہ کیا مگر پسپا نہ کر سکا اور عبداللہ نے فارس و عراق کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا جہاں کے باشندے ان کے مطیع و فرماں بردار تھے۔

۱۲۸ھ میں سلیمان کی تحریک پر ضحاک خارجی مروان کے مقابل آیا اور مروان نے

اس کو شکست دی۔ اسی زمانے میں مضافات یمن میں ابو حمزہ نے علم بغاوت بلند کیا اور ان سب پر مستزاد بنی عباس کی طاقت تھی جو آہستہ آہستہ ادعائے حکومت میں مروان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

عباسی تحریک

سفیران الٰہی کے موقف کا اعلان حضرت علیؑ ابن ابی طالب رسالت مآب کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہونے کے بعد ہی کر چکے تھے کہ ان کی تلوار اگر بلند ہوگی تو صرف تبلیغ اسلام کے لئے، شخصی اقتدار کے لئے خونریزی آپ کا منصب نہیں۔ وہی مسلک تمام آئمہ کا تھا۔ امام حسنؑ اسی کے تحت اقتدار سے دست کش ہو گئے اور امام حسینؑ نے تلوار اٹھائی تو صرف اس لئے کہ یزید سفیانی مذہب کو اسلام کا نام دے رہا تھا جس کے مقابلے پر صحیح اسلام کا پیش کرنا ضروری تھا تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ دمشق میں جس کو اسلام کہا جا رہا ہے وہ جادۂ یزید ہے مسلک، اسلام نہیں ہے۔

امام زین العابدینؑ پھر امام محمد باقرؑ اور اب امام جعفر صادقؑ، سب ہر ظلم و ستم برداشت کرتے رہے مگر انہوں نے کبھی کسی کو تلوار اُٹھانے کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس کے پس پشت بہر طور تسخیر ملک کا نظریہ ملتا تھا جس کے لئے وہ پیدا نہیں ہوئے تھے ان کا مقصدِ حیات تو صرف اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا تھا جو مساعد اور نامساعد حالات میں وہ کر رہے تھے۔

یہی سبب تھا جو امام زین العابدینؑ نے مختارؒ کی سرپرستی قبول نہیں کی تھی اور جب زید شہید اُٹھے تو امام محمد باقرؑ نے سکوت اختیار کر لیا۔ اب ویسا ہی ایک منصوبہ بنی عباس کی طرف سے بنایا گیا تب بھی امام جعفر صادقؑ نے اپنے اقتضائے منصب کا اظہار فرمایا۔

عبداللہ ابن عباس قتل امام حسینؑ کے بعد طائف میں اقامت پذیر ہو گئے تھے آپ کے بیٹے علی بن عبداللہ نے بھی اپنی زندگی اسی طرح گزار دی۔ علی کے بیٹے محمد کو ۱۲۰ھ میں ایسی زندگی سے اکتا کر بنی امیہ کے جور و ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے مدینہ کے قریب "ابوا" میں عمائدین بنی ہاشم کو جمع کیا۔ جن میں عبداللہ المحض

ابن حسن مثنیٰ، ان کے دونوں بیٹے محمد و ابراہیم، ابوالعباس بن محمد، ابوجعفر بن محمد اور ابراہیم بن محمد (عبداللہ ابن عباس کے پوتے) اور ان کے چچا صالح بن علی اور محمد بن علی شامل تھے۔ صالح نے تقریر کی کہ اس طرح کی زندگی کب تک گزاری جائے گی۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم سب کسی ایک کو منتخب کر کے اس کی بیعت کرلیں اور دھیرے دھیرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملاتے رہیں۔

عبداللہ المحض نے اپنے بیٹے "محمد" المعروف بہ نفسِ ذکیہ کو تجویز کیا جو شجاعت و سخاوت حدیث و فقہ، دُور بینی اور دانش مندی میں منفرد تھے۔ جن کی دونوں ہتھیلیوں میں بیضے کے برابر نشان تھے۔ ابوجعفر نے اتفاق کیا اور پورے مجمع نے متفق ہو کر نفس ذکیہ کی بیعت کر لی۔

اس کے بعد امام جعفر صادق کو بلایا گیا۔ آپ نے تمام واقعات سن کر عبداللہ محض سے فرمایا۔

"ابھی مہدی آل محمدؐ کا زمانہ بہت دُور ہے ــــ تم لوگ مظالم سے تنگ آکر فی سبیل اللہ خروج بالسیف کرنا ہی چاہتے ہو تو رئیس قوم اور بزرگِ خاندان تم خود ہو، لوگ تمہارا زیادہ احترام کریں گے"۔

"آپ اپنے ابنِ عم سے جلتے ہیں ــــ" عبداللہ محض نے کسی قدر ترشروئی سے کہا اور امام نے بڑی متانت سے ابوالعباس کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

"یہ خلیفہ ہوگا، اس کے بعد اس کا بھائی، پھر اولاد ــــ تمہارے دونوں بیٹے قتل ہوں گے!"

یہ کہہ کر وہاں سے چل پڑے۔ ابوالعباس اور ابوجعفر پیچھے آئے اور دریافت کیا "کیا آپ نے جو فرمایا ہے، وہ صحیح ہے؟"

"بالکل صحیح ــــ" امام نے جواب دیا اور اُس دن سے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا خاندان آلِ محمدؐ سے کترانے لگا۔

سنہ ۱۰۱ھ میں محمد بن علی شام گئے تاکہ محمد حنفیہ کے پوتے ابوہاشم سے مدد حاصل

کریں جو سلیمان بن عبدالملک کے منہ چڑھے تھے مگر اتفاق سے انہیں دنوں ابو ہاشم کو زہر دے دیا گیا ابو ہاشم کے انتقال کے بعد محمد بن علی نے مشہور کر دیا کہ ابو ہاشم انہیں اپنا خلیفہ بنا گئے ہیں محمد حنفیہ محبان اہل بیت میں حقوق آل محمدؐ کے داعی مشہور تھے۔ اس لئے دمشق اور دوسری جگہوں کے چھپے ہوئے شیعہ ابو ہاشم سے ایک ربط رکھتے تھے اور اس رشتے کے تحت بہت سے لوگوں نے خفیہ طور پر محمد بن علی کی بیعت کر لی۔

محمد بن علی نے ہوش مندی یہ کی کہ ابو عکرمہ سراج کو دو آدمیوں کے ساتھ خراسان روانہ کر دیا اور تاکید کی کہ جس کسی سے بیعت لی جائے، وہ نصرت آل محمدؐ کے لئے۔

یہ خفیہ کارروائی ۱۰۰ھ میں ہشام کے وقت سے شروع کی گئی اور ۱۲۰ھ میں زمانہ ولید تک بڑی احتیاط سے چلتی رہی، پھر محمد بن علی نے سلیمان ابن کثیر اور قحطبہ ابن شبیب کو ایران روانہ کیا اور ان سے بھی یہی کہا کہ حقوق اہل بیت حاصل کرنے کے لئے دعوت جہاد دی جائے۔ اسی زمانے میں محمد بن علی کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے ابراہیم نے باپ کا کام سنبھال لیا۔

جناب زیدؒ اور جناب یحییٰؒ کی شہادتوں نے لوگوں میں ایک فطری اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ لہٰذا ابراہیم کے داعی ابو سلمہ کو کوفہ اور جرجان دونوں مقامات پر کامیابی ہوئی اور لوگ نبی کی عترت کے لئے ایک جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے۔

بنی عباس کا شمار ہر نہج واعتبار سے بنی ہاشم میں ہوتا تھا اور مشق ستم بننے میں سب ایک سطح پر رہے تھے۔ اس سے قبل بنی عباس اور آل رسولؐ کی کوئی تفریق بھی نہ تھی اور اب بھی بنی عباس کا کوئی جداگانہ تصور کسی کے ذہن میں نہ تھا مگر عبداللہ ابن عباس کے پر پوتے شاید دوسرے انداز پر سوچ رہے تھے۔ تاہم انہوں نے دلوں کا کھوٹ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا اور مدد کے لئے عبداللہ ابن جعفر کے پوتے عبداللہ کے پاس پہنچ گئے جنہوں نے عجم سے قومس تک اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔

عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار، حضرت عبداللہ ابن عباس کی اولاد کو اپنے سے مختلف سمجھ بھی نہ سکتے۔ وہ سب کے سب جب ان کے پاس پہنچے تو جعفر طیار

کے پوتے نے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنے لشکر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا مگر ۱۱۹ھ میں جب ہشام کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو عبداللہ کا لشکر ہزیمت یاب ہوا اور آپ چند ساتھیوں کے ساتھ ابومسلم خراسانی کی طرف چل پڑے جو رضائے آلِ محمدؐ کے لئے اُس علاقے میں بیعت کی دعوت دے رہا تھا۔

ہرات میں ابومسلم کے ایک کارندے مالک بن ہیثم نے عبداللہ کو روکا اور ابومسلم کو اطلاع دی۔ ابومسلم نے کسی غلط فہمی یا جان بوجھ کر ان کے قتل کا حکم دے دیا اور مالک بن ہیثم نے اس کی تعمیل کر دی ـــــ ہرات میں ان شہیدوں کے مزار "مقابر سادات" کے نام سے آج تک پائے جاتے ہیں۔

اسی دوران مروان نے ابراہیم کو گرفتار کر لیا اور کچھ دنوں حران میں قید رکھ کر سب کو قتل کرا دیا لیکن اس سے ابومسلم کی پیش قدمی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ قحطبہ نے رے پر قبضہ کر لیا اور حسن و ابوعیون نے امویوں اور خارجیوں کو مار بھگایا پھر نہاوند میں شامیوں کا محاصرہ کر لیا۔

امویوں کی ایک فوج عبداللہ کی سرکردگی میں بالائی عراق سے، دوسری یزید وانسرائے کی ماتحتی میں نہاوند کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ابوعیون نے نہاوند فتح ہوتے ہی عبداللہ کو روک لیا اور قحطبہ فرات عبور کر کے یزید کے سر پہ جا پہنچا۔ دونوں فوجیں امام حسین کی شہادت گاہ کے قریب ایک دوسرے سے متصادم ہوئیں ایک خونریز جنگ کے بعد اموی شکست یاب ہوئے مگر خود قحطبہ بھی مارا گیا یا فرات میں ڈوب گیا اور حسن نے باپ کی جگہ لے لی۔ اس شکست نے مروان کو حواس باختہ کر دیا اور مشتعل ہو کر وہ حماقتوں پر حماقتیں کرنے لگا۔

ابوجعفر، اسمٰعیل، ابوداؤد، صالح، عبدالصمد اور دیگر بنی عباس کوفہ میں ابوسلمہ کے پاس پہنچ کر روپوش ہو گئے تھے۔ حسن کا لشکر پہنچنے کے بعد وہ منظر عام پر آئے۔

بنی عباس کی اس کامیابی میں عترتِ رسول کے نام کی کرامت تھی مگر خود اہلِ شام کے پیدا کردہ عوامل بھی اس میں دخیل تھے اور حقیقت یہ ہے کہ:۔

"عباسیوں کے عروج کا راز اس طرزِ حکومت میں سربستہ ہے جس کی بنا حجاج نے ڈالی تھی اور جو عمرِ ثانی کی سخت کوشش اور جدوجہد کے باوجود شاہانِ اُمیہ سے ترک نہ ہوسکا تھا ـــــ حاکم، محکوم سے بالکل الگ تھلگ رہتے اور طرفہ یہ کہ دونوں کے درمیان کوئی ایسا واسطہ نہ تھا جو ایک کو دوسرے کا ہمدرد بنائے رکھتا۔ قومی تفاخر پر نازاں ہوکر عرب مقامی باشندوں سے کھنچے کھنچے رہتے۔ اسلام کی تعلیم کے باوجود ان کو حقیر سمجھتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ درمیانی فصل بڑھتا رہا اور اسی کش مکش میں اخوت کا رشتہ ٹوٹ گیا۔" (۱۰۴) پھر نفرت کی خلیج بتدریج گہری ہوتی چلی گئی۔

ایسے میں عباسیوں نے اپنی تحریک چلائی جو آلِ فاطمہؑ کے نام پر مقبول ہوتی چلی گئی۔ پھر ابوالعباس اور ابوجعفر نے کہنا شروع کر دیا کہ نبیؐ کی اولاد گوشہ نشین ہوگئی ہے اس نے ہمیں پورے اختیارات دے دیئے ہیں ـــــ تسخیرِ کوفہ کے بعد آلِ رسول کا نام بالکل پیچھے پڑ گیا اور صرف بنی عباس سامنے رہ گئے جو کل خانوادۂ رسالت کے ذیل میں تھے اور آج اپنے کو اوپر لانے میں کوشاں تھے۔

اس تحریک کے دو فعال کردار تھے۔ ایک ابومسلم، دوسرا ابوسلمہ۔ ابومسلم کو بنی عباس نے آلِ محمدؐ کے نام پر شریکِ کار بنایا تھا۔ ابوسلمہ کوفے کا باشندہ تھا مگر اس کا صحیح پتہ نہیں چلتا کہ آلِ محمدؐ کا داعی وہ کیونکر بنا؟ اس کی عالمانہ حیثیت تھی اور وہ عترتِ اطہار کے سوا کسی کا نام بھی نہ لیتا تھا۔ اس لئے تسلط ہوتے ہی اس نے ایک قاصد مدینے روانہ کر دیا اور تین خط اس کے حوالے کئے۔ ایک امام جعفر صادقؑ کے نام، دوسرا عبداللہ محض کو اور تیسرا عمر الاشرف ابن امام زین العابدینؑ کے نام۔ قاصد کو اس نے ہدایت کی کہ اگر امام جعفر صادق قبول فرمالیں تو باقی دو خط نوچ ڈالنا

قاصد نے پہلے ابوسلمہ کا خط امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت نے بغیر کھولے چراغ کی لَو پر رکھ کر جلا دیا اور قاصد سے کہا۔

"اس کا جواب تمہیں کوفے پہنچ کر خود مل جائے گا ـــــ"

قاصد نے وہاں سے نکل کر عبداللہ محض کا خط انہیں پہنچایا۔ عبداللہ اس خط کو لے کر امام کی خدمت میں آئے۔ امامؑ نے نصیحت فرمائی کہ اس سازش میں نہ آئیں۔ قاصد نے تیسرا خط عمرالاشرف کو پہنچایا۔ آپ نے کہا کہ وہ لکھنے والے سے واقف ہی نہیں ہیں تو جواب کیا دیں۔

ابوسلمہ الخلال کی نیت کیا تھی اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن اگلے دن جب جامع مسجد میں اجتماعِ عام ہوا تو ابوسلمہ نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر کہا۔

"ابومسلم، محافظ اہل بیت کی رائے ہے کہ موجودہ لوگوں میں ابوالعباس سے زیادہ عادل، منصف اور لائق آدمی کوئی دوسرا نہیں ہے لہذا انہیں مسندِ خلافت پر بٹھا دیا جائے۔"

عام خیال تھا کہ مخالفت میں آوازیں بلند ہوں گی کیونکہ پوری تحریک آلِ محمد کے نام پر چلائی گئی تھی لیکن اہل کوفہ چڑھتے سورج کے پجاری تھے۔ انہوں نے نعرہ ہائے تکبیر بلند کر دیئے! ابوالعباس کسی مقام پر تیسے کا منتظر تھا۔ اس کو فوراً بلوا لیا گیا اور بیعت شروع ہو گئی ـــــ رسول کے منبر پر اہل ایمان کو کبھی بندر اچھلتے نظر آئے تھے تو ان کی جگہ اب ایک گرگ باراں دیدہ نے لے لی اور ایک خونی باب بند ہونے سے قبل دوسرا خونی باب کھل گیا۔

کوفے والوں کی تلون مزاجی کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ شیعانِ علی تھے ہی کتنے لیکن تحیر خیز ہے ابوسلمہ کی غداری کہ وہ داعی بن کر آیا تھا آلِ محمد کا مگر راتوں رات آتنا یدللکم روز روشن ہوتے ہی رسول کا نام لینے کے بجائے بنو عباس کا کلمہ پڑھنے لگا کوئی مخالف آواز اٹھ جاتی تو وہ اس کی تاویل کرنے پر تیار ہو کر آیا تھا اور یوں بھی اس نے بندوق ابومسلم کے کاندھے پر رکھ کر داغی تھی، ساری عسکری قوت جس کی رہین منت تھی۔

مختصر لفظوں میں اس تحریک کو چار چیزوں نے کامیاب کرایا تھا۔ محمد بن علی کی سازش ابراہیم کے دماغ، ابوسلمہ کی زبان اور ابومسلم کی تلوار۔ ان میں ابومسلم کی تلوار سب پر حاوی تھی مگر وہ کوفے میں موجود نہ تھا۔ حسن بن قحطبہ اس کا نمائندہ تھا جس کو ابوالعباس

نے پہلے ہی توڑ لیا تھا۔

ابوالعباس الفتاح کے لقب سے سریر آرائے خلافت ہوا لیکن اس کی خونخواری کے سبب عوام میں السفاح کہہ کر پکارا گیا اور یہی اس کا لقب پڑ گیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے بعد یہ دوسری سازش تھی جو آلِ محمدؐ کے خلاف کامیاب ہوئی۔ سقیفہ میں بھی آلِ محمدؐ موجود نہ تھے اور کوفے کی جامع مسجد میں بھی نہ وہ پارٹی بنے تھے اور نہ کسی نے ان کی نمائندگی کی اور بنی اُمیہ کے بعد نیابتِ رسولؐ بنی عباس میں منتقل ہوگئی جو بنی اُمیہ کی طرح غاصب تھے اور قطعاً اس کے حقدار نہ تھے۔

بنی اُمیہ کی آخری جنگ

شمال میں صورتِ حال بسرعت بدل رہی تھی۔ ابوعیون، زاب کوچک کے مشرق مروان کے بیٹے پر حملہ آور ہوا اور اس کو زبردست شکست دی۔

اس شکست نے مروان میں پہلی سی مستعدی پیدا کر دی۔ ایک لاکھ بیس ہزار جوانوں کے ساتھ اس نے دریائے دجلہ عبور کیا اور زاب کلاں کی طرف بڑھنے لگا اس اثنا میں ابوعیون کو کوفہ سے کمک پہنچ گئی۔ ابوالعباس سفاح کا ایک چچا عبداللہ بن علی آنے والی فوج کا سربراہ تھا۔ وہ عباسی سپاہ کا سردار مقرر ہوا اور ابوعیون سردارِ اعلیٰ بنایا گیا۔

دریائے زاب کے بائیں کنارے پر بمقام توشاف دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ مروان الحمار کو اپنی شجاعت پر بڑا اعتماد تھا۔ اس نے سرداروں کے منع کرنے کے باوجود دریائے دجلہ پر پُل بنوایا اور پوری فوج کو دریا کے دوسری جانب اتار لایا جہاں دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔

عباسیوں نے شروع ہی سے ماتمی اداکاری کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اپنے پرچموں کا رنگ اور پوشش سیاہ رکھی تھی۔ اس آخری لڑائی میں گھوڑوں کی زینیں اونٹوں کی پاکھریں اور جھولیں بھی سیاہ کر دیں۔ گویا وہ غمِ حسینؑ میں مجسم سوگوار تھے اس ہولناک منظر سے اموی کچھ متوحش ہوئے اور انہوں نے اس کو بدشگونی قرار دیا،

لیکن مروان نے کسی بات کی پرواہ کئے بغیر ہلہ بول دیا۔

یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ عباسیوں کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ ابوعیون نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ گھوڑوں سے اتر کر نیزے زمین پر گاڑ دیں۔ عبدالرحمٰن بن علی نے تقریر کر کے شجاعانِ خراسان کو للکارا اور ان کی رگِ حمیت پر چوٹ لگائی۔ ادھر مروان نے امویوں کو اُبھارا لیکن عباسیوں کے زبردست حملے سے وہ لڑکھڑانے لگے۔

اس دوران مروان استنجے کے لئے ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے گھوڑے کو خالی دیکھ کر شامی دل ہار گئے اور بھاگنے لگے۔ ۱۱ رجمادی الثانی ۱۳۲ھ کو عباسیوں نے شامیوں کی بدقسمتی پر مہر لگا دی۔

مروان پہلے موصل کی طرف فرار ہوا، وہاں سے حران آیا پھر حمص ہوتا ہوا دمشق پہنچا مگر خطرہ پت جھڑ کے سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی طرح اس پر منڈلا رہا تھا۔ عبداللہ بن علی شکاری کتے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دمشق کو غیر محفوظ سمجھ کر مروان نے فلسطین کی راہ سے رومی علاقے کا رُخ کیا کہ شاہِ روم سے مدد کی درخواست کرے مگر رفیقوں نے مصر کا مشورہ دیا اور وہ بالائی مصر کے شہر فیوم کی طرف روانہ ہو گیا۔

عبداللہ بن علی نے اپنے بھائی ابوعیون کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس نے نیل کے مغربی کنارے پر بصیر نامی گاؤں کے چھوٹے سے گرجا میں مروان کو جا لیا اور نیزے کی نوکوں سے چھید کر رکھ دیا۔

مروان جابروں اور ظالموں کی اولاد میں آخری زندہ کردار تھا مگر لائق اور شجاع ترین بادشاہ۔ وہ اپنی بدنصیبی سے حکومتِ بنی اُمیہ کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر گیا اور سیاہ پوش خونیوں کو اپنی جگہ بٹھا گیا جنھوں نے معاویہ کی سیاست اور یزید کی خباثت سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اس کے بعد عبداللہ بن علی نے اتنی کینہ توزی اور جفاشعاری سے کام لیا جس کی نظیر تاریخ میں خال خال ملتی ہے۔ عباسیوں نے نہ صرف زندوں کو جور و ستم کا نشانہ بنایا بلکہ قبروں سے بوسیدہ ہڈیاں نکلوا کر جلوائیں اور راکھ ہوا میں اڑا دی انتقام

کے جوش نے ان کو اندھا کر دیا تھا کہ انسانیت کا لحاظ اور تہذیب کا پاس بھی باقی نہ رہا جہاں کہیں بنی اُمیہ کا کوئی فرد ملتا، وہیں ذبح کر دیا جاتا۔ دُور دراز علاقوں، ویرانوں غاروں اور کھنڈروں میں انہیں تلاش کیا جاتا اور ان کے خون سے تلواروں کی پیاس بجھائی جاتی تھی۔

صوبۂ فلسطین میں دریائے ابو فطرس کے کنارے عبداللہ بن علی نے مروان الحمار کے رشتہ داروں کو معافی کے وعدے پر جمع کیا اور ذرا سی دیر میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔

خوش نصیب تھے بنی اُمیہ کے چند افراد جو بچ کر نکل گئے۔ ان میں ہشام کا ایک پوتہ عبدالرحمٰن بھی تھا جو پہلے مراقش گیا پھر سپانیہ پہنچا وہاں اس کی قسمت نے یاوری کی اور وہ عبدالرحمٰن الداخل کے نام سے اندلس کا حکمران بن گیا۔

اس طرح عباسیوں کے ہاتھوں بنی امیہ کی اکیانوے سال کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور اس کا اتنا خون بہا جتنا انہوں نے بنی ہاشم کا نہ بہایا ہوگا لیکن نجس خون کا دریا بھی اولادِ رسُول کے طاہر خون کے ایک قطرہ کا متبادل نہ ہوسکتا۔

بنی عباس کا یہ جذبۂ انتقام اس لئے نہ تھا کہ بنی اُمیہ دشمنِ اہلِ بیت تھے بلکہ انہوں نے اپنے اقتدار کے لئے ملک امویوں سے خالی کرایا تھا اور مظالم اس لئے ڈھائے تھے کہ عوام میں ان کا رعب دبدبہ قائم ہوجائے ـــــ جہاں تک آلِ محمد کا تعلق ہے، آلِ عباس کے دلوں میں ان کے لئے ہمدردی کا کوئی امکان ہی نہ تھا کیونکہ جس طرح بنی اُمیہ غاصب تھے، اسی طرح وہ خود بھی تو تھے۔ اصل حقدار بنی اُمیہ کی آنکھوں میں بھی کھٹکتے رہے اور اب بنی امیہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بنی عباس کی نظر عترتِ پیغمبرؐ کی طرف اُٹھنا ہی چاہیئے تھی، کیونکہ جھوٹی عزت اس وقت تک استوار نہیں ہوسکتی جب تک حقیقی عزت دار پر کیچڑ نہ اچھالی جائے اور انھیں مطعون نہ کیا جائے کہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کا وقار مجروح ہوجائے۔

میرے ایک سُنّی دوست نے ایک بار مجھ سے کہا۔

"تم لوگ بنی امیہ پر لعنت بھیجتے ہو اور ان کے مظالم پر روتے ہو اور کہتے ہو کہ دشمنِ اہلِ بیت تھے مگر بنی عباس تو بالکل اپنے تھے انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

بات اتنی سامنے کی تھی کہ دل پر چوٹ لگی مگر معترض نے واقعاتی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر اعتراض کیا تھا لہٰذا میں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"غیر تو کوئی نہیں تھا سب ہی اپنے تھے مسئلہ تھا اقتدار کا۔ ہر غاصب اصل حقدار کو کچل کر اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش میں لگا رہا کیونکہ حقدار جب تک زندہ رہتا، زبردستی اور مکر و فریب سے چھینی ہوئی چیز کی واپسی کا مطالبہ زندہ رہتا اس سلسلے میں بنی عباس، بنی اُمیہ اور اس سے پہلے کے لوگ، سب برابر ہیں۔"

بنی عباس نے اہلِ رسولؐ کے نام پر بنی امیہ کا استیصال کر کے حکومت حاصل کی۔ بنی اُمیہ نے امام حسنؑ کی صداقت اور اسلام پسندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر خلافت پر قبضہ کیا اور اس کو شہنشاہیت میں بدل دیا اور نقطۂ آغاز کو دیکھا جائے تو وضع احادیث کے پھندوں میں تختِ خلافت کے پائے جکڑے ہوئے نظر آئیں گے۔

ان سے زیادہ اپنا تو کوئی نہیں تھا جو ہر وقت پیغمبرِ اسلام کے ارد گرد جمع رہتے تھے انہوں نے وقت سے فائدہ اُٹھا کر نبی کی میت کو چھوڑ دیا اور آپ کے قبیلے کی عدم موجودگی میں آپ کی خلافت کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اگر یہ انتخاب تدفین کے بعد ہوتا تو پورا مدینہ اور ہر قبیلہ جمع ہو جاتا اور کسی کو من مانی کا موقع نہ ملتا۔

بظاہر اتنی جلدی کی کوئی وجہ نہیں تھی جو رسول کی خلافت کو تجہیز و تکفین سے زیادہ اہمیت دی گئی بجز اس کے کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ یہ سب کچھ اس منصوبے کے تحت کیا گیا کہ اصل حقدار آنے نہ پائے اور ایک دفعہ حقدار کو محروم کیا گیا تو دیکھا دیکھی معاویہ کی ہمت بھی پڑی اور پھر بنی عباس نے بھی وہی کیا جو سقیفۂ بنی ساعدہ میں ہوا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اوّلیت کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

امام جعفر صادقؑ کے مشاغل

امیرالمومنین حضرت علیؑ اور آپ کے تمام جانشین اپنے وجود سے پیکرِ رشد و ہدایت تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ان کا کام ہی یہ تھا کہ انسان اور انسانیت کی خدمت کریں، خداشناسی اور خودشناسی کے شعور کو بیدار کرتے رہیں اور لوگوں کو اسلام کے صحیح راستے پر لانے کی مساعی کریں۔

امام محمد باقرؑ کو کچھ اطمینان کا وقت مل گیا تھا لہٰذا آپ نے علوم الٰہیہ اور مسائل دینیہ کا کچھ زیادہ کام کیا اور درس گاہِ امامت کے فیوض و برکات کو زائد سے زائد لوگوں تک پہنچایا۔ جن میں اُس دور کے بعض مشاہیر بھی تھے۔

انتشارِ سلطنت نے بنی اُمیہ کو ان کی طرف توجہ کرنے کا وقت نہ دیا اور آپ قدرے سکون سے فرائضِ امامت انجام دیتے رہے۔ یونہی بنی عباس اور بنی اُمیہ کی نبرد آزمائی میں کچھ پُرسکون رہا تھا لہٰذا امام جعفر صادقؑ نے تدریس و تعلیم کو عام کر دیا۔ آپ اپنی علمی بارگاہ میں فقیروں کی شان سے بیٹھتے اور تشنگانِ حدیث و فقہ کو سیراب کرتے رہتے۔

آپ کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے جس میں چند ممتاز نام بھی شامل ہیں۔ جیسے امام ابوحنیفہ، یحییٰ بن سعید انصاری، ابن جریح، شعبہ، ابوعاصم امام مالک بن انس، امام سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ایوب سجستانی اور امام الکیمیا جابر بن حیان طرطوسی، آپ کا علم شش جہات تھا، لہٰذا شاگردوں کے فن کی نوعیتیں بھی مختلف ہوئیں۔ تاہم جو بھی آیا وہ اس بارگاہ سے اپنی صلاحیت کے بقدر دامانِ طلب کو علوم و فنون سے بھر کر نکلا۔ یہ الگ بات ہے کہ دامن بھر جانے کے بعد کسی نے اپنی تہی دامنی کو یاد رکھا اور کوئی اپنی کوتاہ ظرفی کے سبب امامؑ کے مقابلے پر آ گیا پھر بھی استاد و شاگرد کا فرق ہمیشہ باقی رہا۔ حامل علم لدنی کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا تھا جس نے در در کی ٹھوکریں کھا کر اپنے کشکول کو بھرا ہو اور کشکول کی چیزوں میں خالص اور غیر خالص کی تمیز بھی نہ کر سکتا ہو۔

فقہ و حدیث تو امام کے گھر کی باتیں تھیں ان کو لوگوں تک پہنچانا تو آپ کا پیدائشی منصب تھا۔ علم القرآن بھی اسی ذیل میں آتا ہے لیکن دنیا کا کوئی علم ایسا نہیں تھا جس میں آپ کو درجۂ کمال تک دسترس حاصل نہ ہو۔ مادے کا تغیّر و تبدّل، ماہیت افادیت اشیاء، نظام قمری و شمسی طبیعیات و کیمیا، علم جفر، علم الافلاک و نجوم، کائنات سے پہلے اور کائنات کے بعد کا حال، سب کچھ ادراک میں تھا جس سے لوگ استفادہ کرتے اور باہر جاکر عوام کے دلوں پر اپنی قابلیت کا سکّہ بٹھاتے۔

امام کے لئے یہ خوشی کی بات تھی کہ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی عباسی دربار میں امام اعظم بن گئے اور جابر بن حیان طرطوسی کو آپ سے فیض یاب ہونے کی بدولت امام الکیمیا قرار دے دیا گیا۔ بہتے ہوئے دریا سے کوئی کتنا ہی پانی لے لے، اس میں کوئی کمی نہیں آتی۔ دریا بہتا ہی اسی لئے ہے کہ تشنہ انسانوں اور پیاسی زمینوں کو سیراب کرے۔ پھر امام تو اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی رگ ہائے گلو کے خون سے خنجروں کی پیاس بجھاتا رہا۔ آپ بنی نوعِ انسان کو تشنہ کیونکر رکھتے۔

کوئی فلسفی حاضرِ خدمت ہوا تو آپ نے فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی، منطقی کو منطق سے قائل کیا اور دہریئے سے الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کی روشنی میں بحث کی۔ اس سلسلے میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنی گفتگو کا خلاصہ آپ نے مفضل بن عمر الجعفی کو لکھ کر دیا تھا جس کا ذکر بعض علماء نے کیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ: ایک کنزالعلوم

ایک اندازے کے مطابق عراق و شام، کابل، خراسان، ہندوسندھ اور روم و فرنگ کے ساڑھے چار ہزار اصحاب نے آپ سے استفادہ کیا اور اپنے اپنے مقامات پر جاکر لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ان میں سے جو صاحب تصنیف ہیں، انہوں نے اپنی کتابوں میں آپ کا تذکرہ کیا ہے۔

ان لوگوں میں راویانِ حدیث بھی ہیں اور ماہرینِ فنون بھی۔ احادیث میں وہ حدیثیں ہیں جو آپ نے امام محمد باقرؑ اور باقرؑ نے زین العابدینؑ سے اور زین العابدینؑ

نے امام حسنؑ یا امام حسینؑ اور ان دونوں میں سے کسی نے حضرت علیؑ سے اور حضرت علیؑ نے حضور سرورِ کائنات سے سنیں۔ ہمارے نزدیک ایسی ہی حدیثیں معتبر ہیں، بشرطیکہ وہ شخص، جس نے امام جعفر صادقؑ کی زبان سے سُنا، وہ بھی معتبر ہو، جس کا استناد کتبِ رجال سے کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امامؑ نے ایک کتاب علم رمل و جفر پر بھی لکھی تھی۔ علم تشریح الاجسام اور افعال اعضاء کی صراحت تو آپ نے متعدد بار کی اور مفردات میں داؤں کے نام بھی بتائے جس سے اصولِ فطرت پر آپ کی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ علم نجوم اور علم منطق الطیر سے واقفیت آپ کی آفاقیت کی دلیل ہے اور ایسی ہر صلاحیت کو خدائے بخشندہ کی دین کے سوا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

غرضیکہ زندگی کا کوئی شعبہ آپ کی رسائی سے باہر نہ تھا اور معجزات اس پر مستزاد تھے جو عقیدے کی بساط پر آپ کے شخصی فیضان کو مستند کرتے ہیں۔ امامت کی یہ چھٹی منزل پچھلی تمام منزلوں کی ترجمان تھی۔ وقت ملتا تو ان سب سے ایسی ہی برکتیں ظہور پذیر ہوتیں لیکن زمانے نے کسی کو مہلت ہی نہیں دی اور خلافتِ عباسیہ کا استقرار ہوتے ہی آپ کے لئے وہ دَور شروع ہو گیا جس سے علیؑ کی اولاد اب تک دوچار رہی تھی۔

عباسی بساطِ سلطنت

بنی امیہ کے استیصال کلی کے بعد ابوالعباس، عبداللہ بن محمد المعروف بہ سفاح بنی عباس کا پہلا خلیفہ ہوا۔

اس نے اپنی نئی حکومت کا ڈھانچہ اس طرح کھڑا کیا کہ اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو جزیرہ، آذربائیجان اور آرمینیہ کا والی بنایا، اپنے چچا داؤد کو مدینہ منورہ مکہ معظمہ، یمن اور یمامہ سپرد کیا اور اپنے ایک بھتیجے کو کوفہ بھیجا، اور دوسرے چچا کو شام دیا۔ مصر کی حکومت ابوعیون کے سپرد کی، خراسان کی باگ ڈور بدستور ابومسلم کے ہاتھ میں رہنے دی اور فارس کا امیر اپنے بھائی کو بنایا۔

وزارت کے عہدے پر ابو سلمہ حفص بن سلیمان مقرر کیا گیا جو کوفہ کا ایک ذی علم عالی دماغ اور فیاض امیر تھا اور مشہور عباسی داعی بکیر بن ہامان کا داماد تھا۔ دعوتِ انقلاب میں ابو سلمہ نے آلِ محمدؐ کا نعرہ لگایا تھا لیکن جب ابو العباس کی خلافت کے لئے زور ڈالا گیا تو اس نے خاندانِ رسالت سے روگردانی کر لی۔ یہ اتنی بڑی خدمت تھی کہ ابو العباس میں ذرا بھی شرافت ہوتی تو وہ ابو سلمہ کے پاؤں دھو دھو کر پیتا مگر اس کا ایک جرم بھی تھا کہ اس نے امام جعفر صادقؑ کو دعوتِ خلافت دی تھی جس کو ابو العباس معاف نہ کر سکتا۔

ابو مسلم بھی ابو سلمہ کے وزیر ہو جانے سے جل کر کباب ہو گیا تھا لہذا ابو العباس نے اس سے سازش کی اور ایک رات، جب ابو سلمہ محل شاہی سے واپس آ رہا تھا تو ابو مسلم کے آدمیوں نے اس کو قتل کر دیا اور ابو العباس نے قتل کا الزام خارجیوں کے سر رکھ دیا جس کی مثال حضرت معاویہ قائم کر چکے تھے۔

سفاح نے خلافت کی ابتداء تو کوفے سے کی تھی لیکن ۱۳۴ھ میں انبار میں ایک شہر ہاشمیہ آباد کر کے اس کو دار الخلافہ بنا لیا جو بعد میں مدینۃ المنصور کہلایا۔

نئی حکومت کو ابتداءً مسلسل بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن سفاح نے ان پر قابو پا لیا اور چار سال آٹھ ماہ حکومت کر کے ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶ھ بعمر ۳۶ سال انتقال کر گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر تخت نشین ہوا۔

ابو جعفر عبد اللہ بن محمد الملقب بہ منصور

بڑے بھائی کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق منصور بنی عباس کا دوسرا خلیفہ ہوا لیکن عنانِ سلطنت ہاتھوں میں لیتے ہی اس کو اپنے چچا عبد اللہ بن علی کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ سچ یہ ہے کہ عبد اللہ بن علی ان چند آدمیوں میں تھا جن کی محنت، تدبر اور شجاعت سے بنی امیہ کو شکست ہوئی تھی اور ابو العباس نے اس سے وعدہ بھی کیا تھا کہ اس کے بعد عبد اللہ ہی تخت حکومت پر بیٹھے گا مگر اس نے وصیت کر دی منصور کے حق میں، لہذا عبد اللہ میدان میں آ گیا لیکن بھتیجا فراست میں چچا سے آگے تھا، اس

نے اپنے پرانے مُہرے ابومسلم کو بساطِ سیاست پر دھر دیا اور اس کے اشتراک سے نصیبین کے مقام پر عبداللہ کو شکست دے دی، پھر قید میں ڈال دیا اور وہ قید ہی میں مر گیا۔

اس جنگ کے مالِ غنیمت کے سلسلے میں ابومسلم اور منصور کا اختلاف بڑھ گیا۔ اور ابومسلم خراسان میں آزاد حکومت کا منصوبہ بنانے لگا مگر منصور نے حکمت عملی سے رنجش کے غبار کو ابومسلم کے دل سے دھو دیا اور دربار میں اس کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔

ایک دن منصور نے قتل کا منصوبہ بنا کر ابومسلم کو بُلا بھیجا، جب وہ آیا تو اس کی تلوار باہر رکھوالی گئی۔ ابومسلم کچھ سمجھا مگر اس کو یقین نہ آیا کہ اتنی خدمات کے بعد منصور اس طرح کا سلوک اس سے کر سکتا ہے۔ اندر پہنچتے ہی منصور نے اس سے تلخ کلامی شروع کر دی، اندر چھُپے ہوئے آدمی اچانک ابومسلم پر ٹوٹ پڑے اور اس کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔

ابومسلم کے قتل کی خبر جب باہر پہنچی اور اس کے ہمراہیوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے محل کو گھیر لیا۔ منصور نے بالاخانے پر کھڑے ہو کر اعلان کرایا کہ "وہ تو مارا جا چکا، اب تم اپنی جانیں کیوں دیتے ہو؟" اس کے ساتھ ہی اس نے سونے کی مہریں ان لوگوں میں پھنکوا دیں۔ یہ جادو چل گیا اور وہ لوگ مہریں لے کر وہاں سے چلے گئے۔

اب منصور کے راستے کا ہر کانٹا صاف ہو گیا تھا مگر ایک بات اس کو ہر وقت کھٹکتی رہتی کہ اس نے تحریک شروع کرنے کے لئے محمد بن عبداللہ، نفس ذکیہ کی بیعت کی تھی۔ منصور کو ڈر لگا رہتا کہ کہیں عبداللہ محض اس کے مقابلے کے لئے اُٹھ نہ کھڑے ہوں مگر وہ فی الفور اس طرف توجہ نہ کر سکا، کیونکہ ابومسلم کے انجام کی خبر سن کر اس کے پیروؤں نے خراسان میں علم بغاوت بلند کر دیا تھا مگر وہ جلد ہی شکست یاب ہو کر تتر بتر ہو گئے۔

"ابومسلم کے مرید اسے امام وقت سمجھتے تھے جس کی موت پر وہ دو فرقوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک کہتا تھا، وہ زندہ ہے اور عنقریب دُنیا میں ظاہر ہو کر عدل و انصاف کا دور قائم کرے گا اور دوسرے نے موت

کا قائل ہو کر اس کی بیٹی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اسی زمانے میں راوندیوں نے، جو خلفائے عباسیہ کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے، ہاشمیہ میں بغاوت کر دی اور منصور کی زندگی واقعی خطرے میں پڑ گئی ـــــ یہ بغاوت فرو کی گئی، جاہل اور وہمی لوگ شہر بدر کئے گئے، راوندی منصور کو خدا اور اس کے اردلیوں کو بمنزلہ جبرئیل سمجھتے تھے۔" (۱۰۵)

ان مشرکانہ عقائد میں منصور کی ہمت افزائی کو شامل تصوّر کیا گیا اور دین دار مسلمان منصور کے دشمن ہو گئے۔ مگر وہ بہت زیرک حکمراں تھا، اس نے صلح و آشتی سے اس آگ کو فرد کر دیا ـــــ ہوشیار اور چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بخیل اور دانہ زو تھا، اس لئے بڑے بھائی سفاح کی طرح دوانیقی کہلایا اور اسی خصوصیت کے ساتھ مشہور ہو گیا۔

اسی زمانے میں قیصر روم کا حملہ ہوا۔ منصور نے اس کو پسپا کر کے سات سال کے لئے صلح کر لی۔

پھر طبرستان کی پہاڑیوں میں کچھ سردار مسلم علاقوں پر حملہ آور ہوئے انہیں بھی شکست دی گئی اور بعض دوسرے علاقوں میں تسلط حاصل کیا گیا، ان تمام کاموں سے فراغت پا کر منصور نے مدینے کی طرف دیکھا۔

مدینہ کبھی ریگزار عرب میں سب سے بارونق شہر تھا۔ حضور ختمی مرتبت کے عہد میں تو عظمت و سطوت کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب کے انسان تو آتے ہی تھے، عرش سے فرشتے بھی نازل ہوتے۔ اس کے بعد تسخیری مہمات شروع ہوئیں تو دوسرے ملکوں کی سفارتیں آنے لگیں، البتہ درمیانی چار پانچ سال تک اس شہر کی چہل پہل کچھ کم رہی۔ جب حضرت علیؑ نے امیر شام کا مقابلہ کرنے کے لئے کوفے کو مرکز خلافت بنا لیا تھا مگر اس کے بعد پھر سابقہ صورت حال پیدا ہو گئی۔

پھر مدینہ اس وقت سے اُجڑ گیا جب سے امام حسینؑ نے اس کو خیرباد کہا اور

فاطمہ زہرا کی اولاد عراق و شام میں بکھر گئی۔ مسلم بن عقبہ کی تلوار نے اس کو اس طرح تاراج کیا کہ اس کی ویرانی برسوں تک دُور نہ ہو سکی۔ وقت کے تھوڑے فصل سے حجاج بن یوسف کی شقاوت نے اہل مدینہ میں جینے کا حوصلہ بھی ختم کر دیا۔ اب وہ جہالت کے ریگزار میں علوم کا واحد نخلستان تھا، تقدس اس کے ذرے ذرے میں رچا بسا تھا مگر آج کی اصطلاح میں جس کو شہرت کہتے ہیں وہ مدینے میں پائی نہ جاتی۔

اب تو یہ شہر صرف سطوتِ ماضی کی ایک یادگار رہ گیا تھا جس میں آخری نبی مرسل کی اولاد اپنی خاموش زندگیوں میں فریضۂ ہدایت انجام دے رہی تھی۔ ابوبکر و عمر کے پوتے پرپوتے دنیا سے الگ تھلگ ایک طرح گوشہ نشینی میں بسر کر رہے تھے۔ انہیں میں زبیری نسل کے باقیات بھی تھے اور دیگر اصحابِ رسُول اور برگزیدہ تابعین بھی۔ جن کو مدینے کے در و دیوار کی محبت نے جدی وطن کی طرف واپس نہ ہونے دیا تھا۔

ان لوگوں کا اقتدار سے کوئی واسطہ نہ تھا اور وہ کوئی سروکار رکھنا بھی نہ چاہتے مگر نہ جانے کیا خطرات لاحق رہتے، حکومتوں کو ان عزلت گزینوں سے کہ اموی دور میں بھی انہیں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور اب انھیں میں سے ایک خاندان نے آلِ رسُول کے نام کے سہارے حکومت حاصل کر لی تھی تو وہ بھی ان سب کا دشمن بنا ہوا تھا۔

ظلم و جور کا ایک نیا دور

بنی عباس کے دوسرے خلیفہ دوانیقی نے اس دشمنی کا باقاعدہ آغاز ۱۴۲ھ سے کیا اور عزم محکم کے ساتھ مکے کی طرف روانہ ہوا ــــــ زیدؑ شہید کی شہادت کے بعد اولادِ حسنؑ شہر واسط میں آباد ہو گئی تھی، منصور نے دورانِ سفر ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے اور مختلف قسم کی تکالیف پہنچا پہنچا کر قتل کیا۔ بعض کو جلتی آگ میں ڈلوا دیا۔ بعض کو دریا میں ڈبو دیا اور اکثریت کو تہہ تیغ کر دیا۔

پھر وہ مکے ہوتا ہوا مدینے پہنچا اور اولادِ حسنؑ کی اکثریت کو گرفتار کر لیا۔ عبداللہ محض کے دونوں بیٹے روپوش ہو گئے وہ جانتے تھے کہ منصور انہیں کی فکر میں ہے کیونکہ اس نے شروع میں نفسِ ذکیہ کی بیعت کی تھی۔

یہ لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپتے چھپاتے ساحل عرب پر پہنچے، عدن میں چند روز قیام کرکے ہندوستان کے عازم ہوئے مگر سندھ میں بھی اطمینان کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو خفیہ طریقے سے مدینے آگئے۔ اس سے قبل امام حسنؑ کی اولاد گرفتار ہو کر جا چکی تھی۔

بغداد کا محل تعمیر ہو رہا تھا کہ اسیروں کا قافلہ مدینے سے گزرا۔ اسی پچاس سال قبل ایک قافلہ کربلا سے کوفہ لایا گیا تھا۔ یہ دوسرا قافلہ تھا جو اسی انداز پر مدینے سے بغداد جا رہا تھا: تمام قیدی رسن بستہ، بعض طوق و زنجیر پہنے ہوئے، اونٹوں کی ننگی پیٹھوں پر سوار، باب جبرئیل سے گزرے تو امام جعفر صادقؑ نے ان کو دور سے دیکھا اور فرمایا:۔

"میں ان غریبوں کی نصرت ضرور کرتا لیکن قضا و قدر سے مجبور ہوں!"

قافلے میں بوڑھے بھی تھے، جوان اور بچے بھی، ربذہ کے مقام پر منصور نے بوڑھے محمد دیباج کو طلب کیا جو ابراہیم کے خسر تھے اور ان سے پوچھا کہ ابراہیم کہاں ہے؟ مگر انھیں معلوم ہی نہیں تھا، بتاتے کیا؟ جس کے نتیجے میں ان پر اتنے کوڑے برسائے گئے کہ سر سے پیر تک لہولہان ہو گئے اور ان کا خوبصورت چہرہ پہچانا نہ جا سکتا۔

شرافت و نجابت کے پیکر، فضیلت و کمال کے مجسمے، صورت و سیرت کے مرقعے فرط شرم سے گردنیں جھکائے، منصور کے فوجی قافلے کے گھیرے میں، بغداد کی سمت بڑھتے رہے۔ ایک دن نفس ذکیہ و ابراہیم بھیس بدل کر عبداللہ محض سے آکر ملے تو آپ نے بیٹوں کو آخری نصیحت کی۔

"عزت کی زندگی میسر نہیں آتی تو عزت کی موت سے تو تمہیں کوئی روک نہیں سکتا!"

دونوں بیٹے باپ کو آخری سلام کرکے چلے گئے اور پھر چار سال بعد مدینے آئے اور وہاں اپنی بیعت لینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بے دینی سے اکتائے ہوئے اہل مدینہ کب سے ظالموں کے حق میں بد دعا کر رہے تھے انہوں نے بھی مقدس محمد بن عبداللہ کی حمایت کا اعلان کر دیا اور حریت کی ایک نئی لہر سوتے ہوئے مسلمانوں میں بیدار ہو گئی۔

اسیروں کا قافلہ ہاشمیہ کے تنگ و تاریک قید خانے میں پہنچا دیا گیا جہاں اوقات

نماز کا بھی اندازہ نہ ہوتا لہذا قیدیوں نے تلاوت کے دورانیہ کو پانچ ایسے حصوں میں تقسیم کرلیا تھا جس سے فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کا اندازہ ہوسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ قیدیوں کو منصور نے رہا کر دیا تھا، سلیمان و عبداللہ پسران داؤد بن حسن مثنیٰ، موسیٰ بن عبداللہ محض، حسن بن جعفر باقی اسی زندان میں مرگئے۔ کسی پر چھت گر گئی، کوئی کنوئیں میں گر پڑا، کوئی باہر لاکر محل بغداد کی دیوار میں چن دیا گیا اور اکثر اس زہریلی تعفن سے مرگئے جو غلاظت اور لاشوں کے سڑنے سے قید خانے میں پیدا ہوئی تھی۔

نفس ذکیہ

آخر محمد بن عبداللہ محض نفس ذکیہ نے مکے سے یمن تک اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور ابراہیم نے بصرہ پہنچ کر نعرۂ جہاد بلند کیا تو ہزاروں آدمی ان کے علم کے نیچے جمع ہوگئے ـــــــ نفس ذکیہ کا منصوبہ تھا کہ ابراہیم اپنے لشکر کے ساتھ آجائیں تو دونوں مل کر کوفہ کی طرف مراجعت کریں لیکن ابھی ابراہیم پہنچنے نہ پائے تھے کہ دوانیقی لشکر مدینہ آپہنچا۔ عیسیٰ بن موسیٰ سپہ سالار تھا۔ اس نے حملے سے پہلے نفس ذکیہ کے سرداروں سے سازش کی، انہیں لالچ دے کر توڑ لیا اور محمد کے ساتھ صرف تین سو آدمی رہ گئے۔

دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ محمد اپنے سرفروشوں کو لے کر کسی طرح میدان سے نکل جاتے لیکن علیؑ کے پوتے نے پیٹھ دکھانا موجب ننگ سمجھا اور اس مختصر سی تعداد کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ دنیا نے ایک بار پھر اکثریت اور اقلیت کی ہولناک جنگ کا منظر دیکھا۔ اقلیت نے لاشوں کے انبار لگا دیئے مگر تا کجے؟ نفس ذکیہ کا ایک ایک ساتھی کم ہوتا چلا گیا اور آخر وہ خود بھی پشت پر حمید بن قحطبہ کے نیزے کے وار سے گر گئے اور ۱۴ رمضان ۱۴۵ھ کو ۲۵ سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

آپ کی لاش صلیب پر لٹکا دی گئی جس کو بعد میں مدینے کی ایک عورت نے عیسیٰ سے اجازت لے کر دفن کر دیا۔

عیسیٰ نے اولادِ علیؑ کی تمام جائیدادیں ضبط کرلیں۔ امام جعفر صادقؑ اپنے علاقے فرع میں تھے وہ بھی اس ظلم سے نہ بچ سکے۔

پھر عیسیٰ نے سادات اور اصحابِ رسولؐ کا قتلِ عام کیا اور جدھر سے گزرا، خون کی ایک لکیر کھینچتا چلا گیا۔

منصور کو جب نفسِ ذکیہ کا سر ملا تو اس نے قید خانے میں عبداللہ محض کے پاس بھجوا دیا۔ عبداللہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس سے فارغ ہوکر آپ نے بیٹے کا سر اُٹھاکر سینے سے لگایا اور کہا۔

"تقویٰ نے تم کو گناہوں سے محفوظ رکھا اور تلوار نے ذلت سے بچالیا ____"

اس کے ساتھ ہی عبداللہ نے ایک سرد آہ کھینچی اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔

ابراہیم بن عبداللہ محض

بھائی کی قبل از وقت شہادت سے ابراہیم کے ہاتھ کٹ گئے تاہم انہوں نے کئی بار منصور کی فوجوں کو شکست دی بلکہ اس حد تک عباسیوں کو ہراساں کردیا کہ منصور نے کوفے کی طرف بھاگ جانے کا ارادہ کرلیا، پھر بڑی مایوسی کے ساتھ اس نے عیسیٰ کو ثابت قدم رہنے کی تاکید کی۔

دریائے فرات کے کنارے ایک خونریز معرکے میں عباسی لشکر نقصان اُٹھاکر پسپا ہوگیا مگر ابراہیم نے سیرتِ علیؑ کے پیشِ نظر منفرورین کا بھاگنے میں قتل نہیں کیا جس کے نتیجے میں تھوڑی دُور جاکر وہ پھر جمع ہوگئے۔ کچھ لوگ زخمیوں کے درمیان بن کر لیٹ رہے تھے۔ بھاگنے والے جب پلٹ کر آئے تو وہ بھی اُٹھ کر کھڑے ہوگئے اور ایک مرتبہ پھر گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔

ابراہیم جیتی ہوئی جنگ پھر جیت لیتے مگر قضا و قدر پر کسی کا اختیار نہیں چلتا ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور ابراہیم کے لگا۔ عین اسی وقت تلوار کا وار ہوا اور ابراہیم گر گئے جس کے بعد فوج تتر بتر ہوگئی۔

۲۵ ذی قعدہ ۱۴۵ھ کے بعد منصور نے بصرے کا بھی وہی حال کیا جو مدینے

کا گیا تھا بلکہ بصرے میں جانی اور مالی نقصانات کچھ زیادہ ہی ہوئے۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے نفس ذکیہ کے حق میں فتاوے دیئے تھے۔ انھیں کوڑے لگائے گئے پھر امام ابوحنیفہ سے منصور کا سمجھوتہ ہو گیا۔ انہیں علماء کی صف میں درجہ اوّل دیا گیا اور امام اعظم کے لقب سے نوازا گیا ـــــــ یہ پہلا دَور ہے جس میں فاطمہ زہرا کی اولاد کے علاوہ کسی نے اپنے کو امام کہا، اور پھر اسی زمانے میں تین امام ہو گئے۔ امام اعظم، امام مالک، امام سفیان ثوری ـــــــ اس طرح منصور پہلا فرمانروا تھا جس نے لفظِ امام کو وسیع المعنیٰ بنا دیا۔

منصور کی ستم آفرینی

شیعانِ علیؑ کے قتل کی شروعات یقیناً حضرت معاویہ کا نتیجۂ فکر ہیں لیکن سادات کشی میں منصور نے ان کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صلح حسنؑ کے بعد وہ تقیہ میں چلے گئے تھے اور بنی امیہ کو خبر نہ ہو سکی کہ کون کہاں چھپا ہے مگر منصور خود بھی گھر کا بھیدی تھا، پھر بنی عباس ذاتی طور پر ایک ایک کو جانتے تھے لہذا ان کی گرفتاریوں میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی اور روز صبح ڈیر شام فاطمہؑ کے نونہال پکڑ پکڑ کر لائے جانے لگے اور قتل ہوتے رہے۔

ابراہیم کی جنگ میں منصور کو اپنی تباہی کا یقین ہو گیا تھا لہذا اس سے فارغ ہوتے ہی اس نے تہیہ کر لیا کہ اس نسل کا ایک متنفس بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔

قتلِ سادات کے لئے اس نے قصر الحمرا کو مختص کر لیا۔ وہاں آ بیٹھتا۔ قیدی ایک ایک کر کے لائے جاتے اور وہ کسی کو صفائی کا موقع دیئے بغیر قتل کرا دیتا ـــــــ ان کا یہ قصور اس کے نزدیک کچھ کم تو نہ تھا کہ وہ علیؑ کی اولاد تھے!

منصور نے صرف سامنے کے لوگوں کو گرفتار کرانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ سادات کے لئے پورے ملک میں مخبروں کا جال بچھا دیا، جن کا کام ہی صرف محبانِ اہلِ بیت اور سادات کا سراغ لگانا تھا۔ کمسن بچوں کو عموماً بغداد کی دیواروں میں چنوا دیتا، جوان اور بوڑھے قید کی صعوبتوں سے بچ جاتے تو انہیں قتل کرا دیتا۔ مورخین نے اس

کی تفاصیل تحریر کی ہیں جن میں صرف حسنی سادات کی فہرست سیکڑوں میں ہے

علی الشدید کو قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ اسی عالم میں انتقال ہوا۔

محمد الطحائی بحرین چلے گئے تھے، جاسوسوں نے وہیں جاکر قتل کیا۔

حمزہ اصغر طبرستان میں شہید کر دیئے گئے۔

علی بن عبدالرحمٰن رے میں تہہ تیغ کئے گئے۔

حسن داعی صغیر اہل میں مارے گئے۔

زین بن عبداللہ مظالم سے پریشان ہوکر اہواز چلے گئے تھے، وہیں شہید ہوئے۔

محمد بن عبداللہ نیشاپور میں گرفتار کئے گئے، قید خانے میں وفات پائی۔

حسن بن اسحٰق ارضِ مغرب میں قتل کئے گئے۔

جعفر کوکبی اور محمد بن جعفر مازندران میں ابن لیث کے ہاتھوں مارے گئے۔

احمد بن محمد اہل و عیال سمیت بخارا چلے گئے تھے، وہاں گمنامی کی موت مر گئے۔

ابراہیم بن حسن مثنیٰ بغداد میں قتل ہوئے۔

حسن مثلث نے زندانِ ہاشمیہ میں انتقال کیا۔

یحییٰ صاحب دیلم کو ہارون کے حکم سے زہر دیا گیا۔

عبداللہ اشتر کابل چلے گئے تھے۔ مخبروں نے وہیں قتل کیا۔

علی الزاہد فخ میں شہید کئے گئے۔

امیر عبداللہ کئی سال قید رہ کر انتقال کر گئے۔

علی بن حسن مثلث کا قید خانے میں انتقال ہوا۔

یحییٰ صاحب دیلم کے چار بیٹوں کو کال کوٹھری میں دھواں بھر کر مارا گیا۔

سلیمان بن عبداللہ محض بھی صاحب فخ کے ساتھ شہید کئے گئے۔

حسن بن اسمٰعیل دیباج بائیس سال قید میں رکھ کر قتل کئے گئے۔

بے شمار نام ہیں جن کا پتہ چل گیا ہے۔ ہزاروں سیدوں کی عمریں قید خانوں میں کٹ گئیں، جن کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ ہزاروں مصر، افریقہ، شام، ترکستان

ایران، افغانستان، ہند، سندھ اور دوسرے ملکوں میں ترک وطن کر گئے، جن کی قبور جابجا پائی جاتی ہیں مگر خاندانوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کتنا بھیانک نتیجہ ہے دوزخی منصور کے اس ظلم وستم کا کہ سادات جلاوطن ہو کر مر گئے تو مر گئے لیکن ان کے پسماندگان کی نسلیں کن کن ناموں سے پکاری گئیں اور اکثر تو اپنے بچوں کو بتا بھی نہ سکے کہ وہ فاطمہ کی اولاد میں ہیں۔

منصور کے دست ستم سے بچ کر نکل جانے والوں میں عبداللہ محض کے پوتے ادریس بھی تھے جنھوں نے مراقش میں ادریسی حکومت کی بنیاد رکھی مگر منصور کے جاسوسوں نے انہیں زہر دے کر شہید کر دیا۔

شہید ہونے والوں میں بعض شہزادوں کے حالات اتنے دردناک ہیں کہ منصور دوانیقی کے سامنے شمر ذی الجوشن اور حرملہ بن کاہل کی شقاوت ماند پڑ جاتی ہے ان میں علی بن محمد بن حسن دیباج، عباس بن حسن کے واقعات ہیں۔ سدیف بن میمون شاعر اہلبیت کو زندہ دفن کر دیا گیا بغرض کہ مظالم کی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جس کو عبداللہ ابن عباس کے پوتے منصور دوانیقی نے استعمال نہ کیا ہو۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ علیؑ و فاطمہؑ کا نام لیوا روئے زمین پر باقی نہ رہے اور کوئی بنی عباس کو غاصبِ خلافت نہ کہہ سکے۔

اس کوشش میں اسے کامیابی ہوئی۔ حجاز، عراق، شام اور دُور دُور تک کوئی یہ کہنے والا نہ رہا کہ میں علیؑ کا وارث ہوں، میں فاطمہؑ کی اولاد ہوں، خلافت میرا حق ہے۔ کچھ لوگ جو بچے تھے وہ تقیہ میں گمنام ہو گئے۔ ان میں سے اکثر ایک نسل کے بعد دوسرے خاندان میں شامل ہو گئے۔ مدینے میں امام جعفر صادقؑ اور چند نفوس باقی تھے لیکن کربلا کا تصور منصور کے جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا تھا، کیونکہ گئے گزرے حالات میں بھی علیؑ کے سجادہ زہد کا وارث عالم اسلام میں جانا پہچانا جاتا تھا لہذا امام کے خلاف تلوار اٹھانے کی ہمت بزدل منصور میں نہ تھی۔ کسی اور طریقے سے وہ چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر میں تھا جس کے راستے سوچتا رہتا تھا۔

ان واقعات کے بعد امام حسنؑ کی کثرت ازدواج کا فلسفہ شاید مخالفین کی سمجھ میں بھی آجائے اور وہ ہمیں اس الزام سے بھی بری کردیں کہ آلِ محمدؐ کے متعلق جو حدیثیں ہیں، ان میں ہمارا بھی ہاتھ ہے، ہم تو کہیں سنتے ہی نہیں اور اپنے کو ظاہر ہی نہ کرسکتے تو زبان کھولنے کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے لیکن انصاف کی اُمید کس سے کریں، پہلے بھی ہمیں سیکڑوں برسوں تک بے گناہی کی سزا ملتی رہی اور آج بھی ہماری حق گوئی کو جھوٹ کہا جاتا ہے۔

امام ظالم کے دربار میں

"ابوجعفر نیکی اور بدی کا عجیب مجموعہ تھا. سیاست داں، مدّبر اور بادشاہ ہونے کی حیثیت سے بے مثل و بے نظیر تھا. رعایا کی ہمدردی اور دُوراندیشی میں بھی وہ کسی سے کم نہ تھا۔ اپنے فرزندوں سے کمال محبت رکھتا تھا. باوجود ان اوصاف کے وہ سخت دغاباز اور انسانی زندگی کی کچھ پرواہ نہ کرنے والا تھا. سفاح کے مظالم انتقام کے جوش میں سرزد ہوتے تھے مگر اس کے جانشین کے مظالم کمال غور و تامل اور جوڑ توڑ کا نتیجہ تھے۔ وہ کسی ایسے آدمی کو زندہ نہ چھوڑتا جس پر اسے خفیف سا بھی شک ہو جاتا. خلیفہ علیؑ کی اولاد سے اس کے سلوک نے عباسی تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر دیا ہے" (۱۰۶)

جسٹس امیر علی نے منصور پر ایک مسلم حکمراں کی حیثیت سے تبصرہ کیا ہے۔ وہ یہ بھول گئے کہ منصور نے جس کی نسل کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی، حکومت اسی کے نام سے حاصل کی تھی اور مسلمانوں نے صرف حضورؐ کی نسبت سے عباسیوں کا ساتھ دیا تھا۔ منصور صرف احسان فراموش ہی نہیں تھا محسن کش بھی تھا اور اب وہ پیغمبرؐ کے راست جانشین کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

ایک مرتبہ اس نے ربذہ کے قیام میں امام جعفر صادقؑ کو طلب فرمایا تھا مگر قتل کرا دینے کا حوصلہ نہ کرسکا، دوبارہ پھر طلب کیا لیکن ڈر گیا، تیسری بار ابومسلم

کی طرح قتل کا منصوبہ بنایا مگر جیسے ہی امامؑ پر نظر پڑی تعظیم کے لئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حاجب نے امامؑ کے جانے کے بعد قتل نہ کرنے کا سبب پوچھا تو بولا: "امامؑ کے عقب میں ایک اژدھا آ رہا تھا۔ میں قتل کرتا تو وہ مجھے کھا جاتا۔" چوتھی طلبی پر امامؑ کے آتے ہی قصر میں زلزلے کے آثار پیدا ہو گئے اور منصور سہم کر آپ سے کہنے لگا۔

"کوئی حاجت ہو تو بیان فرمایئے ــــــ"

"مجھے بار بار بلایا نہ کرو"۔ امام نے جواب دیا اور واپس ہو گئے ــــــ مگر منصور باز نہ آیا اور پھر بُلا بھیجا۔ اب کی اس نے کہا کہ فلاں نے آپ کی شکایت کی تھی۔ امامؑ نے اس شخص کو بلوایا اور اس نے امامؑ کے روبرو آپ پر تہمت رکھ دی۔ امام نے اس کی طرف دیکھا اور وہ گر کر واصلِ جہنم ہو گیا۔

اب کی منصور نے چند فرضی خطوط امام کی طرف سے تیار کرا کے رکھے اور جب آپ پکڑ کر لائے گئے تو خطوط آپ کے سامنے ڈال دیئے۔ امامؑ نے فرمایا۔

"ہم نے بنی اُمیہ کے خلاف ایسا اقدام نہیں کیا تو اب کیا کرتے ــــــ!"

منصور نرم پڑ گیا اور آپ کے جانے کے بعد بتایا کہ رسُول اللہؐ غضب کے عالم میں نظر آتے تھے، میں ان سے ڈر گیا۔

اس طرح سات مرتبہ اس نابکار نے امام جعفر صادقؑ کو زحمت سفر دی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو زچ ہو کر اس نے آپ کے مکان میں آگ لگوا دی۔ منصور کے خوف سے اب لوگوں نے امامؑ کی خدمت میں حاضری بہت کم کر دی تھی۔ تاہم آپ کا درسِ ہدایت جاری تھا۔ آگ لگنے پر اصحاب اُٹھے۔ آگ بجھانے کی کوشش کی مگر شعلے بھڑکتے رہے۔ آخر آپ خود تشریف لائے۔ عبا کے دامن کو شعلوں کے رُخ پر کئی بار جھٹکا دیا، ایک دعا پڑھی اور شعلے بجھ گئے۔

پھر منصور نے کئی دوسری شاطرانہ چالیں چلیں کہ کسی طرح آپ کو ماخوذ کرے لیکن ہر وار خالی گیا۔

منصور کے لئے آپ کا تبحرِ فقہی و علمی بھی قابلِ برداشت نہ تھا۔ اس لئے

مقابلے کے لئے علماء کی ایک جماعت پال رکھی تھی ، حضرت ابوحنیفہ کو امام اعظم اور عالمِ دہر کا خطاب دیا تھا اور اپنی مملکت میں اعلان کرایا تھا کہ جو امام جعفر صادقؑ سے فتویٰ پوچھے گا، اسے ایک مہر طلائی جرمانہ ادا کرنا پڑے گا اور جو امام ابوحنیفہ سے رجوع کرے گا، اس کو ایک مہر انعام دیا جائے گا۔ نتیجے میں امام ابوحنیفہ کے دروازے پر ہجوم لگا رہتا۔ تاہم امامؑ کی درس گاہ مدینے میں سُونی نہیں رہی مختلف حیلوں اور بہانوں سے لوگ آتے رہتے اور بارہا لوگوں نے جرمانے بھی ادا کئے۔

امامؑ کی وفات

بے غیرت بادشاہ کا یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا تو جھلا کر اس نے معاویہ کا مجرب نسخہ استعمال کر ڈالا اور آپ کو زہر دلوا دیا، جس سے ۱۵ شوال ۱۴۸ھ کو ۶۵ سال کی عمر میں آپ کی شہادت واقع ہوگئی۔

پس ماندگان میں آپ نے مختلف بیویوں سے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں امام موسیٰ کاظمؑ، عبداللہ، اسحٰق، محمد، عباس اور علی، اُم فروہ، اسماء اور فاطمہ آپ کے سب سے بڑے بیٹے جناب اسمٰعیل تھے مگر وہ امام جعفر صادقؑ کے حین حیات انتقال فرما گئے تھے۔

جناب اسمٰعیل کے بیٹے محمد نے ادعائے امامت کیا۔ فاطمین مصر محمد بن اسمٰعیل کی اولاد میں ہیں جنہوں نے عباسی خلافت کے زوال پر مصر میں خلافت قائم کی۔ ان کا سلسلہ امام جعفر صادقؑ تک شیعوں سے ملتا ہے۔ اس کے بعد وہ امام موسیٰ کاظمؑ کے بجائے محمد بن اسمٰعیلؒ کی امامت کے قائل ہیں اور یا سلسلہ عبداللہ الرضیٰ احمد الوفی حسین التقی، عبیداللہ المہدی کو امام مانتے ہیں۔

ابو محمد عبیداللہ المہدی باللہ فاطمی خلافت کے بانی ہوئے اور آپ کے بعد القاسم محمد نزار قائم بامر اللہ، ابو طاہر منصور باللہ، ابو تمیم معز لدین اللہ، ابو منصور نزار عزیز باللہ، ابو علی منصور بامر اللہ، ابو الحسن علی ظاہر لاعزاز دین اللہ، ابو تمیم معد مستنصر بامر اللہ، ابو القاسم احمد مستعلی باللہ، ابو علی منصور امر باحکام اللہ، عبدالمجید

میمون حافظ لدین اللہ، ابومنصور اسمٰعیل ظافر بامر اللہ، ابوالقاسم فائز بنصر اللہ ابومحمد عبداللہ عاضد لدین اللہ، بالترتیب خلیفہ ہوئے جو فرقہ بواہیر کے پیشوا ہیں۔

صلاح الدین ایوبی نے جب خلافتِ فاطمین کو ختم کیا تو سلجوقی دور میں حسن بن صباح ایک بزرگ نے احیاء خلافت کی کوشش کی جن کو تاریخ نے شیخ الجبال کے نام سے یاد کیا ہے۔ ان کا مسلک شیعوں سے جدا ہے کیونکہ اس میں اسلام کے ساتھ عیسائیت اور مانی و مزدک کے فلسفے کی آمیزش کر دی گئی ہے۔ آغا خان حسن بن صباح کی اولاد میں ہیں اور آغا خانی خوجوں کے عقیدے میں حاضر امام ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ امام مہدی بھی اسی سلسلے میں پیدا ہوں گے۔

ساتویں امام

امیر المومنین حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

۱۵ شوال ۱۲۸ھ تا ۲۵ رجب ۱۸۳ھ

سید صبیر رضا

امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سجادۂ امامت پر رونق افروز ہوئے۔ گستاخ پر احسان کرنے والے، غصے کو پی جانے والے، حلیم بُردبار اور ظالم کو معاف کر دینے پر قادر تھے۔ ہمارے ساتویں امام، اسی لئے کاظم کہلائے اور یہ لفظ آپ کے نام کا جزو بن گیا۔

آپ کی ولادت ۷ صفر ۱۲۸ھ کو "ابوا" نزد مدینہ میں ہوئی۔ شان پیدائش دیگر آئمہ کی طرح تھی، رُخ آسمان کی طرف، کلمہ شہادتین زبان پر، انداز و اطوار سے منصوص من اللہ، مختون و ناف بریدہ متولد ہوئے۔

بنی امیہ کے اقتدار کا چراغ بجھ رہا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا جس کی روشنی نامانوس نہ تھی مگر جس کی شعاعوں سے خونِ سادات کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے آنکھ کھول کر پدر عالی مقام کی بے چارگی کو دیکھا اور اس ماحول پر بھی نظر ڈالی جس پر یاس و ہراس کے بادل چھائے ہوئے تھے ـــــ سب کچھ جانا بوجھا تھا تاہم جامہ بشری میں آپ اپنے کو بھیانک مستقبل کے لئے تیار کرتے رہے۔

ابو العباس سفاح کے بعد منصور دوانیقی کا دور آیا اور بنی ہاشم پر عرصہ حیات

تنگ ہوگیا پھر کچھ ایسا ہوا کہ دُور دُور تک آلِ رسُول کا ہوا خواہ تقریبًا ناپید ہوگیا۔ اور اپنے بزرگ، برابر کے ساتھی ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے، اکثر تو موت کی آغوش میں سو گئے، کچھ ترکِ وطن کر گئے اور جو بچے کھچے تھے، وہ تقیہ کا نقاب منہ پر ڈال کر پردۂ گمنامی میں جا بیٹھے۔

امام موسیٰ کاظمؑ عظیم المرتبت باپ کے دوش بدوش رشد و ہدایت کرتے رہے تھے۔ بچپن سے جوانی تک کی شب زندہ داری نے جسم کو کمزور و ناتواں بنا دیا تھا کہ امام جعفر صادقؑ ذمہ داریوں کا بوجھ آپ پر ڈال کر دائمی منزل کی طرف چل بسے اور آپ خدا داد امامت کا بار کاندھوں پر اُٹھائے اس میدان میں ایستادہ ہو گئے جہاں آپ کی آواز سننے والے تھے تو مگر اکثریت نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں۔

خلافتِ عباسیہ کے نام نہاد علماء بچپن سے آپ کے علم لدنی کی آزمائش کرتے آئے تھے پھر بھی جب موقع ملا تو شرمندہ کرنے کی کوشش سے باز نہ آئے مگر انجام کار خود لاجواب ہو کر شرمندہ ہوئے۔

منصور دوانیقی اپنے اقتدار کے لئے ہر راستہ صاف کر چکا تھا۔ اس لئے شروع میں اس نے آپ کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور آپ نے کسی قدر اطمینان کے ساتھ وہ علمی تدریس جاری رکھی جس کی بنیاد آپ کے جدِّ اعلیٰ علیؑ ابن ابی طالبؑ نے ڈالی تھی اور جس کو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے نشاۃ ثانیہ عطا کی تھی۔

اواخر ۱۵۸ھ میں ابو جعفر منصور موت کی آغوش میں جا سویا اور مہدی تخت نشین ہوا تو اس نے بھی بے خطر سمجھ کر امامؑ کو نظر انداز کیا اور آپ یک سوئی کے ساتھ اسلام و انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔

محمد مہدی بن منصور

منصور کو شاید اپنی سفاکیوں اور بد اعمالیوں کا احساس تھا۔ اسی لئے جب اس کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو مکے کی سرزمین پر مرنے کے لئے روانہ ہو گیا

مگر یہ مقدس وادی ایسے ظالم کو قبول کرنے والی نہ تھی لہذا وہ مکے سے چند گھنٹوں کی مسافت پر بیر معونہ ہی میں مرگیا۔

خود اس نے بنی اُمیہ کی قبریں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکی تھیں، لہذا وصیت کے مطابق اس کے لئے ایک سو قبریں کھودی گئیں جن میں سے ایک میں وہ دفن کیا گیا ـــــ پھر اس کا بیٹا مہدی باپ کا جانشین ہوا۔

"مہدی" نے عنان خلافت ہاتھ میں لے کر کئی کار خیر کئے۔ آلِ فاطمہؑ اور دوسرے لوگوں کی ضبط شدہ جائیدادیں واپس کر دیں، بعض قیدیوں کو چھوڑ دیا، قدیم کارگزاروں کے وظائف مقرر کئے اور بعض دوسرے رفاہی کام انجام دیئے۔

خلافت کے دعویداروں کی طرف سے اس کو کوئی اندیشہ نہ تھا لیکن ۱۶۴ھ میں جب وہ حج کے لئے آیا اور اس نے امام موسیٰ کاظمؑ کا قبول عام بچشم خود دیکھا تو آپ کو بغداد لے جا کر قید کر دیا مگر جلد ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ایک سال بعد اس نے امام کو رہا کر دیا۔

جشنِ عاشور جو بنی اُمیہ کے دور کی ایجاد تھا اور جس کو منصور دوانیقی نے جاری رکھا تھا، مہدی کے عہد میں بھی منایا جاتا رہا۔ سادات کشی میں اب وہ شدّت نہ رہی تھی کیونکہ ان کا جہاں کہیں وجود تھا، وہ چھپے ہوئے تھے، البتہ محرّم میں کھل جاتے اور یادِ حسینؑ میں مجلسیں ضرور منعقد کرتے۔ لہذا محرم میں قصر الحمرا کے دروازے کھل جاتے اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

مولانا سعادت حسین مصائب الشیعہ جلد پنجم بحوالہ تاریخ الامم جلد ۹، صفحہ ۳۲۰ تحریر فرماتے ہیں کہ منصور دوانیقی نے ریطہ بنت العباس زوجہ مہدی کو ایک خزانے کی چابیاں دی تھیں کہ خزانہ اس کے مرنے کے بعد کھولا جائے، چنانچہ ریطہ نے مہدی کے ساتھ اس کو کھولا تو:۔

"اسے ایک بہت لمبا کمرہ ملا جس میں اولاد ابی طالب (رحمۃ اللہ) کے مقتولین رکھے ہوئے تھے۔ ان کے کانوں میں ایک ایک رقعہ لٹک رہا تھا جس میں ان کا نسب نامہ

تحریر تھا۔ ان مقتولین میں بہت بڑی تعداد میں بچے بھی تھے، جوان بھی تھے۔ مہدی اس دردناک منظر کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا اور حکم دیا کہ ایک گڑھا کھود کر ان کو دفن کر دیا جائے، چنانچہ وہ سب کے سب اسی میں دفن کر دیئے گئے اور اس پر مہدی نے ایک دکان بنوادی۔"

یہ عمل مہدی کی رحمدلی پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ وہ منصور کے پائے کا سفاک نہ تھا۔ محرم میں اس کے معمولات اپنے پیش رو کے سے تھے۔ اس کے مخبر کہیں مجلس ہوتے دیکھتے تو سیدوں کو پکڑ لاتے اور مہدی ان کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

اپنے وزیر یعقوب کو اس نے اولاد علیؑ کی دوستی میں معزول کیا اور زندان میں ڈال دیا جو ہارون رشید کے زمانے میں نابینا ہو کر باہر نکلا۔

جشنِ عاشور میں صفیہ نامی خاتون نے بھرے دربار میں اس کو ملامت کی تو اس نے قتل کرا دیا۔

علی بن عباس بن علی بن حسن مثلث کو ایک سفارش پر قید سے رہا کیا تو دیر اثر زہر پلا دیا جس سے ان کا انتقال ہوگیا۔

حاضر عیسیٰ بن زید کا سراغ لگا کر پہلے قید کیا پھر قتل کر ڈالا۔

دس سال کی مدت خلافت میں اس کا دامن صدہا سادات کے خون سے آلودہ ہوا —— ایک حکمراں کی حیثیت سے کئی بغاوتیں فرو کیں۔ نقاب پوش پیغمبر کے فتنے کو ختم کیا، ۱۶۳ھ میں رومیوں کے حملے کو پسپا کیا اور ۱۶۸ھ میں گھوڑے سے گر کر وفات پا گیا۔

ہادی بن مہدی

مہدی کے بعد عبا دعصائے رسولؐ اور شاہی خاتم اس کے بیٹے ہادی کو ورثے میں ملی۔ اس کی مدتِ خلافت دو سال ہے۔ وہ ایک مستعد فیاض، علم و ادب کا دلدادہ مگر خود سر، سفاک اور بد مزاج حکمراں تھا اور آلِ رسولؐ کی دشمنی خو میں وراثت تھی۔

تیراندازی کی تفریح میں اس نے ایک فراش کے سینے میں تیر مار کر قتل کر دیا۔
علی حوری کو اس جرم میں قید کر دیا کہ اس نے مہدی کی بیوہ سے عقد کر لیا تھا۔
حاکم مدینہ نے اس کے ایما پر امام حسنؑ کی اولاد پر شراب کا جھوٹا الزام لگایا۔
گلوں میں رسیاں بندھوا کر تشہیر کرایا پھر ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا ــــــ اس طرح ہر عہد خلافت اپنی مدت کے تناسب سے سادات کے سروں کے انبار لگاتا رہا اور ان کے خون سے محلات کے در و دیوار کو رنگین کرتا رہا۔

پھر اس نے امام موسیٰ کاظمؑ کو بغداد بلا کر قید کر دیا اور کم و بیش ایک سال کے بعد رہا کیا۔

قاسم بن محمد بن عبداللہ البا ہر سادات کبار میں سے تھے، ہادی نے سر دربار آپ کی تذلیل کرنے کی کوشش کی اور آپ نے خالص بنی ہاشم کے لب ولہجہ میں جواب دیا۔ انجام وہی ہوا کہ پہلے اعضاء سے گوشت جدا کیا گیا پھر جسم کے ٹکڑے کر دیئے گئے مگر آپ کے منہ سے ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ شاید آپ منہ سے آواز نکالنا اپنے صبر و شجاعت کی توہین سمجھتے تھے۔

رسولؐ کی رحلت کے بعد خاندانِ نبوّت پر مصائب کا جو تسلسل شروع ہوا تھا خلافتِ عباسیہ اس کا نقطۂ عروج تھا۔ محبّان اہلِ بیتؑ تو لاکھوں کی تعداد میں قتل ہوئے ہی تھے۔ خود رسولؐ کے جگر کے ٹکڑے ہزاروں میں تہہ تیغ کئے گئے اور اس زمانے میں تو بیچارگی اپنی انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ اِکا دُکا لوگ اِدھر اُدھر باقی تھے جو اپنے کو چھپاتے تو ڈھونڈ کر پکڑ لئے جاتے، خاموش زندگیاں گزارتے تو چین سے بیٹھنے نہ دیا جاتا۔ اِس لئے کبھی کوئی شیر بپھر جاتا اور سوچتا کہ جب قتل ہی ہونا ہے تو کربلا کی تاسی کیوں نہ کی جائے؟ اسی طرح کا ایک واقعہ جوزجان میں بھی ہوا۔ محمد بن قاسم نام کا ایک شہزادہ میدان میں آگیا اور سیکڑوں کو قتل کر کے گرفتار ہوا ــــــ اور ایک مدت قید میں گزار کر تہہ تیغ کیا گیا۔

دوسرا اہم ترین واقعہ جنگ فخ کے نام سے موسوم ہے ــــــ عبدالعزیز بن عبداللہ

فاروقی، عامل مدینہ اسحٰق بن عیسیٰ کا جانشین تھا۔ اس نے حسین بن علی بن حسن مثلث کو حد درجہ پریشان کیا۔ آپ ضبط و تحمل سے کام لے کر ٹالتے رہے لیکن بات برداشت کے باہر ہوگئی تو آپ بھی مقابلے پر آگئے۔ خاندان کے چھبیس آدمی آپ کے ساتھ تھے آپ مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام فخ پر قیام فرما ہوگئے۔

پہلے مقابلے میں عباسی پیٹھ دکھا گئے۔ پھر سلیمان بن جعفر، عباس بن ابی محمد اور موسیٰ بن عیسیٰ، جو حج کے لئے بغداد سے آئے تھے وہ سب مبروک ترک، حاجب اور حسین بن یقطین سے مل گئے اور ایک جمعیت لے کر فخ جا پہنچے۔

امام حسینؑ کے وارثوں نے کبھی کثرت کے زعم کا لوہا نہیں مانا۔ وہ تھے صرف چند ہی مگر تلواریں سونت کر بڑھے تو بزدلوں کے سر آندھی کے آموں کی طرح گرانے لگے مگر محمد بن سلیمان ایک چکر کاٹ کر پشت پر آنکلا اور اس نے اچانک حملہ کیا تو کئی سرفروش گر گئے، پھر یکے بعد دیگرے اکثر قتل ہوگئے جو باقی بچے وہ گرفتار ہو کر موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے ـــــــ اور فخ کی سرزمین نے تقریباً سو برس بعد کربلا کا ایک منظر دہرا دیا۔

ہادی اپنے بھائی ہارون رشید کے قتل کی فکر میں تھا کہ خود اس کا وقت آگیا اور وہ اچانک مرگیا۔

ہارون رشید ابن مہدی

یہ شہرۂ آفاق بادشاہ ۱۷۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت ایشیا میں عربوں کی حکومت کا سنہرا دور تھا۔ اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین سلاطین میں ہوتا ہے۔ ایک تربیت یافتہ سپاہی، صاحب جاہ چشم حکمراں، دانش مند اور بلند اقبال انسان، بیدردی اور رحمدلی کا مرکب تھا لیکن بے دردی غالب تھی جو اس کا موروثی حصہ تھی۔

اس کی سلطنت ایشیا سے افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی لیکن افریقہ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، البتہ عرب، عراق و شام کو اس نے مکمل طور پر قابو میں رکھا

جس نے سر اُٹھایا، اس کو کچل دیا۔ رسُول کی اولاد کے ساتھ اس کا سلوک بھی ظالمانہ رہا، حالانکہ اب ان میں برائے نام بھی کوئی دم خم نہ رہا تھا اور ان کے ماننے والے دُور دُور تک پائے نہ جاتے تاہم کسی خلیفہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ علم و پارسائی کی نسبت سے ان کا کوئی امتیاز باقی رہے۔ اسی لئے ہارون رشید نے اپنے باپ دادا کی طرح جہاں لشکر پرشکر تیار کرائے تھے وہاں ان برگزیدگان خلق کے مقابلے میں علماء کے گروہ بھی مرتب کئے تھے۔

اس کے عہدِ حکومت میں فقیہوں کی جدوجہد سے، جن کا سرغنہ ابویوسف قاضی القضاۃ تھا، حنفی مذہب باضابطہ صورت اختیار کرنے لگا۔ اس مذہب کا نام، اگرچہ امام ابوحنیفہ کے نام پر حنفی ہے، مگر دراصل اس کا بانی رشید کا قاضی القضاۃ ہے، ابویوسف فتووں کے معاملے میں کرنیمر جیسا نرم مزاج اور لچکدار اور ریکن کا سا کشادہ دل تھا۔ اس کے مذہبی سلسلے کی، یا تو اس سبب سے کہ وہ ابھی ابتدائی حالت میں تھا، یا اس وجہ سے کہ مخالف عناصر موجود نہ تھے، اس وقت بہت کم مخالفت کی گئی۔

> "کسی مذہب کی ترویج پر زور دینے کا اثر ان عناصر کے تناسب سے پڑتا ہے، جن سے ان کا مقابلہ ہو ۔۔۔۔ اس زمانے میں فقہ پر عام توجہ ہو جانے کے باعث یہ طریقہ نشوونما کے آثار ظاہر کرنے لگا رشید فقیہوں کا ادب کرتا تھا اور قدر داں تھا جس کے سبب مذہب کی...... پذیرائی کا راستہ صاف ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے زور نے کمزور بادشاہوں کے عہد میں سختی اختیار کی پھر بھی سُنّی مذہب کی عمارت کی بالائی منزل کا آغاز ہو گیا جس کی بنیاد منصور کے وقت میں رکھی گئی تھی۔" (۱۰۷)

اس بیان سے دو باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ منصور دوانیقی اور اس کے جانشینوں نے ہمارے آئمہ پر سیف و قلم دونوں سے حملہ کیا۔ ایک طرف

اپنے تنخواہ دار عالموں سے ایک فقہ ترتیب دلوائی، جس کا نام فقہ حنفی یا فقہ اہل سنت والجماعت رکھا، دوسری طرف امام جعفر صادقؑ کے فتاوے کو فقہ جعفریہ مشتہر کرادیا تاکہ اسلام کے دو الگ الگ مسلک ہو جائیں جس کے نتیجے میں دو گروہوں کے نام بھی وجود میں آگئے یعنی شیعہ اور سُنی ورنہ اب تک دو نام لئے گئے تھے۔ شیعانِ علی اور شیعان معاویہ۔ شیعانِ معاویہ کا نام آہستہ آہستہ مٹ گیا تھا۔ صرف شیعہ اور غیر شیعہ باقی رہ گئے تھے۔ غیر شیعہ کو عباسی خلفا نے حنفی مسلمانوں کا نام دے دیا۔

اس فقہ کا نفاذ اس طرح کرایا کہ ایک طرف ہر فتویٰ لینے کو ایک مہر طلائی انعام اور دوسری طرف فتویٰ لینے والے پر ایک مہر طلائی جرمانہ اور مقابلے کا فیصلہ یک طرفہ کرنے کے لئے ایک پارٹی کے لوگوں کا قتلِ عام اور پارٹی کے روحِ رواں کے لئے تنگ و تاریک قید خانہ ـــــ اس طرح یہ کہنا صحیح ہو یا غلط کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فقہ حنفی کا نفاذ بزور شمشیر کیا گیا اور اس کو اقتدار کی چھاؤں میں پروان چڑھایا گیا۔

شاید اسی بات کو محسوس کرکے امام ابن تیمیہ نے انکار کیا ہوگا کہ امام ابوحنیفہ نہ امام محمد باقرؑ کے شاگرد رہے اور نہ امام جعفر صادقؑ کے، کیونکہ شاگرد کو استاد کا مدِمقابل کیونکر ٹھہرایا جاسکتا ہے!

خلفائے بنی عباس کا مقصد صرف خاندانِ رسالتؐ کے نمائندوں کی قیمت گرانا تھی جس کے لئے وہ ہر حربہ بروئے کار لاتے رہے۔ اتنے ظالم تھے وہ کہ اپنے نجات دہندہ کی نسل کی حالت زار پر کبھی کے لئے بھی کسی کو ترس نہیں آیا۔ جبھی تو اس خاندان کی ہر فرد کا قول تھا کہ اسیری ہماری میراث اور قتل ہونا ہماری عادت ہے۔

ہارون صرف زندوں ہی کا دشمن نہ تھا، مُردوں سے بھی اس کو عداوت تھی محمد بن ابراہیم اشتر نے روضۂ سیدالشہداء میں باب الحائر اور باب قبلہ وغیرہ تعمیر کرائے تھے ان کو اس نے منہدم کرادیا، باب السدرہ پر ایک درخت سدرہ لگا ہوا تھا، اس کو قطع کرا دیا تاکہ زائرین کو قبر اقدس کا صحیح پتہ نہ چل سکے۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے شب و روز

ہرامام کی راتیں عموماً عبادت میں گزرتی تھیں مگر امام زین العابدین کے بعد اس شغل میں امام موسیٰ کاظمؑ کو طرہ امتیاز حاصل رہا۔ گھر میں ہوئے یا قید خانے میں، رات کا بس ایک ہی شغل تھا عبادت۔ مدینے میں دن کا کچھ حصّہ درس و تدریس میں گزر جاتا، زندان میں دن کی عبادت بھی معمولات میں داخل ہو جاتی۔ ہارون رشید نے اپنی خلافت کے ابتدائی دو سال تک آپ سے تعرض نہیں کیا مگر ۱۷۲ھ میں حج کے لئے گیا تو امامؑ کو اپنے ساتھ لیتا آیا اور قید خانے میں ڈال دیا۔

ہارون رشید اپنے اسلاف کے مقابلے میں زیادہ باتدبیر تھا۔ اس نے اپنے نفس کے لحاظ سے امامؑ کو پرکھا اور ایک حسین و جمیل کنیز آپ کی خدمت کے بہانے قید خانے میں بھیج دی۔ کنیز کو ہر جنسی وار کرنے کی ہدایت کی تھی۔ امامؑ نے انکار کیا، پھر بھی وہ تنہائی میں چھوڑ دی گئی۔ چند دنوں کے وقفے سے ہارون نے ایک آدمی کو پتہ لگانے کے لئے بھیجا تو وہ تحیّر میں پڑ گیا! کنیز سجدے میں پڑی سبوحٌ قدوسٌ کہہ رہی تھی۔ ہارون نے اُسے طلب کر کے پوچھا تو اس نے بتایا۔

"مجھ کو دیکھ کر امامؑ نے فرمایا۔ یہ لوگ موجود ہیں، مجھے تیری کیا ضرورت ہے؟" آپ کے اشارہ کرنے پر میں نے دیکھا تو حور و غلمان کا ایک گروہ تھا جو ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

ہارون رشید نے کنیز کو ایک علیحدہ مقام پر بھیج دیا جہاں وہ باقی زندگی مصروفِ عبادت رہی اور امام کی شہادت سے چند دنوں قبل وفات پا گئی۔

لگ بھگ ایک سال امامؑ نے قید میں گزاری، پھر رہا کر دیئے گئے۔ ۱۷۹ھ میں جب ہارون دوبارہ حج کے لئے گیا تو آپ کے قتل کا مصمم ارادہ لے کر روانہ ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ درباری سازشی امام کے خلاف اس کے کان بھرتے رہتے تھے، پھر امامؑ کے مرحوم برادرِ بزرگ اسمٰعیل کے بیٹے بھی ہارون کی طلبی پر بغداد گئے تھے۔ ہارون ان کو امامؑ کے مقابلے کے لئے اُبھارنا چاہتا تھا۔ محمد اس فریب

میں آ گئے۔ انہوں نے بھی امامؑ کے بارے میں غلط باتیں کہیں، لہٰذا ہارون نے طے کر لیا کہ اس کانٹے کو راستے سے ہٹا ہی دیا جائے۔

اس کے بعد ہی اس نے گرفتاری کے لئے آدمی بھیج دیئے۔ آپ روضۂ رسولؐ پر مصروف نماز تھے۔ ۲۰ شوال ۱۷۹ھ کو اسی عالم میں پکڑ کر لائے گئے۔ ہارون نے بغاوت کے اندیشے سے دو محملیں تیار کرائی تھیں۔ ایک میں اس نے امام کو بصرہ روانہ کیا، دوسری خالی محمل بغداد بھیج دی ــــــ ہارون کا چچیرا بھائی عیسیٰ ابن جعفر بصرے کا عامل تھا۔ وہ جلد ہی امام کی ملکوتی سیرت اور روحانی عظمت سے متاثر ہو گیا۔ اس کی اطلاع پاتے ہی ہارون رشید نے آپ کو بغداد بلوا لیا اور فضل بن ربیع کی حراست میں دے دیا۔

فرشتوں کا کردار اگر انسان میں ہو تو جانور بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں پھر فضل تو آدمی تھا۔ ہارون نے اس سے بدگمان ہو کر امام کو یحییٰ برمکی کے حوالے کیا اور اس کو بھی سخت گیر نہ پا کر "سندی بن شاہک" کی قید میں دے دیا جو امامؑ کے مسئلے میں اس کے کام کا آدمی تھا۔

ایک شب امام ابو یوسف اور محمد بن حسن قید خانے پہنچے تاکہ امامؑ سے واجب و سنت کے متعلق بعض مشکل سوالات کر کے آپؑ کو شرمندہ کریں اور ہارون رشید کی خوشنودی حاصل کریں۔ ابھی وہ جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ملازم ڈیوٹی ختم کر کے گھر جانے لگا تو اس نے آپؑ سے پوچھا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو کل لیتا آؤں؟"

آپ نے نفی میں جواب دیا اور جب وہ چلا گیا تو ابو یوسف سے فرمانے لگے۔

"بے چارہ کہتا ہے کہ کل لیتا آؤں گا۔ اس کو کیا معلوم کہ رات اس پر کٹے گی ہی نہیں ــــــ"

غیب کے اس اظہار پر ابو یوسف سکتے میں رہ گئے، پھر انہوں نے آپ سے کچھ نہیں پوچھا ــــــ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ ملازم رات میں اچانک انتقال

کر گیا۔

ان واقعاتی کمالات کے علاوہ آپ نے بہت سے معجزات دکھائے جن کو بدعقیدہ لوگ فی زمانہ ماننے پر تیار نہ ہوں گے مگر ہمارے عقیدے میں تو ان میں کی ہر فرد پیکر اعجاز تھی ـــــ اور ان کا مسلک اتنا واضح اور روشن تھا کہ غیر جانبدار ہو کر اس کو دیکھا جائے تو ہر بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس مسلک میں ایسا نہیں ہے کہ کوئی بات عوام کو نہ بتائی جائے جب کہ دوسرے مسلک میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کی تاویل نہیں کی جا سکتی، عوام سُنیں گے تو ان کا عقیدہ کمزور پڑ جائے گا۔ اسی لئے تاکید کی جاتی ہے کہ شیعوں سے زیادہ بات چیت نہ کی جائے۔ مجلسوں میں قطعاً نہ جائیں، اس سے بغضِ صحابہ پیدا ہوتا ہے۔ کیوں ـــــ ؟ اس کا جواب نہیں دیا جاتا۔

اس کی ابتدا بھی ہارون رشید نے کی تھی۔ قید خانے سے نکلنے کے بعد کنیز کو کسی سے ملنے نہ دیا۔ ابو یوسف کا واقعہ ہارون تک محدود رہا۔

جانتے سب تھے مگر مسئلہ تھا حقدارِ خلافت کا، لہٰذا انصاف کا خون بھی روا، انسان کا خون بھی مباح تھا۔

ہارون رشید کی سادات کشی

اس سلسلے میں ہارون کا دَور منصور دوانیقی سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ حمید بن قحطبہ عامل ایران کا واقعہ بحوالہ منتخب التواریخ نمونے کے طور پر درج ہے کہ اس نے عبداللہ براز نیشاپوری سے بیان کیا۔

ہارون نے ایک رات طلب کیا اور پوچھا

"تو میرا کس حد تک مطیع ہے ـــــ ؟"

"جان و مال سے حاضر ہوں"۔ میں نے جواب دیا اور اس نے مجھے رخصت کر دیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر بلا بھیجا اور پھر یہی سوال کیا۔ میرا جواب پہلے ہی جیسا تھا۔ ہارون مسکرایا اور پھر جانے کو کہہ دیا۔ تیسری بار جب اس نے طلب کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں مرنے کے لئے تیار ہو کر پہنچا تو اس نے

سامنے رکھی ہوئی تلوار اُٹھا کر مجھے دی اور کہا۔

"اس غلام کے ساتھ جا اور اس کے کہنے پر عمل کر۔۔۔۔"

"غلام مجھے ایک مکان میں لے گیا جس میں تین مقفل کمرے تھے۔ غلام نے ایک کمرہ کھولا۔ اس میں بیس بچے بوڑھے اور جوان زنجیروں سے جکڑے ہوئے پڑے تھے جن کے گیسو شانوں تک آ گئے تھے۔"

"غلام بولا۔ یہ سب تمہارے ہاتھوں قتل ہوں گے۔۔۔۔"

"غلام ایک ایک سید کو کنویں کے کنارے لاتا گیا اور وہ قتل ہو کر کنویں میں گرتا رہا۔"

"پھر اس نے دوسرا کمرہ کھولا۔ اس میں بھی بیس سادات تھے، تیسرے میں بھی بیس ہی تھے۔۔۔۔ میں انیس کی گردنیں اُڑا چکا تو بیسویں معذور مردِ بزرگ نے کہا۔"

"ظالم۔ تو قیامت میں میرے جد کو کیا جواب دے گا۔۔۔۔؟"

"میں کانپنے لگا تو غلام نے مجھے ڈانٹا اور میں نے ضعیف پاکباز کی گردن بھی اُڑا دی۔"

ایسے ہی ان گنت واقعات ہیں جو ان خلفائے اسلام کے ہاتھوں پیش آئے ہارون رشید کے عہد میں بغداد کی راتیں کتنی ہی رنگین رہی ہوں، علوم و فنون نے کیسا ہی عروج پایا ہو مسلمانوں کی سطوت و شوکت کتنی ہی قابلِ ذکر قرار پائے لیکن وہ پیغمبر اسلام کی روح کو شب و روز دُکھ پہنچاتا رہا اور اسلام میں تو انتشار ڈال گیا گویا اس نے اُمیّہ و ہاشم کی طرح اسلام کا ایک توام بھائی پیدا کر دیا جس کو تلوار سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا۔

ادریس بن ادریس مراقش پہنچ گئے تھے تو اس کو اتنی پرخاش تھی کہ وہاں مخبر بھیج کر زہر دلوا دیا۔ یحییٰ بن عبداللہ محض نے دیلم میں پناہ لی تھی تو فضل بن یحییٰ برمکی کو ان کے قتل پر مامور کیا۔ فضل نے مکر سے کام لے کر یحییٰ کو تحائف بھیجے اور

امان کا وعدہ کیا اور اس کے وعدے کے مطابق ہارون نے یحییٰ پر ظاہری نوازشیں بھی کیں لیکن گھات میں لگا رہا۔

پھر ایک دن فضل کا لکھا ہوا پروانۂ امان یحییٰ کے گھر سے چرا لیا اور انہیں گرفتار کرکے زندان بھیج دیا۔

دو مرتبہ قید خانے سے بلوا کر سر پر عصا سے ضربیں لگائیں اور تیسری بار زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ علی بن ہاشم، عبدربہ بن علقمہ اور مخول بن ابراہیم نہدی بھی آپ کے ساتھ ماخوذ ہوئے۔

یہ تھا الف لیلہ کا ہارون رشید، مورخین جس کے قصیدے پڑھتے ہیں جعفر برمکی کے خون ناحق کا الزام ہر قلمکار اس پر لگاتا ہے لیکن محمدؐ کے پوتوں اور کونین کے شہزادوں کو زہر سے شہید کرنے کی بات کوئی نہیں کرتا۔ شاید دنیا دار جعفر برمکی کی قیمت امام موسیٰ کاظمؑ اور امام رضاؑ کی روحانی بلندی سے زائد تھی۔

امام موسیٰ کاظمؑ کا انتقال پر ملال

سندی بن شاہک اپنے عہد کا مسلم بن عقبہ اور حجاج بن یوسف تھا مگر امامؑ کی محویت عبادت کو دیکھ کر وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آخر خود ہارون رشید نے پچاس ساٹھ وحشی عربوں کا انتظام کیا اور انہیں امامؑ کو قتل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ انہوں نے ایک نورانی پیکر کو سر بسجدہ پا کر توقف کیا، پھر اس کے استغراق کو دیکھ کر نقشِ حیرت بن گئے۔ امامؑ نے سجدے سے سر اٹھایا تو انہیں کی زبان میں پوچھا۔

"تم لوگ کیوں آئے ہو، کیا چاہتے ہو؟"

صحرائی عرب آپ کے قدموں پر گر پڑے اور ان کو چومنے لگے۔ امامؑ نے سروں پر ہاتھ رکھ کر انہیں اٹھایا ـــــ اس اثنا میں ہارون قید خانے میں داخل ہوا اور عربوں کی حالت ـــ دیکھ کر مایوس پلٹ گیا۔

ہارون کا خیال تھا کہ سندی کی قید میں امام زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں گے

لیکن اس میں اس کو مایوسی ہوئی تو اس نے مسیّب بن زہیر کو امام کا نگران بنا دیا مگر اس طرح بھی کامیابی نہ ہوئی تو زہر بھرے انگور سندی کو بھجوائے کہ وہ امام کو کھلا دے۔

امام علیہ السلام نے چند دانے نوش فرمائے اور ایک دانہ سامنے بیٹھے ہوئے کتے کے سامنے ڈال دیا۔ یہ کتا ہارون رشید کا تھا وہ اس دانے کو کھاتے ہی مر گیا جس کا ہارون کو بہت دکھ ہوا۔

امام علیہ السلام پر زہر کا اثر فوراً ہونے لگا تھا تاہم آپ دو روز زندہ رہے۔ تیسرے دن ۲۵ رجب ۱۸۳ھ کو پچپن سال کی عمر میں انتقال فرمایا مرنے کے بعد آپ کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کٹوائی گئیں جو چودہ سال بعد جسم سے اتری تھیں۔

ہارون اس کام سے فارغ ہو کر رقہ چلا گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ میّت کی کوئی نماز نہ پڑھے اور اس کو یوں ہی رکھا رہنے دیا جائے لیکن انتقال کی خبر سن کر سلیمان بن ہادی سر و پا برہنہ آ گیا۔ آپ کے بڑے بیٹے امام علی رضا علیہ السلام بھی باعجاز امامت مدینے سے آ گئے اور آپ نے ہی اپنے ہاتھوں تجہیز و تکفین فرمائی۔

اولادِ اطہار

۱۹ بیٹے اور ۱۸ بیٹیاں آپ نے سوگوار چھوڑیں۔ بیٹوں کے اسمائے گرامی تھے: حضرت امام علی رضاؑ، ابراہیمؒ، عباسؒ، قاسمؒ، اسمٰعیلؒ، جعفرؒ، ہارونؒ حسنؒ، احمدؒ، محمدؒ، حمزہؒ، عبداللہؒ، زیدؒ، حسنؒ، فضلؒ، حسینؒ، سلیمانؒ بیٹیوں کے نام تھے: کبریٰؒ، فاطمہ صغریٰؒ، رقیہؒ، علیمہؒ، رقیہ صغریٰؒ کلثومؒ، ام جعفرؒ، لبابہؒ، زینبؒ، خدیجہؒ، علیۃؒ، آمنہؒ، حسنہؒ، بریہؒ ام سلمیٰؒ، میمونہؒ، ام کلثومؒ، ام اسماءؒ۔

یہ تمام بچے اور بچیاں کئی بیویوں سے تھیں۔

یہ لوگ پردیس میں امام کی شہادت کا جتنا بھی غم کرتے، کم تھا لیکن مدینے کے عام رہنے والوں کو بھی بہت صدمہ تھا اور ہارون رشید کے ظلم پر ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ ہر مجبور ایسے موقعوں پر آہیں بھر کر رہ جاتا ہے۔

(۱۰۸)

آٹھویں امام

امیر المومنین حضرت امام علی رضا علیہ السلام

۲۵ رجب ۱۸۳ھ تا ۲۰۳ھ

ابتدائی حالات

آپ ۱۱ ذی قعدہ ۱۵۳ھ کو مدینے میں پیدا ہوئے۔ نام علی بن موسیٰ اور کنیت ابوالحسن تھی، رضا لقب توصیفی تھا۔ اس طرح آپ امام علی رضاؑ کہلائے۔ آپ کی نشو و نما والد محترم کے زیر سایہ ہوئی۔ امام موسیٰ کاظمؑ جب زندانِ مصیبت میں گرفتار ہوئے تو آپ جوان ہو چکے تھے۔ منصبِ امامت پر فائز ہونے کے وقت آپ کی عمر تیس سال تھی۔

آپ نے منصور دوانیقی، مہدی اور ہادی کے زمانے دیکھے تھے اور ہارون رشید کے عہد کا بڑا حصّہ گزار لائے تھے، جن حالات سے آپ کو دوچار ہونا تھا ان کا آپ کو اندازہ تھا اور امام وقت کی حیثیت سے آپ اس کے لئے تیار تھے لیکن امامت کی شروعات ایک بالکل غیر متوقع انداز سے ہوئی۔

امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت میں محمد بن اسمٰعیل مدعی ہوئے تھے۔ اس سے شیعوں میں ایک نئے فرقے کی بنیاد پڑ گئی پھر امام رضاؑ کو قدرے مختلف صورتحال سے گزرنا پڑا اور ایک نیا فرقہ واقفیہ پیدا ہو گیا۔

زکوٰۃ اور خمس کا روپیہ جو آئمہ طاہرین کے ذریعہ مستحقین پر تقسیم ہوتا تھا۔ وہ حضرتؑ کی اسیری کی وجہ سے تقسیم نہ ہو سکا تھا یہ حضرتؑ کی طرف سے

علی بن حمزہ، عثمان بن عیسیٰ اور زید بن مروان کے پاس جمع تھا ــــ پہلے اور دوسرے کے پاس تیس تیس ہزار دینار ــــ اور تیسرے کے پاس ستر ہزار دینار۔

امام علیہ السلام کی وفات کے بعد ان لوگوں پر طمع غالب ہوئی اور انہوں نے اس رقم کو ہضم کر لینے کا قصد کر لیا۔ ان میں سب سے پہلے جس نے اس فاسد عقیدے کا اظہار کیا وہ علی بن حمزہ تھے پھر عثمان بن عیسیٰ اور زید بن مروان

"حضرت امام رضا علیہ السلام نے ان لوگوں سے، جب اس مال کو مانگ کر محتاجوں پر تقسیم کرنا چاہا، تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ عثمان بن عیسیٰ نے تو کھلے لفظوں میں یہ جواب دیا کہ تمہارے باپ ابھی زندہ ہیں، مرے نہیں، تم کو ان کی زندگی میں اس مال کے طلب کرنے کا حق نہیں اور اگر بالفرض مر بھی گئے ہیں تو انہوں نے مجھے اس کی وصیت نہیں کی کہ اس مال کو تم تک پہنچا دوں۔ ان بدبختوں نے اتنے ہی پر بس نہیں کی بلکہ اس مال کے لئے دوسروں کو بھی ہم خیال بنانا شروع کر دیا۔" (۱۰۹)

ان کا عقیدہ تھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں وہ مہدی موعود ہیں اور وقت آنے پر ظہور فرمائیں گے، چونکہ یہ لوگ بارہ اماموں کے بجائے سات اماموں پر رک گئے تھے اور وقف کے معنی ٹھہرنے کے ہیں لہٰذا انہیں واقفیہ کہا گیا۔

امام موسیٰ کاظمؑ نے غالباً اسی کے پیش نظر امام علی رضاؑ کے حق میں ایک وصیت نامہ لکھ دیا تھا اور خانۂ شہادت میں بعض لوگوں کے دستخط بھی کرا دیئے تھے مگر امام رضاؑ کے بعض بھائیوں نے اسے بھی نہیں مانا۔

۱۸۶ھ میں ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات سے فائدہ اٹھا کر اہلِ مدینہ سے اپنی بیعت لینے کی کوشش کی مگر مدینے والوں کی ایک تعداد

نے بیعت سے انکار کر دیا۔ اس پر ہارون نے عیسیٰ الجلودی کے ماتحت ایک فوج روانہ کی کہ محمد بن جعفر کو قتل کر دیا جائے جو امام رضا کے چچا تھے۔ محمدؒ نے اپنے ساتھیوں کو لے کر مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور گرفتار ہو کر بغداد بھیج دیئے گئے۔

پھر عیسیٰ نے مدینے کو اس طرح لوٹا کہ کربلا کی لوٹ نظروں میں پھر گئی۔ عام غارت گری سے فراغت پا کر عیسیٰ، امام رضاؑ کے گھر پر پہنچا۔ آپ نے گھر کا تمام اثاثہ کپڑے اور زیور خود اس کو لا کر دے دیئے اور اس نے سارا سامان بغداد بھیج دیا۔

فرقۂ واقفیہ اور بہکے ہوئے بھائیوں کو امام رضاؑ نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مخالفت سے باز نہ آئے پھر بھی امامؑ کا رویہ ان سب کے لئے مشفقانہ رہا پھر آہستہ آہستہ ان کی تعداد گھٹنے لگی۔ امام محمد تقیؑ کے عہد تک لگ بھگ یہ لوگ ناپید ہو چکے تھے۔

ہارون رشید کا عہد آخر

"۱۷۸ھ اس واقعہ کے لئے مشہور ہے جس نے رشید کی قبائے سلطنت کو نہ صرف داغدار کیا بلکہ اس کی آئندہ زندگی کو بھی تلخ کر دیا۔ سترہ سال تک برامکہ نے نہایت وفاداری اور دیانت سے حکومت کی خدمت کی تھی۔ ان کے عہد میں لوگ شاد و خرم رہے۔ سلطنت مالدار اور مضبوط ہوئی۔ قومی سرمائے میں اضافہ ہوا اور ہر جگہ تہذیب و ترقی نے نشو و نما پائی مگر خود ان کی شان و شوکت، خیرات و فیاضی نے جس کی بدولت لوگ ان کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے تھے، ان کے بہت سے دشمن پیدا کر دیئے جو تباہی و بربادی پر تل گئے۔" (۱۱۰)

جعفر اور شہزادی عباسہ کی شادی کو بنی عباس کے طرفدار ایک افسانہ قرار دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کو استقرار حکومت کی خاطر کچھ بھی کرنے میں تامل نہ تھا جس کی نظیریں امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے رشتوں سے ملتی ہیں۔ یہ دونوں امام بھی داماد بنائے جانے کے بعد زہر سے شہید کئے گئے۔

جعفر برمکی ہارون رشید کا بہنوئی تھا مگر کان کے کچے اور تلون مزاج بادشاہ نے بدگمانی میں مبتلا ہوکر "مسرور" کی تلوار سے اس کا سر اتروا لیا پھر برمکیوں کی تمام جائیدادیں ضبط کرلیں، بوڑھے یحییٰ اور فضل برمکی کو قید خانے میں محبوس کر دیا جہاں یحییٰ ۱۹۰ھ میں اور فضل ۱۹۳ھ میں مر گیا۔

۱۸۱ھ میں رومیوں سے جنگ ہوئی۔ نائس فورس سے رشید کا معرکہ بے جگری اور دلیری کا ایک کارنامہ ہے۔ ہارون رشید کی سپاہ نے چالیس ہزار عیسائیوں کو کاٹ کر رکھ دیا مگر اس کے بعد رومیوں سے مسلسل اس کی ٹکر ہوتی ہی رہی۔

اس دوران مختلف مقامات پر کئی بغاوتیں ہوئیں جن کو فرو کیا گیا۔ اتنی بڑی سلطنت میں ایسے واقعات کوئی غیر معمولی نہ تھے۔ ان میں اسے مسلسل الجھا رہنا پڑا، پھر بھی اس کی ذات سے علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی۔

> "وہ ظالم، جابر، وہم پرست، تیز طبیعت، مطلق العنان اور خودسر مگر بہت باذوق، مدبر اور زیرک حکمراں تھا۔ اس کا دربار شوکت و رونق کے اعتبار سے عدیم النظیر تھا۔ اس نے اپنے دربار میں باکمال لوگ جمع کر رکھے تھے۔ بے شمار بے گناہوں کے خون کے دھبے اس کے دامن پر نظر آتے ہیں۔ عدل و انصاف نے بارہا خالقِ دو جہاں سے اس کی فریاد کی ہے اور اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی، پھر بھی اس نے آرٹ، سائنس اور علم الابدان کے ہر شعبے اور شاخ کی ترقی کے لئے شاہانہ جود و کرم سے کام لیا۔ ہارون رشید پہلا شخص ہے جس نے راگ کو شریف پیشہ قرار دیا۔ سائنس اور لٹریچر کی طرح اس کی بھی ڈگریاں اور اعزازی درجے مقرر کئے۔" (۱۱۱)

عیسائیوں سے مسلسل جنگوں اور اندرونی بغاوتوں میں اس کی صحت خراب ہو گئی تھی اور وہ رقہ میں اقامت گزیں ہوگیا تھا مگر ۱۹۲ھ میں پھر اسے یونانیوں سے مقابلے کے لئے نکلنا پڑا۔ خراسان کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی

آخر طوس کے نواح میں قریۂ تنار آباد میں ۴- جمادی الثانی ۱۹۳ھ کو ساڑھے تیئس سال حکومت کر کے چل بسا۔

امین بن ہارون

امین باپ کے انتقال پر تختِ خلافت پر بیٹھا فضل بن ربیع، جعفر برمکی کے بعد سے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے مامون کے مقابلے پر رشید کی وصیّت کے خلاف امین کا ساتھ دیا اور خزانہ و فوج لے کر اس سے آملا۔

رشید نے اپنی زندگی ہی میں مامون کا علاقہ ربے علیحدہ کر دیا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس کی فلاح و ترقی میں لگا رہا۔ امین اس کے برعکس خلیفہ ہوتے ہی رنگ رلیوں میں پڑ گیا پھر فضل اور دوسرے امیروں کے بہکانے پر مامون کو بغداد طلب کر لیا۔ مامون نے نہ جانے کا بہانہ کیا تو امین نے پچاس ہزار کا لشکر دے کر علی بن عیسیٰ کو اس کی سرزنش کے لئے روانہ کر دیا۔ جس کا مقابلہ مامون کی طرف سے طاہر بن حسین نے کیا اور اس کو شکست دے کر امین کی سرحد میں داخل ہو گیا۔

اب دونوں بھائیوں میں حصولِ خلافت کی جنگ شروع ہو گئی اور طاہر بن حسین علاقوں پر علاقے فتح کرتا رہا۔ ادھر مامون نے امیر المومنین کا لقب اختیار کر کے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ بدقسمت امین شکستوں پر شکستیں کھاتا رہا۔ آخر اس نے اپنے کو مامون کے ایک سالار فوج ہرثمہ بن اعین کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہی ہوا تھا کہ ایرانی سپاہیوں نے پکڑ کر ہلاک کر دیا۔

امین کی عمر ۲۸ سال اور مدّتِ خلافت چار سال آٹھ ماہ تھی۔

مامون رشید بن ہارون رشید

۱۹۸ھ میں مامون بھائی کی جگہ تخت نشینِ خلافت ہوا۔ وہ ایک بہادر، لائق عالم اور مدبّر حکمراں تھا لیکن سیاسی سوجھ بوجھ میں اس کا جواب نہ تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ رزم سے زائد بزم کے لئے موزوں تھا۔ اس نے نظمِ سلطنت اپنے وزیر فضل بن ربیع کے ہاتھ میں دے دیا اور خود اصلاحات کی طرف متوجہ ہو گیا جس کے

نتیجے میں مختلف مقامات پر بدامنی کے آثار پیدا ہو گئے۔ آخر اس نے مرو سے بغداد منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

امام رضاؑ کے دس سال

دور ہارون رشید کے آخری چند برس اور اس کے بعد ۲۰۰ھ تک کا زمانہ امام علی رضاؑ کو ایسا ملا کہ آپ نے رشد و ہدایت کی خدمت قدرے سکون سے انجام دی۔ آپ کے روز کے معمولات بھی تقریباً وہی تھے جو دوسرے آئمہ کے رہے تھے۔

محاسن اخلاق اور تواضع و انکساری میں آپ کا یہ عالم تھا کہ دستر خوان پر اپنے ساتھ سائیس اور دربان تک کو بٹھا لیتے اور سائل تو آپ کے در سے خالی جاتا ہی نہ تھا، وہ آپ کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتا اور آداب دسترخوان خود بخود سیکھ جاتا تھا۔

راتوں کو آپ اکثر عبادت و ریاضت میں گزارتے۔ دن کو صبح سے شام تک روزہ رکھتے لیکن ہمیشہ ایسا نہ ہوتا، تاہم مہینے میں تین روزے ضرور رکھتے تھے آپ کا قول تھا کہ تین روزے رکھ لینا ایسا ہی ہے جیسے انسان ہمیشہ روزے رکھے۔

خیرات کا یہ عالم تھا کہ رات کے پردے میں مستحقین کے گھروں پر خود پہنچا دیا کرتے اور کبھی پانے والے کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ کون دے کر گیا ہے۔

لوگوں سے بات چیت کرنے میں لہجہ بہت نرم ہوتا اور مخاطب جب تک اپنی بات ختم نہ کر لیتا، اس وقت تک خاموش رہتے۔ جب وہ آپ کی بات سننے پر تیار ہوتا تب ہی بولتے تھے۔

کسی کے سامنے تکیہ کا سہارا لے کر یا پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے، خواہ آپ کتنے ہی تھکے کیوں نہ ہوں۔

قہقہہ لگا کر نہ ہنستے، عموماً مسکرا دیا کرتے تھے تاہم چہرے پر ہمہ وقت ایک شگفتگی پائی جاتی، دل پر کتنا ہی بوجھ ہو مگر آپ دوسروں کو اس سے متاثر نہ ہونے دیتے۔

آپ کا فرش بوریہ ہوتا جس پر بیٹھ کر وعظ کیا کرتے اور مسائلِ شرعیہ بیان کرتے یا فتاوے دیا کرتے تھے۔ موسم سرما میں بوریے کے بجائے کمبل پر بیٹھتے تھے، اور اسی پر آنے والوں کو بھی بٹھاتے تھے۔

مسائل کے بیان میں آپ عموماً اتنا طول دیتے کہ اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہنے پاتے۔ نمازِ صبح اگرچہ طولانی ہوتی مگر لوگوں کو پند و نصائح فرمانے کا جو وقت معین تھا، اس میں کوئی کمی نہ کرتے۔ یہ بھی آپ کے نزدیک واجبات میں سے تھا۔

شب و روز میں ایک ہزار رکعت نماز کی ادائی فرماتے، روزانہ ایک قرآن ختم کرتے اور سوروں کی تلاوت کرتے کرتے سو جاتے تھے۔

مومن و منافق کی پہچان میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آدمی کے سامنے آتے ہی اس کے بشرے سے آپ کو معلوم ہو جاتا تھا کہ ایمان کے کس درجے پر ہے مگر منافق کے سامنے اس کا اظہار نہ کرتے۔

امام کو مجلس سید الشہداء میں بھی بڑا شغف تھا۔ محرم میں مسلسل مجلسیں منعقد کرتے۔ ایک مرتبہ یوم عاشورا کو دعبل خزاعی پہنچ گئے تو ان سے مرثیہ پڑھوایا اور خواتین کو بھی سنوایا۔ شور گریہ بلند ہوا تو آپ نے گریہ کا ثواب بیان کیا۔

علمائے اسلام مشکل مسائل میں آپ سے رجوع کرتے اور آپ فوراً ان کے جوابات دے دیتے تھے۔

بعض لوگ تحریری طور پر پوچھتے تھے، آپ جواب لکھ کر دے دیا کرتے۔ مدینے کے قیام میں ان کی تعداد اٹھارہ ہزار بتائی جاتی ہے۔

مختصراً آپ علوم الٰہی اور اسرار مشیّت کا گنجینہ تھے۔ علماء و فضلاء، محدثین و مفسرین، جنہوں نے آگے چل کر ہمسری بلکہ برتری کا دعویٰ کیا، اگر ضمیر کی شہادت کے ساتھ ان سے پوچھا جائے تو انہیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ انھوں نے امام رضا علیہ السلام سے بھی فیض حاصل کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ذاتی مفاد نے انہیں اخفائے حقیقت پر مجبور کر دیا ہو۔

کمالات ومعجزات اور غیب دانی کی تو اتنی مثالیں ہیں کہ بدعقیدہ لوگوں کو بھی کسی وقت مانے بغیر چارہ نہ رہتا۔

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو دینی خدمت کا جتنا وقت ملا تھا۔ امام رضاؑ کو بھی اس سے کم وقت نہیں ملا اور آپ نے اس وقت میں اس خوبی سے فرائض امامت انجام دیئے کہ ان کے نقوش مطلع مخالف پر کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔

سلطنت عباسیہ کا انتشار اور سادات علویہ

فطرت کا اصول ہے کہ درخت کی شاخیں جس قدر کاٹی جائیں، اس سے زائد نئی شاخیں اس میں نکلتی ہیں۔ یہی صورت خانوادۂ نبوت میں بھی رونما ہوتی رہی ڈیڑھ سو سال سے زائد گزر رہے تھے کہ سادات کے ہاتھ پاؤں اور گردنیں قطع کی جا رہی تھیں لیکن ایک تلوار کی دھار پر سے گزرتا تو پانچ اپنے بعد چھوڑ جاتا، ان پانچ میں سے چار خون کے دریا میں ڈوب جاتے تو چودہ اس کے جانشین بن جاتے اور چودہ میں سے بارہ کٹ جاتے تو چالیس پروان چڑھنے کے لئے تقیہ میں چلے جاتے۔ اس طرح کوئی نہ کوئی تعداد ویرانوں اور کھنڈروں میں پائی جاتی جو موقع پاتے ہی برآمد ہو جاتی اور خون کے دریا بہا کر اپنا خون بھی کربلا والوں میں شامل کر جاتی تھی۔

جناب زیدؒ شہید کی اولاد واسط میں پناہ گزین تھی جو کئی مرتبہ قتل کی گئی اور منتشر ہو کر پھر سمٹ آئی۔

مامون کے آغاز حکومت میں بنی امیہ کی ایک فرد نصر نے الجزیرہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ جعفر طیارؒ کی اولاد میں ابن طباطبا نے بغداد کے افسر فوج ابوسرایا کی مدد سے اعلان حریت کیا۔ ابن طباطبا کے اچانک مرجانے پر ابوسرایا نے حضرت زیدؒ کے ایک پوتے محمد بن زید کو تخت پر بٹھا کر عراق سے یمن تک اپنی حکومت قائم کرلی۔

مکے پر بھی سادات کا قبضہ تھا۔ آگے چل کر معتصم کی فوج نے ان کو شکست دی۔ اس بار بھی حصول اقتدار میں سادات کا خون بہایا گیا۔

انقلاب کی یہ لہر کسی خاص علاقے تک محدود نہ تھی، ہر طرف آلِ محمدؐ کے حقوق کا آوازہ بلند ہو رہا تھا۔

الحسن الہرش نے ۱۹۸ھ میں دعوت رضائے حق دی، ایک بڑی تعداد جمع کر لی۔ محرم ۱۹۹ھ میں عباسی فوج سے مقابلہ ہوا۔ اَن گنت عباسی مارے گئے مگر الحسن کو شکست ہوئی اور انہوں نے لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔

حسن بن ہذیل صاحب فخ کے ساتھیوں میں تھے۔ آپ کا یادگار جملہ تذکروں میں محفوظ ہے۔

"جو شخص خون میں تربتر ہو کر جام موت نہ پیئے گا، اُسے بڑھاپے میں موت آئے گی۔ موت وہ پیالہ ہے جسے انسان کو بہر طور پینا ہی پڑتا ہے"

محمد بن الحسین یمن کے داعیوں میں تھے۔ یمنیوں نے جب عباسیوں سے جنگ کی تو شیرانہ حملے کرتے ہوئے مارے گئے۔

بے گنتی لوگ ہیں جن کے نام مسلک شہادت پر درخشاں ہیں۔ ان میں صرف سادات اور ان کے حلقہ بگوش ہی نہ تھے بلکہ ایک بڑی تعداد غیر جانبدار لوگوں کی بھی تھی جو بے اختیار مظلوموں کے حامی بن گئے تھے مگر وہ سب علیحدہ علیحدہ اور چھوٹی چھوٹی جنگوں میں قتل کر دیئے گئے۔

مامون کے سپہ سالار حسن بن سہل نے مسلسل جنگوں کے بعد کھویا ہوا اقتدار واپس لے لیا لیکن اب اس حقیقت میں کوئی شک نہ رہا کہ مسلم عوام کے دل اولادِ رسولؐ کے ساتھ ہیں اور جب ان کی کوئی فرد انہیں آواز دیتی تو وہ حق کی حمایت میں جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر نکل آتے۔ خود سادات تعداد میں زیادہ نہ تھی لیکن قتل ہوتے ہوتے عاجز ہو چکے تھے لہٰذا موقع ملتے ہی سروں کو کٹوانے کے لئے نکل پڑتے کیونکہ یہ موت ان کے شایان شان ہوتی تھی۔

اسلاف کی پوری تاریخ مامون کے سامنے تھی۔ منصور دوانیقی، مہدی، ہادی اور ہارون رشید کے قید خانے شاہد تھے کہ وہ اکثر و بیشتر سادات ہی کے دم قدم

سے آباد رہے اور جب دو چار سو نکال کر موت کے کنوؤں میں ڈالے گئے تو پانچ سات سو نے ان کی جگہ لے لی۔ اس طرح ہزاروں آئے اور قتل ہوئے پھر ہزاروں رونقِ زنداں بن گئے ـــــ کتنی پیداوار تھی اولادِ رسولؐ کی کہ پرانا خون نکالا جاتا تھا تو نیا خون اسی قدر یا اس سے زائد آجاتا تھا ـــــ اب اگر ہمارے آئمہ اور خاندانِ رسالت کے اکابر درجنوں وارث چھوڑ کر نہ جاتے تو پیغمبرؐ کی نسل تو روئے زمین پر باقی ہی نہ رہتی۔

مامون کا اندازِ فکر

کربلا کے بعد سے تاریخ کے اُفق پر ایک نظر ڈالی جائے تو صرف مشرق و مغرب میں نہیں، شمال و جنوب میں بھی خونِ شہیداں کی شفق پھولتی نظر آئے گی اور اس میں سے ایمان کے آفتاب طلوع ہوتے دکھائی دیں گے۔

مامون کی دُور رس نگاہ ماضی کی فضا میں دیکھتی چلی گئی اور اس نے ایک فیصلہ کر لیا کہ حقدار کی صداقت تلوار اور تشدّد سے دبائی نہیں جا سکتی مگر یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا کہ وہ حکومت سے دستبردار ہو جاتا کیونکہ اس کو جو کچھ کرنا تھا، وہ بقائے حکومت کی خاطر ہی تو کرنا تھا۔ اس لئے اس نے طے کر لیا کہ تلوار نیام میں تو رکھ لی جائے مگر سیاست کے زہر میں بُجھا کر۔

آلِ رسولؐ کو سپر بنا کر حکومت کرنے کی فکر کچھ نئی نہ تھی۔ اس سے قبل بنی اُمیّہ اسی طریقے کو اپنانے کی کوشش کر چکے تھے۔ سب سے پہلے معاویہؓ نے حضرت عقیل کا دمشق میں خیر مقدم کیا تھا مگر آپ حضرت علیؑ پر تبرّا ہوتے دیکھ نہ سکے اور واپس چلے گئے، پھر ہر فرماں روا اس خاندان کی کسی نہ کسی فرد کو توڑنے کی سعی کرتا رہا۔ سلیمان بن عبدالملک نے محمد حنفیہؒ کے پوتے ابو ہاشم کو دربار میں ایک معزز جگہ دی تھی، نواح کے تمام محبانِ علیؑ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے اور عباسی داعی محمد بن علی نے ان کی شخصیت سے فائدہ اُٹھا کر اپنی تحریک پھیلائی تھی۔

مامون جانتا تھا کہ وقتی تسلط تو اس نے حاصل کر لیا ہے لیکن عرب و عراق اور

شام و ایران ہر علاقے میں آلِ نبیؐ کی مظلومیت کے جھنڈے گڑ چکے ہیں۔ سلطنت ادریسیہ مراقش میں قائم ہو چکی ہے۔ خود عباسیوں کی طرح کوئی خفیہ تحریک چل گئی تو حشر بنی اُمیّہ سے مختلف نہ ہوگا۔ یہ بات شاید اس کے علم میں نہ تھی کہ فاطمی تحریک ہارون رشید کے دَور سے چل چکی ہے لہٰذا اس نے دشمنی کو دوستی میں اور عناد کو مروّت میں بدل دینے کا عزم کر لیا اور امام رضاؑ کی خدمت میں تشریف لانے کا ایک خط بھیج دیا۔

دربارِ خلافت سے طلبی ہر دور میں ہوتی رہی تھی مگر کبھی کوئی امامؑ فوج کے گھیرے میں، کوئی رسن بستہ، کوئی زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب عباسی خلیفہ نے حکم کے بجائے استدعا کی تھی اور عزت و احترام کے ساتھ بلایا تھا۔

مامون کی مقصدی طلبی نگاہِ امامت سے چھپی نہ تھی لیکن امامؑ کو تو اپنے فرائض انجام دینا تھے، خواہ بوریے پر، یا تختِ حکومت پر ـــــ پھر بھی آپ نے خط کا جواب نہ دیا۔ اس کے بعد کئی خط یکے بعد دیگرے آئے لیکن آپ جانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

مامون کو احساس تھا کہ امامؑ اس چکر میں نہ پھنسیں گے مگر سادات کی مخالفت ختم کرنے کا اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہ تھا کہ امامؑ کی پشت پناہی حاصل کر لی جائے اور سازش کے ہر خطرے اور بغاوت کے ہر اندیشے کو دُور کر لیا جائے۔

آخر مامون نے اپنے ایک عزیز رجاء بن ضحاک کو چند ارکانِ سلطنت کے ہمراہ روانہ کیا، خط پڑھ کر امام کی زبان سے نکلا۔

"انسان تقدیرِ الٰہی سے مجبور رہے ـــــ"

حضرت علیؑ کا دَورِ خلافت امام رضاؑ کا رہنما تھا۔ آپ نے حضورؐ کے روضے پر حاضری دی، بلک بلک کر روئے کیونکہ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ آپؑ کو معلوم تھا۔ مدینے سے رخصت ہو کر آپ کعبۂ معظمہ پہنچے۔ مقامِ ابراہیم کے پاس نماز ادا کی اور رجب ۲۰۰ھ میں مرو کی جانب روانہ ہو گئے۔

لے جانے والے آپ کو کوفہ و قم کے راستے نہیں لے گئے کہ کہیں ان مقامات کے شیعہ آپ کو روک نہ لیں بلکہ بصرہ و اہواز کی راہ اختیار کی۔ آپ کی سواری جب نیشاپور کے قریب پہنچی تو علماء و فضلاء نے ایک منزل بڑھ کر استقبال کیا۔ لوگ ٹڈیوں کی طرح اُبل پڑے ـــــ اور آپ کو دیکھ کر بے اختیار رونے لگے ـــــ آپ نے محلہ غزونی میں قیام فرمایا جہاں آپ کے قدموں کی برکت سے پانی کا ایک خشک چشمہ اُبل پڑا۔

خراسان میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیش آئی، پھر آپ طوس میں وارد ہوئے۔ طوس سے سناباد آئے۔ یہاں قبۂ ہارون واقع تھا۔ آپ اس کے اندر تشریف لے گئے اور اس میں قبلہ رُو ایک خط کھینچ کر فرمایا۔

"میں اس جگہ دفن کیا جاؤں گا ـــــ"

مرو میں مامون نے بذاتِ خود خیر مقدم کیا اور تین روز بعد جب کسل سفر دُور ہوگیا تو مامون نے تنہائی میں آپ سے ولی عہدی قبول کرنے کی درخواست کی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ اسی طرح تین روز گزر گئے۔ وہ کہتا رہا اور آپ انکار کرتے رہے۔ آخر مامون سخت برہم ہو کر بولا۔

"اگر آپ قبول نہ کریں گے تو میں آپ کو قتل کر دوں گا ـــــ"

امام کو موت سے کیا ڈر ہوتا لیکن اتمامِ حجت کے لئے آپ نے فرمایا۔

"انکار میں ہلاکت کا خدشہ ہے اس لئے قبول کرتا ہوں ـــــ مگر ان شرائط کے ساتھ کہ کاروبارِ سلطنت سے میرا کوئی سروکار نہ ہوگا۔ نہ کسی کا تقرر کروں گا نہ برطرف اور نہ ملکی قانون میں کوئی ترمیم و تنسیخ۔ ہاں کسی مسئلے پر مجھ سے مشورہ کیا جائے گا تو خدا و رسولؐ کے حکم کے مطابق مشورہ دے دوں گا۔"

مامون نے منظور کر لیا اور آپ اپنے مقام پر آ کر گریہ و زاری کے ساتھ دُعا فرماتے رہے۔

"خداوندا! تو جانتا ہے کہ کس مجبوری سے میں نے اس امر کو قبول کیا ہے

مجھ سے مواخذہ نہ کرنا!"

یکم رمضان ۲۰۱ھ کو دربار عام کی تاریخ مقرر ہوئی اور حکم دیا گیا کہ لوگ کالے کپڑوں کے بجائے آلِ فاطمہ کا سبز لباس پہن کر آئیں۔

عباسیوں نے سخت مخالفت کی مگر مامون نہ مانا۔ ملکی مصلحتوں کو عام آدمی تو سمجھ نہ سکتے۔ مامون نے سب کو جھڑک دیا۔ بھرے دربار میں پہلے اس نے اپنے بیٹے عباس سے امام کی بیعت کرائی پھر اہلِ دربار نے بیعت کی۔ ایک شاندار تقریب میں امامؑ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔

بنی عباس ناخوش تھے اور محبّانِ اہلِ بیت بہت خوش لیکن خوشی و ناخوشی کا انجام مامون کو معلوم تھا یا امام کے علمِ امامت میں تھا۔

مامون نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنی بیٹی اُم حبیب کا عقد بھی اسی سال ۲۰۲ھ میں امامؑ کے ساتھ کر دیا اور آپ کے نام کا سکّہ بھی جاری کر دیا تاکہ کسی کو اس کی نیّت پر کوئی شک نہ رہے ـــــ مگر اُم حبیب کی رخصتی نہیں کی، وہی اپنی بہن عباسہ والی ترکیب، پھر جعفر کی طرح امامؑ کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔

بغداد میں آپ کی ولی عہدی کی خبر سے ہل چل پڑ گئی اور عباسیوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ سلطنت عباسیوں سے نکل کر آلِ رسولؐ میں پہنچ گئی۔ ان سب نے مل کر ابراہیم بن مہدی کو بغداد کے تخت پر بٹھا دیا اور مامون کی معزولی کا اعلان کر دیا۔

فضل بن سہل نے اس انقلاب کی خبر مامون کو نہ ہونے دی لیکن امامؑ نے ایک رات خود اس کے پاس جا کر خبردار کر دیا اور مامون فوراً بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔ سرخس میں اس نے وزیر سلطنت فضل بن سہل کو غداری کے جرم میں ایک حمام میں قتل کرا دیا۔ اسی طرح مامون نے ہرثمہ بن اعین کو بھی مروا دیا تھا

مامون کے طرفدار ہرثمہ کے قتل سے مامون کو بری الذمّہ ٹھہراتے ہیں جس میں جسٹس امیر علی بھی شامل ہیں لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ پھر زہر کس نے دلوایا تھا حقیقت یہ

ہے کہ وہ مامون کے سیاسی ذہن تک پہنچ ہی نہ سکے۔ مامون سیاست میں دُور رس نتائج کا قائل تھا، خواہ یہ نتائج کوئی لمبا راستہ اختیار کرکے ہی حاصل ہوں۔

وہ عباسی تھا اور عباسیوں کا سرغنہ بھی۔ اگر اس کو سلطنت بچانے کی فکر نہ ہوتی تو امام کو ایسی پیشکش ہی کیوں کرتا ــــ معاویہ بن یزید کی ایک نظیر اس سے قبل تاریخ پیش کرچکی تھی۔ اس نے اُس تخت پر بیٹھنا گوارا نہیں کیا جس پر امام حسینؑ کا سر رکھا گیا تھا اور مامون جس تخت پر بیٹھا تھا، وہ تو ہزاروں بار خونِ سادات میں ڈوب چکا تھا، اگر اس تخت سے مامون کو کراہت تھی تو اس کو حاصل کرنے کے لئے بھائی کو قتل کیوں کرایا؟ پہلے ہی دن حسین بن طاہر اور ہرثمہ بن اعین سے کہہ دیتا کہ مجھے ایسی خونی حکومت کی ضرورت نہیں، مامون کو اس کا خیال اس وقت کیوں آیا جب عباسی حکومت کو کسی انقلاب کے خطرات درپیش تھے۔

مامون حقیقتاً صرف پیغمبرؐ اسلام ہی کا دشمن نہ تھا بلکہ دینِ اسلام کا دشمن بھی تھا جس کے خلاف آزادیٔ خیال اور علوم کی سرپرستی کے بہانے اس کے دربار میں سازش کی گئی ــــ وہ صرف ایک فرماں روا تھا اور عباسی فرماں روا، ضرورت پڑنے پر اس نے اپنے پرچم کا رنگ سبز کردیا اور وقت گزر جانے پر پھر سیاہ کردیا۔ اپنے مقصد کے لئے وہ سب کچھ کرسکتا تھا۔

"بلاشبہ وہ اپنے بھائی امین الرشید کو قید خانے کی کوٹھڑی میں قتل کرا سکتا تھا اور یقیناً اس کے بھیجے ہوئے جلادوں کی تلواروں میں یہ قدرت تھی کہ سکین امین کے تکیہ کی ڈھالوں پر غالب آجائیں لیکن اس کی پوری حکومت اور حکومت کی تمام طاقتیں بھی اس سے عاجز تھیں کہ حاملینِ شریعت اور علمائے حق کے استقامت و ثبات پر غالب آسکیں اور ان کو حق و ہدایت کی اُس راہ سے پھرادیں جس پر ان کا یقین اور نورِ ایمان انہیں چلا رہا تھا۔

تاہم فتنہ عظیم تھا اور اس کے قہارانہ نتائج نے وہ سب کچھ کیا جو ایسے مواقع پر ہمیشہ ہوا ہے۔ بہت سے علمائے حق قید ہوئے بہت

سے جلا وطن کئے گئے، بعض خاک و خون میں بھی تڑپے اور بہتوں کے
قدم جادۂ ثبات سے ڈگمگا بھی گئے۔ (۱۱۲)

مولانا ابوالکلام آزاد نے تصویر کشی کی ہے ان فتنوں کی جو حریّت فکر کے نام پر مامون کے دربار میں اُٹھتے رہے۔

امام رضا علیہ السلام: ولی عہد سلطنت

بغداد میں ائمّام سے عام نفرت تھی۔ عباسی اور ان کے ہواخواہ شب و روز آپ کا وقار مجروح کرنے کی فکر میں لگے رہتے۔ ایک دن جب آپ مامون سے ملنے گئے تو کسی حاجب نے اندر جانے کے لئے پردہ نہیں اُٹھایا تاکہ آپ کی ذلت ہو مگر جیسے ہی آپ پردے کے قریب گئے، ہوا کا ایک جھونکا آیا اور پردہ خود بخود ایک طرف ہو گیا۔ واپسی میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب کئی روز یہ اتفاق پیش آیا تو تمام حاجب خود شرمندہ ہوئے اور انہوں نے یہ حرکت چھوڑ دی۔

کچھ دنوں کے وقفے سے رمضان آگیا اور رمضان کے بعد عید۔ مامون نے آپ سے عید کی نماز پڑھانے کے لئے کہا۔ آپ نے عذر کیا کہ جس طرح خلیفہ یا کوئی اور پڑھاتا ہے، ویسے ہی پڑھائے مگر مامون بضد ہو گیا تو آپ نے فرمایا۔

"میں اسی طرح جاؤں گا جس طرح میرے جد جایا کرتے تھے ــــــ"

مامون نے اجازت دے دی اور آپ عید کے دن اس طرح باہر نکلے کہ ہاتھ میں عصا، پائجامہ آدھی پنڈلی تک اُٹھا ہوا، کپڑے سمٹے ہوئے، ننگے پاؤں دو تین قدم چل کر آپ ٹھہرے اور منہ آسمان کی طرف اُٹھا کر کہا۔

"اللہ اکبر، اللہ اکبر ــــــ!"

پیچھے چلنے والوں نے بھی تکبیر کہی، پھر تکبیر کی آواز بلند ہوتی رہی اور در و دیوار سے آوازِ بازگشت سنائی دینے لگی، محسوس ہونے لگا کہ جیسے زمین و آسمان سب آپ کے ساتھ تکبیر کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔

بالاخانوں پر لوگ سواری کا منظر دیکھ رہے تھے، سب دوڑ پڑے، اسی

ہیئت میں نعرہ ہائے تکبیر لگانے لگے اور بعض لوگ تو جذبات میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے

"جلوس کا انتظام خود رعایا کی طرف سے تھا، دعوت خاص نہ تھی بلکہ عام تھی کسی کے لئے روک ٹوک نہ تھی۔ امیر و غریب خورد و کلاں سب امام کی زیارت سے مشرف ہو رہے تھے۔ بوڑھے اور ضعیفوں کے قدموں نے جواب دے دیا ہو مگر ان کے دل شوق دید میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ عورتیں لبِ بام کھڑی تھیں، مائیں اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے اور کاندھوں پر چڑھائے ہوئے تھیں اور اشارے سے دنیا کے اس انقلاب پسند، مساوات پرور اور امن آفرین خاندان کے آٹھویں قائد کی نشان دہی کر رہی تھیں جس کا نام برسوں سے ان کی زبان پر تھا۔ بچے پوچھتے:۔ اماں یہ کس کا جلوس ہے، آج کون عیدگاہ کی طرف جا رہا ہے؟ مائیں کہتیں:۔ یہ ہمارے امام ہیں، ہم سب انہیں کے نانا کا کلمہ پڑھتے ہیں، قرآن انہیں کے گھر میں نازل ہوا تھا۔ یہ ہماری شہربانو کے پوتے ہیں۔ دین اور دنیا دونوں کے بادشاہ ہیں۔ آج ابو مسلم خراسانی کی روح شاداں ہوگی، وہ ایک مرتبہ خوشی کے مارے قبر میں اُچھل پڑا ہوگا ــــــ

"اگر امام مصلّے تک پہنچ گئے تو منصور کی اولاد دیکھ لے گی کہ دوستوں سے دغا کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟ جس خاندان کے نام اور کام کی آڑ میں انھوں نے حکومت حاصل کی تھی، آج اس کا فرزند خود اہلِ خراسان کے سامنے جلوہ فرما تھا۔" (۱۱۳)

مامون کو خبر ہوئی تو اس نے فوراً آدمی آپ کی طرف دوڑایا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ آپ کو بہت زحمت ہو رہی ہے، آپ پلٹ آئیں۔

امام اسی جگہ رک گئے، پھر پلٹ کر اپنی جگہ آ گئے ــــ یہ واقعہ بھی مامون کی نیت کا عکاس ہے۔ وہ سنّت رسولؐ کی تصویر کشی کو برداشت نہ کر سکتا۔

مامون نے اپنے دربار میں مختلف مذاہب کے علماء کو جمع کیا تھا اور سیکڑوں

سال بعد پیدا ہونے والے اکبرِ اعظم کے لئے ایک راہ ہموار کی تھی۔ ایک دن مامون نے یہودی عالم راس الجالوت کو اشارہ کیا کہ امام سے بحث کرے۔ راس الجالوت بڑا متکبر اور مغرور عالم تھا۔ اس نے آپ سے کئی سوالات کئے اور آپ نے ان کے جوابات دے دیئے، پھر آپ نے پوچھا۔

توریت میں ہے "آیا نور سینا سے اور روشن ہوا جبل ساعیر سے اور ظاہر ہوا کوہ فاران سے"۔

اس نے اقبال کیا کہ "ہاں" ہے تو آپ نے اس کا مطلب پوچھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ نے تشریح فرمائی۔

"نور سے مراد وحی ہے، سینا سے کوہِ سینا، جبل ساعیر سے محل و مقام عیسیٰ کوہِ فاران سے جبلِ مکہ جو شہر سے ایک منزل پر واقع ہے"۔

پھر فرمایا۔ حضرت موسیٰ کی یہ وصیت دیکھی ہے تم نے کہ "تمہارے پاس بنی اخوان سے ایک نبی آئے گا۔ اس کی بات ماننا اور اس کے قول کی تصدیق کرنا"

راس الجالوت نے کہا۔ ہاں دیکھی ہے مگر اس کا مطلب نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا۔

"وہ اولادِ اسمٰعیلؑ ہیں، حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ حضرت اسحٰق کے بھائی ـــــ اور حضرت اسمٰعیل کی نسل سے حضرت محمدؐ ہیں"

پھر آپ نے جبل فاران والی بشارت کی تشریح کی۔

"شعیا نبی کا قول توریت میں مذکور ہے کہ میں نے دو سوار دیکھے جن کے پرتو سے دنیا روشن ہوگئی۔ ان میں ایک گدھے پر سوار تھا اور ایک اونٹ پر۔"

"بتا سکتے ہو راس الجالوت کہ وہ سوار کون تھے؟"

اس نے انکار کیا تو آپ نے فرمایا:۔

"راکب الحمار حضرت عیسیٰ اور راکب الجمل محمدؐ مصطفیٰ ہیں"۔

اس سلسلے میں آپ توریت کی تشریح کرتے چلے گئے اور راس الجالوت سر جھکا کر خاموش ہوگیا۔

ایسا ہی ایک مناظرہ نصرانی عالم جاثلیق سے بھی ہوا اور وہ لاجواب ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔

ایک بار ایک مجوسی عالم سے زرتشت کے بارے میں مناظرہ ہوا۔ اس کو بھی آپ نے خاموش کرا دیا۔

اسی زمانے میں معجزہ نمائی کا امتحان کرنے کے لئے مامون نے کہا۔

"یا ابن رسُول اللہ! بارش نہ ہونے سے قحط پڑ گیا ہے۔ دعا فرمایئے کہ بارش ہو جائے ـــــ!"

آپ نے کہا۔

"دوشنبہ کو طلبِ باراں کے لئے نکلوں گا۔"

لوگ وقت معیّن پر جوق در جوق جمع ہو گئے۔ امامؑ صحرا کی طرف بڑھے اور مُصلّیٰ بچھا کر دست بدعا ہو گئے۔ ابھی آپ کی دُعا تمام نہ ہوئی تھی کہ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ اَبر اُٹھا اور موسلا دھار پانی برسا۔ اس قدر پانی کہ جل تھل ہو گیا۔

بداعتقادوں میں سے ایک شخص حمید بن مہران نے کہا کہ بارش تو ہونا تھی، وہ ہوتی ہی، معجزہ تو اُس وقت ہے کہ قالین پر بنا ہوا شیر اصلی ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: "میں نے تو کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا لیکن خدا ہر بات پر قادر ہے۔"

پھر آپ نے شیر کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"اس فاسق و فاجر کو چیر پھاڑ کر کھا جا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رہے!"

یہ کہنا تھا کہ تصویر نے گوشت پوست کا پیکر اختیار کیا، جست لگا کر اُس منافق پر آ گرا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا گیا۔ مامون دہشت میں بے ہوش ہو گیا۔ آپ نے اس کو ہوشیار کیا اور شیر سے کہا۔

"اپنی اصلی حالت پر آ جا ـــــ"

شیر تصویر بن گیا، جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

اس طرح کے کتنے ہی معجزات آپ نے دکھائے مگر جن کے قلوب سیاہ ہو

ہو چکے تھے، ان میں روشنی کی کرن بھی نہ پھوٹی۔

مامون کے دربار کا ایک رُخ تو یہ تھا دوسرا رُخ ایک اور بھی تھا جو اس دکھاوے پر حاوی تھا جس میں خلیفتہ المسلمین جامہ تقدس وقبائے خلافت سمیت، علماء و محدثین کو جلو میں لئے دادِ عیش دیتا نظر آتا ہے، مغنیان نازک اندام حسن و شباب میں ڈوبی ہوئی، صدرِ محفل کے ساتھ فقہائے عصر کے ہونٹوں سے خود جام شراب لگاتی ہیں اور عالم بدمستی میں کوئی کیا کر رہا ہے، اُسے خود ہوش نہیں ہوتا۔ اس کا نقشہ علامہ شبلی نعمانی نے المامون میں اپنے قلم سے کھینچا ہے اور اس کی کوئی تاویل وہ پیش نہیں کر سکے۔ اور اسی سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

"ماننا پڑتا ہے کہ شاہانِ بنی عباس میں سیاست و حکمت عملی میں مامون رشید کا جواب نہ تھا اور بنی اُمیّہ میں بھی حضرت معاویہ کے علاوہ کسی کا نام بھی مامون کے ساتھ نہیں لیا جا سکتا۔ جانبداری سے کام نہ لیا جائے تو معاویہؓ کا بھی مامون سے تقابل نہیں ہو سکتا۔ اس نے جس سوجھ بوجھ سے دودھ کے اُبال کو ٹھنڈا کیا اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ امام رضاؑ کو لا کر اس نے انہیں اس طرح اپنی سپر بنا لیا کہ دودھ کا اُبال اُچھل کر اس کی طرف آئے تو چھینٹیں اس کے بجائے امامؑ پر پڑیں اور وہ بالکل بچا رہے۔"

اب حالات کا جوش و خروش ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس لئے امام رضاؑ کے خطرے کو باقی رکھنا عقل کا کام نہ تھا۔ اس نے ایک ذہنی منصوبہ بنا لیا اور بغداد سے طوس کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ امام بھی ساتھ ساتھ تھے۔ ایک دن اس نے امام رضاؑ کو بُلا بھیجا تو بہترین انگوروں کا ایک طبق اس کے قریب رکھا ہوا تھا۔ امامؑ کو اس نے عزت کے ساتھ بٹھایا اور کہا۔

"بہت اچھے انگور ہیں نوش فرمایئے۔"

آپ نے جواب دیا۔

"جنت کے انگور اس سے اچھے ہوتے ہیں۔"

اس نے بہت اصرار کیا تو آپ نے تین دانے اُٹھا کر کھا لیے جو زہر آلود تھے پھر آپ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مامون نے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ ——؟"

"جہاں تو نے بھیجا ہے ——" امامؑ نے جواب دیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنی جگہ آ گئے۔

تین روز تک آپ تڑپتے رہے۔ اس اثناء میں امام محمد تقیؑ باعجاز امامت مدینے سے آ گئے۔ آپ نے بیٹے کو اسرارِ امامت تعلیم فرمائے، پھر آپ کی روح مبارک جوارِ رحمت میں جا بسی۔ ۲۳ ذی قعدہ ۲۰۳ھ یوم جمعہ سرزمینِ طوس کے لئے ہمیشہ غم کا ایک پیغام لاتی رہے گی۔

مامون نے دکھانے کے لئے آپ کی موت پر بہت رنج کا اظہار کیا مگر دل ہی دل میں وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا کہ بنی عباس کے راستے کا سب سے بڑا کانٹا نکل گیا اور اس تدبیر سے سادات کی تحریک کے خدشات بھی دُور ہو گئے۔

ایک بیٹا اور ایک بیٹی آپ نے یادگار چھوڑی؛۔ بیٹے کا نام محمد تقیؑ تھا، بیٹی کا نام فاطمہ۔

معصومۂ قم

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی بیٹی جناب فاطمہؑ ۲۰۳ھ میں بھائی سے ملنے کے لئے مدینے سے مرو کی طرف روانہ ہوئیں۔ مقام ساوہ پر پہنچ کر آپ بیمار ہو گئیں موسیٰ بن خزرج اطلاع پا کر حاضرِ خدمت ہوئے اور آپ کو لے کر قم پہنچے، وہاں امام رضاؑ کی شہادت کا حال معلوم ہوا۔ اس صدمے سے آپ کی علالت بڑھ گئی۔ اور ۱۷ روز بعد انتقال فرما گئیں۔ بابلان میں قبر کھودی گئی تو ایک سرداب برآمد ہوا جو پہلے سے تیار تھا۔

آپ ابھی قبر میں اُتاری نہ گئی تھیں کہ دو نقاب پوش صحرا کی طرف سے آئے انہوں نے تدفین کی اور اسی طرح صحرا کی طرف چلے گئے۔ یہ کون تھے؟ معلوم نہ ہو سکا۔

امام رضاؑ کے بعد

اولادِ فاطمہ کو مدینہ امام رضاؑ کے بعد ویران و سنسان معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص آپ کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھا۔ معصومۂ قم کے عقب میں بہت سے لوگ ملاقات کے لئے روانہ ہوئے، جن میں بھائی، بھتیجے، دوست احباب اور عقیدت مند سب شامل تھے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد سات سو ہو گی۔ یہ لوگ شیراز کے قریب پہنچے تو انہیں امامؑ کی خبر شہادت ملی۔

محمد بن موسیٰ کاظم، شاہ چراغؒ، قائم اللیل اور صائم النہار، ان کے سرگروہ تھے وہ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ قتلغ شاہ حاکم شیراز نے انھیں آ کر گھیر لیا۔ شاہ چراغ نے اس موقع پر فاتح کربلا کو یاد کیا اور ساتھیوں سے کہا۔

"ہمیں پیٹھ نہیں دکھانا ہے، جس کو جانا ہو، وہ چلا جائے ــــــ"

پتہ نہیں چلتا کہ کوئی گیا یا نہیں گیا لیکن طرفین میں ایک ہولناک جنگ ہوئی۔ تین روز کی لڑائی کے بعد حاکم شیراز ہزیمت یاب ہو کر قلعہ بند ہو گیا۔ اب اس نے ایک ترکیب کی کہ تھوڑے سے آدمیوں کو مقابلے میں بھیجا اور وہ تھوڑی دیر لڑ کر قلعہ میں بھاگنے لگے۔ سادات بھی تعاقب میں اندر آ گئے اور چاروں طرف سے گھیر لئے گئے۔ مقابلہ ایک سے کئی کا ہوا، اس لئے آہستہ آہستہ سادات کی تعداد گھٹنے لگی اور ایک ایک کر کے سب ختم ہو گئے۔

شاہ چراغ کے چھوٹے بھائی حسین جن کی عمر تیرہ سال تھی، زخمی ہو کر ایک جھاڑی میں چھپ گئے، وہ کسی طرح بچ کر نکل گئے۔ نہر پر وضو کرتے ہوئے، باغبان نے انہیں بیلچہ مارا اور جسم کو پارہ پارہ کر دیا۔ وہ اسی مقام پر دفن کر دیئے گئے ــــ اتابک نے ان کی قبر پر گنبد بنوا دیا تھا جو گنبد باغ کے نام سے مشہور ہے۔

شاہ چراغ کے ایک بھائی علی بن حمزہ بھی زخمی ہو کر نکل گئے تھے۔ دامن کوہ میں جا کر بے ہوش ہو گئے۔ ایک درویش شیخ علی، بابائے کوہی اٹھا کر لے گیا۔ آپ کا علاج کیا۔ سات برس آپ اس کے پاس رہے۔

ایک دن شیخ نے تیل لانے کے لئے آپ کو شہر کی طرف بھیجا، واپسی پر چند منافقین نے دیکھ کر حملہ کر دیا اور شہید کر ڈالا، پھر سر علیحدہ کر کے حاکم شہر کے پاس لے جانے کی کوشش کی مگر سر کسی کے اٹھائے اٹھ نہ سکا۔ شیخ کو ہی تلاش کرتا ہوا آیا اور قریب پہنچا تو سر اچھل کر جسم سے جا ملا اور کچھ دور چل کر ایک مقام پر جسم سے علیحدہ ہو گیا۔ شیخ نے اسی مقام پر دفن کر دیا ـــــ جہاں آگے چل کر عضد الدولہ نے مقبرہ تعمیر کرا دیا۔

قتل کا یہ سلسلہ اس مقام پر ختم نہیں ہوا بلکہ مسلسل آگے چلتا رہا جیسے سادات پیدا ہی اسی لئے ہوتے تھے کہ اپنا خون دے کر ہر دور امامت کی بنیادوں کو استوار کرتے رہیں۔

نویں امام

امیر المومنین حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

۲۰۳ھ تا ۲۲۰ھ

ولادت وتربیت

آپ ۱۰ رجب ۱۹۵ھ کو مدینے میں پیدا ہوئے۔ ولادت کے بعد پہلا معجزہ یہ ظہور میں آیا کہ آپ کو نہلانے کے لئے طشت میں لٹایا گیا تو چراغ خود بخود گل ہو گیا مگر روشنی بدستور قائم رہی ——— یہ دلیل تھی اس حقیقت کی کہ چراغِ امامت سے جو روشنی پھیلتی ہے، وہ چراغ گل ہو جانے کے بعد اسی طرح پھیلی رہتی ہے۔

یہ امین بن ہارون کا دور تھا پھر مامون تختِ خلافت پر بیٹھا ——— آپ کی عمر ابھی پانچ چھ سال کی ہوگی کہ بغداد سے امام رضاؑ کی طلبی ہو گئی۔ آپ کو پوری طرح یاد تھا کہ امام رضاؑ کس کرب کے ساتھ قبرِ رسولؐ سے لپٹ کر روئے تھے۔ خود امام محمد تقیؑ بہت چھوٹے تھے۔ جی نہ چاہتا تھا کہ پدر عالی مقام کو جانے دیں مگر آپ نے بھی مشیت کے سامنے سر جھکا دیا۔

کوئی امامؑ کسی دنیاوی تربیت کا محتاج نہیں ہوتا لیکن ہر بچہ باپ کے سایہ عاطفت میں پلنا چاہتا ہے۔ اس حیثیت سے امام محمد تقیؑ کو پانچ سال ملے۔ اس مدت میں سادات پر ظلم وجور کی داستانیں آپ سنتے رہے اور خاندانِ رسالتؐ کی دو سو سالہ تباہی کی سرگزشت بھی آپ کے کانوں میں پڑی لیکن آپ امام زادے تھے اور ہونے والے امامؑ بھی، اس لئے بڑے تحمل سے سب کچھ سُنا اور وہ بھی دیکھا

جس سے امام رضاؑ دوچار ہوتے تھے۔

مامون نے بڑی عزت کے ساتھ امام رضاؑ کو بلوایا تھا پھر بھی آپ نے اس طرح پدر گرامی کو دیکھا تھا گویا اب پھر کبھی نہ دیکھیں گے۔ وہی ہوا کہ دو ڈھائی سال بعد ایک دن غیب کی ایک آواز آپ کو سنائی دی اور پھر ایک فرشتہ آکر دوش ہوا پر آپ کو خراسان لے گیا۔ تجہیز و تکفین کرکے آپ واپس ہوئے تو آپ کی عمر آٹھ سال ہوگی دیکھتے ہی دیکھتے خونِ سادات کی ارزانی پھر شروع ہوگئی اور امام محمد تقیؑ صبر کے گھونٹ پیتے رہے۔

امام محمد تقیؑ: بغداد میں

مامون نے اخفائے جرم کی ہر تدبیر پہلے سے کرلی تھی مگر امام رضاؑ کے بعد ایک سوال ہر شخص کے ذہن میں پیدا ہوا کہ زہر کس نے دیا؟ آپ نے جن لوگوں کو پہلے یا بعد میں بتایا تھا، ان کے بیان کو تسلیم نہ کیا جاتا تب بھی زہر دینے والا کوئی تھا ہی اور وہ مامون ہی ہوسکتا، کیونکہ تھوڑی دیر پہلے آپ اچھے خاصے گئے تھے اور واپس آئے تو حالت غیر تھی۔ اس طرح ہر ایک نے سمجھ لیا کہ مامون ہی نے آپ کی شہادت کے اسباب فراہم کئے۔

مامون کا مقصد بظاہر پورا ہوچکا تھا پھر بھی شہادت کے مابعد اثرات ظاہر ہو رہے تھے اور مختلف جگہوں پر بغاوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

امام رضاؑ کو نظر کے سامنے رکھنے سے مامون کے کئی مقاصد تھے جو کچھ تو پورے ہوئے تھے اور کچھ نہیں۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے کو بری الذمہ ثابت نہ کرسکا۔ لوگ اس کو قتلِ امام پر مطعون بھی کرنے لگے، لہٰذا اس نے سوچا کہ امام کے بیٹے امام محمد تقیؑ کو بلواکر بغداد میں رکھے۔ عام لوگ اس کو تلافی مافات سمجھیں گے لیکن بغداد کا مرکز اس کے ہاتھ میں رہے گا پھر ایک امکان یہ بھی تھا کہ امام محمد تقی کی پرورش امیرانہ ماحول میں ہوگی تو وہ اجداد کی روش چھوڑ کر اس رنگ میں رنگ جائیں گے۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے ایک منصوبہ بنایا اور امام محمد تقیؑ کو اسی

انداز پر بغداد طلب کر لیا، جس انداز پر امام رضاؑ کو لایا گیا تھا

امام محمد تقیؑ اگرچہ ابھی بلوغت کے دائرے میں داخل ہی ہوئے تھے مگر امامؑ تھے آپ کے بشرے پر علم لدنی کا کمال اور چہرے سے اسلاف کا جاہ و جلال ٹپکتا تھا۔ بغداد میں آپ کو آرام و آسائش کا ہر سامان فراہم کر دیا گیا لیکن آپ نے اپنی ذات خاص کے لئے وہی بوریہ اور کمبل رکھا اور محل سے الگ مکان لے کر رہنے لگے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ امام رضاؑ ولی عہدی کے زمانے میں زرق برق کپڑوں میں ملبوس نظر آتے تھے مگر اندر آپ کے جسم پر وہی کھاردے کا لباس ہوتا۔ جواں سال محمد تقیؑ کی بھی یہی صورت تھی ـــــ ایک دن آپ سرراہ چند نوجوانوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے کہ مامون کی سواری اُدھر سے گزری، سب بھاگ گئے مگر آپ کھڑے رہے۔ مامون نے پوچھا۔

"صاحب زادے، تم کیوں نہیں بھاگے؟"

"میرے چلے جانے سے راستے کی کشادگی بڑھ تو نہ جاتی ـــــ پھر میں نے کوئی خطا بھی تو نہیں کی تھی اور بے خطا کو آپ سزا کیوں دینے لگے!"

آپ کے جواب میں ایک طنز چھپا ہوا تھا جس کو مامون سمجھ نہ سکا اور اس نے آپ کی بات کو پسند کیا ـــــ وہ اپنے باز لے کر شکار کے لئے جا رہا تھا۔ ایک باز چھوڑا گیا تو وہ واپسی پر ایک چھوٹی سی مچھلی کو منہ میں دبا کر لایا مامون نے اس مچھلی کو مٹھی میں لے لیا واپسی پر امام کو اسی جگہ پایا، تو ان سے پوچھنے لگا۔

"بتائیے میری مٹھی میں کیا ہے؟"

"ابر دریاؤں سے بخارات لے کر بلند ہوتا ہے کبھی کبھی کوئی بہت چھوٹی مچھلی بھی ابر میں چلی جاتی ہے جس کو کسی بادشاہ کا باز پکڑ لاتا ہے اور بادشاہ اس کو مٹھی میں چھپا کر خاندانِ رسالتؐ کا امتحان لیتا ہے۔"

مامون آپ کے جواب پر حیران رہ گیا اور بولا

"بے شک تم امام رضاؑ کے بیٹے ہو ـــــ"

لوگ کم سنی کے سبب آپ کو خاطر میں نہ لاتے لیکن جب آپ کی طرف سے علم و عرفان کا مظاہرہ ہوتا تو حیرت کا ٹھکانہ نہ رہتا۔ یہی صورت مامون کی بھی ہوئی اور وہ دل ہی دل میں سوچتا رہا۔ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے!

اس دن کے بعد سے وہ آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کرنے لگا۔ روز آپ کو بلا کر تخت پر بٹھاتا اور آپ کی باتوں سے استفادہ کرتا تھا۔

خونِ سادات

کچھ عجیب پالیسی تھی مامون کی بھی، ایک طرف یہ سیاسی کھیل ہو رہا تھا، دوسری طرف وہی خونریزی :-

تبریز میں دختران خانوادۂ رسالت سلیمہ، حکیمہ، سکینہ اور رحیمہ قتل کر دی گئیں پھر فاطمہ، سکینہ، شریفہ اور صفیہ بنات عبداللہ بن ہادی شیراز میں شہید ہو گئیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرد تو مرد عورتیں بھی قابلِ معافی نہ تھیں۔

محمد بن ابراہیم کے صاحب زادگان ہمدان میں پناہ گزین ہوئے تھے جن میں حسن و محسن قتل ہو گئے، باقی بچ کر سلطانہ چلے گئے لیکن وہاں بھی محفوظ نہ رہے انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

رے میں یحییٰ، موسیٰ، مسیب، مختار، عباس و ہارون پسران عبداللہ ابن جعفر شہید ہو گئے۔

سنہ ۲۰۵ھ کا ایک واقعہ ان تمام خونیں داستانوں کو ماند کرتا ہے۔ دغا بازی سے امام رضا کی شہادت نے بنی ہاشم میں اتنا اشتعال پیدا کر دیا تھا کہ لوگ خود اپنے قابو میں نہیں رہے تھے۔ چنانچہ ۲۷۰۰ افراد کا ایک قافلہ جوشِ انتقام میں ڈوبا ہوا مدینے سے نکلا اور خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس قافلے نے علاقہ شہریار کے موضع سار دقمش میں قیام کیا۔ شہریار کے حاکم نے مامون کو لکھا۔ اس نے حسن سمنانی اور سیاہ پوش سمنانی کو متعین کیا کہ ان میں سے کوئی بچ کر جانے نہ پائے۔ چالیس ہزار فوج نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ مقامی باشندے

سادات کے ساتھ تھے وہ انہیں رسد پہنچاتے رہے لیکن تابہ کَے۔ آخر امام زادے شمشیر بکف میدان میں آ گئے اور شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ چھ ہزار موذیوں کو فی النار کر دیا مگر سادات کی ایک تعداد بھی شہید ہو گئی۔

اس عرصے میں مزید لشکر کمک کے لئے آ گیا پھر بھی سادات نے مقابلہ کیا لیکن انھیں شکست ہوئی اور ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی، باقی بھاگ نکلے۔

علی، جعفر اور ابراہیم نے شہریار میں پناہ لی جہاں منصور دمشقی کے ہاتھوں مارے گئے۔

علی بن امام موسیٰ کاظمؑ کو اسکنان میں حارث نے قتل کیا۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے بیٹے اور پوتے ہارون اور احمد اپنے متعلقین کے ساتھ کوہ الیاس پر چلے گئے تھے۔ دشمنوں نے تعاقب کر کے سب کو تہہ تیغ کر دیا، صرف احمد جان بچا کر شام پہنچ سکے۔

جعفر، محمد اور حسین پسران محمد باقرؑ کو موضع جرمان میں الیاس دمشقی نے شہید کیا ابراہیم، سلیمان اور ان کی بہن کو سیاہ پوش سمنانی نے۔ علی بن امام زین العابدینؑ اپنی دو بہنوں سمیت زرک کے چشمے پر وضو کر رہے تھے کہ وہاں کا رئیس گلفام پہنچ گیا۔ اس نے سب کو قتل کر دیا۔

زید و محسن پسران قاسم بن امام محمد باقرؑ کو قلعہ پایان میں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

موسیٰ و اطہر اولاد موسیٰ کاظمؑ میں سے تھے دونوں مع اپنی بہن کے قریہ کبودگنبد میں قتل کئے گئے۔

سارو قسش میں کئی امام زادوں کے سر اتارے گئے اور ان کے سروں کو مامون کے پاس بھیجا گیا لیکن راستے میں ناصر آباد کے قریب ابوذر غفاریؓ کی نسل کی ایک مومنہ رابعہؒ نے اپنے اقربا کے ذریعہ ان سروں کو چھین لیا اور سیاہ پوش کو قتل کر دیا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کے بیٹے عون نے بھی اسی جنگ میں شہادت پائی۔

امام موسیٰ کاظمؑ کی اولاد سے محمد، یعقوب، زکریا، ابوطالب، طاہر، عبداللہ ناصر، عمار، عبدالمطلب، ہاشم، مظہر، خضر اور الیاس کندر کی طرف چلے گئے لیکن مامون کے عمال نے پیچھا کر کے ان سب کو تہہ تیغ کر دیا۔

صالح برادر محمد فاضل و کامل بزرگ تھے مامون نے انہیں زہر دے کر مار ڈالا۔

محمد بن ابی عمیر ازدی جلیل القدر عالم اور یگانہ عصر تھے۔ سو سے زائد کتب کے مصنف۔ امام رضاؑ کی شہادت کے بعد مامون نے شیعوں کے نام نہ بتانے کے جرم میں انہیں قید کر دیا اور سو تازیانے لگوائے۔

یہ تھوڑے سے نام مصائب الابرار اور دوسرے تذکروں سے ماخوذ کئے گئے ہیں ورنہ مکمل فہرست کوئی بنا سکے تو ان کا شمار مشکل ہوگا۔ تنہا مامون رشید کے کشتگان ہزاروں سے تجاوز کر جائیں گے۔

تاریخ اس کو مامون اعظم کہے یا کچھ اور مگر ہماری نظر میں وہ چنگیز خان اعظم کا نقش اول تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چنگیز صحرا سے اٹھا تھا صحرا ہی میں رہا اور مامون کے اجداد تھے گرچہ صحرائی لیکن پیغمبرؐ عرب کے قدموں کے صدقے میں متمدن بن گئے اور اب مامون بغداد کے پرشکوہ دارالامارہ میں بصد جاہ و جلال تخت سلطنت پر متمکن تھا مگر اسی پیغمبرؐ عرب کی اولاد کا خون اس کی باچھوں سے بہہ رہا تھا، جس کو وہ بار بار ایک نئے رومال سے پونچھ لیتا تھا۔

مشرق کا عظیم دربار

کچھ دنوں قبل دنیا نے اسی دربار میں رسول اسلام کے آٹھویں جانشین کو دیکھا تھا، جس نے مذاہب عالم کے نمائندوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ آج اس کی جگہ ایک طفل دہ سالہ کو منصور اعظم نے لا بٹھایا تھا۔ اس دربار میں ایک طرف نصرانیت، صیہونیت، مجوسیت اور دہریت کے علم بردار، اس سے کچھ فاصلے پر مسلک اعتزال کے علماء نزدکش تھے۔ جس کے بانی واصل ابن عطا، امام جعفر صادقؑ کے شاگرد بھی تھے اور جنہوں نے حسن بصری سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ ابوحذیفہ واصل بن عطا الغزال

۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ خاندانِ رسالتؐ سے ان کی آبائی وابستگی تھی لیکن دماغ فلسفیانہ پایا تھا۔ آزاد خیالی پہلے انہیں حسن بصریؒ کے مدرسے میں لے گئی، پھر استاد سے اختلاف کے سبب انہوں نے خود اپنا مدرسہ کھول لیا اور افکار و عقائد کی ایک نئی شاہراہ بنا کر ۴۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ان کے شاگردوں میں کچھ باکمال لوگ گزرے ہیں جنہوں نے مامون کے درباری علماء کے ناطقے بند کر دیئے تھے تاہم وہ اتنے محتاط رہے کہ ہمارے آئمہ برحق سے متصادم نہیں ہوئے ــــــ دوسری طرف امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید ابو یوسف اور ان کے ساتھ بڑے بڑے فقہاء و محدثین۔ پھر درمیانی فصل میں موسیقی اور دیگر فنون کے باکمال جن کا سرپرست نام نہاد امیرالمومنین مامون رشید تھا۔

امام علی رضاؑ کا دس سال کا بیٹا ان کہن سال لوگوں کے سامنے بظاہر کیا حقیقت رکھتا مگر وہ اس طرح فروکش تھا، جیسے اس کے سامنے کسی کی کوئی قیمت ہی نہ ہو۔ منصور نے اس دن کے لئے تمام عمائدین سلطنت کو دعوت دی تھی۔ وہ سب موجود تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نو سو کرسیاں صرف علماء و فضلاء کے لئے مختص کی گئی تھیں منصور نے ایک بار دربار پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور قاضی القضاۃ یحیٰی بن اکثم سے کہا۔

"تم ان سے کچھ پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو۔"

مجمع ایک تحیّر میں دیکھنے لگا۔ کہاں گرگ باراں دیدہ یحیٰی، کہاں یہ نوخیز جوان بلکہ بچہ مگر بچہ کس کا تھا اور اس کی حیثیت کیا تھی، وہ گہوارے میں بھی ہوتا تو بھی امامؑ تھا۔ یحیٰی نے خانوادۂ رسالتؐ کے احترام کو ملحوظ رکھ کر امامؑ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"پوچھ سکتا ہوں کچھ ــــــ؟"

"بسم اللہ ــــــ" امام نے فرمایا اور یحیٰی نے سوال کیا۔

"حالت احرام میں کوئی شکار کرے تو کیا حکم ہے اس کے لئے؟"

"سوال مبہم ہے۔ آپ نے فرمایا۔" اس میں کئی باتیں صراحت طلب ہیں، شکار

حل میں تھا یا حرم میں، شکاری مسئلے سے واقف تھا یا نہیں، اس نے عمداً جانور کو مار ڈالا یا دھوکے سے قتل ہوگیا، شکاری آزاد تھا یا غلام، کمسن تھا یا بالغ، پہلی دفعہ ایسا کیا تھا یا اس سے قبل بھی کر چکا تھا۔ شکار پرندہ تھا یا کوئی اور جانور، شکاری کو اپنے فعل پر پشیمانی ہے یا نہیں، شکار رات میں چھپ کر کیا یا دن دہاڑے، احرام عمرے کا تھا یا حج کا؟"

ان سوالات سے یحییٰ کے چہرے پر شکستگی کے آثار پیدا ہوگئے جس کو محسوس کر کے مامون نے امامؑ سے کہا۔

"آپ ان شقوں کے احکام بیان فرمائیں ــــــ"

امامؑ نے ایک ایک شق کی تصریح کی پھر حکم بیان کیا۔ حاضرینِ دربار اور یحییٰ بن اکثم سب متحیر رہ گئے اور مامون نے امامؑ سے کہا۔

"آپ چاہیں تو قاضی سے سوال کر سکتے ہیں۔"

امامؑ نے یحییٰ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ، جس پر صبح ایک عورت حرام تھی، دن چڑھے حلال ہوگئی، ظہر کے وقت حرام تھی، عصر کے وقت پھر حلال ہوگئی، آدھی رات کو حرام تھی، صبح کو پھر حلال ہوگئی۔"

قاضی یحییٰ اتنا گھبرا گیا کہ اس کے منہ سے آواز نکلنا مشکل ہوگئی۔ وہ نہایت عاجزی سے بولا۔

"فرزندِ رسولؐ۔ آپ ہی وضاحت فرمائیں۔"

آپ نے فرمایا۔

"وہ عورت کسی کی لونڈی تھی۔ صبح کو ایک اجنبی نے اس پر نظر ڈالی تو وہ حرام تھی۔ دن چڑھے اس نے اس لونڈی کو خرید لیا تو حلال ہوگئی۔ ظہر کے وقت اس کو آزاد کر دیا تو حرام ہوگئی۔ عصر کے وقت اس نے اس سے نکاح کر لیا تو حلال ہوگئی۔ مغرب کے وقت اس سے ظہار کیا تو پھر حرام ہوگئی۔ عشاء کے وقت ظہار کا کفارہ دے دیا تو

توحلال ہوگئی۔ آدھی رات کو طلاق رجعی دے دی تو حرام ہوگئی۔ صبح کو اس طلاق سے رجوع کرلیا تو پھر حلال ہوگئی۔"

مجمع اچھل پڑا اور مامون نے بڑی مسرّت کا اظہار کیا۔ اُس وقت واقعی اس کی نیت خالص معلوم ہو رہی تھی۔

مورخین مامون کے سلسلے میں رطب اللسان ہیں لیکن یہ تعریف اگر کسی غیر مسلم حکمران کی حیثیت سے ہوتی تو جبر و ستم کی تمام داستانیں بھی گوارا ہو جاتیں لیکن غضب تو یہ تھا کہ وہ اپنے کو امیر المومنین کہتا اور رسول اللہ کی مسند خلافت پر بیٹھا ہوا تھا۔

مامون کے ہاتھوں اسلام کو جتنا نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہارون رشید نے اہل سنت والجماعت کا ایک حلقہ منقش کیا تھا مگر اس کو باقاعدہ تشکل مامون نے دی اور امام ابو یوسف سے اپنے استاد ابو حنیفہ کے فتادے مدون کرا کے اس کو فقہ حنفیہ کا نام دیا۔ اس کے علاوہ جو فقہ تھی، اس کا نام فقہ جعفر یہ رکھ دیا۔ جب کہ یہی فقہ حضرت علیؑ کے دور سے چلی آرہی تھی اور اس کا نام فقہ اسلام تھا، امام جعفر صادق سے منسوب کرنے کا محل ہی کیا تھا۔

ہر شخص کو اس نے اظہار خیال کی اتنی آزادی دی کہ اسلام پر بلا روک ٹوک حملے ہوئے اور فقہا سے ان کے جوابات بن نہ پڑے۔ انجام کار دہریت فروغ پانے لگی۔

مسلمانوں میں مسئلہ خلق قرآن پیدا کر کے اتنی الجھنیں پیدا کر دیں کہ آپس میں خون خچر کی نوبت آگئی۔

واصل بن عطا کا مذہب اعتزال اسلام اور مختلف النظریات عقائد کا آمیزہ تھا جس میں مزدک ومانی کے بعض فلسفیانہ اصول بھی شامل تھے۔ مامون نے خود بھی اس کو قبول کیا اور سارے ملک میں اس کی اشاعت کے احکام جاری کئے۔

اکبر اعظم کا دین الٰہی شاید اسی کی بگڑی ہوئی تشکل تھا مگر اکبر کے گریبان میں ہاتھ اس لئے ڈالا نہیں جا سکتا کہ اسلام کی مسندِ خلافت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا

وہ تو مادی دنیا کا ایک حکمراں تھا۔

اور ان سب پرستزاد صرف بقائے حکومت کی خاطر اولاد رسولؐ کا مسلسل قتلِ عام کسی طرح قابلِ معافی نہیں ہو سکتا۔

مامون کی پالیسی پر ایک انتقادی نظر ڈالی جائے تو اس کی حکومت کے راستے میں دو چیزیں حائل تھیں : اولادِ رسولؐ اور اسلام۔ اولاد رسولؐ کو تو ہر فرمانروا نے تختہ مشق بنایا تھا۔ اسی طرح اس نے بھی بنایا لیکن اس کے وقت میں سادات عوام کو لے کر کربلا کی تاسی پر اُتر آئے تھے لہذا اس نے بیٹی دینے کے بہانے ائمّام وقت کو اپنی شریفانہ حراست میں لے لیا اور سادات کے قتل کا جو سلسلہ پہلے سے جاری تھا، اس کو اسی طرح جاری رکھا۔

رہ گیا اسلام، تو اس کو کمزور کرنے کے لئے حریّت فکر کے نام پر اس نے کئی محاذ بنائے۔

پہلا محاذ واصل بن عطا کے مسلک اعتزال کا تھا جس میں شیعی عقائد دوسرے نظریات میں شامل کر کے شیعی عقائد کی شکل بگاڑ دی تاکہ علوی افکار کے لوگ آزاد خیالی کے نام پر ادھر متوجہ ہو سکیں۔ مامون خود اس مسلک کا سرپرست تھا۔ یہی کئی ادوار تک سرکاری مسلک رہا۔ اس کی براہِ راست ضرب اس عقیدے پر پڑتی تھی جس کے علم بردار علیؑ کے جانشین تھے۔

لیکن اس میں اس کو کامیابی کا پورا یقین نہ تھا لہذا اس نے اہلِ سنت والجماعت کے اس حلقے کو مضبوط کیا جس کا نام معاویہ نے تجویز کیا تھا مگر جس کی داغ بیل آگے چل کر منصور دوانیقی نے ڈالی تھی۔

امامت شیعوں کے اصولِ دین میں ہے اور ان کے عقیدے میں ہر نائب رسولؐ امام ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ اس لئے منصور نے جب امام جعفر صادقؑ کے خلاف علماء اور فقہاء کا محاذ بنایا تو ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کو امام اعظم اور عالم دہر کے خطابات دے کر اس شعبے کا حاکم مقرر کیا اور امام

کا تقرر خدا کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح اس لفظ کی تخصیص خاندانِ رسالت سے ختم کرنے کی کوشش کی جس کے بعد امام مالک اور دوسرے امام ہوگئے اور زہری کے نام کے ساتھ بھی امام کا اضافہ ہوگیا۔

ان اماموں کی تقسیم کی جائے تو پہلی قسم وہ ہے جو محمدی ہے، دوسری قسم حکومتِ وقت کی ـــــ حکومت کے یہ امام اُس مسلک کے سربراہ تھے جس کا نام منصور نے رسمی طور پر اہلِ سنت والجماعت رکھا تھا۔ ہارون رشید نے جس کی پشت پناہی کی اور مامونِ اعظم نے امام ابویوسف کی سربراہی میں جس کا باقاعدہ محکمہ بنا دیا۔ پھر خداساز اور انسان ساز اماموں کے دو مستقل حلقے قائم ہوگئے۔

آنحضرتؐ نے اسلام کا جو آئینِ حیات اور دستورالعمل پیش کیا تھا اس کا مرکز و محور اہلِ بیت تھے لیکن نیرنگ زمانہ سے انصرامِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں آپڑا، اُن میں سے کوئی اس پر تبحّر نہ رکھتا۔ اس لئے شروع میں تو خانوادۂ رسالتؐ اور مؤقر صحابہ کرام سے پوچھ گچھ کر کام چلا لیا گیا اور کہیں کہیں پر اپنے قیاس کو دخل دے کر احکامِ شرعی نافذ کر دیے گئے لیکن یہ ضرورت اوّل دن سے محسوس کی گئی کہ اہلِ بیت کی محتاجی ختم ہونا چاہیئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر یہ تقاضا بڑھتا رہا مگر جب معاویہ بن ابی سفیان ترمیم شدہ مسلمان کی حیثیت سے خلیفۂ وقت کے مقابل آکھڑے ہوئے تو انہوں نے اسلام میں بھی تنسیخ و اضافہ کردیا کیونکہ اب اصحابِ نبیؐ کی اکثریت ختم ہوچکی تھی اور جو باقی تھے ان کی آنکھیں تلواروں کی چمک سے چکا چوند ہو رہی تھیں۔

حضرت معاویہ باضابطہ طور پر تو اسلام کو رسولؐ کے گھر سے اپنے گھر نہ لا سکے مگر بنی عباس نے ان کے اس خواب کو پورا کر دکھایا اور نہ صرف اسلام کو بیتِ نبیؐ کی اجارہ داری سے باہر نکال لائے بلکہ خدا کے بخشے ہوئے منصبِ امامت کے سامنے اپنے بنائے ہوئے امام بھی لا کھڑے کئے۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ امام دو تھے ایک محمدی، دوسرے حکومتی یا عوامی

حکومتی امام فقہ حنفیہ کا مبلّغ تھا لہذا محمدی امام کی فقہ کا نام بھی کچھ ہونا ہی چاہیئے تھا۔ یہ مشکل بھی مامون نے حل کر دی اور اس کو امام جعفر صادقؑ سے منسوب کرکے اس کا نام فقہ جعفری رکھ دیا۔

اسلام اور آلِ رسولؐ پر یہ بڑی کاری ضرب تھی ـــــ حضرت معاویہ نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی کہ مسلمانوں کے دو مستقل دھڑے بنادیں مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سہرا بنی عباس بلکہ مامون اعظم کے سر پر بندھا اور اس کے بعد سے آج تک امامت کے دو گروہ اور فقہ اسلام کی دو شاخیں پائی جاتی ہیں۔ ایک امامیہ، دوسری اہلِ سنت والجماعت۔ پھر دوسری شاخ میں بہت سی شاخیں پیدا ہوگئیں۔ متوکل اور اس کے بعد سے فقہ حنفی سلاطین کی سرپرستی میں پھلتی پھولتی رہی اور عوامی امامت کے ذیل میں ناموں کا اضافہ ہوتا رہا۔ امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ، امام حافظ ابن قیم، امام غزالی، امام فخرالدین رازی اور دوسرے آئمہ گزرتے رہے۔

فقہ اسلامی سے ایک فقہ منصور دوانیقی نے درآمد کی تھی تو بعد کے بعض آئمہ نے نظریاتی اختلافات کے تحت اپنی اپنی الگ فقہیں نکال لیں اور ان کے علیحدہ علیحدہ نام رکھ لئے، جیسے فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی۔ پھر ایک مسلک محمد بن عبدالوہاب نجدی نے پیدا کیا جو وہابی کہلاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی ایک مستقل فقہ ہے جس پر امام ابن تیمیہ اور امام احمد بن حنبل کی چھاپ ہے۔

حنفی فقہ کو کسی ذہن کی پیداوار قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ وہ روایات کے اُس انبار سے نکالی گئی ہے جس کا ذخیرہ رحلت رسولؐ کے بعد سے ہونے لگا تھا۔ اموی دور میں اس کی حیثیت اس خزانے کی ہوگئی تھی جس میں اصلی اور جعلی دونوں سکّے کثرت سے بھرے ہوئے ہوں اور جعلی سکّے اس خوبصورتی سے ڈھالے گئے ہوں کہ اصلی سکوں سے ان کا امتیاز مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہو جائے۔

اس پر راویوں کی بہتات کہ ثقہ اور غیر ثقہ کی تمیز آسان نہ رہی۔ پھر ستم

بالائے ستم یہ کہ روایتوں کا انتخاب کرانے والا اہلِ بیت کا کٹر دشمن تھا۔ نتیجے میں جو کچھ مرتب ہوا وہ بیشتر ایسا، جو تعلیماتِ علیؑ کے خلاف تھا۔ بعد کے لوگوں نے اسی سطح پر کھڑے ہو کر دیکھا اور وہ اس کو برحق سمجھتے رہے اور آج بھی برحق سمجھتے ہیں۔

یہ تو صرف وہ حالات تھے جن میں مقصدی طور پر تدوین فقہ ہوئی۔

ہمارا جہاں تک تعلق ہے، ہمیں تو کبھی چین سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ آئمہ کے دور تک اور اس کے بعد ایک طویل عرصے تک تو اکثر و بیشتر تقیہ میں رہے۔ ۱۵ ارشعبان ۳۲۹ھ کو باب امامت قربِ قیامت تک کے لئے بند ہو گیا، تب بھی یہ جرم باقی رہا کہ ہمارے دلوں میں علیؑ کی محبت ہے اور اس جرم میں ہم پر ظلم و ستم اسی طرح روا رکھا گیا جس طرح پہلے ہوتا رہا تھا۔

اب کوئی منصوص من اللہ امام بظاہر روئے زمین پر نہ تھا مگر جس طرح آئمہ کی تعلیمات باقی تھیں، اسی طرح آئمہ کی عداوت بھی۔ یہ عداوت اب کیوں تھی؟ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ــــــ پھر وقت کے تدریجی ارتقا کے ساتھ علی کی عداوت محبانِ علیؑ کی عداوت میں منتقل ہو گئی۔ تبرا اب بھی کیا جاتا مگر اب اس میں علیؑ اور اولادِ علیؑ کی بجائے محبانِ علی کے نام لئے جاتے۔ بغداد کے دربارِ خلافت اور غزنی کے در و دیوار جس کے گواہ ہیں۔ ہم پر مسلم سلاطین کے دور میں بھی لعنت کی گئی۔ صلاح الدین ایوبی اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے جس کی شہادت دیں گے۔

ایسے میں ہمارے لئے اس ذخیرۂ احادیث کا محفوظ رکھنا آسان نہ تھا جو علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کے برگزیدہ اصحاب ہمارے لئے چھوڑ گئے تھے۔

ہم ہر زمانے میں تلوار کی زد پر رہے، ہمارے گھروں کو نذر آتش کیا گیا اور بار بار اس روایتی مواد کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا جو ہمارے اسلاف جمع کرتے آئے تھے۔ پھر بھی خدا رحمت کرے ان صاحبانِ ایمان پر جو شمشیروں کی چھاؤں میں جہاد یا تعلیم کرتے رہے اور ہماری رہبری کے لئے ایک دینی سرمایہ چھوڑ گئے جو کلام الٰہی کے بعد

رطب و یابس سے پاک تھا لیکن منافقوں نے اس میں بھی جعلی حدیثیں جمع کر دیں. ہماری اصلی روایتیں جب وضعی روایتوں کے سامنے رکھی جاتی ہیں تو انہیں من گھڑت کہہ دیا جاتا ہے یعنی اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

ہمارے مرتبین احادیث میں محمد بن یعقوب کلینی، شیخ صدوق، شیخ مفید سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، سید رضی، شیخ طوسی، علامہ مجلسی اور اس طرح کے چند دوسرے نام ہیں جن کی تالیفات سے ہماری فقہ اسلامی کا تعین ہوتا ہے اور ہم اسی کو حق سمجھتے ہیں۔

اب نہ خلافت کا قصہ ہے اور نہ حکومت کا، آخر اب ہم سے اتنی پرخاش کیوں ہے؟ ہمارا ایک سیدھا سادھا مسلک ہے: رسولِ اسلام اور آئمہ مامورمن اللہ۔ کوئی کسی طرف جائے، ہم اس کو نہیں روکتے اور نہ کسی کو بجبر اپنی طرف بلاتے ہیں البتہ ہم دوسروں کے راستے کو صحیح نہیں سمجھتے لہذا ہمارے اس طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے مولا علیؑ ابنِ ابی طالب نے برادرانہ سطح پر ایک صلح جوئی کی تعلیم دی تھی، ہم اس پر عامل ہیں اور عامل رہیں گے۔ علیؑ نے بھی اسلام کے نام پر تعاون کیا تھا، ہمارا مخلصانہ تعاون ہمیشہ عام مسلمانوں کے لئے رہا ہے اور رہے گا۔

اس لئے ہونا تو یہ چاہیئے کہ ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیا جائے ـــــ آخر ہمیں بھی تو اپنے راستے سے اسی منزل پر پہنچنا ہے جس پر دوسرے اپنے راستوں سے پہنچیں گے اس کا فیصلہ منزل پر پہنچ کر ہو جائے گا کہ کس کا راستہ صحیح تھا؟

یہی بات ہمارے آئمہ بھی کہتے رہے تھے کہ وہ ایک گوشے میں پڑے ہیں کسی کو ان سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے مگر حکومت کے زعم میں کسی نے نہ مانا، اولادِ رسولؐ کا خون بہتا رہا اور مامون نے تو اس میں اتنی شدت اختیار کی کہ سادات کشی انتہا پر پہنچ گئی دور دور تک نبیؐ کی اولاد اور علیؑ کے نام لیوا کا پتہ نہ تھا، کوئی زبان کیا کھولتا یا سر کیا اُٹھاتا ـــــ ہاں ظلم انتہا پر پہنچ جاتا تو مردانگی سے مرنے والے نکل آتے تھے۔

مامون ستم زدگان کے ذہنی انقلاب کو سمجھتا تھا. اس لئے وہ چاہتا تھا کہ نبیؐ کی مسندِ امامت پر جو بھی فائز ہو، وہ اس کے قابو میں رہے لہذا اس نے امام محمد تقیؑ کے ساتھ اپنی بیٹی شہزادی اُم الفضل کی شادی تجویز کر دی جو عباسیوں کی مرضی کے خلاف تھی مگر اس کی افادیت کو مامون خوب جانتا تھا لہذا اس نے کسی مخالفت کی پرواہ کئے بغیر عقد بھی کر دیا اور رخصتی بھی۔

عباسہ اور اُم حبیب تو نام کی دو دلہنیں تھیں لیکن اُم الفضل عملی طور پر امامؑ کی رفیقۂ حیات بن گئی۔ بغداد کا دار الامارہ جس کے ایک حصے میں قصر الحمراء واقع تھا، اسی میں اُم الفضل کی پرورش ہوئی تھی اور اب وہ ایک بوریہ نشین سے بیاہ دی گئی تھی ـــــ یہ شادی کامیاب ہوئی یا نہیں؟ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ وہ محور مامون کی دسترس سے دور نہیں رہا جس کے گرد سادات کی بغاوت گردش کر سکتی تھی۔

یہ تدبیر پچھلی دو حکمت عملیوں کی طرح تحصیل حاصل ثابت ہوئی کیونکہ امامؑ نے گھر داماد بن کر رہنا قبول نہیں فرمایا۔ بغداد میں بھی علیحدہ مکان لے کر رہے پھر کچھ دنوں بعد مدینے چلے گئے ـــــ ایک دوسرا پہلو، جس کے کامیاب ہونے کا پورا یقین تھا، اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ امام شہزادی کی زلف گرہ گیر کے اسیر بھی نہیں ہوئے۔ اس کا سبب شہزادی کی بدمزاجی کے علاوہ خود امامؑ کے فرائض امامت بھی تھے، آپ کے عدل سے ایک قدم ہٹنے کا امکان ہی نہ تھا۔

شہزادی اُم الفضل کو بغداد کی ازدواجی زندگی میں کوئی شکایت نہیں ہوئی کیونکہ جب اس نے سر اُٹھایا، امامؑ نے بڑی نرمی اور شفقت سے اس کو جھکا دیا مگر ایک سال بعد، جب امام محمد تقیؑ مامون کی مرضی سے مدینے گئے تو اُم الفضل رہ رہ کر برافروختہ ہوتی رہی مگر مساوات محمدی کے علمبردار کی روش میں کوئی فرق نہ آیا۔

مدینے کے قیام میں امامؑ نے حضرت عمار یاسر کی نسل کی ایک لڑکی سے عقد فرمایا جو امام علی نقیؑ کی ماں ہوئیں۔ اس کی شکایت اُم الفضل نے مامون کو لکھی مگر

مامون نے اپنی بے چارگی کا احساس کر کے اُمّ الفضل کو سمجھایا کہ اس کی خاطر حلال کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مامون کی اس وسیع النظری میں یہ راز بھی چھپا ہوا تھا کہ ملکی حالات سے وہ مطمئن نہ تھا اور یہ خطرہ بھی تھا کہ امام محمد تقیؑ سے بیٹی کا رشتہ کرنے کے بعد سادات کی طرف سے جو اطمینان ہوا تھا، وہ چھن نہ جائے، اس لئے وہ ایک باپ کی حیثیت سے اُمّ الفضل کو نصیحتیں کرتا رہا ــــ عمر کے اس حصّے میں بغاوتوں کا تواتر بھی اس کے لئے فکر کا موجب تھا۔

مصر عبدوس کی بغاوت سے دوچار تھا۔ ۲۱۳ھ میں مامون نے خود جا کر اس کو سزا دی اور روم کی طرف پیش قدمی کی کیونکہ قیصر کی فوج نے شام و فلسطین کے علاقوں کو تہہ و بالا کر رکھا تھا۔ رومی لشکر نے اس سے شکستوں پر شکستیں کھائیں اور اس نے چار قلعے فتح کر لئے۔

اسی دوران طرطوس کے قیام میں اس پر سردی کا اثر ہو گیا۔ چھوٹا بھائی اور ولی عہد معتصم اس کے ہمرکاب تھا۔ علاج معالجے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی مگر وقت آ چکا تھا۔ پہلی رجب ۲۱۸ھ کو رقہ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ۴۸ سال کی عمر میں بیس برس پانچ ماہ تیرہ دن حکومت کر کے وہ اپنے انجام کو پہنچا۔

ایک کامیاب و باجبروت حکمراں، خیر و شر کا مجموعہ، عقل و دانش کا پیکر، تدبر و سیاست کا دیوتا، جس کا نظریہ حکومت، مسلک حکومت اور مذہب حکومت تھا۔ اس نے اس حکومت کو اتنا آراستہ و پیراستہ کر دیا تھا کہ خود اس کی کمزوریاں حکومت کی آب و تاب نے چھپالی تھیں اور آج دور سے دیکھنے والوں کو اس کی ذات میں صرف افادیت اور اس کی شخصیت میں صرف چمک دمک دکھائی دیتی ہے۔

مدینے میں امام محمد تقیؑ کے معمولات

آپ کی امامت کا دائرہ صرف شہر رسولؐ تک محدود نہ تھا۔ زمین و آسمان، ساری کائنات اس کے گھیرے میں تھی۔ اطراف و اکناف عالم کی ہدایت آپ کا منصب تھا

آپ اس کو انجام دیتے لیکن لوگوں کی مادی آنکھیں نہ دیکھ سکتیں۔ آپ جہاں چاہتے چشم زدن میں پہنچ جاتے۔ فضائے بسیط سمٹ کر آپ کے قدموں کو بوسہ دیتی یا زمین کی طنابیں کھنچ کر منزل کو آپ کے سامنے لے آتیں۔

اس سلسلے میں بہت سے معجزات ظہور پذیر ہوئے، جن کا ذخیرہ مختلف تذکروں میں موجود ہے۔ ایک مرد مومن حماد بن عیسیٰ امیہ بن علی کے ساتھ کسی سفر پر جا رہے تھے۔ رخصت کے لئے خدمتِ امامؑ میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ آج نہ جائیں مگر وہ لوگ اپنا سامان تک اونٹوں پر بار کرا چکے تھے، انہوں نے عُذر کیا اور چلے گئے ایک وادی میں قیام کیا۔ وہاں رات میں ایک عظیم سیلاب آیا اور حماد کو بہا لے گیا۔

مدینے میں آپ کا رہن سہن وہی تھا جو اجداد کے وقت سے چلا آرہا تھا۔ شہنشاہِ وقت کی بیٹی گھر میں تھی مگر ڈیوڑھی پر نہ کوئی دربان، نہ آیندہ روند پہ کوئی روک ٹوک، نہ تزک و احتشام، نہ ملاقات کے لئے تعین اوقات، نہ ملنے والوں کے ساتھ برتاؤ میں کوئی تفریق۔ زیادہ تر نشست مسجد نبوی میں رہتی، جہاں عوام وعظ و نصائح سے استفادہ کرتے۔ طالبانِ علم زانوے ادب تہہ کرتے، حدیث و فقہ کے دلدادہ دو زانو بیٹھ کر مسائل پوچھتے اور طلب علم کا دامن بھر کر واپس ہوتے۔

مسلک پند و ہدا میں کم عمری کے باوجود آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ کے بعد آپ کے اقوال کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔

جو کسی کو بڑا سمجھتا ہے، اس سے ڈرتا ہے۔

جس کی خواہشات زیادہ ہوں گی، اس کا جسم موٹا ہوگا۔

کتاب حیات مسلم کا سرمایہ حسن خلق ہے۔

انسان کی تمام خوبیوں کا مرکز زبان ہے۔

جو خدا کے بھروسے پر لوگوں سے بے نیاز ہو جائے، لوگ اس کے محتاج ہونگے

ان اقوال کی تعداد کئی ہزار بتائی جاتی ہے اور معجزے بھی سیکڑوں کی گنتی میں ہیں۔

معتصم باللہ بن ہارون رشید

معتصم نے مامون کے انتقال کے بعد رمضان ۲۱۸ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا ـــــ ایرانی نظامِ حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ بات شروع ہی سے معتصم کو پسند نہ تھی۔ اس لئے معتصم نے ان کا زور توڑنے کے لئے ترکوں کو آگے بڑھایا جن کا اقتدار آہستہ آہستہ اتنا بڑھا کہ آگے چل کر حکومت کے لئے وبال بن گیا۔

معتصم کو زمام حکومت سنبھالتے ہی کئی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کو اس نے باآسانی فرو کرادیا، پھر اس نے بابک خرمی پر توجہ کی جس نے عہد مامون میں خود سری اختیار کی تھی معتصم نے ترک جرنیل افشین بن حیدر کو اس کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ افشین نے کئی جنگوں کے بعد صلح کے بہانے اس کو گرفتار کرلیا اور وہ بغداد پہنچنے پر قتل کر دیا گیا۔

طبرستان آرمینیہ اور دوسرے مقامات کی بغاوتیں بھی معتصم نے اسی طرح ختم کیں

امام زین العابدینؑ کی اولاد میں ایک بزرگ محمد بن قاسم تھے، فقیہہ و متقی عابد و زاہد، عموماً مسجد نبوی میں مصروفِ عبادت رہتے تھے۔ خراسان کے لوگ اپنی ہدایت کے لئے آپ کو مدینے سے لے آئے۔ جوزجان میں آپ کے ارادتمندوں کا ایک بڑا حلقہ ہوگیا۔ عبداللہ بن طاہر نے بغاوت کے شبہ پر حملہ کر دیا۔ حامیانِ اہلِ بیت بڑی جوانمردی سے لڑے، پھر طالقان کی پہاڑیوں میں عباسیوں کا مقابلہ کیا۔

ان کی تعداد کم نہ تھی مگر سب غیر تربیت یافتہ اور رموز جنگ سے ناواقف آخر انھیں شکست ہوئی اور محمد بن قاسم قید کرکے بغداد بھیج دیئے گئے جہاں معتصم نے زندان میں ڈال دیا لیکن وہ ایک دن فرار ہوگئے۔ آپ ۲۱۹ھ سے متوکل کے زمانے تک روپوش رہے، پھر قید کرلئے گئے اور قید ہی میں انتقال کیا۔

اسی طرح کے ایک بزرگ جعفر طیار کی اولاد میں جناب عبداللہ تھے، آپ نے عباسی حکومت کا سیاہ لباس پہننے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا قید کرلئے گئے اور زندان ہی میں مرگئے۔

امام کی گرفتاری اور شہادت

مدینے میں ساڑھے سات سال کے قیام میں آپ بڑی یکسوئی سے فیضان عام کرتے رہے، عراق، یمن، حضرموت، الجزائر، شام اور مصر تک سے لوگ آتے، علم وفضل کے خزانے لے کر جاتے اور اپنے قبائل کو مستفیض کرتے، دھیرے دھیرے آنے والوں کی تعداد بڑھ گئی اور حج کے زمانے میں تو اتنا اضافہ ہو جاتا کہ بعض دن مسجد نبویؐ بھر جاتی۔

یہ عہد مامون کی بہت مصروفیات کا تھا، بالخصوص عمر کے آخری کئی سال تو اس نے بغداد کے باہر ہی کاٹے۔ ام الفضل اس زمانے میں بھی امامؑ کی شکایتیں لکھ کر باپ کو بھیجتی رہی مگر وہ کوئی توجہ نہ کر سکا۔ شاید اس کا منتظر ہو کہ سکون سے بغداد جا کر بیٹھے تو امامؑ کو بلا کر ان سے بات چیت کرے مگر اس کو موت نے مہلت ہی نہ دی اور اس کے انتقال پر بدنصیب ام الفضل چچا کو لکھنے لگی۔

معتصم شروع ہی سے بھائی کی اس پالیسی کا مخالف تھا پھر بھی اس نے اچانک امام محمد تقیؑ کو گرفتار نہیں کرایا بلکہ عامل مدینہ کو زور ڈال کر بغداد بھیجنے کی تاکید کی۔ امام رضاؑ بھی اسی طرح بلائے گئے تھے۔ امام محمد تقیؑ نے پانچ چھ سال کے بیٹے امام محمد نقیؑ کو اپنا وصی اور خلیفہ مقرر کیا، انہیں علوم الٰہی تعلیم فرمائے آثار رسالت یا ہی حوالے کئے۔ ام الفضل کو لے کر مدینے سے روانہ ہوئے اور ۹ محرم ۲۲۰ھ کو بغداد پہنچ گئے۔

معتصم کی مخالفت کے اسباب میں اس کا ذاتی عناد اور ام الفضل کی لگائی بجھائی دونوں شامل تھیں۔ یہ بدنہاد عورت خالص دنیاوی مرد کی فریفتگی چاہتی تھی لیکن حضرت علیؑ کے سجادۂ ولایت کا وارث عدل محمدی کا پابند تھا۔ امور خانہ داری اور ازدواجی زندگی میں، بزرگوں نے اپنی بیویوں کو جن حدود میں رکھا تھا۔ ام الفضل بھی وہیں رکھی گئی جس کو اس کے شاہانہ غرور نے اپنی توہین قرار دیا اور وہ محبت

کرنے کے بجائے آپ کی دشمن ہوگئی۔

قیام بغداد میں معتصم نے آپ سے کوئی ظاہری بداخلاقی نہیں کی اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ قید کر کے تکلیفیں پہنچائیں پھر رہا کر دیا۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن جب معتصم نے زہر آلود شربت آپ کو پینے کے لئے بھیجا تو معتصم سے آپ کے تعلقات خوشگوار تھے۔ آپ نے غلام سے فرمایا کہ شب میں پی لوں گا مگر وہ مُصر ہوگیا کہ مجھے اپنے سامنے پلا دینے کی تاکید کی ہے۔ آپ نے پی لیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس سازش میں اُم الفضل بھی شریک تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے خود معتصم کے کہنے سے زہر ملایا تھا۔

بہر طور زہر آلود شربت آپ نے نوش فرمایا اور اس سے ۲۹ ذی قعدہ ۲۲۰ھ کو ۲۵ سال، ۳ ماہ ۱۲ دن کی عمر میں آپ کی موت واقع ہوئی

امام علی نقیؑ کو علم غیب سے اس کی خبر ہوگئی تھی۔ آپ اعجازِ امامت سے تشریف لائے، اپنے ہاتھوں سے غسل و کفن دیا اور امام موسیٰ کاظمؑ کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا ——— کاظمین کا موجودہ روضہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے تعمیر کرایا، اور محمد شاہ قاچار نے اس کو مزین کیا۔

ام الفضل معتصم کے پاس چلی گئی۔ اس کے اندرونی حصے میں ناسور ہوگیا تھا اور انجام کار وہ دیوانی ہو کر لاولد فوت ہوئی۔

دو لڑکے اور دو لڑکیاں امامؑ نے یادگار چھوڑیں۔ حضرت امام محمد نقیؑ، جناب موسیٰ مبرقع، جناب فاطمہ، جناب امامہ یا حکیمہ

دسویں امام

امیرالمومنین حضرت امام علی نقی علیہ السلام

۲۹ ذی قعدہ ۲۲۰ھ تا ۳ رجب ۲۵۴ھ

مولد و مسکن

آباء اجداد کی طرح آپ کا مولد بھی مدینہ تھا۔ آپ ۵ رجب ۲۱۴ھ کو پیدا ہوئے۔ معجز نمائی کا سلسلہ دوسرے آئمہ کی طرح بطنِ مادر سے شروع ہو گیا تھا۔ اندازِ ولادت بھی وہی تھا اور اوّل دن سے آپ ولی اللہ کے پوتے اور رسول کے مسند نشین معلوم ہوتے تھے۔

امام محمد تقیؑ کی بغداد روانگی کے وقت آپ کی عمر صرف ساڑھے پانچ سال تھی اور طرزِ روانگی مستقبل کو آئینہ کر رہا تھا مگر آپ نے تحمل کو ہاتھ سے نہ دیا اور سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی پدر گرامی کو اس طرح رخصت کر دیا جیسے آپ دوش طفلی پر ہر بوجھ اٹھانے کو تیار ہوں۔

دس گیارہ مہینے کے بعد ساڑھے چھ سات سال کی عمر میں آپ کی امامت کا آغاز ہوا، آپ جسمانی طور پر بالغ بھی نہ ہوئے ہوں گے لیکن منصبِ روحانی میں انسانوں کے ساتھ جن و ملک بھی آپ کے تابع تھے۔

حکومت نے کم سنی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے عبداللہ جنیدی کو آپ کی تعلیم پر مامور کر دیا، صرف یہ دکھانے کے لئے کہ امام کو علم لدنّی نہیں ہوتا، امام کو جبریہ تعلیم کے لئے قصر صربار میں منتقل کر دیا گیا، دن کو کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ رات میں

قصر کا دروازہ بند کر دیا جاتا مگر یہ ساری کوششیں بیکار گئیں۔ دشمن آلِ محمد جنید نے خود کہہ دیا کہ وہ اس کم سنی میں مجھ سے زائد علم رکھتے ہیں۔ میں کچھ بتانا چاہتا ہوں تو میرے بولنے سے قبل خود بیان کرنے لگتے ہیں۔ وہ حافظ قرآن ہی نہیں تاویل و تنزیل کو بھی جانتے ہیں ـــــ سفارتِ الٰہیہ کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا درکار تھا۔ مگر دل کے اندھے اس کے بعد بھی منصوص من اللہ ماننے پر تیار نہیں۔

مامون رشید کے عہد میں آپ کی ولادت ہوئی تھی، معتصم کے دور میں امامت پائی، پھر واثق کا زمانہ اصل خیر سے گزر گیا اور آپ سے کوئی تعرض نہ ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خلفاء خود اپنی الجھنوں میں مبتلا رہے۔

معتصم کا جنگی دورِ حکومت

معتصم نے اپنی حکومت میں جہاں ترکوں کو دخیل کیا تھا وہاں بغداد کے بجائے سرّ من رأی کو دارالخلافہ بنا لیا تھا۔ اسی مقام پر اس نے ڈھائی لاکھ فوجیوں کے لئے بیرکیں بھی بنوائی تھیں۔

وہ ابھی بابک خرمی کے قضیئے سے فارغ ہوا تھا کہ رومی ملحق اسلامی علاقوں میں در آئے اور وہاں انہوں نے بے پناہ مظالم ڈھائے۔ معتصم بذاتِ خود مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے ہراول نے قیصر تھیوفلس کو عبرتناک شکست دی۔ اس کی جائے پیدائش اموریم کو ایک طویل محاصرے کے بعد فتح کیا اور شہر کو مسمار کر دیا۔

اسی دوران عباس بن ہارون نے اس کے خلاف سازش کی اور معتصم نے سامرہ واپس آکر اس کا قلع قمع کیا۔

سنہ ۲۲۴ھ میں طبرستان کے ایک مجوسی شہزادے فریار نے بغاوت کی جس میں افشین کی سازش پائی گئی، فریار قتل ہوا اور افشین قید کر دیا گیا جو قید خانے ہی میں جاں بحق ہو گیا۔

اس کے بعد معتصم خود ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۹ ربیع الاول سنہ ۲۲۷ھ کو انتقال کر گیا۔

واثق باللہ بن معتصم

واثق ۲۲۷ھ میں باپ کے مرنے پر تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی ترکوں کو عربوں اور ایرانیوں پر ترجیح دی۔ عقیدے کے لحاظ سے مامون و معتصم کی طرح وہ بھی معتزلی تھا اور واصل بن عطا کا پیرو۔ اس نے بھی اپنے دونوں پیش رووں کی طرح معتزلی مسلک کی ترویج کے لئے کوشش کی، و مسئلہ خلق قرآن اور نظریۂ رویت باری کو اہمیت دی۔

علماء پہلے کی طرح اب بھی سامنے آ کر کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے مگر درپردہ خلیفہ کی مذمت کرتے تھے جو عوامی ذہن کے لئے تباہی بخش تھا۔

"اس نے بھی سائنس، لٹریچر، صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دیا۔ علمی چاشنی کے سبب وہ راگ میں دستگاہ کامل رکھتا تھا۔ اس نے ایک سو راگ اور راگنیاں ترتیب دی ہیں۔ اس کی خیرات کی کوئی حد نہ تھی۔ اس کے عہد معدلت گستر میں سلطنت میں ایک بھی بھیک منگا نہ تھا۔ اس نے یونانیوں سے ایک بڑے پیمانے پر قیدیوں کا تبادلہ کیا" (۱۱۴)

۲۴ ذی الحج ۲۳۲ھ کو سامرہ میں واثق کا انتقال ہو گیا ــــــ حکومت کی گرفت اس کے دور سے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس نے سادات یا کسی اور پر کوئی تشدد نہیں کیا۔

متوکل بن معتصم

اراکین سلطنت کا خیال تھا کہ واثق کے بعد اس کے خورد سال بیٹے کو تخت پر بٹھایا جائے لیکن ترکوں نے مخالفت کی اور واثق کے بھائی جعفر کو المتوکل باللہ کا خطاب دے کر خلیفہ بنا دیا۔ اس نے سلطنت عباسیہ کی تاریخ کا آخری باب سادات کے خون سے قلم بند کیا اور غیر مسلموں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔

متوکل کو شراب و شباب سے خاص دلچسپی تھی۔ رات کا بیشتر حصہ وہ

انھیں مشاغل میں گزارتا اور دن معتزلیوں کی سرکوبی میں بسر کرتا۔ مسلک اعتزال سے اس کو ازلی دشمنی تھی اور حنفی فقہ کا سخت حامی۔ اس فقہ کی بنیاد کا سہرا منصور دوانیقی، ہارون رشید اور مامون رشید کے سر بندھا ہے لیکن اس کا نفاذ پہلے پہل متوکل ہی نے کرایا۔

اعتزال کو اس نے غیر قانونی قرار دیا۔ معتزلیوں کو سرکاری عہدوں سے برطرف کر دیا۔ سائنس اور فلسفے کی تقریروں پر پابندی لگا دی اور بڑے بڑے معتزلیوں کو قید خانے میں ڈال دیا ــــ غیر مسلم بھی اسی تعریف میں تھے۔

واثق کے وزیر ابن الزیات کو اس نے قتل کرا دیا، کیونکہ متوکل جب بادشاہ نہیں تھا تو ابن الزیات نے اس کی تعظیم نہیں کی تھی۔ آلِ زہرا کا باغِ فدک اس نے پھر ضبط کر لیا اور سادات کشی کے کھلے احکام ممالک محروسہ کو بھیج دیئے۔

امام علی نقیؑ: ایک معجز نما اور عالمِ غیب

ایک دن امام علی نقیؑ، علی بن حصیب کے ساتھ چل رہے تھے۔ ابن حصیب نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا کہ ذرا تیز قدم اٹھایئے۔ امام نے فرمایا۔

"آگے بڑھو، تمہیں پہلے جانا ہے۔"

اس واقعہ کے چار روز بعد ابن حصیب چل بسے۔

یحییٰ بن ذکریا کا بیان ہے کہ میں نے امام علی نقیؑ کو لکھا۔

"میری بیوی حاملہ ہے، دعا فرمائیں کہ لڑکا پیدا ہو۔"

"بعض لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ہوتی ہیں ــــ" امام نے جواب دیا اور یحییٰ کے گھر میں لڑکی ہی پیدا ہوئی۔

۲۳۷ھ میں ایک دن ترکوں کی فوج قریب سے گزر رہی تھی۔ امام علی نقیؑ ابو ہاشم کے ساتھ انہیں دیکھنے تشریف لے گئے اور قریب سے گزرتے ہوئے غلام ترکی سے اس کی زبان میں کچھ کہا۔ وہ رک گیا اور دیر تک باتیں کرتا رہا، پھر قدم چومنے کے لئے جھک گیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کس بات نے تجھے امامؑ کا گرویدہ بنا لیا؟ وہ بولا۔
"آپ نے مجھے اس نام سے مخاطب کیا جس کا جاننے والا میرے باپ کے سوا کوئی نہیں تھا۔"

امامؑ دنیا کی ہر زبان سے واقف تھے۔ ایک دن ابو ہاشم سے ٹھیٹ ہندی میں بات کی تو وہ حیرت سے آپ کا منہ دیکھنے لگے۔

امامؑ نے پتھر کی ایک کنکری اُٹھا کر پہلے اپنے مُنہ میں رکھی، پھر ابو ہاشم کے مُنہ میں دے دی جس کے بعد ابو ہاشم تہتر زبانوں کے عالم بن گئے۔

ایک دن ابو ہاشم کی تنگ دستی دُور کرنے کے لئے ایک مُٹھی ریت اُٹھا کر ابو ہاشم کے دامن میں ڈال دی، انھوں نے نظر جا کر دیکھا تو ریت کے بجائے خالص سونا تھا جو بازار میں اچھے داموں فروخت ہو گیا۔

واثق کا ایک مُنہ چڑھا رفیق اسباطی عراق سے مدینے پہنچا تو امام علی نقیؑ کے سلام کو حاضر ہوا۔ آپ نے واثق کا حال دریافت کیا تو اس نے کہا۔
"بخیریت چھوڑ کر آیا ہوں۔"
"لوگ کہتے ہیں کہ وہ فوت ہو گیا۔" امامؑ نے فرمایا پھر پوچھا۔
"اور ابن الزیات ــــــ ؟"
"اچھا ہے ــــــ " اسباطی نے بتایا اور امامؑ نے فرمایا۔
"حکم خدا کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ واثق کا انتقال ہو گیا۔ متوکل خلیفہ ہو گیا۔ اس نے ابن الزیات کو قتل کرا دیا۔"

کچھ دنوں بعد متوکل کا قاصد مدینے آیا تو ان واقعات کی تصدیق ہو گئی۔

بحیثیت مجموعی آپ یتیم نواز، غریب پرور، صابر و متحمل، زاہد و متقی، سخی و حلیم اور ایک پیکر رشد و ہدایت تھے۔ غیب جن کی نظروں میں شہود اور اسرار کائنات مثل موجود تھے۔ جلالت یہ تھی کہ جابر فرماں روا آپ کے قتل پہ تیار ہوتا مگر جب آپ پہنچتے تو اُٹھ کر تعظیم کرتا تھا۔

آپ کے اقوال اسلام کا گراں مایہ ذخیرہ ہیں اور بعض فرمودات تو آپ سے مختص ہیں۔ آپ نے سال کے چار روزوں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ پہلا روزہ یوم ولادت پیغمبرؐ ۱۷ ربیع الاوّل، دوسرا یوم بعثت و معراج ۲۷ رجب، تیسرا ۲۵ ذی قعدہ جس دن کعبے کے نیچے زمین بچھائی گئی اور سفینۂ نوح کوہِ جودی پر ٹھہرا، چوتھا یوم غدیر ۱۸ ذی الحج۔

متوکل کے کارنامے

مامون اعظم کی وسیع سلطنت سامرہ کی طرف سمٹتی آرہی تھی۔ طاہر بن عبداللہ خراسان میں حکومت طاہریہ کی بنیاد ڈال چکا تھا سجستان پر یعقوب بن لیث کا قبضہ ہوچکا اور دیلمی حکومت کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتیں رونما ہورہی تھیں خود تو متوکل جاہل ترکوں کی مدد سے برسر اقتدار آیا تھا لہٰذا وہ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھا پھر بھی صبح کا ناشتہ بے گناہوں کے خون سے کرتا اور رات رقص بسمل کا تماشا دیکھ کر سوتا تھا ــــــ سوتا نہیں تھا بلکہ غرقِ مے ناب ہوجاتا تھا۔

حکومت کے ابتدائی چار پانچ برسوں میں اس نے مخالفین کی قبریں زمین کے برابر کرادیں۔ غیر مسلموں کے لئے حکم جاری کیا کہ زنّار باندھ کر گھروں سے باہر نکلیں تاکہ مسلمانوں سے ان کا امتیاز ہوسکے۔ عورتیں بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ پھر اولادِ رسولؐ کا صفایا شروع کیا اور سارے ملک میں اچانک منصور کے دور کا اعادہ ہونے لگا۔

امام علی نقیؑ مدینے میں ایک الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے لیکن اس نے آپ کو بھی معاف نہیں کیا اور یحییٰ بن ہرثمہ کو ایک دستۂ فوج کے ساتھ مدینے بھیج دیا جو آپ کو ۲۳۴ھ میں اپنی نگرانی میں مدینے سے سامرہ لے آیا اور آپ شہر کے غلیظ ترین علاقے میں ٹھہرا دیئے گئے۔ جہاں چار پانچ سال کے امام حسن عسکریؑ کو بھی آپ کے ساتھ رہنا پڑا۔

متوکل نے تین روز بعد اپنے مہمان کو رومی النسل سردار فوج زراقی کے سپرد کر دیا جو اس کا معتمد اور انتہائی ظالم و بدمزاج آدمی تھا مگر آپ رحمتِ الٰہی کے نمائندے اور محاسنِ اخلاق کے پیکر تھے۔ زراقی نے شب و روز آپ کی عبادت کا منظر دیکھا تو شقاوتِ قلب کمزور پڑ گئی۔

متوکل کو جب آپ کے ساتھ نرم برتاؤ کی اطلاع ملی تو اس نے آپ کو سعید کی حراست میں دے دیا جو قسی القلب اور بے رحمی میں خشک لکڑی کی طرح تھا جس پر بارانِ رحمت کیا، موسلا دھار بارش کا اثر بھی نہ ہو سکتا۔ اس نے آپؑ کے ساتھ ہر ظلم روا رکھا اور متوکل کی ہدایات پر پورا عمل کرتا رہا۔

متوکل کا عہد سادات کے لئے پچھلے تمام ادوار سے زیادہ سخت تھا۔ اس کے زمانے میں تو کسی پر محبِ اہلِ بیت ہونے کا شبہ بھی ہو جاتا تو اس کی گردن اڑا دی جاتی تھی مگر اس پر بھی لوگ امامؑ کی خدمت میں حاضری دیتے اور سزایاب ہونے کو سعادتِ دارین تصور کرتے۔

متوکل کا وزیر فتح ابن خاقان چھپا ہوا شیعہ علیؑ تھا۔ اس نے متوکل کو مشورہ دیا کہ نواحِ شہر کی خالی زمینیں شرفاء کے ہاتھ فروخت کر دی جائیں تاکہ وہ ان پر مکانات تعمیر کرا لیں۔ اس سے حکومت کو مالی فائدہ بھی ہوگا اور شہر کی رونق بھی بڑھ جائے گی۔ متوکل کی سمجھ میں آ گیا، پھر خاقان نے زمین کا ایک ٹکڑا امامؑ کو بھی دلوا دیا جس پر آپ نے مکان بنوا لیا۔ فتح نے غیر جانبدار رہ کر امامؑ کو اس میں رہنے کی اجازت دلوا دی تاہم سعید کی نگرانی جاری رہی۔

امامؑ کے مکان کے متصل ایک دشمن آلِ رسول عمر بن الخضیب کی زمین تھی جو آئے دن آپ کو پریشان کرتا رہتا تھا اور مکان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور کرتا تھا۔ ایک روز وہ گھر میں گھس کر آپ کو نکال دینے پر آمادہ ہو گیا تو آپ نے بڑی نرمی کے ساتھ اس سے فرمایا:۔

"دو روزہ زندگی میں ایک غریب ہمسائے کو کیوں ستاتے ہو ——— "

اس نے تکرار کی اور آپ نے زور دیتے ہوئے فرمایا۔

ہاں ـــــ دو روزہ!"

وہی ہوا کہ دو دن بعد وہ خراجِ شام کے غبن میں پکڑا گیا، شکنجے میں کس کر جلتی زمین پر ڈال دیا گیا اور اسی حالت میں مر گیا۔

متوکل چاہتا تھا کہ راہ کا یہ کانٹا اس کی راست مداخلت کے بغیر نکل جائے اسی لئے اس نے سعید کو آپ کے پیچھے لگا دیا تھا اور خود بظاہر ایسا سلوک کرتا گویا اس کو امام سے کوئی خاص پرخاش ہی نہ ہو۔ وہ اکثر آپ کو بلواتا تھا اور تھوڑی دیر بٹھا کر رخصت کر دیتا تھا۔

محل کے صحن میں ایک طرف بطخیں پلی ہوئی تھیں، کوئی نیا آدمی جب آتا تو وہ چیخنے لگتی تھیں لیکن جب امام تشریف لے گئے تو کوئی آواز نکالنے کے بجائے سرنگوں ہو گئیں۔ جتنی دیر آپ وہاں رہے، وہ بالکل خاموش رہیں۔ اس کے بعد پھر معمول پر آ گئیں۔

احمد بن عیسیٰ نے ایک خواب میں دیکھا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے ایک مٹھی میں پچیس خرمے اٹھا کر دیئے۔ امامؑ کے سامرہ پہنچنے پر وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کے سامنے ایک طشت میں خرمے رکھے ہوئے تھے آپ نے ایک مٹھی خرمے اس کو عنایت فرمائے۔ اس نے گنے تو پچیس تھے۔ احمد بن عیسیٰ نے کہا۔

"مولیٰ۔ کچھ خرمے اور بھی مل سکتے ہیں"؟

"میرے جد نے اس سے زیادہ دیئے ہوتے تو میں بھی دے دیتا" آپ نے مسکرا کر فرمایا اور احمد حیرت میں پڑ گیا کہ امامؑ کو خواب تک کا حال معلوم ہوتا ہے۔

متوکل کا اسلامی دربار

یوں تو ہر عباسی خلیفہ عترتِ رسولؐ کا جانی دشمن رہا لیکن دو کو خصوصیت حاصل ہے۔ پہلا ابو جعفر منصور، دوسرا متوکل۔ اس کو امیر المومنین حضرت علیؑ سے اتنی عداوت

تھی کہ دربار میں جگہ انہیں کو دیتا جو آلِ فاطمہؑ کے خون کے پیاسے ہوں۔ ان لوگوں میں شاعر ابو جہم، عمر بن فرج، ابوالخط، ابن اترجہ، ابوالعبر بہت ممتاز لوگ تھے جو کریلے کی بیل کو نیم پر چڑھاتے رہتے اور متوکل سے کہتے رہتے کہ سادات میں سے جب تک ایک بھی باقی ہے، سلطنتِ عباسیہ محفوظ نہیں۔

انجام کار، متوکل کو لہو و لعب سے جو وقت ملتا، وہ اولادِ رسولؐ کو ملیامیٹ کرنے میں صرف کر دیتا۔ اس کو سلاطین ماسبق کی طرح موسیقی میں بھی کچھ دخل تھا۔ لہٰذا دربار میں رقص و سرود کا وظیفہ جاری رہتا۔

۲۳۶ھ میں ایک دن مدہوشی میں اس نے اُس مغنیہ کا نام لیا جو اس کو بہت پسند تھی۔ مغنیہ بعض درباریوں سے اجازت لے کر گئی تھی۔ انہوں نے متوکل کو بہلانے کی کوشش کی اور دوسری مغنیہ بُلالی مگر متوکل نہ مانا۔ اتنے میں وہ مغنیہ آگئی اور متوکل نے اس سے سوال کر دیا۔

"کہاں گئی تھی ——— ؟"

"حج کرنے گئی تھی ———" اس نے جواب دیا۔

"ماہِ شعبان میں حج ——— ؟" رندِ خرد مند چونکتے ہوئے بولا، اور مغنیہ نے سچی بات کہہ ڈالی۔

"قبرِ امام حسینؑ کی زیارت کرنے گئی تھی ———"

متوکل نے غضب ناک ہو کر اس کو قید کر دیا اور اس کا سارا مال و متاع ضبط کر لیا پھر منادی کرائی کہ جو کربلا کی زیارت کو جائے گا، وہ گرفتار کر لیا جائے گا ——— جابر خلیفہ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک سردار قاسم بن احمد کو بلا کر حکم دیا۔

"کچھ لوگوں کو لے جا کر قبرِ حسینؑ کا نشان مٹا دو اور زمین کو ہل چلوا کر برابر کر دو۔"

قاسم صرف حکم کا بندہ تھا۔ وہ فوراً کربلا پہنچ گیا مگر مسلمانوں نے اس کام

کے لئے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً اس نے یہودیوں سے مدد لی۔

کہا جاتا ہے کہ جانور جو ہل میں جوتے گئے تھے وہ تھوڑی دُور تو چلتے مگر قبر کے قریب پہنچ کر رُک جاتے۔ سردار نے ان پر ہنٹر برسوائے تو جانور قبر کی سمت جانے کے بجائے دوسری طرف نکل گئے۔ اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد متوکل شقی کا کارندہ سوچتا رہا اور دریا سے پانی کی نالی بنوا کر قبر کی طرف لے آیا لیکن پانی قریب پہنچ کر رُک گیا اور اِدھر اُدھر کٹ کر بہنے لگا۔

اس اثنا میں اس کی خبر نواح میں پھیل گئی اور چاروں طرف کے مسلمان کربلا میں جمع ہو گئے۔

متوکل کا یہ حکم بھی تھا کہ آئندہ کوئی قبرِ حسینؑ کی زیارت نہ کرے۔ عقیدت مندوں نے اس حکم کو نہ مانا اور متوکل کے امیر لشکر سے کہا کہ وہ ایک ایک آدمی کو قتل بھی کر دے گا تب بھی زیارت کا سلسلہ بند نہ ہو گا۔ اس نے سارا واقعہ متوکل سے جا کر بیان کر دیا اور وقتی طور پر وہ غصے کو پی گیا مگر دل ہی دل میں عزم کر لیا کہ پہلے اس عقیدت کے زور کو گھٹائے گا تب اپنے منصوبے پر عمل کرے گا۔

بعض روایات کے مطابق یہ واقعہ امام علی نقیؑ کے سامرہ پہنچنے سے قبل کا ہے پھر بھی امامؑ اپنے علمِ لدنی کے ذریعہ اس سے باخبر تھے بلکہ متوکل ان کے بارے میں جو کچھ سوچتا تھا وہ بھی آپ سے چھپا نہ تھا تاہم آپ پابندِ مشیت تھے، آپ کو بہرحال مرضئ الٰہی پر چلنا تھا۔

سابقہ درباروں کی طرح فقہاء متوکل کے دربار کی بھی زینت تھے مگر اب فقیہوں کی ایک خاص قسم ہی اس کے گرد جمع رہتی جن کو وہ حنفی کہتا تھا اور وہی اس کے ہر عمل کے فتوے دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے متوکل کو زہر دے دیا۔ اس نے منت مانی کہ اگر بچ گیا تو مالِ کثیر خیرات کرے گا۔ اتفاق سے وہ بچ گیا اور اس نے علماء سے دریافت کیا کہ مالِ کثیر کتنا ہوتا ہے؟

کسی نے ایک ہزار، کسی نے دس ہزار کسی نے ایک لاکھ درہم بتائے اور متوکل

مخمصے میں پڑ گیا کہ واقعی مالِ کثیر کتنا ہوتا ہے؟ حسن نامی ایک دربان نے اس کو پریشان دیکھ کر کہا کہ اس کو اجازت ہو تو صحیح جواب لا دے۔ متوکل نے کہا کہ جواب تشفی بخش ہوا تو دس ہزار درہم دے گا ورنہ سو کوڑے لگوائے گا۔

غلام کے دل پر امام علی نقیؑ کی عظمت کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے متوکل کی شرط منظور کر لی اور دوڑ کر امامؑ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ امامؑ اس کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"مالِ کثیر کی تفصیل پوچھنے آیا ہے، جا، متوکل سے کہہ دے مالِ کثیر اسّی درہم ہوتا ہے۔"

اس نے متوکل کو بتایا تو متوکل نے دلیل طلب کی۔ وہ پھر پلٹ کر آیا تو امامؑ نے فرمایا۔

"قرآن مجید میں کہا گیا ہے۔ رسولؐ! اللہ نے تمہاری مدد مواطنِ کثیرہ پر کی ہے اور یہ مواطنِ کثیرہ گنتی میں اسّی ہوتے ہیں، لہٰذا کثیرہ کا اطلاق اسّی پر ہوتا ہے، وہ جہاں جہاں بھی استعمال ہو۔"

متوکل مطمئن ہو گیا۔ اس نے اسّی درہم خیرات کر دیئے اور دس ہزار درہم دربان کو عطا کر دیئے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ دربار میں بھی پیش آیا۔ ایک نصرانی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کرتا ہوا پکڑا گیا۔ حد سے بچنے کے لئے اس نے آتے ہی اسلام قبول کر لیا اور قاضی یحییٰ بن اکثم نے چھوڑ دینے کا فتویٰ دے دیا۔ دوسرے فقیہہ نے حد جاری کرنے کا حکم لگایا۔ فقہا میں اختلاف ہوا تو متوکل نے امام سے رجوع کیا۔ آپ نے جواباً لکھ کر دیا۔

"اتنا مارنا چاہیئے کہ وہ مر جائے ——"

یحییٰ بن اکثم اور دوسرے فقیہوں نے کہا۔

"ایسا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے۔"

بات امامؑ تک پہنچی تو آپ نے آیت تحریر فرمائی۔

"جب کافروں نے ہماری سختی دیکھی تو کہا، ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اپنے کفر سے توبہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ان کے لئے مفید نہ ہوا اور نہ ایمان لانا کام آیا۔"

اس آیت نے علماء کا بھی مُنہ بند کر دیا اور متوکل نے نصرانی کے لئے وہی عمل کیا جو امامؑ نے لکھا تھا اور ایسے کاموں سے تو اس کے ذوق کی تسکین بھی ہوتی تھی۔

متوکل وقتاً فوقتاً امامؑ کو ذلیل کرنے کے لئے دربار میں بلواتا تھا مگر اس کو کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک بار اس نے اپنے درباری شاعر ابن سکیت سے بعض سوالات کرائے جن کے جوابات امام علی نقیؑ نے دے دیئے۔ اس پر یحییٰ بن اکثم نے ایک پرچہ امامؑ کے ہاتھ میں دے دیا جس پر وہ گھر سے کئی سوال لکھ لایا تھا۔ امامؑ نے ہر سوال کے نیچے اس کا جواب لکھ دیا۔

ایک سوال تھا "قرآن میں سبعۃ البحر (سات دریاؤں) اور کلمات اللہ سے کیا مراد ہے؟"

آپ نے تحریر فرمایا۔ عین الکبریت، عین الیمن، عین البرہوت، عین الطبریہ عین السیدان، عین الافریقہ اور عین الباحوران۔ کلمات اللہ سے ہم محمد و آلِ محمد مراد ہیں۔"

یحییٰ نے یہ جوابات متوکل کو دکھا کر چھپا لئے۔

ایک بار ایسے ہی موقع پر آپ نے مسئلہ قضاو قدر کی صراحت بھی فرمائی کیونکہ مسلک حنفی کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"انسان نہ بالکل مجبور ہے، نہ بالکل آزاد بلکہ دونوں حالتوں کے بین بین ہے"

مولانا نجم الحسن کراروی اس کی صراحت فرماتے ہیں کہ انسان اسباب و علل میں آزاد ہے اور نتیجے کی برآمدگی میں خدا کا محتاج۔

ابن سکیت شاعر دربار بھی تھے اور متوکل کے بچوں کے اتالیق بھی۔ وہ عموماً متوکل کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے مگر ایک دن نہ جانے کیا متوکل کے جی میں آئی کہ اس نے ابن سکیت سے سوال کر دیا۔

"تمہاری نظر میں میرے بیٹے معتز اور موید بہتر ہیں یا علی کے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ؟"

بڑا سخت وقت آپڑا تھا ابنِ سکیت پر کہ دنیا کے لئے دین کے سودے پر آخری مہر لگ رہی تھی۔ انہوں نے ٹالنے کی بہت کوشش کی کہ اس تقابل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مگر متوکل بضد ہو گیا اور بعض دشمنانِ اہلِ بیت درباریوں نے بھی آواز بلند کر دی۔

"ہاں اس کا فیصلہ کر ہی دیا جائے۔"

آخر ابن سکیت نے اعلائے حق کا فیصلہ کر لیا اور بلند آواز میں کہہ گزرے

"آپ کے بیٹوں کا حسنینؑ سے مقابلہ کیا وہ تو ان کے غلام قنبر کی ہمسری بھی نہیں کر سکتے!"

دربار میں سناٹا چھا گیا۔ متوکل غصے سے کانپنے لگا۔ جلاد اس کے اشارے پر ابن سکیت کی طرف بڑھے جو اس کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے حسنینؑ کی برتری کا اعلان کیا تھا تو یہ سمجھ کر کہ سر ان کے ناموں پر قربان کر دیں گے۔ وہی ہوا کہ سرِ دربار ان کی زبان گدی سے کھینچ لی گئی۔

متوکل امامؑ کو قتل کرنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں اس نے آپ پر بغاوت کا بہتان بھی رکھ دیا، گھر کی تلاشی لی گئی کہ کوئی بڑی چھری بھی برآمد ہو جائے تو باغی قرار دے دیا جائے مگر وہاں جائے نماز اور بوریے کے سوا ملتا کیا۔ کئی بار اس نے دربار میں قتل کے ارادے سے طلب کیا مگر آپ کی معجز نمائی سے ڈر گیا۔

ایک بار اس نے بھرے دربار میں آپ کو بلا کر ایک عورت کی طرف اشارہ کیا کہ دیکھئے یہ کیا کہتی ہے؟ جوان اور خوبصورت عورت بولی۔

"میں زینب بنت علی ہوں۔ آنحضرتؐ نے مجھے دُعا دی تھی کہ ہر چالیس پچاس سال بعد جوان ہوجاؤں گی!"

آپؑ نے اس کو جھوٹا قرار دیا مگر وہ بضد رہی۔ اس پر آپ نے فرمایا۔

"میرے جد کا ارشاد ہے کہ درندوں پر آپ کی اولاد کا گوشت حرام ہے اگر یہ سچی ہے تو کوئی درندہ اس کی طرف رُخ بھی نہ کرے گا"

اہلِ دربار نے آپس میں اشارہ کیا اور ایک بولا۔

"پہلے آپ اپنی ذات سے اس قول کو سچا ثابت کردیں ــــــ"

امامؑ نے بلا تامل حامی بھر لی اور اپنے قدموں سے چل کر خود شیر کے پنجرے میں داخل ہوگئے۔ متوکل بالاخانے پر چڑھ گیا اور دُور سے تماشا دیکھنے لگا۔

پنجرے کا دروازہ کھلنے پر شیر آپ کی طرف بڑھے۔ درباری منتظر تھے کہ اب شیر آپ پر حملہ آور ہوں گے لیکن سب بُت بن کر رہ گئے۔ درباریوں نے دیکھا کہ شیر آپ کے قدموں کو چُوم کر گرد پھرنے لگے، پھر گھٹنے ٹیک کر سامنے بیٹھ گئے۔ آپ نے باری باری ہر ایک کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل آئے۔

زینب کذابہ نے یہ حال دیکھا تو ڈر کے مارے اپنی غلط بیانی کا اعتراف کرلیا شاید اس کو کسی نے بھڑکا کر بھیجا تھا۔

اس طرح متوکل کی طرف سے امتحان پر امتحان اور سازشوں پر سازشیں ہوتی رہیں پھر بھی توکّل متوکل کے بجائے امامؑ ہی طرف رہا۔ ایک بار متوکل کی پیڑھ کی ہڈی کے نیچے پھوڑا نکل آیا۔ سخت تکلیف تھی، کوئی دوا فائدہ نہ کرتی تھی فتح بن خاقان نے متوکل کی ماں کی اجازت سے امام علی نقیؑ سے دوا پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ بکری کی مینگنیاں گلاب کے عرق میں حل کرکے لگا دی جائیں۔

درباریوں نے دوا کا مذاق بھی اڑایا مگر ابن خاقان معتقد تھا۔ اس نے لیپ لگا دیا۔ پھوڑا پھوٹ گیا اور وہ تین روز میں صحت یاب ہوگیا۔

متوکل کی ماں نے شکرانے کے طور پر دس ہزار اشرفی سر بمہر کرکے امامؑ

کی خدمت میں نذر بھیجی جو آپ نے رکھ لی۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد متوکل نے بغاوت کے شبہ پر آپ کے گھر چھاپہ مارنے کا حکم دیا تو وہی اشرفیوں کی تھیلی اور ایک تلوار برآمد ہوئی ۔ مگر بے درد زمانہ اس پر بھی باز نہ آیا اور آپ کو ستانے کا سلسلہ جاری رہا۔

متوکل کو اپنی مساعی میں جتنی ناکامی ہوتی ، اس کا عناد اتنا ہی بڑھتا جاتا ـــــ حضرت معاویہؓ نے تبرّے کی جس رسم کا اجرا کیا تھا وہ پہلے حضرت علیؑ کی ذاتِ گرامی تک محدود رہی ، پھر اس میں اولاد کو شامل کر لیا گیا۔ منصور دوانقی نے بھی اس کا اتباع کیا لیکن بے دین متوکل نے تو اس میں سیّدہ کونین کو بھی شامل کر لیا۔ اب صرف حضورؐ کا وجود اقدس باقی تھا ، بنی عباس کی سلطنت باقی رہتی تو یہ کسر بھی پوری ہو جاتی مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور پھر کوئی منصور یا دوسرا متوکل پیدا نہیں ہوا۔

"ابن حشیش کہتا ہے ابو الفضل نے بیان کیا کہ ایک دن منتصر نے اپنے باپ کو جناب فاطمہؑ پر سب و شتم کرتے سُنا۔ اس نے اس کا ذکر کسی شخص سے کیا تو اس نے جواب دیا کہ ایسے باپ کا قتل واجب ہے لیکن جو اپنے باپ کو قتل کرتا ہے ، اس کی عمر طولانی نہیں ہوتی منتصر نے کہا کہ جب میں باپ کو قتل کر کے اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کروں گا تو اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ میری عمر کم ہو" (۱۱۵)

بیٹے کے مُنہ سے باپ کے اس گناہ عظیم کی تصدیق کے بعد بنی عباس کے طرف دار روایت کو کمزور قرار دینے کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتے اور یہ جواب ہمارے ہر دعوے کے خلاف ملتا رہا ہے اور ملتا رہے گا۔

غاصبوں اور ظالموں کی سرپرستی کا ایک فیصلہ پہلے سے موجود ہے تو اپنی داستانِ غم ہم کسی کو کیوں سُنائیں ۔ صرف اپنوں کو بتانا ہے کہ ہمارے آئمہ پر کیا گزری اور ہم کس قدر سخت جانی سے مظالم کے طوفانوں سے گزرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں

دوسرے اماموں کی طرح ہمارے دسویں امام بھی بڑے صبر و شکر کے ساتھ نظربندی کی میعاد پوری کرتے رہے۔

شیعوں پر یہ دور پچھلے تمام ادوار سے زیادہ سخت تھا۔ اس زمانے میں تو صرف شبہ پر تہہ تیغ کر دیا جاتا تھا۔ انجام کار عاجز ہو کر کئی سید مختلف مقامات پر جانوں سے کھیل گئے۔

سو لیقہ میں ابو عبداللہ محمد بن صالح میدان میں آ گئے پھر اپنے چچا موسیٰ بن عبداللہ کے سمجھانے سے ہتھیار رکھ دیئے اور سامرہ میں تین سال قید رہ کر رہا ہوئے رہے ہیں محمد بن جعفر نے تحریک چلائی لیکن عبداللہ بن طاہر کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور قید خانے میں انتقال کیا۔

قاسم بن عبداللہ اولادِ رسولؐ ہونے کے جرم میں پکڑے گئے، متوکل نے اپنے طبیب کے ذریعہ زہر دلوا دیا۔

احمد بن عیسیٰ قید خانے سے فرار ہو گئے تھے، عمر بھر روپوش رہے۔ متوکل کے زمانے میں انتقال کیا۔

عبداللہ بن موسیٰ مامون کے دور میں چھپ گئے تھے، آپ نے بھی متوکل کے عہد میں وفات پائی۔

ستم بالائے ستم یہ تھا کہ ایک دوسرے کا حال سننا بھی تو کوئی مدد نہ کر سکتا اور مدد کے لئے نکلتا تو خود بھی گرفتار ہو جاتا یا قتل کر دیا جاتا، اس لئے عالم تقیہ میں کوئی کسی سے مل لیتا تو ملاقات ہو جاتی ورنہ عموماً اپنے ہی کو گرفت سے بچائے رکھنے کی کوشش کی جاتی۔

عباسی سلطنت ہچکولے کھا رہی تھی۔ مصر رومیوں کی یلغار سے تباہ ہو چکا تھا۔ ایران و عراق کے کئی علاقے نکل چکے تھے پھر بھی اہلِ بیتؑ کی دشمنی میں متوکل اسی طرح سرگرم تھا۔

نجف اشرف اور کربلا کی تباہی

ایک خاص طبقہ کی آل محمدؐ سے اتنی دشمنی کے اسباب کسی طرح سمجھ میں نہیں آتے زندہ افراد کی مخالفت کی تو کچھ تاویل ہو بھی سکتی ہے لیکن مُردے تو اُٹھ کر دعوئے حکومت نہ کر سکتے، ان سے اتنی عداوت کیوں تھی متوکل کو، کہ ایک بار ۲۳۷ھ میں قبر حسین کو کھدوا ڈالنے کی کوشش کی۔ اس میں ناکام ہو کر مسلسل پیچ و تاب کھاتا رہا اور وقت کا منتظر رہا۔

حد ہوتی ہے بد باطنی کی کہ ایک طرف زندہ امامؑ کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کی فکر میں تھا، دوسری طرف مُردہ امامؑ کا نشان مٹا دینے کی کد کر رہا تھا۔ شاید وہ بھی ہماری طرح انہیں زندہ ہی سمجھتا تھا اور اس علامت کو ختم کر دینا چاہتا تھا جو ان کی زندگی کا اشاریہ تھی۔

کچھ دنوں بعد اس نے پیچھے پڑی ہوئی اس مہم کا آغاز کیا کہ نجف و کربلا کے ہر علاقے کو مٹا دیا جائے۔ اس کام کے لئے اس نے حاکم کوفہ موسیٰ بن ہارون کو متعین کیا جس نے ہزاروں زائرین قتل کر دیئے، نتیجے میں آنے والوں کی تعداد کچھ کم ہو گئی لیکن ہر طرف ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔

ابوبکر عیاشی اور یحییٰ بن عبدالحمید عمائدین کوفہ میں سے تھے، انہوں نے جا کر موسیٰ کو روکنے کی سعی کی، اس پر موسیٰ نے دونوں کو پٹوایا اور وہ بمشکل صحیح و سلامت گھر پہنچ سکے ــــ پھر بھی مزاروں کے انہدام میں موسیٰ کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے اس مقصد کے لئے جن لوگوں کو بھیجا تھا، وہ بعض کرامات دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے اور اسی طرح واپس پلٹ آئے۔

اب کی متوکل نے ایک معتمد ابراہیم دیرج کو ایک دستۂ فوج کے ساتھ کوفے کے قاضی جعفر بن محمد کے پاس روانہ کیا کہ اس کی نگرانی میں انہدام کیا جائے۔

ابراہیم نے دوسری بار بھی وہی سب کچھ کیا جو پہلی مرتبہ کر چکا تھا لیکن انجام پہلا جیسا ہوا۔ آخر اس نے سارا ماجرا متوکل سے جا کر کہہ سنایا اور گھر پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا۔

متوکل اس پر بھی شقاوت سے باز نہ آیا اور اپنے ایک اور ملازم ہارون معلی

کو مامور کیا۔ اس کو خواب میں ختم المرسلین نظر آئے، جنھوں نے اس بدعت سے منع کیا مگر ہارون نے سعیٔ مسلسل کی۔ نشانِ قبر کو تو وہ مٹا نہ سکا مگر خود اس کا یہ حال ہو گیا کہ چہرہ سیاہ پڑ گیا، ہاتھ پاؤں ایسے ہو گئے کہ دیکھنے سے گھن آتی تھی اور مُنہ کے چھالوں سے ہر وقت پیپ بہتا رہتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ موسیٰ بن ہارون نے ایک شیعہ سے قبر کی مٹی منگا کر اس کا استہزا کیا تھا اور خاکِ شفا کو مقام بول و براز پر لگایا تھا اور لگاتے ہی آگ آگ چلانے لگا تھا۔ لوگ پانی پلاتے تو استفراغ ہوتا اور اندر کے حصّے کٹ کٹ کر نکلنے لگتے اس طرح وہ جہنم واصل ہوا۔

ابراہیم دیرج جب کربلا میں ظلم ڈھا رہا تھا تو اس کے آدمیوں نے ایک گروہ کو دیکھا جو اُن پر تیر چلا رہے تھے۔ آدمیوں نے بھی ابراہیم کے حکم پر انہیں تیر مارے مگر جو تیر ان کی کمانوں سے نکلے وہ اُلٹ کر انھیں کے سینوں پر آ لگے۔ ابراہیم یہ دیکھ کر اتنا ڈر گیا کہ اسی وقت باقی آدمی لے کر سامرہ آ گیا۔ متوکل کو اگر وہ یہ واقعہ سُناتا تو متوکل اس کو بُزدلی پر قتل کرا دیتا لہٰذا اس نے اس سے صرف بیلوں اور پانی کا قصّہ بیان کیا، خود ڈرا سہما گھر آ گیا اور آتے ہی بخار میں مبتلا ہوا تو پھر پلنگ سے اُٹھ نہ سکا اور قتل متوکل کے دوسرے دن مر گیا۔

مسلسل ناکامیوں کے باوجود متوکل نے اپنی ناصبیت نہیں چھوڑی۔ کربلا میں ہر طرف پہرے بٹھا دیئے کہ کوئی زیارت کے لئے قبر تک پہنچنے نہ پائے، لیکن جانے والے جاتے ہی رہے۔ اس سلسلے میں بے شمار واقعات بیان کئے جاتے ہیں کہ کس طرح زائرین نے مال و دولت اور اولاد کی قربانیاں دیں اور زیارت کا شرف حاصل کیا۔

متوکل کو اس روک تھام میں اتنی دلچسپی تھی کہ کبھی کبھی خود دیکھنے کو نکلتا تھا کہ کوئی کربلا کی طرف جا تو نہیں رہا ہے۔ ایک روز وہ بغداد کے پُل پر خیمہ زن تھا کہ ایک سیّدزادی اپنے سات سالہ بچے کے ساتھ جاتی نظر آئی۔ متوکل نے اس کو اپنے

سامنے طلب کیا اور کہا۔

"کیا رکھا ہے حسینؑ کی زیارت میں؟"

"خدا و رسولؐ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔ متوکل بولا۔

"حسینؑ اس قابل تھے کہ ان کے ذریعہ معرفت خدا اور رسولؐ ہو!"

اس پر سیدانی کی گرج فضا میں بلند ہو گئی۔

"حسینؑ سے معرفت حاصل نہ ہوگی ــــــ تو کیا تجھ جیسے فاسق و فاجر سے ہوگی!"

سیدانی نے چھپاتا ہوا خنجر نکال لیا مگر وہ وار نہ کر سکی۔ سپاہیوں نے دوڑ کر دونوں طرف سے اس کو پکڑ لیا اور متوکل نے حکم دے دیا۔

"بچے کو اس کی گود میں ذبح کر دو ــــــ"

سیدانی نے فرط محبت میں بچے کو اٹھا لیا تھا۔ سپاہیوں نے دونوں کو گرا کر بچے کی گردن کاٹ دی اور ماں بچے کے خون میں لت پت ہو گئی۔

پھر وہ اس کی لاش اٹھا کر عازم کربلا ہو گئی۔ روضے پر کچھ زائر موجود تھے۔ وہ ان سے آگے پہنچ گئی اور چلا کر بولی۔

"فرزند رسولؐ! غریب و نادار ہوں ــــــ اور تو کچھ نہیں تھا، یہ تحفہ لائی ہوں ــــــ"

بچے کا منہ اس نے مزار کی طرف کر دیا ــــ اس نے دیکھا کہ قبر حسینؑ کانپ گئی۔ ایک نور ہر طرف پھیل گیا اور آواز آئی۔

"مومنہ۔ تیری زیارت قبول ہوئی۔ دیکھ تیرا بچہ حسینؑ کی گود میں ہے ــــ"

سیدانی نے کچھ دیکھا یا نہیں دیکھا؟ مگر وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ یہ رونا بچے کے لئے نہیں تھا، غم حسینؑ میں تھا۔

مظالم کی یہ داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بنی عباس کے بھیڑیوں نے ایسی کتنی ہی جانیں لیں۔ ہزاروں سلام ان صاحبان ایمان پر جو خاک و خون میں تڑپتے رہے گھروں کو تباہ و برباد کرایا، اپنے بچوں کی لاشیں خود اپنے ہاتھوں پر اٹھائیں مگر

مزارِ سید الشہدار کی زیارات کا ارادہ ترک نہیں کیا۔

متوکل کی یہ خونیں داستانیں ہوا کے دوش پر ممالک محروسہ میں پھیل رہی تھیں مصر میں زید مجنون نے بھی سُنا اور پا پیادہ چل پڑے۔ مدّت کے بعد عراق پہنچے تو بازارِ کوفہ میں عارفِ آلِ محمد بہلول دانا سے ملاقات ہوئی۔ بہلول گلی کوچوں میں، شاہراہوں پر، غریبوں کے جھونپڑوں اور امیروں کے محلوں تک خونِ سادات کی سُرخیوں کو پھیلا رہے تھے۔

حضرت عمار یاسرؓ اور حضرت ابوذرؓ غفاری نے عراق و شام کے در و دیوار پر مدحِ آلِ محمدؐ کے نقوش بنائے تھے۔ بہلول دانا اپنے آنسوؤں سے مظلومیت کی داستانیں سُنا رہے تھے مگر وہ اپنے ہوش میں ہوتے تو کوئی انہیں گرفتار کرتا زید مجنون سے ملاقات ہوگئی تو دو دیوانگانِ خردمند یکجا ہوگئے اور دونوں کربلا کی طرف چل پڑے۔

انھیں دنوں متوکل کی ایک کنیز حبشیہ مرگئی تھی جو اس کو بہت عزیز تھی اس کا جنازہ بڑی دھوم سے اُٹھا، سیاہ جھنڈے کھلے ہوئے، عورتیں سر برہنہ، مرد گریباں چاک، پیچھے پیچھے رونے والوں کا ہجوم۔ اس کی قبر اطرافِ کربلا میں تیار کی گئی تھی زید مجنون کربلا پہنچے تو دُور سے یہ منظر دیکھا۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زنِ حبشیہ کی میّت ہے۔

اب زیدؒ کو تابِ ضبط کہاں؟ چیخ کر روئے، گریباں پھاڑ ڈالا، خاک سر پر ڈالی اور ایک فی البدیہہ مرثیہ پڑھنا شروع کر دیا۔

"عبرت کا مقام ہے کہ ایک زنِ زانیہ کی قبر اس طرح آباد کی جائے اور حسینؑ کی قبر کو کھیت بنانے کے لئے ہل چلایا جائے ــــــ!"

ان اشعار کی گونج متوکل کے کانوں میں پڑی تو وہ بہت غضبناک ہوا۔ زیدؒ کو دربار میں پکڑ بلوایا اور پوچھا۔

"ابوتراب کون تھے ــــــ؟"

"جو اُن کے مدارج و شرف کو نہیں جانتا، وہ جھوٹا اور کافر ہے ——"
پھر زیدؒ نے فضائل امیرالمومنین بیان کرنا شروع کر دیئے۔ متوکل نے آتش غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈلوا دیا —— لیکن وہ سونے کے لئے لیٹا تو ایک آواز کان میں گونجی۔

"زیدؒ کو ابھی رہا کر دے ورنہ تجھ کو ہلاک کر ڈالوں گا۔"
ظالم جتنا بڑا ہو، اتنا ہی بزدل بھی ہوتا ہے۔ متوکل نے صبح اُٹھ کر پہلا کام یہی کیا کہ زیدؒ کو چھوڑ دیا اور وہ کربلا ہوتے ہوئے کسی طرف چلے گئے۔ بہلول دانا بھی ان کے ساتھ تھے مگر وہ کسی طرف کو چل نکلے۔ ممکن ہے، ان کی ملاقاتیں اسی سرزمین پر ہوتی رہی ہوں کیونکہ دونوں کے درمیان یہی مشترک رشتہ تھا۔

امام علی نقیؑ ان حالات سے بے خبر نہ تھے مگر وہ کرتے بھی کیا حسینؑ مظلوم کے وارث ہی تو تھے، آپ رضائے رب میں راضی اور ہر حال میں صابر و شاکر ——
ایک روز متوکل نے حکم دیا کہ سارے امراء، علماء و فضلاء اس کی سواری کے ساتھ پاپیادہ چلیں، ان میں امام علیہ السلام بھی تھے۔

سواری تیز چلتی تو آپ کو بھی دوڑنا پڑتا۔ تیز دھوپ میں آپ پسینے پسینے ہو گئے۔ سانس پھولنے لگی۔ متوکل کے کاتب زراقہ کو آپ پر بہت ترس آیا، وہ کہنے لگا۔

"بہت تکلیف ہو رہی ہے آپ کو —— !"
"کیا کروں، متوکل نے یہ سب مجھے ذلیل کرنے کے لئے کیا ہے مگر میری منزلت ناقۂ صالح سے کم نہیں ہے۔ متوکل بھی تین دن زندہ رہے گا۔" آپ نے فرمایا اور پھر دوڑنے لگے۔

وہی ہوا کہ تیسرے دن ۴ شوال ۲۴۷ھ کو منتصر کے آدمیوں نے مدہوشی میں متوکل کو قتل کر دیا اور زمین ایک ناپاک کا وجود ختم ہونے سے پاک ہو گئی۔
متوکل کے ساتھ اس کا وزیر فتح ابن خاقان بھی تہ تیغ کر دیا گیا۔

عباسی دورِ خلافت کا اس کے اٹھان سے انحطاط تک ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اس میں پانچ چیزیں مایہ الامتیاز نظر آئیں گی۔ ابو مسلم کی تلوار، منصور دوانیقی کا استقلال، ہارون رشید کا ذوقِ تعیش، مامون کا تدبر و سیاست اور متوکل کی سفاکی۔ اس سفاکی کے ساتھ مسلک حنفیہ کی ترویج بھی اس کی انفرادیت ہے جس کو اب اعتزال کے بجائے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

اسلام کے عقائد و نظریات کے لحاظ سے ادوار کا تعین ذرا مشکل ہے مگر تاریخ پر اُچٹتی نظر ڈالی جائے تو اصول کی صراحت میں زاویہ ہائے نگاہ کے اختلاف سے بتدریج کوئی نہ کوئی تفریق رونما ہوتے نظر آتی ہے۔

"پیغمبر اسلام نے جو قانونی احکام یا فیصلے صادر کئے وہ ایک نیم متمدن اور پرانی وضع کے معاشرے پر مبنی تھے۔ آپ کے بعد حضرت علیؑ نے دینِ اسلام کے حقائق کی توضیح کی۔ قرآن میں تشریعی احکام بہت کم تھے اور جتنے تھے، وہ بھی ایسے تھے کہ ان کی تعمیل حالات کے مطابق کی جا سکتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ان کی توضیح و تشریح زیادہ تر حضرت علی اور ان کے شاگرد حضرت ابن عباسؓ کی"۔ آگے چل کر "روایتوں کا انبار لگ گیا لیکن دبستانِ مدینہ کے سوا کہیں بھی کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ آنحضرت کے ابتدائی جانشین ایک معین اصول کے پابند تھے انہیں عہدِ نبویؐ یا خلافتِ علوی کی کوئی نظیر مل جاتی جس کی تصدیق اہلِ بیتؑ نے کی ہوتی تو اسے فیصلے کی بنیاد بناتے ورنہ ذاتی اجتہاد پر اعتماد کرتے"۔

"خلفائے بنی اُمیہ کے زمانے میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ صوبوں کے عمال اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور بزور شمشیر انہیں منواتے تھے"۔

"جب عباسی مسند نشین ہوئے تو اس وقت امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں دو ایسے شخص تحصیل علم کر رہے تھے جن کا شمار بعد میں سُنی مذہب کے آئمہ مجتہدین میں ہوا۔ یعنی امام ابو حنیفہ اور امام مالک بن انس"۔

امام ابوحنیفہؒ ایک قیاسی مقنن تھے۔ ان کے خیالات کو ان کے دو شاگردوں نے منضبط کیا: ابویوسف اور محمد الشیبانی"۔

"امام مالک کا طریقہ کار جدا تھا ـــــــ ان کا مسلک جادۂ پامال (موطا) کی راہ نوردی تھا۔" انہوں نے احادیث سے زائد قرآن پر اعتماد کیا۔

"امام مالک کے کچھ عرصہ بعد امام شافعی آئے۔ وہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی بہ نسبت دنیا کے معاملات سے زیادہ واقفیت بھی رکھتے تھے"۔

"یہ حالات تھے جن میں امام احمد ابن حنبل منظر عام پر آئے وہ انتہائی درجے کے متشرع تھے اور کسی قسم کے اختلاف رائے کے متحمل نہ ہوتے" آپ نے حنفی فقہ پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ان کا مسلک تمام و کمال احادیث پر مبنی ہے"

"معتصم اور واثق نے سختی سے ان مذہبی دیوانوں کے تشدد کی روک تھام کی۔ امام احمد بن حنبل کو قید خانے میں ڈال دیا گیا جہاں ان کی وفات ہوئی"۔

(اسپرٹ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۶۳۰)

تیسری صدی ہجری کے اختتام پر ابوموسیٰ اشعری کی اولاد میں امام ابوالحسن الاشعری نے مسلک الاشاعرہ کا اعلان کیا اور اسلام کے قیاسی عقائد اور عقلی نظریات کا وہ تصادم شروع ہوا جس میں پھر کمی نہیں آئی۔

فی الوقت حدود سلطنت عباسیہ پر امام ابوحنیفہ کا پرچم لہرا رہا تھا اور مذہب علویہ کہیں کہیں گوشوں میں اپنے کو عوام کی نظروں سے بچائے ہلکی ہلکی سانسیں لے رہا تھا۔

اس موقع پر ارباب فکر کے لئے ایک دعوت عام ہے کہ توحید، قرآن اور رسالت کے علیحدہ علیحدہ عنوانوں کے ذیل میں پہلے ہمارے اصول، پھر حنفی، مالکی، شافعی حنبلی، اشعری، بعد میں کی ہوئی ابن تیمیہ، فخرالدین رازی اور غزالی وغیرہ کی توضیحات اور انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہونے والا وہابی مسلک، ان سب کے نظریات الگ الگ خانوں میں یکجا کئے جائیں تو اندازہ ہوگا کہ توحید مشکل اور مجسم ہوگئی۔ قرآن

مخلوق نہیں رہا تو کیا خالق بن گیا؟ اگر قرآن خالق ہو گیا تو خلاّق مطلق کہاں گیا؟

نوبت پہنچی رسولؐ تک تو خلقت، سیرت و کردار، بشر اور رسول کی حیثیتیں سب مشتبہ۔ آپ کا کون سا قول قابلِ تقلید اور کون قابل تقلید نہیں؟ یہ ہمارے فیصلے کی بات قرار پائی اور اس کی تصدیق قرآن سے ہونا ناممکن تھی اور رہے گی۔

ہمارے نظریات رسولؐ کی حیات سے آج تک ہر سہ اصول کے بارے میں منفرد اور مسلم ہیں اور رہیں گے۔ ان کی ہم آہنگی نظریاتِ احناف سے (بریلوی مسلک) بڑی حد تک ہوتی ہے۔ صرف اختلاف خلافت کا ہے تو ہم ان کے احترام میں کوئی تنقید نہیں کرتے کیونکہ ہمارا امام منصوص من اللہ ہوتا ہے لیکن اور کسی مسلک سے ہمارے نظریات کی مطابقت نہیں ہوتی، اور صرف ہمارا ہی نظریہ دوسروں سے مختلف نہیں ہے بلکہ مسلکِ حنفی کی بھی وہی صورت ہے جو ہماری ہے ــــ البتہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کی حد تک امام مالک کا اجتہاد ہم سے مطابقت رکھتا ہے اور بعض دوسری باتیں بھی ملتی جلتی ہیں۔

اگر ایک بار ہماری استدعا پر توحید، قرآن اور رسالت کے بارے میں سارے نظریے نیچے اوپر رکھ کر تقابل و توازن کر لیا جائے اور ہمارا قول غلط ثابت ہو تو ہم ایک بڑی جماعت کے ساتھ نظریاتی حلقہ بگوشی پر تیار ہیں۔ کاش کوئی وسیع النظر ہماری اس درخواست پر توجہ کر سکے لیکن خلوص نیّت اور اصولِ دیانت شرط اولیں ہے ــــــ ورنہ ہمارا کیا ہے، ہم تو ابوطالب اور خدیجۃ الکبریٰ کے غلام ہیں۔ اسلام کی حقانیت اور ہادئ اسلام کی سیرت کا تحفظ ہمارا کام ہے۔ کوئی منصور آئے یا کوئی متوکل جائے۔ ہم ظلم و ستم کی دسترس سے دور اور دسترس میں رہ کر خون تازہ پیدا کریں گے اور جوان نسلوں کی رگ ہائے گلو میں بھر کر اسلامی درندوں کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔

متوکل کی موت ہمارے لئے وقتی اطمینان کا ایک پیغام تھی لیکن ڈھائی تین سو سال کے تجربات نے ہمیں بتایا تھا کہ فضا کا ہر سناٹا آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے لہٰذا ہم اس کے لئے تیار تھے اور جو موقع مل گیا تھا، اس کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔

منتصر باللہ بن متوکل

منتصر باللہ ایک منصف مزاج، بردبار، فیاض، دانشمند اور رعایا کا بہی خواہ حکمران تھا

"اس نے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کے مزارات پھر سے بنوائے اور ان کی جائیداد جو متوکل نے ضبط کر لی تھی، واپس کر دی۔ ان سخت قیود و شرائط کو ہٹا دیا جو اس کے باپ نے غیر مسلموں پر لگا رکھی تھیں، مگر افسوس یہ عالی تبار بادشاہ صرف چھ ماہ حکومت کرنے پایا تھا کہ موت کا پیغام آ پہنچا۔" (۱۱۶)

سرسام ہو جانے سے مر گیا۔ ترکوں نے اس کے بعد مستعین بن معتمد کو تخت نشین کیا۔

مستعین باللہ بن معتصم

۲۴۸ھ میں وہ تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کا دور اقتدار برائے نام تھا کئی صوبے خود مختار ہو گئے۔ نیشاپور میں طاہریہ حکومت قائم ہو گئی۔

"۲۵۰ھ میں یحییٰ بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید علوی نے کوفہ میں خروج کیا۔ مستعین باللہ کی فوج نے مقابلہ کر کے ان کو شکست دے دی اور گرفتاری کے بعد قتل کیا۔ ان کے بعد حسین بن زید نے جن کا لقب "داعی الحق" تھا علاقہ طبرستان اور اس کے حدود میں اپنا پورا قبضہ جما لیا۔ انیس برس کامل ان کی حکومت رہی ان کے مر جانے کے بعد ان کے بھائی محمد بن حسن نے اس علاقے میں اٹھارہ برس تک سلطنت کی۔ آخر میں اسمٰعیل سامانی کے اشارے سے محمد بن ہارون نے ان کو قتل کرایا"

"امام علی نقی علیہ السلام کو یحییٰ اور داعی الحق وغیرہ کے معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگرچہ سادات کرام نے بہت چاہا کہ امامؑ ان کے شریک حال ہو جائیں لیکن حضرتؑ نے دنیوی بکھیڑوں میں پڑنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ آپ کو بجز عبادت خدا اور تلقین و ارشاد مطلق

"جو ان کے مدارج و شرف کو نہیں جانتا، وہ جھوٹا اور کافر ہے ——— "
پھر زیدؒ نے فضائل امیرالمومنین بیان کرنا شروع کر دیئے۔ متوکل نے آتش غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈلوا دیا ——— لیکن وہ سونے کے لئے لیٹا تو ایک آواز کان میں گونجی۔

"زیدؒ کو ابھی رہا کر دے ورنہ تجھ کو ہلاک کر ڈالوں گا"

ظالم جتنا بڑا ہو، اتنا ہی بزدل بھی ہوتا ہے۔ متوکل نے صبح اٹھ کر پہلا کام یہی کیا کہ زیدؒ کو چھوڑ دیا اور وہ کربلا ہوتے ہوئے کسی طرف چلے گئے۔ بہلول دانا بھی ان کے ساتھ تھے مگر وہ کسی طرف کو چل نکلے۔ ممکن ہے، ان کی ملاقاتیں اسی سرزمین پر ہوتی رہی ہوں کیونکہ دونوں کے درمیان یہی مشترک رشتہ تھا۔

امام علی نقیؑ ان حالات سے بے خبر نہ تھے مگر وہ کرتے بھی کیا حسینؑ مظلوم کے وارث ہی تو تھے، آپ رضائے رب میں راضی اور ہر حال میں صابر و شاکر ——— ایک روز متوکل نے حکم دیا کہ سارے امراء، علماء و فضلاء اس کی سواری کے ساتھ پا پیادہ چلیں، ان میں امام علیہ السلام بھی تھے۔

سواری تیز چلتی تو آپ کو بھی دوڑنا پڑتا۔ تیز دھوپ میں آپ پسینے پسینے ہو گئے۔ سانس پھولنے لگی۔ متوکل کے کاتب زراقہ کو آپ پر بہت ترس آیا، وہ کہنے لگا۔

"بہت تکلیف ہو رہی ہے آپ کو ——— !"

"کیا کروں، متوکل نے یہ سب مجھے ذلیل کرنے کے لئے کیا ہے مگر میری منزلت ناقۂ صالح سے کم نہیں ہے۔ متوکل بھی تین دن زندہ رہے گا" آپ نے فرمایا اور پھر دوڑنے لگے۔

وہی ہوا کہ تیسرے دن ۴ شوال ۲۴۷ھ کو منتصر کے آدمیوں نے مدہوشی میں متوکل کو قتل کر دیا اور زمین ایک ناپاک کا وجود ختم ہونے سے پاک ہو گئی۔

متوکل کے ساتھ اس کا وزیر فتح ابن خاقان بھی تہہ تیغ کر دیا گیا۔

عباسی دورِ خلافت کا اس کے اٹھان سے انحطاط تک ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اس میں پانچ چیزیں مابہ الامتیاز نظر آئیں گی۔ ابو مسلم کی تلوار، منصور دوانیقی کا استقلال، ہارون رشید کا ذوقِ تعیش، مامون کا تدبر و سیاست اور متوکل کی سفاکی۔ اس سفاکی کے ساتھ مسلک حنفیہ کی ترویج بھی اس کی انفرادیت ہے جس کو اب اعتزال کے بجائے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

اسلام کے عقائد و نظریات کے لحاظ سے ادوار کا تعین ذرا مشکل ہے مگر تاریخ پر اچٹتی نظر ڈالی جائے تو اصول کی صراحت میں زاویہ ہائے نگاہ کے اختلاف سے بتدریج کوئی نہ کوئی تغزلق رونما ہوتے نظر آتی ہے۔

"پیغمبر اسلام نے جو قانونی احکام یا فیصلے صادر کئے وہ ایک نیم متمدن اور پرانی وضع کے معاشرے پر مبنی تھے۔ آپ کے بعد حضرت علیؑ نے دینِ اسلام کے حقائق کی توضیح کی۔ قرآن میں تشریعی احکام بہت کم تھے اور جتنے تھے، وہ بھی ایسے تھے کہ ان کی تعمیل حالات کے مطابق کی جا سکتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ان کی توضیح و تشریح زیادہ تر حضرت علی اور ان کے شاگرد حضرت ابن عباس کی۔ آگے چل کر "روایتوں کا انبار لگ گیا لیکن دبستانِ مدینہ کے سوا کہیں بھی کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ آنحضرت کے ابتدائی جانشین ایک معین اصول کے پابند تھے انہیں عہدِ نبویؐ یا خلافتِ علوی کی کوئی نظیر مل جاتی جس کی تصدیق اہلِ بیتؑ نے کی ہوتی تو اسے فیصلے کی بنیاد بناتے ورنہ ذاتی اجتہاد پر اعتماد کرتے۔"

"خلفائے بنی امیہ کے زمانے میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ صوبوں کے عمال اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور بزورِ شمشیر انہیں منواتے تھے۔"

"جب عباسی مسند نشین ہوئے تو اس وقت امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں دو ایسے شخص تحصیل علم کر رہے تھے جن کا شمار بعد میں سنی مذہب کے آئمہ مجتہدین میں ہوا یعنی امام ابو حنیفہ اور امام مالک بن انس۔"

امام ابو حنیفہؒ ایک قیاسی مقنن تھے۔ ان کے خیالات کو ان کے دو شاگردوں نے منضبط کیا: ابو یوسف اور محمد الشیبانی۔"

"امام مالک کا طریقہ کار جدا تھا ——— ان کا مسلک جادۂ پامال (موطا) کی راہ نوردی تھا۔" انہوں نے احادیث سے زائد قرآن پر اعتماد کیا۔

"امام مالک کے کچھ عرصہ بعد امام شافعی آئے۔ وہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کی بہ نسبت دنیا کے معاملات سے زیادہ واقفیت بھی رکھتے تھے۔"

"یہ حالات تھے جن میں امام احمد ابن حنبل منظر عام پر آئے وہ انتہائی درجے کے متشرع تھے اور کسی قسم کے اختلاف رائے کے متحمل نہ ہوتے۔" آپ نے حنفی فقہ پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ان کا مسلک تمام و کمال احادیث پر مبنی ہے۔"

"معتصم اور واثق نے سختی سے ان مذہبی دیوانوں کے تشدد کی روک تھام کی۔ امام احمد بن حنبل کو قید خانے میں ڈال دیا گیا جہاں ان کی وفات ہوئی۔"

(اسپرٹ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۶۳۰)

تیسری صدی ہجری کے اختتام پر ابو موسیٰ اشعری کی اولاد میں امام ابو الحسن الاشعری نے مسلک الاشاعرہ کا اعلان کیا اور اسلام کے قیاسی عقائد اور عقلی نظریات کا وہ تصادم شروع ہوا جس میں پھر کمی نہیں آئی۔

فی الوقت حدود سلطنت عباسیہ پر امام ابو حنیفہ کا پرچم لہرا رہا تھا اور مذہب علویہ کہیں کہیں گوشوں میں اپنے کو عوام کی نظروں سے بچائے ہلکی ہلکی سانسیں لے رہا تھا۔

اس موقع پر ارباب فکر کے لئے ایک دعوت عام ہے کہ توحید، قرآن اور رسالت کے علیحدہ علیحدہ عنوانوں کے ذیل میں پہلے ہمارے اصول، پھر حنفی، مالکی، شافعی حنبلی، اشعری، بعد میں کی ہوئی ابن تیمیہ، فخر الدین رازی اور غزالی وغیرہ کی توضیحات اور انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہونے والا وہابی مسلک، ان سب کے نظریات الگ الگ خانوں میں لکھے جائیں تو اندازہ ہوگا کہ توحید متشکل اور مجسم ہوگئی۔ قرآن

مخلوق نہیں رہا تو کیا خالق بن گیا؟ اگر قرآن خالق ہوگیا تو خلاّق مطلق کہاں گیا؟ نوبت پہنچی رسولؐ تک تو خلقت، سیرت و کردار، بشر اور رسول کی حیثیتیں سب مشتبہ۔ آپ کا کون سا قول قابلِ تقلید اور کون قابل تقلید نہیں؟ یہ ہمارے فیصلے کی بات قرار پائی اور اس کی تصدیق قرآن سے ہونا ناممکن تھی اور رہے گی۔

ہمارے نظریات رسولؐ کی حیات سے آج تک ہر سہ اصول کے بارے میں منفرد اور مسلم ہیں اور رہیں گے۔ ان کی ہم آہنگی نظریاتِ احناف سے (بریلوی مسلک) بڑی حد تک ہوتی ہے۔ صرف اختلاف خلافت کا ہے تو ہم ان کے احترام میں کوئی تنقید نہیں کرتے کیونکہ ہمارا امام منصوص من اللہ ہوتا ہے لیکن اور کسی مسلک سے ہمارے نظریات کی مطابقت نہیں ہوتی، اور صرف ہمارا ہی نظریہ دوسروں سے مختلف نہیں ہے بلکہ مسلکِ حنفی کی بھی وہی صورت ہے جو ہماری ہے ـــــ البتہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کی حد تک امام مالک کا اجتہاد ہم سے مطابقت رکھتا ہے اور بعض دوسری باتیں بھی ملتی جلتی ہیں۔

اگر ایک بار ہماری استدعا پر توحید، قرآن اور رسالت کے بارے میں سارے نظریے نیچے اوپر رکھ کر تقابل و توازن کر لیا جائے اور ہمارا قول غلط ثابت ہو تو ہم ایک بڑی جماعت کے ساتھ نظریاتی حلقہ بگوشی پر تیار ہیں۔ کاش کوئی وسیع النظر ہماری اس درخواست پر توجہ کر سکے لیکن خلوص نیّت اور اصولِ دیانت شرط اولیں ہے ـــــ ورنہ ہمارا کیا ہے، ہم تو ابوطالب اور خدیجۃ الکبریٰ کے غلام ہیں۔ اسلام کی حقانیت اور ہادیٔ اسلامؐ کی سیرت کا تحفظ ہمارا کام ہے۔ کوئی منصور آئے یا کوئی متوکل جائے۔ ہم ظلم و ستم کی دسترس سے دُور اور دسترس میں رہ کر خونِ تازہ پیدا کریں گے اور جوان نسلوں کی رگ ہائے گلو میں بھر کر اسلامی درندوں کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔

متوکل کی موت ہمارے لئے وقتی اطمینان کا ایک پیغام تھی لیکن ڈھائی تین سو سال کے تجربات نے ہمیں بتایا تھا کہ فضا کا ہر سناٹا آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے لہٰذا ہم اس کے لئے تیار تھے اور جو موقع مل گیا تھا، اس کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔

منتصر باللہ بن متوکل

منتصر باللہ ایک منصف مزاج، بردبار، فیاض، دانشمند اور رعایا کا بہی خواہ حکمران تھا

"اس نے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کے مزارات پھر سے بنوائے اور ان کی جائیداد جو متوکل نے ضبط کر لی تھی، واپس کر دی۔ ان سخت قیود و شرائط کو ہٹا دیا جو اس کے باپ نے غیر مسلموں پر لگا رکھی تھیں، مگر افسوس یہ عالی تبار بادشاہ صرف چھ ماہ حکومت کرنے پایا تھا کہ موت کا پیغام آ پہنچا۔" (۱۱۶)

سرسام ہو جانے سے مر گیا۔ ترکوں نے اس کے بعد مستعین بن معتمد کو تخت نشین کیا۔

مستعین باللہ بن معتصم

۲۴۸ھ میں وہ تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کا دور اقتدار برائے نام تھا کئی صوبے خود مختار ہو گئے۔ نیشاپور میں طاہریہ حکومت قائم ہو گئی۔

"۲۵۰ھ میں یحییٰ بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید علوی نے کوفہ میں خروج کیا۔ مستعین باللہ کی فوج نے مقابلہ کر کے ان کو شکست دے دی اور گرفتاری کے بعد قتل کیا۔ ان کے بعد حسین بن زید نے جن کا لقب "داعی الحق" تھا علاقہ طبرستان اور اس کے حدود میں اپنا پورا قبضہ جما لیا۔ انیس برس کامل ان کی حکومت رہی ان کے مر جانے کے بعد ان کے بھائی محمد بن حسن نے اس علاقے میں اٹھارہ برس تک سلطنت کی۔ آخر میں اسمٰعیل سامانی کے اشارے سے محمد بن ہارون نے ان کو قتل کرا دیا"

"امام علی نقی علیہ السلام کو یحییٰ اور داعی الحق وغیرہ کے معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگرچہ سادات کرام نے بہت چاہا کہ امامؑ ان کے شریکِ حال ہو جائیں لیکن حضرتؑ نے دنیوی بکھیڑوں میں پڑنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ آپ کو بجز عبادتِ خدا اور تلقین و ارشادِ مطلق

کسی دوسرے کام کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔" (۱۱۷)

مستعین باللہ کا چار سالہ دور لڑتے جھگڑتے گزر گیا۔ آخر اس نے ترکوں کی بالادستی سے تنگ آکر بغداد میں پناہ لے لی۔ ترکوں نے اس کے جاتے ہی معتز بن متوکل کو تخت پر بٹھا دیا۔ نتیجے میں مستعین اور معتز میں کئی لڑائیاں ہوئیں، پھر مستعین تخت سے دستبردار ہو گیا اور ابن طولون کی نظر بندی میں مر گیا۔

معتز باللہ بن متوکل

معتز کے دور حکومت کا آغاز ۲۵۲ھ میں ہوا۔ اس کا پورا دور انتشار کا شکار رہا لیکن اہل بیت کرام کے لئے وہ متوکل کا بیٹا ہی ثابت ہوا، اور امام علی نقی علیہ السلام کی طرف سے غافل نہ رہا۔

امام علی نقی علیہ السلام کی شہادت

متوکل کی ہلاکت کے بعد سے، اگرچہ آپ کو پورا اطمینان نہ تھا، پھر بھی پریشانیاں بہت کچھ کم ضرور ہو گئی تھیں۔ عقیدت مند بسہولت آپ تک پہنچ جاتے اور حسب دل خواہ آپ سے فیض حاصل کرتے تھے۔ سامرہ کی سترہ سالہ نظر بندی کے یہ چھ سات سال ایسے تھے جن میں آپ نے آزادی کے ساتھ فرائض امامت انجام دیئے اور شیعان علیؑ پر اتنی زیادہ سختیاں نہیں ہوئیں کہ وہ امامؑ کا نام لیتے تو قید کر دیئے جاتے۔ اس کا سبب خود حکمرانوں کی مملکتی الجھنیں تھیں۔ انہیں اتنا موقع ہی نہ ملتا کہ اولادِ رسولؐ پر ظلم کر کے دل کے پھپھولے پھوڑ سکیں۔

متوکل کے بیٹے معتز کو اگرچہ پورا سکون میسّر نہ تھا، تاہم اس نے باپ کی سیرت کو فراموش نہ کیا، اور ایک دن ایک آدمی کو بہانے سے بھیج کر کھانے کی کسی چیز میں زہر ملوا دیا۔ جس کے کھاتے ہی ۳ رجب ۲۵۴ھ کو آپ کی شہادت واقع ہو گئی۔ آپ کی عمر اس وقت ساڑھے اکتالیس سال تھی۔

امام حسن عسکریؑ موجود تھے۔ آپ نے تجہیز و تکفین کی اور گھر کے اندر ہی قبر کھود کر دفن کر دیا۔

اولادِ اطہار

مختلف بیویوں سے چار بیٹے اور ایک بیٹی یادگار تھی: امام حسن عسکریؑ، حسین بن علی، محمد بن علی، جعفر بن علی اور رعقبہ یا عائشہؒ بنت علی۔

جعفرؒ امام حسن عسکریؑ کے بعد طالبِ امامت ہوئے تھے لیکن حضرت حجتؑ کی موجودگی میں ان کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا گیا، لہٰذا جعفر کذّاب مشہور ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ادّعائے امامت نہیں کیا، اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت حجتؑ کی امامت تسلیم کر لی تھی۔ لہٰذا ان کی اولاد انہیں جعفر توّاب کہتی ہے۔ سادات امروہہ ان ہی کی نسل سے ہیں اور اپنے کو نقوی کہتے ہیں۔

امام محمد تقیؑ علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت امام علی نقیؑ، دوسرے موسیٰ مبرّقعؒ۔ امام علی نقیؑ کی اولاد نقوی کہلاتی ہے تو تقوی عموماً اپنے کو جدِ اعلیٰ امام علی رضا علیہ السلام سے نسبت دے کر "رضوی" کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ مبرقع ۲۵۵ھ میں بعمر ۴۳ سال کوفہ پہنچے، کوفہ سے قم گئے۔ قم میں ایک عرصہ قیام کے بعد کاشان تشریف لے گئے مگر اہلِ قم پھر آپ کو واپس لے آئے اور پھر آپ کی نسل قم میں آباد ہو گئی۔ (۱۱۸)

امیر المومنین حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

۳ رجب ۲۵۴ھ تا ۸ ربیع الاوّل ۲۶۰ھ

ولادت و طفولیت

۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ کو آپ مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ ایک امام کی طرح پہلے ہی دن سے معجز نمائی کی اور جس نے دیکھا، اس نے سمجھ لیا کہ امام علی نقی کا جانشین متولد ہوا ہے۔ دوسرے آئمہ کی طرح آپ کے القاب بھی بے شمار تھے۔ آپ کا قیام ایک طویل مدت تک سرمن رائے کے محلہ عسکر میں رہا تھا۔ اس لئے عسکری کہلائے۔

بچپن میں آپ گھر کے کنوئیں میں گر گئے تو عورتیں چیخنے لگیں، امام علی نقیؑ مصروف نماز تھے۔ نماز ختم کر کے آپ اُٹھے تو دیکھا کہ امام حسن عسکری پانی کی سطح پر کھڑے ہوئے، پانی سے کھیل رہے ہیں۔

ایک روز آپ ایک مقام پر کھڑے کچھ بچوں کو کھیلتے دیکھ رہے تھے کہ اُدھر سے بہلول دانا کا گزر ہوا۔ انہوں نے کہا۔

"تم اس لئے رو رہے ہو کہ تمہارے پاس وہ کھلونے نہیں ہیں جو ان بچوں کے پاس ہیں ـــــ میں ابھی لاتا ہوں تمہارے لئے بھی!"

آپ نے فوراً انہیں روکا۔

"ہم علم و عبادت کے لئے پیدا ہوئے ہیں، کھیلنے کے لئے نہیں ـــــ"

تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا؟" بہلول نے پوچھا اور آپ نے جواب دیا۔

"قرآن مجید سے تم نے پڑھا تو ہو گا ـــــ کیا تم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور کیا تم ہماری طرف پلٹ کر نہ آؤ گے ؟"

بہلول متحیّر رہ گئے۔ آپ نے پوچھا

"بیٹے تم رو کیوں رہے تھے۔ اتنے کم سن ہو کہ گناہ کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا؟"

آپ نے فرمایا۔

"کم سنی سے کیا ہوتا ہے میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے کہ بڑی لکڑیاں جلانے کے لئے پہلے چھوٹی لکڑیاں جلاتی ہیں ـــــ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں جہنم کے بڑے ایندھن کے لئے چھوٹے بچے استعمال نہ کئے جائیں!"

فکر کی یہ بلندی علیؑ کے سلسلۂ امامت کے ہر بچے بوڑھے میں یکساں تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ ولی کے گھر ولی پیدا ہوتا ہے اور شیر کے گھر شیر کا بچہ۔

بہلول دانا

آپ ایک مجذوب نما بزرگ تھے۔ جان بوجھ کر آپ نے اپنی یہ حالت بنا رکھی تھی۔ تاکہ ظالم بادشاہوں کے دست ظلم سے محفوظ رہیں اور جو کچھ کہنا ہو بے دھڑک کہہ جائیں مگر تھے دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ عرفان آلِ محمدؐ آپ کے دور میں آپ سے زائد بہت کم لوگوں کو تھا۔ آپ نے امام جعفر صادقؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک کی زیارت کی اور سات عباسی خلفاء کا زمانہ دیکھا۔ عجیب و غریب خرد افروز کہانیاں آپ سے منسوب ہیں۔

ایک بار ایک مجمع میں کوئی کہہ رہا تھا شیعوں کی تین باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ خدا دیکھنے کی چیز نہیں، بندہ اپنے فعل میں مختار ہے۔ شیطان آگ میں جلایا جائے گا۔ جب کہ وہ آگ ہی سے بنا ہے۔ بہلول سن رہے تھے۔ انہوں نے ایک مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر اس کے سر پر مار دیا۔ لوگوں نے بہلول کو پکڑ لیا اور قاضی کے پاس لے گئے۔ قاضی نے پوچھا۔

"تم نے اس کو ڈھیلا کیوں مارا؟"

"میں نے تو نہیں مارا، خدا نے مارا ہے ـــــ بندہ اپنے فعل میں مجبور ہے جو کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے ـــــ پھر اس فعل سے اس کا نقصان ہی کیا ہوا؟"

"ہوا کیوں نہیں ـــــ"، اس شخص نے کہا۔ "اب تک سر میں درد ہو رہا ہے"

بہلول اس کے قریب گئے اور سر پکڑ کر دیکھنے لگے۔ "کہاں ہے درد؟"

"درد بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے؟" وہ بگڑ کر بولا اور بہلول نے نرمی سے کہا "موجود ہے تو دکھائی ضرور دے گا ـــــ تم تو ابھی کہہ رہے کہ خدا ہے تو نظر ضرور آئے گا۔"

اب بہلول کا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا۔ آپ نے کہا۔

"ڈھیلا مٹی کا تھا، تم بھی مٹی کے بنے ہو۔ مٹی کو مٹی سے چوٹ کیونکر لگی ـــــ؟ اور اگر یہ سچ ہے تو آگ کا بنا ہوا شیطان جہنم کی آگ سے جل سکتا ہے ـــــ!"

مستغیث ہکا بکا رہ گیا۔ قاضی نے بہلول کو بری کر دیا اور وہ دیوانگی میں ہاتھ ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

ایک بار بہلول ایک ٹوٹی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ کسی نے کہا۔

"اس ویرانے میں کیا کر رہے ہو بہلول، شہر جاؤ۔"

"شہر والے تو یہاں آ رہے ہیں میں شہر جا کر کیا کروں!" بہلول نے جواب دیا۔ کہنے والے پر نظریں جما کر کہا۔ "شہریوں میں بیٹھنے والا نہیں ہے میں تو ان لوگوں میں بیٹھا ہوں جو نہ کسی کی غیبت کرتے ہیں، نہ کسی کا مال چھینتے ہیں، نہ آپس میں لڑتے ہیں ـــــ ہمسائے کو ستاتے نہیں، گھر آئے ہوئے کو بھگاتے نہیں، دوست آئے دشمن آئے، سب کے لئے ان کے دروازے کھلے ہیں۔ نہ تاج و تخت کی ہوس نہ جاہ و منصب کا خیال۔ نہ کسی کے آنے کی فکر نہ جانے کا غم۔

بہلول دیوانگی میں کار انبیاء انجام دیتے رہتے اور ان کی ہر تان اس جگہ آ کر ٹوٹتی تھی جو منزل تھی تعلیمات امیر المومنینؑ کی۔ کہا جاتا ہے کہ ہارون رشید نے ان کی خردمندی سے متاثر ہو کر وزادت کی پیش کش کی تھی مگر انھوں نے ٹھکرا دی، اور فقیری کے بھیس میں ظلم و مظلومیت دونوں کی انتہا کا جائزہ لیتے رہے۔

محاسن وکمالات

ہمارے آئمہ، انبیاء کی طرح خلقی طور پر پیکر علم و ہدیٰ تھے۔ الفاظ میں ان کا بیان ممکن نہیں۔ اشاروں کے طور پر اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ ایک عالم بہجہت، فقیہہ باکمال اور مفسر باعمل تھے۔ دوسرے اماموں کی طرح آپ کو بھی نشر و تبلیغ کا موقع نہیں ملا تاہم جب بھی وقت نے مہلت دی، آپ نے علم کے دریا بہا دیئے اور پانے والوں نے بقدر ظرف حاصل کر لیا۔

عبادت و تقویٰ آپ کا مزاج بشری تھا جس کے نمونے پچھلے دس امام پیش کر چکے تھے۔

تواضع اور جود و سخا کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ علیؑ و فاطمہؑ کے پوتے تھے۔

علی بن ابراہیم بن جعفر کا بیان ہے کہ ایک دن وہ افلاس سے تنگ آ کر امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ راستے میں سوچا کہ اگر پانچ سو درہم مل گئے تو دو سو کے کپڑے بنوالیں گے۔ خدمتِ امامؑ میں پہنچ کر زبان کو کچھ کہنے کا یارا نہ ہو سکا، بلا کچھ کہے رخصت ہو گئے۔ دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ عقب سے آپ کا غلام ایک تھیلی لے کر آیا۔ اس نے تھیلی ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ فرمایا ہے کہ اس میں سے دو سو درہم کے کپڑے بنوا لیجئے گا۔

پھر اس نے کہا: حضرتؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوہستان کی طرف نہ جایئے گا بلکہ فلاں موضع میں چلے جایئے۔ یہ لوگ اس موضع میں گئے تو وہاں ان کی ملاقات ایک دولت مند عفیفہ عورت سے ہوئی، جس سے علی بن ابراہیم نے عقد کر لیا اور اس کی جائیداد سے انہیں چار ہزار سالانہ کی آمدنی ہو گئی۔

عظمت و جلالت آپ کی خاندانی وجاہت میں شامل تھی۔ دشمن آپ کی عدم موجودگی میں غضب ناک ہوتا لیکن آپ کے سامنے پڑتے ہی مرعوب ہو کر موم پڑ جاتا۔ اس طرح کے کتنے ہی واقعات اسلاف کی طرح آپ کے ساتھ بھی

پیش آئے کہ خلیفہ قتل کے لئے ننگی تلوار لے کر بیٹھا ہے اور جب آپ تشریف لائے تو اس نے تلوار دونوں ہاتھوں پر رکھ کر پیش کر دی۔

علم کے لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ گھٹی میں پڑا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نسلی طور پر خلقت میں رچا بسا تھا۔

عرب کے مشہور فلسفی اسحٰق کندی نے ایک مرتبہ قرآن مجید کے متضاد مفاہیم کی آیات جمع کیں اور قرآن کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کا ایک شاگرد امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس سے کہا۔

"تم اپنے استاد کو اس فضول کام سے کیوں نہیں روکتے؟"

"میری کیا مجال ہے۔ وہ مجھ سے علم و فضل اتنے بڑے ہیں کہ میں ان کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتا۔" اس نے عذر کیا اور آپ نے فرمایا۔

"اس سے کہو تم جس آیت کے جو معنی لیتے ہو، اس کے معنی وہ نہیں ہیں بلکہ کچھ اور ہیں، جو تمہیں خدا بتا سکتا ہے۔ یا وہ شخص جس کو خدا نے بتایا ہو ـــــ اگر خدا یا اس کا فرستادہ تمہیں آکر بتائے تب تو مان لوگے؟"

شاگرد نے اسحٰق کندی سے آکر ویسا ہی کہا اور عظیم فلسفی سمجھ گیا کہ یہ جواب امامؑ کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا اور اس نے وہ سارے اوراق جلا ڈالے جو اب تک لکھے تھے۔

آپ دوسرے آئمہ کی طرح السنہ عالم کے عالم بھی تھے اور آنے والے واقعات کی پیشین گوئیاں تو اس طرح کرتے جیسے آپ بچشم خود انہیں دیکھ رہے ہوں۔

آپ نے ۹ ربیع الاوّل کو حضورؐ اور امیرالمومنینؑ کے عید منانے کی تصدیق فرمائی اور شیعوں کے لئے اس کو مستند قرار دیا۔ اس کو زیادہ اہمیت اس لئے بھی ہے کہ حضرت حجتؑ کا آغازِ امامت اسی تاریخ سے ہوا۔

آپ نے مختلف اوقات میں اپنے ہم جلیسوں کو نصیحتیں بھی کیں جو آپ کے گراں قدر اقوال میں شامل ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

جاہل کی صحبت سے بچو، خواہ وہ ناصح ہی کیوں نہ ہو۔ عاقل سے دوری اختیار نہ کرو، اگرچہ وہ دشمن ہی ہو کیونکہ جاہل سے تمہیں ایسی جگہ نقصان پہنچے گا جہاں نفع کی امید ہو گی۔ عقلمند کی مروت عداوت پیدا ہونے کے اسباب کو روکتی ہے۔

کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، اگر حق کو چھوڑ دے گا، ذلیل ہو جائے گا

بہترین عبادت یہ ہے کہ آدمی اپنے فرائض کو ادا کرتے رہے۔

ہر بلا و مصیبت کے پیچھے رحمت و نعمت ہوتی ہے۔

ادوار خلافت

امام حسن عسکریؑ کی ولادت واثق کے عہد میں ہوئی تھی۔ پھر آپ نے متوکل کا خونیں دورِ حکومت مشاہدہ کیا بلکہ جھیلا۔ ۲۴۷ھ میں منتصر اور ۲۴۸ھ میں مستعین تخت نشین ہوا اور اس کے بعد معتز نے باپ کا سایہ سر سے چھین لیا۔

امام علی نقیؑ کی زندگی میں ایک بار مستعین نے آپ کو طلب فرما کر منہ زور گھوڑا آپ کے حوالے کیا۔ کہ یہ گھوڑا کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ آپ کی جوانی کا زمانہ تھا مگر آپ دودمان حدیث و فقہ کے پروردہ تھے۔ تربیت فرس سے بظاہر آپ کا کیا تعلق ہو سکتا۔ آپ نے عذر کیا مگر مستعین بضد ہو گیا۔ یہ گھوڑا کئی آدمیوں کو گرا چکا تھا مستعین نے سوچا تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے ساتھ ایسا ہی کچھ پیش آیا تو امام علی نقیؑ کا گھر بے چراغ ہو جائے گا اور مستقبل کے خطرات ختم ہو جائیں گے

امام حسن عسکریؑ نے جب دیکھا کہ وہ مانتا ہی نہیں تو آپ گھوڑے کے قریب تشریف لے گئے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا پھر مستعین کی خواہش کے مطابق اس پر سواری کر کے بھی دکھا دی۔

اب معتز کا زمانہ تھا جو امام علی نقیؑ کا قاتل تھا اور سادات دشمنی میں متوکل کا قائمقام۔ اس نے امام حسن عسکریؑ کو علی بن یارش کی حراست میں نظر بند کر دیا لیکن آپ کی شب زندہ داری اور تقویٰ اس کو متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ اس نے اپنی گستاخیوں کی معافی مانگی اور آپ کو خود جا کر دولت سرا تک چھوڑ آیا۔

اس زمانے میں بھی بعض سادات بڑی بے رحمی سے مارے گئے۔ حسین کے بیٹے جعفر، محمود، باقر اور زین العابدین سامرہ سے لار چلے گئے تھے، وہاں سازش سے قتل کر دیئے گئے۔

محمد کے بیٹے رحمت اللہ، لطیف اللہ، عنایت اللہ، ہدایت اللہ اور نعمت اللہ کرمان میں تہہ تیغ کئے گئے۔

پچاس سے زائد آدمیوں کا ایک قافلہ امام رضؑا کے بھائی سید جلال اشرف کی سرکردگی میں بغداد سے طارم جارہا تھا کہ زنکان کے قریب شمر ذی الجوشن کے پوتے ابوالمعالی نے تین ہزار فوج کے ساتھ انہیں گھیر لیا۔ مقامی لوگوں نے امام زادوں کی مدد کی اور دشمن کو شکست ہوئی ۔۔۔۔ مگر یہ لوگ جب سید جلال الدین کے انتقال کے بعد وہاں سے رے منتقل ہوئے تو سوتے میں خارجیوں نے حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا۔

احمد ابن طولون نے معتز کے زمانے میں سادات پر بڑے مظالم ڈھائے بعض تذکروں میں ان کی تعداد اٹھارہ ہزار بتائی جاتی ہے جن میں علی بن ابراہیم حسینی عبداللہ بن علی زیدی، محمد بن احمد علوی، حمزہ بن حسین، حمزہ بن عیسیٰ زیدی، محمد و ابراہیم پسران حسن علوی، حسن بن محمد زیدی، اسمٰعیل بن عبداللہ، محمد بن حسین زیدی اور محمد بن عبداللہ زیدی وغیرہ شامل ہیں۔

اسی دور میں ترکوں سے معتز کی مخالفت بڑھ گئی۔ وہ اس کو محل سے کھینچ کر باہر لے آتے اور نوک شمشیر سینے پر رکھ کر تاج و تخت سے دستبردار کرایا، پھر قید کر دیا اور قید خانے ہی میں اس کا کام تمام کر دیا۔

مہتدی باللہ بن واثق

معتز کے بعد واثق کا بیٹا مہتدی ترکوں کی حمایت سے بادشاہ بنا۔ ذاتی طور پر وہ باصلاحیت حکمران تھا مگر اہلبیتؑ کی دشمنی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس نے امام حسن عسکریؑ کو اپنے وزیر صالح بن وصیف کی حراست میں دے دیا۔ اس ظالم نے

امامؑ کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، حتیٰ کہ پانی تک کی تکلیف دی اور امامؑ کو تیمم سے نماز ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر بھی آپ اپنے وظائف میں مصروف رہے، نگرانی پر متعین غلام اس سے بہت متاثر ہوئے اور آپ کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔ صالح نے غلاموں کی یہ حالت دیکھی تو اس کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ غلام شیعہ نہ ہو جائیں لہٰذا اس نے آپ کو رہا کر دیا۔

اس عرصے میں ترک مہتدی کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ترکوں کا مقابلہ کیا مگر ہزیمت یاب ہو کر گرفتار ہوا اور تھوڑے ہی عرصے بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

معتمد علی اللہ بن متوکل

معتمد ۲۵۶ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ اس نے مرو کے بجائے بغداد کو دارالخلافہ بنالیا۔

اس کے عہد میں مختلف علاقوں میں کئی آزاد حکومتیں بن گئیں۔ مصر پر احمد بن طولون پہلے ہی قابض تھا۔ طبرستان میں حضرت علیؑ کی اولاد میں حسن بن زید نے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ یعقوب بن لیث نے سجستان اور ایران پر قبضہ کر لیا۔ ماوراء النہر میں سامانی حکومت مستحکم ہو گئی۔ مختلف مقامات پر جو بغاوتیں ہوئیں انہیں معتمد کے بھائی موفق نے کچل دیا۔

معتمد کی بچی کھچی سلطنت اگرچہ ابھی کافی وسیع تھی مگر اس میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں بھی معتمد نے امام حسن عسکریؑ پر نظر رکھی۔ حضورؐ کا ارشاد گرامی اس کے پیشِ نظر تھا کہ میرے بارہ جانشین ہوں گے اور بارہواں تمام دُنیا کا نجات دہندہ ہوگا۔ معتمد گیارہویں امامؑ کو قتل کر کے بارہویں کا امکان ہی ختم کر دینے کی فکر میں تھا۔ شاید حضرت حجتؑ کی ولادت اب تک اس کے علم میں نہیں آئی تھی۔

اس مقصد کے لئے معتمد نے اپنے ناصبی غلام نحریر کو امامؑ کو گرفتار کر لینے کا

حکم دیا اور اس نے آپ کو گھر میں نظر بند کر دیا۔ وہ آپ کو اتنا پریشان کرتا تھا کہ خود اس کی بیوی مانع ہوئی تو اس نے غصے میں معتمد سے کہہ کر آپ کو درندوں کے پنجرے میں ڈلوا دیا لیکن دوسرے آئمہ کی طرح درندے آپ کے سامنے بھی سرنگوں ہو گئے۔

درندوں سے بھی گئے گزرے تھے وہ انسان جو امامؑ کے حضور درندوں کی اطاعت دیکھ کر بھی مطیع نہیں ہوئے بلکہ ان کا بغض اور زیادہ ہو گیا اور معتمد نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آپ کو اپنی نگرانی میں قید رکھے گا۔

محل شاہی میں خلوت گاہ کے قریب ایک تہہ خانہ تھا۔ معتمد نے امامؑ کو اسی میں قید کر دیا جس میں خود اس کے علاوہ کسی شخص کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بنی امیّہ کے نقطۂ آغاز سے ہر حکمراں اس فکر میں لگا رہا کہ آلِ محمدؐ کی براہِ راست نسل منقطع کر دے، پھر بنی عباس تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے۔ چنانچہ مامون کے دور سے حالات کا ایک جائزہ لیا جائے تو امام رضاؑ کی عمر بغداد میں کٹ گئی۔ امام محمد تقیؑ آپ کی واحد یادگار رہے۔ پھر امام محمد تقیؑ کو مدینے میں رہنے کا کچھ موقع میسّر آیا تو آپ نے پانچ بچے چھوڑے۔ متوکل کے دماغ میں بھی یہی وسوسہ تھا، اس نے امام علی نقیؑ کو مدّت العمر قید میں رکھا کہ بیوی سے ملنے نہ پائیں اور استقرارِ حمل کا امکان ہی پیدا نہ ہو۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ امام حسن عسکری کی ولادت مدینے میں ہو چکی ہے۔

اب امام حسن عسکریؑ کے بعد خطرہ سر پہ منڈلا رہا تھا لہٰذا اس نے آپ کو عزیز و اقارب اور بیوی سب سے علیحدہ کرا دیا لیکن ہر ممکن روک تھام کے باوجود اپنے کو موسٰیؑ سے بچا نہ سکا۔ معتمد نے امام حسن عسکریؑ کو اس وقت حبسِ دوام میں رکھا، جب فرعون کا موسٰیؑ عالمِ شہود میں آ چکا تھا۔

یہ تہہ خانہ بالکل تیرہ و تار تھا۔ روشنی کا کوئی سوراخ بھی اس میں نہ تھا صرف ایک دروازہ تھا جو صبح و شام کھلتا تھا اور صرف کھانے پینے کی کوئی چیز اندر پہنچا دی جاتی تھی ــــــ معتمد نے آپ کو قتل اس لئے نہیں کرایا کہ وہ پہلے ہی سے مختلف بغاوتوں سے دوچار تھا۔ ڈرتا تھا کہ اس نے ایسا کوئی قدم اٹھایا

تو ایک گروہ جانوں پر کھیل جائے گا پھر اس کو اپنے وفاداروں پر بھی اعتماد نہ تھا۔
اس کا مقصد یوں بھی پورا ہو رہا تھا۔ دو سال کی مسلسل قید نے چوبیس سال کے امامؑ کو ستر برس کا بوڑھا بنا دیا تھا۔

اسی زمانے میں قحط پڑا اور ایک بوڑھے راہب نے مٹھی میں کسی نبیؑ کی ہڈی کا ٹکڑا زیر آسمان بلند کر کے اس کا حوالہ دے کر دعا کی تو بارش ہونے لگی اس کرامت پر لوگ دینِ عیسوی کی طرف مائل ہونے لگے اور معتمد کو مجبوراً اسلام کے اصلی محافظ سے رجوع کرنا پڑا۔ آپ نے حقیقتِ حال سمجھ کر ہڈی اس سے لے لی اور راہب کو بھرے مجمع میں شرمندہ ہونا پڑا۔ پھر آپ نے مصلیٰ بچھا کر دو رکعت نماز ادا کی اور دعا فرمائی تو موسلا دھار بارش ہوئی اور ساری خلقت کے ساتھ معتمد کا سر بھی آپ کے سامنے خم ہو گیا مگر دل اب بھی نہیں جھکا اور قلبی عناد اپنی جگہ پر رہا۔

اس واقعہ کے بعد معتمد نے امامؑ کو گھر میں رہنے کی اجازت دے دی مگر نگرانی کے لئے آدمی مقرر کر دیئے۔

خمس کی وصولیابی کے لئے آپ نے پہلے ہی اپنی طرف سے ابوجعفر محمد عمری کو اپنا وکیل مقرر کر دیا تھا جو خمس کی رقم یکجا کرتے تھے اور آپ سے حکم حاصل کر کے تقسیم کر دیتے تھے۔ آنے جانے والوں پر اب بھی روک ٹوک تھی مگر ابوجعفر کسی نہ کسی بہانے حاضر ہو جاتے۔ معتمد نے اس پر بھی پابندی لگائی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

ابوجعفر کے علاوہ کچھ لوگ اور بھی آپؑ کے معتمد تھے جو اطراف سے رقومِ خمس بھی وصول کرتے اور دوسری خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ علی ابن جعفر قیم ابوہاشم داؤد بن القسم الجعفری، داؤد بن یزید نیشاپوری، محمد بن علی بن ہلال عبداللہ بن جعفر الحمیری قمی، ابوعمر، عثمان بن سعید عمری، اسحٰق بن ربیع کوفی، ابوالقاسم جابر بن یزید فارسی، ابراہیم بن دعبل نیشاپوری۔

ان میں ابو ہاشم داؤد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بھی بہلول دانا کی طرح پانچ اماموںؑ کی زیارت کی تھی۔

امامؑ کی وفات

حضرت معاویہ کے عہد سے اس وقت تک سلاطین کا کامیاب ترین حربہ زہر رہا تھا جس سے وہ دشمن کو راستے سے ہٹا بھی دیتے اور خود الگ تھلگ بھی رہتے۔ پھر وقت کا مورخ اسلام کے نام پر انھیں بے داغ ثابت کرنے میں لگ جاتا۔

معتمد نے بھی یہی حربہ استعمال کیا۔ اظہارِ عقیدت کے لئے غلام کے ہاتھ زہر آلود کھانا بھجوا دیا اور آپ نے اس کو نوش فرما لیا۔

ماموں اعظم کے خوشہ ہائے انگور معتمد کی نظروں میں تھے۔ اس نے بھی یہ کھانا خاص طور سے امامؑ کے لئے تیار کرایا تھا اور کھلایا بھی اس طرح کہ غلام بیٹھا رہا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اتنا لذیذ کھانا آپ کو پسند بھی آیا یا نہیں؟

جب زہر کا اثر ہونے لگا تو معتمد نے اپنے خاص طبیب عبداللہ کو علاج کے لئے بھی بھیج دیا تاکہ کوئی دوسرا معالج تریاق دینے نہ پائے۔

تین دن اور تین راتیں حضرتؑ نے کرب و بے چینی میں گزاریں، پھر صبح ہوتے پانچ سال کے ایک صاحبزادے کو بلا کر ان کو سینے سے لگایا۔ دیر تک کانوں میں کچھ کہتے رہے اور ۸ ربیع الاوّل ۲۶۰ھ میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

معصومؑ کا جنازہ

غسل و کفن گھر کے اندر ہوا اور انھیں صغیر سن صاحب زادے نے سب کچھ کیا جنھیں امامؑ نے آخر وقت سینے سے لگایا تھا۔ پھر میّت نمازِ جنازہ کے لئے رکھی گئی اور امام حسن عسکریؑ کے بھائی جعفر نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن عین وقت پر وہی صاحب زادے اندر سے نکل کر جنازے کے قریب آ گئے اور قدرے بلند آواز سے فرمایا۔

"چچا! آپ ہٹیں، نماز میرے سوا کوئی پڑھا نہیں سکتا ـــــــ"

یہی ہمارے بارہویں امام حضرت حجّتؑ تھے۔ اس کم سِنی میں رسُولؐ کی نیابتِ مطلق کے فرائض آپ نے انجام دیئے اور پھر اندرونی حجرے میں چلے گئے۔

معتمد نے بھی مامون کی طرح امام حسن عسکریؑ کے مرنے پر صدمے کا اظہار کیا۔ عمائدینِ سلطنت نے بھی جنازے میں شرکت کی، بالآخر معتمد کے بھائی عیسیٰ نے نماز پڑھائی۔ اتنا بڑا مجمع اس سے قبل کسی موت پر اکٹھا نہ ہوا تھا۔ قبر امام رضاؑ کے مزار کے قریب تیار تھی جہاں وہ صاحبزادے پہلے سے موجود تھے۔

انھیں چند لوگوں کے سوا کوئی پہچانتا نہ تھا۔ انھوں نے میّت قبر میں اُتاری اور تدفین کر کے فوراً چلے گئے پھر امامت کا وہ باب بند ہو گیا جس کے بعد کا سلسلہ دامنِ قیامت سے جا کر مل جائے گا۔ (۱۱۹)

بارہویں امام

امیر المومنین حضرت امام مہدی آخر الزماں علیہ السلام

۹- ربیع الاوّل ۲۶۰ھ تا قربِ قیامت

حسب و نسب

۱۵- شعبان ۲۵۵ھ کو صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی محمد بن الحسن ہے، معروف القاب مہدی آخر الزماں، صاحبِ امر، قائم آلِ محمد، حضرت حجت، صاحب العصر، امام غائب اور المنتظر ہیں۔ پدر بلند مرتبت امام حسن عسکری علیہ السلام اور مادر علیہ منزلت نرجس خاتون ہیں، جن کا اصلی نام ملیکہ تھا اور جو سوسن ریحانہ کے القاب سے بھی موسوم ہوئیں۔

حضرت نرجس خاتون

آپ قیصر روم کی پوتی تھیں، باپ کا نام یشوعا رتھا، ماں حضرت عیسیٰؑ کے وصی شمعون الصفا کی نسل سے تھیں۔

آپ کے جوان ہونے پر قیصر نے اپنے بھتیجے سے آپ کا رشتہ کر دیا مگر پادری جب رسم شادی ادا کرنے کے لئے بیٹھے تو تمام بت اور صلیبیں اوندھے منہ زمیں پر گر پڑیں تخت کے پائے ٹوٹ گئے۔ دولہا زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا، پادری کانپنے لگے۔ ان حالات کو فال بد سے تعبیر کیا گیا۔ نتیجے میں شادی ملتوی ہو گئی۔

دوسری بار دوسرے شہزادے سے نسبت ہوئی اور شادی کے لئے ہر ممکن احتیاط کی گئی لیکن وہی صورتِ حال پیش آئی۔

اسی رات آپ کو خواب میں جناب عیسیٰؑ نظر آئے، جن کے جلو میں شمعون بھی تھے انہوں نے تخت کی جگہ ایک منبر نصب کرایا پھر کچھ بزرگ اور تشریف لائے جو حضرت محمد مصطفیٰؐ، حضرت علی مرتضیٰؑ اور آئمہؑ طاہرین تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے بقصد تعظیم آنحضرتؐ کو منبر پر بٹھایا اور آپ نے حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا۔

"میں اپنے بیٹے حسن عسکریؑ کے لئے آپ کی بیٹی ملیکہ کا رشتہ مانگنے آیا ہوں"۔

حضرت عیسیٰؑ نے استفہامیہ انداز میں شمعون کی طرف دیکھا۔ شمعون نے شہزادی ملیکہ سے پوچھا اور آپ نے فوراً حامی بھرلی۔

"یہ میرے نصیب کی بات ہوگی ــــــ"

پھر آنحضرتؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ نے آپ کا عقد امام حسن عسکریؑ سے پڑھ دیا۔

اب آپ سیدہ کونین کی بہو تھیں۔ صبح کو آپ بڑی ڈری سی ایک انجانی مسرت میں ڈوبی ہوئی بیدار ہوئیں مگر خواب کے اس واقعہ کا اظہار کسی سے نہ کیا۔ خوشی کی ایک لہر رگ وپے میں دوڑ رہی تھی اور امام کی محبت میں کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ بس ہوتا تو پر لگا کر خدمتِ امامؑ میں پہنچ جاتیں، کیونکہ اب وہ آپ کے لئے غیر تو نہیں رہے تھے۔ اس وقت سے آپ اپنے کو امامؑ کی امانت سمجھنے لگی تھیں۔

اس ذہنی کش مکش میں آپ بیمار پڑ گئیں لیکن طبیبوں کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ دادا آپ کی حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ انہوں نے آپ سے پوچھا کہ کوئی خواہش ہو تو بیان کریں۔ آپ نے فرمایا۔

"سارے مسلمان قیدیوں کو چھوڑ دیں۔ شاید ان کی دعا سے میں اچھی ہو جاؤں"۔

دادا نے ایسا ہی کیا، پھر آپ نے اپنے کو سنبھال لیا۔

چار روز بعد آپ نے جناب فاطمہؑ زہرا اور جناب مریمؑ کو خواب میں دیکھا۔ جناب مریمؑ نے تعارف کرایا۔

"یہ امام حسن عسکریؑ کی دادی ہیں ــــــ"

آپ فاطمہؑ زہرا کا دامن پکڑ کر رونے لگیں اور بولیں

"امامؑ مجھے دیکھنے نہیں آئے —— !"

"کیسے آتے، تو نے ابھی اظہار ایمان تو کیا نہیں" سیدہ عالمیان نے فرمایا پھر آپ کو کلمہ طیبہ تعلیم فرمایا اور جب آپ نے کلمہ پڑھ لیا تو آپ کو سینے سے لگایا اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اب میرا بیٹا تجھ سے ملنے آئے گا"

اگلی ہی رات خواب میں امامؑ تشریف لائے۔ آپ نے ان سے بہت شکایت کی۔ انہوں نے کہا۔

"اب تم دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی ہو، میں آتا رہوں گا"

پھر آپ عالم رویا میں ہر شب زیارت سے مشرف ہوتی رہیں۔

ایک رات امامؑ نے آپ سے فرمایا۔

"تمہارے دادا چند روز میں مسلمانوں سے لڑنے کے لئے ایک لشکر بھیجیں گے پھر عقب میں خود جائیں گے۔ تم بھیس بدل کر کنیزوں میں مل جانا اور دادا کے پیچھے روانہ ہو جانا"

آپ نے ایسا ہی کیا اور مسلمان مخبروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئیں۔

دادا نے آپ کو بہت پڑھایا لکھایا تھا، آپ کئی زبانیں جانتی تھیں۔ اس موقع پر یہ زبان دانی کام آئی۔ کنیزوں کی تقسیم میں آپ جس شخص کے حصے میں پڑیں اس سے عربی میں گفتگو کی، اس لئے آپ کے ساتھ اس کا برتاؤ کچھ نرم رہا۔ آپ نے اس کو اپنا نام ملیکہ کے بجائے نرجس بتا دیا جو کنیزوں کا سا نام تھا۔ اس طرح بغیر سوچے سمجھے آپ نے تقیہ اختیار کر لیا۔

امام علی نقیؑ کا دور تھا۔ ایک دن امامؑ نے بشیر بن سلیمان بردہ فروش کو بلایا اور فرمایا۔

"میں ایک خاص کنیز کی خریداری کے لئے تمہیں بھیجنا چاہتا ہوں"

بشیر دو دمان رسالت کا حلقہ بگوش تھا وہ ہمہ تن تیار ہو گیا۔ امامؑ نے رومی زبان میں لکھا ہوا ایک خط سر بمہر کر کے اس کو دیا اور ایک سو بیس دینار کی ایک تھیلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بغداد میں فرات (دجلہ) کے گھاٹ پر صبح کے وقت اسیروں کی چند کشتیاں آئیں گی ان میں بہت سی کنیزیں ہوں گی، جن کے مختلف مالک ہوں گے۔ عمر بن زید نام کا بردہ فروش ریشمی کپڑوں میں ملبوس ایک کنیز کو پیش کرے گا مگر وہ کسی کو اپنا جسم چھونے بھی نہ دے گی۔ رومی زبان بولتی ہو گی۔ تم کو وہی کنیز خریدنا ہے"۔

پھر امامؑ نے مزید تفصیل بتائی۔

" ایک خریدار اس کی قیمت تین سو دینار لگائے گا اور کہے گا کہ وہ اس کی پاک دامنی پر زیادہ راغب ہو گیا ہے"۔

کنیز جواب دے گی۔

"تو سلیمان بن داؤد کے جاہ و حشم کے ساتھ آئے تب بھی مجھے قبول نہیں"۔

کنیز کا مالک کنیز کو تنبیہہ کرے گا۔

"مجھے تیرا سودا کرنا ہے اور تو کسی کو پسند نہیں کرتی"۔

کنیز کہے گی۔

"جلدی نہ کر، میرا خریدار آنے ہی والا ہے ـــــ"

امام علیہ السلام نے بشیر سے فرمایا۔

"اس وقت تم آگے بڑھنا اور کنیز کے مالک عمر بن زید سے اجازت لے کر میرا خط کنیز کو دے دینا"۔

بشیر نے امامؑ کے ارشاد پر حرف بحرف عمل کیا اور ویسا ہی پیش آیا، جیسا امامؑ نے کہا تھا پھر بشیر نے وہ خط کنیز کو دے دیا اور کنیز نے اپنے مالک سے کہہ دیا "میں اس شخص کے ہاتھ بکنے کو تیار ہوں"۔

عمر بردہ فروش نے کنیز کے راضی ہو جانے پر منہ پھیلا دیا اور زیادہ رقم مانگنے لگا

مگر بشیر بھی اسی تجارتی برادری کا آدمی تھا۔ دونوں میں بڑی ردوقدح ہوتی رہی۔ آخر ایک سو بیس دینار پر سودا ہو گیا اور بشیر کنیز کو لے کر بغداد میں اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔

یہاں پہنچتے ہی کنیز نے خط کو نکالا، آنکھوں سے لگایا اور آنکھوں کو پونچھنے لگی جن میں آنسو بھر آئے تھے۔ بشیر نے متعجب ہو کر کہا۔

"آپ اس خط کو چوم رہی ہیں جس کے لکھنے والے سے آشنا تک نہیں"۔

کنیز نے کہا۔

"نہیں بشیر، تم کو معلوم نہیں کہ میں ان کی بہو ہوں ——"

پھر آپ نے تمام حالات بشیر سے کہہ سنائے اور اُس وقت سے بشیر کا رویہ آپ کے لئے مؤدبانہ ہو گیا، پھر وہ آپ کو لے کر سامرہ کی طرف چل پڑا۔

روم کی شہزادی جب امام علی نقی کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس کے بشرے سے کسی ملکہ کے جلال کے بجائے دوشیزگی کی حیا ٹپک رہی تھی۔ وہ بڑے احترام کے ساتھ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی اور امام نے بڑھ کر اس کے سر کو سینے سے لگا لیا۔

پھر امام نے آپ کو اپنی بہن حکیمہ خاتون کے حوالے کیا، جنھوں نے آپ کو ارکانِ دین اور تہذیب اسلام کی تعلیم دی۔

تحیّر خیز ہے ان خواتین کی سیرت جنہوں نے محلوں میں آنکھ کھولی، کنیزوں اور ماماؤں کے جھرمٹ میں ناز و نعم سے پلیں بڑھیں، پھر خانوادۂ امامت میں آکر مصائب سے دوچار ہوتی رہیں مگر کسی کی زبان سے اُف تک نہیں نکلی، جن میں جناب شہربانو اور حضرت نرجس خاتون کی عظمتوں کے سامنے تو سر جھک جاتے ہیں اور جب ان کا موازنہ اُم الفضل بنت مامون سے کیا جاتا ہے تو ان کی خاک کو پلکوں سے اٹھا لینے کو جی چاہتا ہے۔

امام حسن عسکریؑ نے ازدواجی زندگی کا زیادہ وقت نہ گزارا تھا کہ باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے پھر کچھ دنوں بعد ہی مبتلائے زندان ہو گئے، مگر روم کی

شہزادی نے سوچا بھی نہیں کہ آپ نے قیصر کے پُرشکوہ دارالامارہ میں پرورش پائی تھی بلکہ اس کے برعکس آپ سجادۂ امامت سے وابستگی پر اپنے کو عرش نشین سمجھتی رہیں اور امامؑ کے سامنے اس طرح سر اطاعت خم کئے رہیں، جیسے واقعی آپ ان کی کنیز ہی ہوں۔

اور بیٹے کو پیدا ہوتے ہی کلمۂ شہادت پڑھتے دیکھا تو فخر سے
آپ کا سر بلند ہوگیا اور کیوں نہ ہوتا، آپ اس بچے کی ماں تھیں جس
کے دم سے محمدؐ منتہی ہونے والے تھے اور جس کے ظہور سے آپؐ کی
خاتمیت کا آخری باب لکھا جانے والا تھا۔

نو زائیدہ امام کے داہنے ہاتھ پر جاء الحق و زھق الباطل
کندہ تھا اور پشت پر مُہرِ نبوّت ثبت تھی (۱۲۰)

پرورش

یوں تو ہر امامؑ معجز نما پیدا ہوا لیکن حضرت حجّتؑ کی ولادت میں لوازمۂ مشیّت نے ایک نیا موڑ لیا اور بروایت شیخ صدوق چند مُرغان سفید آسمان سے نازل ہوئے امام حسن عسکریؑ نے اپنے گوہرِ نایاب کو ان میں سے ایک مرغ کے حوالے کیا جو ہر چالیس روز کے بعد آپ کو لے کر آتا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس لے جاتا۔

صورت شکل میں آپ حضورؐ سے بہت مشابہ تھے، میانہ قد، گندم گوں رنگ بڑی آنکھیں، بلند اور پتلی ناک، چوڑی پیشانی، داہنے رخسار پر تِل، چمکدار دانت کشادہ سینہ، دونوں شانوں پر پڑی ہوئی زلفیں، صوفیائے کرام کے تصوّر کی طرح کمبل پوش پیغمبرؐ کا سراپا تھے۔ دو برس کے سن میں آپ پیروں چلنے لگے اور پانچ برس کے ہوئے تو آپ جوان معلوم ہوتے تھے۔

روح القدس کی آغوش آپ کا گہوارہ اور عرش الٰہی پالنا رہا تھا، پھر بھی آپ اپنے گھر سے نامانوس نہ تھے، ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور باپ کے دل کی روشنی تھے ـــــ امام حسن عسکریؑ نے آپ کی پیدائش کو دشمنوں کے ڈر سے چھپایا تھا۔ تاہم پانچ برس کی عمر میں کچھ لوگوں سے ملوا دیا تاکہ وہ آپ کے وجود پر

شاہد بن سکیں لیکن آپ کے حقیقی چچا جعفر کو بتایا نہیں گیا کیونکہ امام ان کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔

جعفر کو اس وقت علم ہوا جب آپ نماز جنازہ کے لئے اندر سے نکل کر آئے اور آپ کی آواز پر جعفر مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

خونخوار بھیڑیئے اور آہوئے رسالت

امام مہدیؑ کے وجود کی خبر پھیلی اور معتمد تک پہنچی تو وہ سناٹے میں رہ گیا۔ امام حسن عسکریؑ کو شہید کر کے وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اب بارہواں امام پیدا ہی نہ ہو گا تو دشمنوں کا استیصال کیا کرے گا لیکن جب امامؑ کے موجود ہونے کا سراغ لگا تو اس کے حکم پر امام حسن عسکریؑ کے گھر پر چھاپہ مارا گیا۔ امام مہدیؑ پہلے سے کہیں منتقل ہو گئے تھے۔ گھر کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا گیا اور ناکامی ہونے پر خواتین کرام کو گرفتار کر لیا گیا۔

کربلا کے بعد دوسری بار امام زادیاں دربار میں پیش ہوئیں۔ ان میں جناب نرجس خاتون بھی تھیں ـــــ عام حالات میں آپ اس چھوٹے سے دربار میں کھڑے ہو کر قیصر روم کو آواز دیتیں اور قسطنطنیہ میں ایک زلزلہ آ جاتا مگر آپ کی منزلت پچھلی حیثیت سے بہت زائد تھی۔ آپ ایک امامؑ کی مقدس رفیقۂ حیات اور خاتم الامامۃ کی برگزیدہ ماں تھیں۔ کوئی دنیاوی بادشاہ آپ کی نظر میں کیا سماتا۔ آپ نے سر آسمان کی طرف اٹھایا اور بغیر کچھ کہے شہنشاہِ کن فیکون سے سب کچھ کہہ دیا۔

معتمد کو خیال ہوا کہ شاید امامؑ پیدا نہ ہوئے ہوں لہذا اس نے عورتوں کی طرف سے اطمینان کرایا کہ ان میں سے کوئی حاملہ تو نہیں ہے؟ لیکن ایسی کوئی علامت کسی عورت میں پائی نہیں گئی تو انہیں چھوڑ دیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد امام مع اپنی والدہ گرامی سامرہ سے حلہ چلے گئے اور ظالموں سے بچنے کے لئے چھپے رہے۔

معتضد باللہ بن طلحہ

سنہ ۲۷۹ھ میں معتمد مر گیا اور متوکل کا پوتا اور معتمد کا بھتیجا تخت نشین ہوا۔ اس

کاسارا وقت خانہ جنگیوں اور قرامطہ کے فتنوں میں گزرتا تھا پھر بھی اس نے حضرت حجتؑ کی تلاش جاری رکھی۔

ایک بار معتضد کو پتہ چلا کہ امامؑ ایک مکان میں قیام فرما ہیں۔ اس نے اپنے ایک معتبر دوست اشیق کو چند سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ نصف شب کے قریب یہ لوگ اس جگہ پہنچے، دربان باہر موجود تھا۔ اشیق نے اس سے پوچھا۔

"کون رہتا ہے اس مکان میں ؟"

"مالکِ مکان" دربان نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ یہ لوگ مکان میں داخل ہو گئے اور دربان نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

انھوں نے اندر جا کر دیکھا۔ کشادہ اور عالیشان مکان کے اندر تھوڑے فاصلے سے ایک خوشنما مکان تھا، جس کے متصل دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کی سطح پر ایک بزرگ چٹائی بچھائے مصروفِ عبادت تھے۔ اشیق کے ایک آدمی نے پانی میں اُتر کر ان کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ آگے بڑھتے ہی ڈوبنے لگا۔ اشیق نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا پھر دوسرے آدمی نے ایسی ہی غلطی کی، وہ بڑی مشکل سے بچ تو گیا مگر بے ہوش ہو گیا۔

پھر ان سب نے بزرگ کی بہت منت سماجت کی لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور اسی محویت سے مصروفِ عبادت رہے۔

دوسری بار معتضد نے ایک اور کوشش کی۔ مکان میں ایک بزرگ خوش الحانی سے تلاوتِ کلامِ پاک کرتے پائے گئے پھر فوجیوں کے بیچ سے نکلے چلے گئے۔ کسی کو ان کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ ہو سکی ــــــ بالکل اسی طرح جس طرح رسولؐ شبِ ہجرت نکل کر گئے تھے۔ (۱۲۱)

حضرت حجتؑ کے نائب

غیبتِ صغریٰ کا آغاز ۹ ربیع الاوّل سنہ ۲۶۰ھ یعنی امامت کے پہلے دن

سے ہوگیا تھا۔ امام حسن عسکریؑ زندگی کے آخری دنوں میں اس کی ہدایات دیے گئے تھے۔

عثمان بن سعید عمری قبیلہ بنی اسد کے بزرگ تھے۔ امام حسن عسکریؑ کے زمانے میں روغن فروشی کیا کرتے تھے اور روغن کی مشک میں رکھ کر مالِ خمس حضرت کو پہنچایا کرتے تھے۔ حضرت حجتؑ کی نیابت میں بھی ان کا یہی اندازِ کار رہا۔ خمس کے علاوہ لوگوں کی درخواستیں لے کر بھی خدمتِ امامؑ میں پہنچاتے اور لوگوں کو ان کے جوابات لاکر دیتے رہے۔ بغداد میں ان کا مزار دروازہ جبلہ کے قریب واقع ہے۔

پھر عثمان کے بیٹے ابوجعفر محمد بن عثمان نے اس منصب کا شرف حاصل کیا۔ یہ بھی اپنے عظیم المرتبت باپ کی طرح بڑی وفاداری اور دیانت سے خدمات انجام دیتے رہے اور دشمن کو امامؑ کی ہوا تک نہ لگی۔ ۳۰۴ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ ان کی قبر دروازہ کوفہ میں سرِ راہ واقع ہے۔

حسین بن روح ابوجعفر محمد کے مقربین میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار تھے ان کی زندگی میں بھی ایسی خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ ابوجعفر محمد کے مرتے وقت حسین بن روح پائنتی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے حسین کو اس اعزاز کی مبارکباد دی اور خود ان کے پائیں بیٹھنے کی کوشش کی مگر حسین نے بیٹھنے نہ دیا۔

حسین بن روح سُنّی اور شیعہ دونوں میں ثقہ اور صالح مانے جاتے۔ آپ نے بڑی محنت سے تقیہ میں رہ کر خدمت انجام دی۔ شعبان ۳۲۶ھ میں انتقال فرمایا اور بغداد کے محلہ نوبخت میں دفن ہوئے۔

ابوالحسن علی بن محمد سمری ان کے قائمقام ہوئے اور ان کے ذریعہ امامؑ سے ان لوگوں کا رابطہ قائم رہا لیکن ۱۵ شعبان ۳۲۹ھ کو آپ کی وفات سے قبل امامؑ کا فرمان صادر ہوگیا۔

"علی بن محمد سمری! خدا تیرے بھائیوں کو تیری مصیبت میں صبرِ عظیم عطا فرمائے تو چھ دن کے اندر اندر مرنے والا ہے۔ پس تیار ہوجا اور کسی کو اب وصیت نہ کر کہ وہ تیرا قائمقام ہو کیونکہ غیبت کبریٰ

واقع ہوگئی ہے۔ اب میں ظاہر نہ ہوں گا مگر بعد اذنِ خدا، اور یہ ایک طولانی مدّت کے بعد ہوگا۔ جب کہ لوگ قسی القلب ہوجائیں گے زمین جور سے بھر جائے گی۔ عنقریب بعض شیعہ مشاہدے کا دعویٰ کریں گے مگر جو خروج سفیانی اور صحیفۂ آسمانی سے پہلے مشاہدے کا داعی ہو وہ جھوٹا اور مفتری ہے" (۱۲۲) (بارہویں امام از مولانا سید ظفر حسن صہ۲۲)

اس کے جواب میں علی بن محمد سمری نے ایک عرضداشت کے ذریعہ دریافت کیا کہ دینی مسائل کس طرح حل ہوں گے؟ اس کا جواب یہ آیا کہ ہماری احادیث کے راویوں سے رجوع کیا جائے اور ان کے بیان کو حجّت قرار دیا جائے اور ان کی مخالفت کو کفر سمجھا جائے۔

ان چار نائبین کے علاوہ امام کے بعض سفراء اور بھی تھے۔ ربط بھی عموماً ان نائبوں کے ذریعہ ہی قائم ہوتا تھا پھر بھی کوئی دُور سے کبھی کبھی ایک جھلک دیکھ لیتا تھا۔

بغداد سے عاجز، بلالی، عطار، کوفہ سے عاصمی، اہواز سے محمد بن ابراہیم ہمدان سے محمد ابن صالح۔ رے سے بسامی و اسدی۔ آذربائیجان سے قسم بن علاء نیشاپور سے محمد بن شاذان۔ قسم سے احمد بن اسحٰق۔

لیکن اب ہر ایک کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا اور امام قیامت تک کے لئے نظروں سے غائب ہوگئے تھے۔

۹ ربیع الاوّل سنہ ۲۶۰ھ سے امام کن کن جگہوں پر رہے اور کب غار میں داخل ہوئے؟ اس کا تعیّن ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی وہ غار میں داخل ہوکر برآمد نہیں ہوئے جسٹس امیر علی لکھتے ہیں۔

"حسنؑ کا کم سن بچہ، جس کی عمر کل پانچ برس تھی، باپ کی جُدائی سے گھبرا کر ایک غار میں، جو گھر کے نزدیک ہی تھا، داخل ہوا۔ اس غار سے وہ بچہ پھر واپس نہ آیا۔ اس جانگداز مصیبت نے پیروانِ حسینؑ کو بڑی بڑی امیدوں سے لبریز کر رکھا ہے

ان کا خیال ہے کہ یہ بچہ اس گناہگار اور غمزدہ دُنیا کو گناہوں اور ظلموں کے بوجھ سے نجات دینے واپس آئے گا۔"

"چودہویں صدی مسیحی تک، جب کہ ابنِ خلدون اپنی مہتم بالشان کتاب حوالۂ قلم کر رہا تھا تو یہ دستور تھا کہ شیعہ لوگ شام کے وقت اس غار کے مُنہ پر جمع ہوتے اور بمنّت وسماجت اس بچے سے واپس آنے کی درخواست کرتے، پھر بہت دیر تک انتظار کر کے دل شکستہ و مایوس اپنے گھروں کو لَوٹ جاتے۔" (۱۲۳)

سامرہ کو حضرت سام بن نوحؑ نے آباد کیا تھا۔ خلیفہ معتصم نے اس کو فوجی چھاؤنی بنایا اور اس کا نام "سرمن راء" رکھا یعنی جو دیکھے، وہ خوش ہو جائے جو کثرتِ استعمال میں "سرمن رائے" ہو گیا۔ یہیں حضرت حجتؑ کے غائب ہونے کا سرداب، ایک مسجد کے قریب واقع ہے اور امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے مزاروں سے قریب ہے۔ یہ سرداب ایک غار کے اندر ہے جس کو کچھ لوگ اس زمانے میں بھی جانتے تھے اور اب تو دُور دُور تک کے لوگ واقف ہیں۔

امامؑ جب اس غار کی طرف چلے ہوں گے تو کچھ لوگ رخصت کرنے ضرور آئے ہوں گے۔ ان میں علیہ منزلت نرجس خاتون بھی ہوں گی اور جناب حکیمہ خاتون بھی۔ کس قدر جذبات آفریں ہوگا وہ منظر، جب امام ہمیشہ کو غائب ہونے کے لئے غار کی طرف جا رہے ہوں گے اور پروانہ وار فدا ہونے والے انھیں جاتے دیکھ رہے ہوں گے۔

امامؑ نے تو صبر کی سِل سینے پر رکھ لی ہو گی کیونکہ وہ امامؑ تھے لیکن ماں اور پھوپھی نے کن آنکھوں سے آخری بار دیکھا ہوگا؟ اس کا اندازہ صرف محسوسات سے لگایا جا سکتا ہے تاہم بعض روایات کی رُو سے ان لوگوں کو اور بعض دوسرے عقیدت مندوں کو کبھی کبھی زیارت کا شرف حاصل ہوا جن میں بغداد، ہمدان وغیرہ کے لوگ شامل ہیں۔

بغداد والوں میں ابوالقاسم بن رئیس، ابوعبداللہ بن فروغ، مسرور الطباخ احمد و محمد پسران حسن، اسحٰق کاتب، صاحب الفراء، صاحب الصرۃ المختومہ، ابوالقاسم بن ابی حلیس، ابوعبداللہ الکندی، ابوعبداللہ الجنیدی، ہارون الفراز اور النیلی

ہمدان کے رہنے والوں میں محمد بن کشمرد، جعفر بن ہمدان۔

دینور کے باشندوں میں حسن بن ہروان، احمد بن ہروان

اصفہان سے ابن بازشالہ، ضیمر سے زیدان۔ قم سے حسن بن نصر، محمد بن محمد، علی بن محمد ابن اسحٰق، محمد بن اسحٰق، حسن بن یعقوب۔ رے سے قسم بن موسیٰ، فرزند قسم، ابن محمد بن ہارون، صاحب الحصاۃ، علی بن محمد، محمد بن یعقوب کلینی، ابوجعفر الرفار

قزوین سے مرداس، علی بن احمد، فارس سے المجروح، شہزور سے ابن الجمال مرو سے صاحب الالف دینار، صاحب المال والرقعۃ البیضا، ابوثابت، قدس سے مجروح

نیشاپور سے محمد بن شعیب، یمن سے فضل بن یزید، حسن بن فضل، جعفری ابن الاعجمی، شمشاطی۔

مصر سے صاحب المولودین، صاحب المال، ابورجاء۔ نصیبین سے ابومحمد بن الوجنا، اہواز سے الحصینی۔

لیکن ۱۵ شعبان ۳۲۹ھ کے بعد پھر کسی نے امامؑ کو نہیں دیکھا؟ آپ کہاں چلے گئے؟ اس کو خدا ہی جانتا ہے۔ بعض روایات سے جزیرۂ خضرا میں آپ کے قیام کا پتہ چلتا ہے اور جزیرۂ خضرا کا مقام بھی متعین کیا جاتا ہے لیکن یہ سب قیاس کا کرشمہ ہے۔ اس سے صرف عالم الغیب واقف ہے کہ اس نے امامؑ کو کہاں رکھا ہے؟

غیبتِ صغریٰ میں امام مہدیؑ کا بیشتر کام تو یہی تھا کہ فقہی سوالات کے جوابات دے کر لوگوں کو تشفی کرتے اور مشیت الٰہی پر شاکر رہنے کی تلقین فرماتے، پھر بھی بعض خطوط کے جوابات بھی آپ نے دیئے ہیں جن میں ایک خط شیخ صدوق کے نام ہے۔ آپ نے غیبتِ صغریٰ میں ہوش سنبھالا اور امامؑ

کی خدمت میں عرضداشت روانہ کیں۔ امام نے ان کا جواب عنایت فرمایا اور زمانے کو دیکھتے ہوئے تقیہ میں رہ کر تبلیغ دین کی تلقین کی۔ ایک خط شیخ مفید کے نام بھی ہے، جو غیبتِ کبریٰ کا معلوم ہوتا ہے۔

اسحٰق بن یعقوب کے خط میں آپ نے محمد بن یعقوب کلینی کے استفسارات کے جوابات دیئے ہیں۔

"جو ہمارا منکر ہے، وہ ہم میں سے نہیں۔ میرے عزیزوں میں سے جو مخالفت کرتے ہیں، ان کی مثال پسرِ نوحؑ اور برادرانِ یوسف کی ہے۔ جَو کی شراب حرام ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ قتل نہیں ہوئے، وہ کافر، جھوٹے اور گمراہ ہیں، گانے والی کی اُجرت و قیمت حرام ہے، خمس ہمارے سادات شیعہ کے لئے حلال ہے۔"

زیارتِ ناحیہ بھی غیبتِ صغریٰ ہی میں امام سے حاصل ہوئی جس سے شہدائے کربلا کے اسمائے مقدس کا تعیّن ہو جاتا ہے۔

غیبتِ کبریٰ میں بہت سے معجزات آپ سے منسوب ہیں۔ ان میں ایک حجرِ اسود کی تنصیب بھی ہے۔ قرامطہ نے جب حجرِ اسود کو نکال کر دوبارہ نصب کرنے کی کوشش کی تو وہ صحیح جگہ پر نصب ہی نہ ہوتا تھا کہ اتنے میں ایک خوبرو جوان، ایک طرف سے آیا۔ اس نے حجرِ اسود کو صحیح جگہ نصب کیا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا۔ کسی کو نہیں معلوم یہ نوجوان کون تھا۔

وقتِ ظہور

امامؑ کی طولِ عمر ایک بحث طلب مسئلہ ہے اور وقتِ ظہور بھی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ابھی حضرت سام کے پوتے کی عمر حضرت نوحؑ کے برابر نہیں پہنچی ہے جو لوگ حیاتِ الیاسؑ و خضرؑ کے قائل ہیں اُنہیں تو آپ کے بقیدِ حیات ہونے کا اعتراف کر ہی لینا چاہیئے۔ رہ گئی ظہور کے وقت کی بات تو وہ حکمِ الٰہی کا پابند ہے، جب اشارہ ہوگا تو سقفِ کعبہ سے اذاں کی آواز بلند ہو جائے گی۔

علاماتِ ظہور میں چند نمایاں باتیں بیان کی گئی ہیں ۔۔۔۔۔ علم دُنیا سے اُٹھ

جائے گا۔ عمل کم ہو جائے گا۔ قاتل زیادہ ہو جائیں گے، اور ہادی و فقہا کم۔ عالم خیانت گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔ شعرا بڑھ جائیں گے۔ قبرستان مسجدوں میں بدل جائیں گے۔ قرآن و مساجد کی زیب و زین زیادہ ہو گی۔ خلوص نیت ناپید، افعالِ قبیحہ غالب ہوں گے۔ ظلم و فساد بڑھ جائے گا۔ لوگ ایک دوسرے کو بُرے کاموں پر اُکسائیں گے اور نیک کاموں سے روکیں گے۔ مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے حاجت پوری کریں گی۔ امرا کافر اور علما فاجر ہو جائیں گے۔ اہل الرائے کی سوچ کج ہو جائے گی اور غبی الذہن کا مشورہ قابلِ قبول ٹھہرے گا۔ زمین تین مرتبہ دھنسے گی، مشرق و مغرب اور جزیرہ نما عرب میں۔ دجال سجستان میں پیدا ہو گا اور سفیانی خروج کرے گا۔

اس طرح کی اور بھی علامات ہیں جب وہ سب ظاہر ہوں گی تو امام علیہ السلام کا ظہور ہو گا۔

شانِ ظہور

آپ تشریف لائیں گے تو بڑی سطوت و جبروت کے ساتھ تاہم نہایت خاموشی سے مکے میں ظہور فرمائیں گے۔ سر پر زرد رنگ کا عمامہ، دوش پر رسالتمآب کی چادر، پاؤں میں حضورؐ کی نعلین، آگے آگے چند بھیڑیں چلتی ہوئی تاکہ کوئی پہچان نہ سکے، یکہ و تنہا بغیر کسی رفیق کے داخل کعبہ ہوں گے۔

ملائکہ رات کی تاریکی میں صف بصف عرش سے اُتر آئیں گے۔ حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل حاضرِ خدمت ہو کر نوید ظہور پہنچائیں گے اور آپ رکن حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر آواز دیں گے۔

"آجاؤ، میرے فدا کارو! ظہور کا وقت آگیا ——"

اور تین سو تیرہ آدمی ہوا کے دوش پر دُنیا کے مختلف حصوں سے سمٹ کر آجائیں گے۔

کتنا نظر افروز ہو گا ظہور کا یہ منظر۔ ایک ابر سفید سر پر سایہ فگن

ہوگا۔ سرورِ کائنات کی زرہ جسم پر اور آپ کی تلوار پہلو میں لٹک رہی
ہوگی۔ جبرائیل داہنی طرف، میکائیل بائیں جانب ایستادہ ہوں گے
اور تین سو تیرہ نقیب آپ کو گھیرے میں لئے ہوئے جدارِ کعبہ سے ٹیک
لگا کر آپ کھڑے ہوں گے۔ جبرئیل کی آواز فضا میں گونجے گی اور ہر مومن تک
پہنچ جائے گی۔ (۱۲۴)

عیسیٰ عرش سے اُتر کر آئیں گے۔ سقفِ کعبہ پر آپ خود اذان دیں گے، پھر
امامت نماز آپ فرمائیں گے۔ عیسیٰ آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور دُنیا کو بتائیں گے
کہ اب کوئی مذہب نہیں بجز دینِ اسلام کے۔

اور پھر واقعی توحید کا بول بالا ہوگا اور صرف محمدؐ اور آلِ محمدؐ کا دَور دورہ ہوگا۔
ہماری نسلوں پر نسلیں ایک امید پر گزرتی چلی جا رہی ہیں مگر وہ دن آئے گا
ضرور جب خونِ سادات کا انتقام لیا جائے گا اور ظالموں کو ان کے کئے کی سزا
ملے گی ـــــ خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو اس روزِ سعید کو دیکھیں گے!

آئیں گے وہ تو آئیں گے اس کرّوفر کے ساتھ
دامن سے ان کے دامنِ محشر بندھا ہوا

مآخذ

۱ کنت کنزاً مخفیاً احببت ان اعرف فخلقتک یا محمد!

۲ اول ما خلق اللہ نوری۔ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص۱ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی۔ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء

۳ کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین۔ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص۲ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی، مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی ۱۹۷۵ء

۴ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص۳ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)

۵ خلقت انا و علیؑ من نور واحد۔ عبقات الانوار، حدیث نور ص۱۰۸ مطبع مشرق الانوار لکھنؤ ۱۳۰۳ھ بحوالہ بہجۃ المجالس از مصطفیٰ بن عبداللہ قسطنطینی (مکتبۃ العلوم کراچی)

۶ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص۳ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)

۷ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص۱ از علامہ محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)

۸ "مضمون قرآن مجید کی برکتیں" از علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی مشمولہ نزول قرآن مجید۔ شمارہ خاص "خاتون پاکستان" کراچی ۱۳۸۷ھ، ص۵۳

۹ "مضمون فرقان، تنزیل قرآن" از مولانا محمد عبدالباری فرنگی محلی مشمولہ نزول قرآن مجید شمارہ خاص "خاتون پاکستان کراچی" ۱۳۸۸ھ، ص۸۷ (مولف)

۱۰ اسپرٹ آف اسلام اردو ترجمہ ص۹۲ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

۱۹۷۳ء بحوالہ لکچر پروفیسر فلکر (مولف)
۱۱ اسپرٹ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۹۵ مطبوعہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۳ء
۱۲ "مضمون فرقان، تنزیل قرآن" از مولانا محمد عبدالباری فرنگی محلی مشمولہ نزول قرآن مجید شمارہ خاص "خاتون پاکستان" کراچی ۱۳۸۷ھ، ص ۹۷
۱۳ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص ۶ از شیخ علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)
۱۴ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص ۷ از شیخ علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)
۱۵ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص ۳۴ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی ۱۹۷۵ء (مولف)
۱۶ اسوۂ علی از رئیس احمد جعفری ندوی ص ۲۶ مطبوعہ آفتاب اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء
۱۷ مدارج النبوۃ حصہ دوم ص ۳۸ از علامہ محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)
۱۸ تاریخ احمدی ص ۱۵ بحوالہ الخصائص محدث نسائی، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۵۲ء (مولف)
الاستیعاب جلد ۲ از علامہ عبدالبر قرطبی ص ۲۲۵ مطبوعہ حیدرآباد دکن (مکتبۃ العلوم کراچی)
۱۹ اسپرٹ آف اسلام از جسٹس امیر علی (اردو ترجمہ) ص ۹۸ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۳ء (مولف)
۲۰ صحیح البخاری جلد ۳ ص ۱۹۳ اور ص ۲۳۴ مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۵ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۲۱ تاریخ ملت عربی ترجمہ ہاشمی فرید آبادی مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۱۷۵

۲۲ اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) مطبوعہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۱۳۳ (مولف)

۲۳ مدارج النبوہ حصہ دوم از شاہ عبدالحق محدث دہلوی ص ۹۲ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی ۱۹۷۵ء (مولف)

۲۴ مدارج النبوہ حصہ دوم از شاہ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۴ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)

۲۵ الفاروق از مولانا شبلی نعمانی ص ۶۴ مطبوعہ مکتبۂ رحمانیہ لاہور (مولف)

۲۶ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۷۵ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ (مولف)

۲۷ الحیواۃ الحیوان جلد ۱ ص ۲۷۴ مطبع المعاهد بجوار قسم الجمالیہ بالقاهره، مطبع حجازی قاهره (مکتبۃ العلوم کراچی)

۲۸ مدارج النبوہ حصہ دوم ص ۲۹۷ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)

۲۹ المجمع البحرین ص ۱۸۱ مطبوعہ تہران ایران ۱۳۱۴ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۳۰ الدرالمنثور جلد ۶ ص ۷۷ مطبوعہ میمنۂ مصر ۱۳۱۴ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۳۱، ۳۲ ماخوذ از مدارج النبوہ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء ص ۴۱۱، ص ۴۱۲ (مولف)

۳۳ روضۃ الصفا جلد ۲ ص ۱۵۸ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۴ء (مکتبۃ العلوم کراچی)

۳۴ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ہندوستان، ص ۶۸ (مولف)

۳۵ مدارج النبوہ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء، ص ۴۸۰ (مولف)

۳۶ مدارج النبوہ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی
۱۹۷۵ء ، ص۵۱۲ (مولف)
۳۷ مدارج النبوہ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی
۱۹۷۵ء ، ص۵۲۲ (مولف)
۳۸ السیرۃ الحلبیہ جلد ۲ ص۲۳۲ مطبوعہ مصطفی البابی
الحلبی مصر ۱۳۴۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۳۹ مدارج النبوہ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی
کراچی ۱۹۷۵ء ، ص۵۳۰ (مولف)
۴۰ مدارج النبوہ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی
۱۹۷۵ء ص۵۸۶ (مولف)
۴۱ المسند احمد ابن حنبل جلد ۳ ص۲۸۳ مطبع میمینہ مصر ۱۳۱۳ھ
(مکتبۃ العلوم کراچی)
۴۲ مدارج النبوہ از علامہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ پبلشنگ کمپنی
کراچی ۱۹۷۵ء ، ص۶۷۹ (مولف)
صحیح المسلم جلد۴ ، باب فضائل علی ص۱۱۰،۱۰۹ مطبع مصطفی
البابی الحلبی مصر ۱۳۴۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۴۳ ذخائر العقبیٰ از محب الدین احمد بن عبداللہ طبری
مکتبۃ القدسی قاہرہ ۱۳۵۶ھ ، ص۲۵ (مکتبۃ العلوم کراچی)
قرآن مجید تفسیر مباہلہ ، مولانا اشرف علی تھانوی ، بر حاشیہ ۔
۴۴ مدارج النبوہ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۔
۱۹۷۵ء ، ص۶۹۳ (مولف)
۴۵ صحیح البخاری جلد ۱ ص۲۵ جلد ۲ ، ص۱۳۵ ، جلد ۳ ص۱۶۵ ، جلد ۴
ص۵ ، ص۱۹۲ مطبع مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۳۴۹ھ

(مکتبۃ العلوم کراچی)
تاریخ ابن خلدون اردو ترجمہ حصہ اوّل ص ۲۰۸ مطبوعہ نفیس اکیڈمی
کراچی سنہ ۱۹۷۶ء (مکتبۃ العلوم کراچی)
۴۶ روضۃ الصفا جلد ۲، ص ۲۰۸ سطر ۱۶ مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۹۱۴ء (مکتبۃ العلوم کراچی)
۴۷ غیاث اللغات ص ۲۷۰ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ (مولف)
۴۸ صحیح البخاری جلد ۲ باب تزویج النبی ص ۲۱۶، جلد ۳ ص ۱۸۹
مطبع المصطفیٰ البابی الحلبی مصر سنہ ۱۳۴۹ء (مکتبۃ العلوم کراچی)
۴۹ تاریخ احمدی ص ۱۰۷ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۳۵۲ھ بحوالہ
سیرۃ الحلبیہ (مولف)
۵۰ تاریخ احمدی ص ۱۰۵ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۳۵۲ء بحوالہ
جذب القلوب (مولف)
۵۱ خلافت وملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۳۰۶ مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن
لاہور سنہ ۱۳۸۸ء (مولف)
۵۲ صحابیات از علامہ نیاز فتحپوری ص ۵۸ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء (مولف)
۵۳ صحیح البخاری جلد ۱ باب الغسل بالصاع مطبع المصطفیٰ البابی
مصر سنہ ۱۳۴۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۵۴ صحیح المسلم جلد ۳، ص ۱۴۳ مطبع المصطفیٰ البابی الحلبی مصر
سنہ ۱۳۴۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۵۵ المسند امام احمد بن حنبل الجزو الثانی ص ۲۶ مطبع المیمنیہ
مصر سنہ ۱۳۱۳ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۵۶ الملل والنحل از امام ابوالفتح محمد بن عبد الکریم شہرستانی
ص ۲۵، ص ۲۶ مطبع حیدری بمبئی سنہ ۱۳۱۴ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۵۷ الفاروق از شبلی نعمانی ص ۸۳ مکتبہ رحمانیہ لاہور (مولف)

یعقوبی جلد۲، ص۹۳ مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۳۷۸ھ
(تاریخ یعقوبی) (مکتبۃ العلوم کراچی)

۵۸ الملل والنحل از شہرستانی مطبع حیدری بمبئی ۱۳۱۴ھ
(مکتبۃ العلوم کراچی)

۵۹ مدارج النبوۃ از شاہ عبدالحق محدث دہلوی ص۶۹۸ مطبوعہ مدینہ
پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۵ء (مولف)

۶۰ صحابیات از علامہ نیاز فتحپوری ص۲۹ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء
بحوالہ استیعاب (مولف)

۶۱ مدارج النبوۃ از علامہ عبدالحق محدث دہلوی ص۷۰۶ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ
کمپنی ۱۹۷۵ء (مولف)

۶۲ المعارف از ابن قتیبہ دینوری ص۷۶ مطبع رحمانیہ مصر
۱۳۵۳ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۶۳ البدایہ والنہایہ جلد ۶، ص۳۲۲ از علامہ ابن کثیر مطبعۃ
السعادۃ مصر ۱۳۵۸ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۶۴ تاریخ اعثم کوفی اردو ترجمہ مکتبۂ تعمیر ادب لاہور، ص۳۲ (مولف)

۶۵ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۹۵۲ء (مولف) ص۱۴۸

۶۶ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۹۵۲ء، ص۲۴۸ (مولف)

۶۷ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۹۵۲ء، ص۲۵۸ (مولف)

۶۸ خلافت وملوکیت از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ص۱۰۰ مطبوعہ ترجمان القرآن
لاہور ۱۹۸۸ء (مولف)

۶۹ الاستیعاب جلد ۱ ص ۶۰ مطبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد دکن ۱۳۳۶ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۷۰ تاریخ الطبری جلد ۵ ص ۱۷۲ مطبع حسینیہ مصر (مکتبۃ العلوم کراچی)
۷۱ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۳۳۲ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)
۷۲ ہسٹری آف سیراسنز اردو ترجمہ ص ۸۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۷۹ء (مولف)
۷۳ خلافت و ملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۳۸ مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۸۸ء (مولف)
۷۴ ناسخ التواریخ کتاب الصفین ص ۳۱۵ مطبع آقا میر باقر تہرانی ۱۳۱۳ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۷۵ تاریخ سندھ از مولانا ابوظفر ندوی ص ۳۳ مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء (مولف)
تاریخ اسلام از ذاکر حسین جلد ۳ ص ۲۲۳ مطبوعہ دہلی ۱۳۳۱ھ (مولف)
۷۶ تاریخ فرشتہ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ص ۹۰ (مولف)
۷۷ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۳۵۲ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)
۷۸ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۲۸۹ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)
۷۹ تاریخ ابوالفدا جلد ۱ باب ذکر تسلیم الحسن ص ۹۷ مطبوعہ دارالطباعۃ العربیۃ بیروت (لبنان) مکتبۃ العلوم کراچی)
۸۰ صحیح البخاری جلد ۱ باب قبلہ ص ۶۱ مطبوعہ المصطفی البابی الحلبی مصر ۱۳۵۵ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)

۸۱ صحیح البخاری باب سہو ص ۱۵۱ مطبوعہ المصطفیٰ البابی
الحلبی مصر ۱۳۵۵ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۸۲ خلافت وملوکیت از سید ابو الاعلیٰ مودودی ص ۱۶۶ مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن
لاہور ۱۹۸۸ء (مولف)
۸۳ عقد الفرید جلد ۲ ص ۳۱۳ مطبعۃ الجمالیۃ مصر ۱۳۳۱ھ
(مکتبۃ العلوم کراچی)
۸۴ ینابیع المودۃ از شیخ سلیمان قندوزی ص ۹۷ مطبعۃ
اختر اسلامبول ۱۳۰۱ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۸۵ حبیب السیر جلد اجزو سوم ص ۸۵ مطبوعہ بمبئی
(مدرسۃ الواعظین لکھنؤ)
۸۶ صواعق المحرقہ ص ۱۳۱ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۱۲ھ
(مکتبۃ العلوم کراچی)
۸۷ شہادت حسین از مولانا ابو الکلام آزاد ص ۸۴ مطبوعہ ادبستان لاہور
۱۹۶۶ء (مولف)
۸۸ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۵۴ مطبوعہ دار المصنفین
اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)
۸۹ شہادت حسین از مولانا ابو الکلام آزاد ص ۸۴ مطبوعہ ادبستان لاہور ۱۹۶۶ء (مولف)
۹۰ جلاء العینین فی سیرۃ علی ابن الحسین ص ۵ مطبع اثنا عشری
دہلی ۱۳۳۹ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۹۱ المعارف ابن قتیبہ دینوری ص ۹۵ مطبع رحمانیہ مصر
۱۳۵۳ھ (مکتبۃ العلوم کراچی)
۹۲ سر الشہادتین از شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ص ۱۵، ۱۶ امامیہ پبلیکیشنز لاہور
۹۳، ۹۴ شہادت حسین از مولانا ابو الکلام آزاد ص ۴۸، ۵۰ مطبوعہ ادبستان لاہور ۱۹۶۶ء

۹۵ واقعات مندرجہ ذیل کتب سے ماخذ ہیں۔

تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء

سرۃ الشہادتین از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی مطبوعہ امامیہ پبلیکیشنز لاہور

شہادت حسین از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ ادبستان لاہور ۱۹۶۵ء

الحسین از مولانا آغا مہدی آل غفراں مآب مطبوعہ جمعیت خدام عزا کراچی

چودہ ستارے از مولانا سید نجم الحسن کراروی مطبوعہ رضا پبلیکیشنز لاہور

امت اور اہل بیت مولفہ سید بشارت علی مطبوعہ کاظمی پریس حیدرآباد دکن ۱۴۰۲ھ

امام زین العابدین کی سیاسی زندگی از سید محمد باقر شمس مطبوعہ دارالتصنیف رضویہ کالونی کراچی

بحارالانوار از علامہ مجلسی اردو ترجمہ مطبوعہ رضویہ بک ایجنسی کراچی ۱۹۸۰ء

۹۶ شہادت حسین از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ ادبستان لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۸۷ (مولف)

۹۷ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ دارالتصنیف اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء، ص ۶۳ (مولف)

۹۸ ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی اردو ترجمہ ص ۹۱ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۵ء (مولف)

۹۹ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۶۱ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)

۱۰۰ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۸۰ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)

۱۰۱ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی ص ۹۰ مطبوعہ دارالمصنفین

اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)

۱۰۲ انساب الاشراف از احمد بن یحییٰ جابر بلاذری جلد ۵ ص ۲۷۴ (شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

۱۰۳ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ دوم ص ۱۸۷ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء (مولف)

۱۰۴ ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی، اردو ترجمہ ص ۱۶۴ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۰۵ ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی، اردو ترجمہ ص ۲۰۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۰۶ ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی اردو ترجمہ ص ۲۰۲ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۰۷ ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی اردو ترجمہ ص ۲۳۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۰۸ واقعات مندرجہ ذیل کتب سے اخذ کئے گئے۔

مصائب شیعہ پنجم و ششم از مولانا سعادت حسین خان مطبوعہ ادارۂ ناشر العلوم لکھنؤ ۱۹۷۸ء۔

امت اور اہل بیت مولفہ محمد بشارت علی مطبع کاظمی حیدرآباد دکن ۱۹۷۸ء

چودہ ستارے از مولانا نجم الحسن کراروی مطبوعہ الرضا پبلیکیشنز لاہور

چھٹے امام از مولانا ظفر حسن مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

۱۰۹ آٹھویں امام از مولانا ظفر حسن مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ص ۱۶

۱۱۰، ۱۱۱ ہسٹری آف سیراسنز جسٹس امیر علی اردو ترجمہ ص ۲۲۸، ص ۲۳۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۱۲ دعوتِ حق از مولانا ابوالکلام آزاد ص ۲۰ مطبوعہ کتاب خانہ لاہور

۱۱۳ عہدِ مامون اور امام رضاؑ ص ۱۷ مولفہ سید ابن حسن جارچوری مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ کراچی۔ (مولف)

۱۱۴ ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی اردو ترجمہ ص ۲۶۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۱۵ مصائب الشیعہ جلد ششم از مولانا سعادت حسین ص ۱۲۳ مطبوعہ ناصر العلوم لکھنؤ ۱۹۷۸ء، بحوالہ بحار الانوار (مولف)

۱۱۶ ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی اردو ترجمہ ص ۲۶۸ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۵ء (مولف)

۱۱۷ دسویں امام از مولانا ظفر حسن ص ۵۹ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ (مولف)

۱۱۸، ۱۱۹ - واقعات مندرجہ ذیل کتب سے ماخوذ ہیں۔

دسویں امام از مولانا سید ظفر حسن مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی اردو ترجمہ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء

چودہ ستارے از سید نجم الحسن کراروی مطبوعہ الرضا پبلیکیشنز لاہور

ائمت اور اہلِ بیت از محمد بشارت علی مطبع کاظمی حیدرآباد دکن ۱۴۰۴ھ

۱۲۰ تا ۱۲۴ - بارہویں امام از مولانا سید ظفر حسن مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

ہسٹری آف سیراسنز از جسٹس امیر علی اردو ترجمہ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء

چودہ ستارے از سید نجم الحسن کراروی مطبوعہ الرضا پبلیکیشنز لاہور۔